بسم الله الرحمن الرحیم

فَاسْئَلُوْآ اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

فتاویٰ نظامیہ

از:

حضرت العلام المفتی محمد رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اول دارالافتاء مدرسہ نظامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سیّد المرسلین محمدن المصطفیٰ و علیٰ آلہ و اصحابہ الطیّبین الطاہرین۔ اما بعد، بلدہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں محض بہ توجہِ خاص و عنایاتِ سرکار عالی متعالی صاحب التفضل و المعالی سلطان ابن سلطان نواب میر عثمان علیخان بہادر نظام الملک آصف جاہ سابع جی۔سی۔ایس۔ای خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، مدرسہ نظامیہ علوم دینیہ کا مرکز اور شہرۂ آفاق ہونے کی وجہ سے اہلِ غرض حسب ضرورت دینی سؤالات بغرضِ استحصالِ جوابات مدرسہ مذکورہ کو ارسال کیا کرتے تھے، طلبہ و مدرسینِ مدرسہ کو تعلیم و تعلم سے اتنی فرصت نہ تھی کہ اپنے مفوضہ کام کے علاوہ ادائیِ جوابات کی بھی خدمت پابندی سے اداء کریں۔ اور چونکہ لوازمات مدرسہ سے فتویٰ نویسی بھی ایک ضروری امر تھا، اس لئے سید العلمائ و العلماء حضرت حافظ حاجی مولانا مولوی محمد انوار اللہ خان بہادر معین المہام امور مذہبی سرکار عالی سرپرست مدرسہ موصوف نے بتاریخ غرۂ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۸ ہجری دار الافتاء افتتاح کرکے راقم کو مفتی مدرسہ مقرر فرماکر اس کام کی باقاعدہ بنیاد قائم کی، خدا کے فضل سے جب کثیر التعداد مسائل دینیہ کا ذخیرہ جمع ہونے لگا تو حسبِ درخواست اعیانِ قوم حضرت قبلہ مدظلہ العالی کا ارشاد ہوا کہ جمع شدہ مسائل کو چھپوانے کا سلسلہ جاری کیا جائے تاکہ سائلین کے علاوہ جملہ مؤمنین بھی اس سے مستفید ہوں اور مسائلِ فقہیہ کا کافی ذخیرہ اردو زبان میں فراہم ہوجائے۔

حسب الارشاد مولانا ممدوح ان مسائل دینیہ کا مجموعہ موسومہ بہ "فتاویٰ نظامیہ" حصۂ اول ناظرین کے ملاحظہ میں پیش ہے، اور حصۂ دوم کے طبع کا انتظام جاری ہے، ان شاء اللہ تا قیام دار الافتاء اسی طرح اس کے تمام حصص کے طبع کا سلسلہ بھی جاری رہیگا۔ (۱)

پس ناظرین باتمکین سے التماس ہے کہ بمقتضائے بشریت اس میں اگر کہیں خطا واقع ہو تو بنظر عطاء معاف فرمائیں اور مؤلف و جمیع معاونین کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

محمد رکن الدین عفی عنہ

مفتی مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن

---

(۱) حضرت مولانا مفتی کبیر محمد رکن الدین رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی اعظم جامعہ نظامیہ کے یہ فتاویٰ پہلی طباعت میں تین جلدوں میں شائع ہوئے تھے، لیکن عرصہ سے ناپید تھے، مجلس اشاعت العلوم نے اب انکو دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے اجلاس عام میں غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ عالیہ میر مجلس اشاعت العلوم حضرت مولانا مفتی محمد عظیم الدین صاحب اس کی ترتیب پر غور مکرر فرماکر فقہی ابواب کے مسائل یکجا کرکے حسب ترتیب "ہدایہ" تمام کے تمام فتاوائے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ایک ہی جلد میں مرتب فرمائیں۔ چنانچہ حسب قرارداد فتاویٰ نظامیہ کی سابقہ تین جلدیں ایک ہی جلد میں بہترین عصری انداز کی کمپیوٹر کتابت کے ذریعہ آفسٹ پر طبع کی جارہی ہیں تاکہ اہل اسلام ان سے استفادہ کرسکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کِتَابُ العَقَائِد

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کو معراج جسمانی ہوئی تھی یا روحانی؟ بہ صورت اولیٰ خرق و التیام (یعنی آسمانوں کے پھٹنے اور ملنے) کو محال سمجھنے والا شخص جو جسمانی معراج کو محال سمجھے اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اور معراج میں آپ کو رؤیتِ خداوند آنکھ سے ہوئی یا دل سے؟

الجواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کو جسمانی معراج ہوئی تھی۔ اور یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے، جو شخص اس سے انکار کرے وہ بدمذہب ہے۔ خرق و التیام کا محال ہونا فلاسفہ کا مذہب ہے جو اسلام کے مخالف ہے۔ شرح عقائد نسفی میں ہے: و المعراج لرسول اللّٰہ فی الیقظۃ بشخصہ الی السماء ثمّ الی ما شاء اللّٰہ تعالیٰ من العلیٰ حق ای ثابت بالخبر المشہور حتی ان منکرہ یکون مبتدعا ۔ و انکارہ و ادعاء استحالتہ انما یبنی علی اصول الفلاسفۃ ۔ و الا فالخرق و الالتیام علی السماوات جائز، و الاجسام متماثلۃ یصح علی کل ما یصح علی الآخر و اللّٰہ تعالیٰ قادر علی الممکنات کلہا ۔ فقولہ (فی الیقظۃ) اشارۃ الی الرد علی من زعم ان المعراج کان فی المنام علی ما روی عن معاویۃ رضی اللّٰہ عنہ انہ سئل عن المعراج، فقال کانت رؤیا صالحۃ ۔ و روی عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنہا انہا قالت ما فقد جسد محمد علیہ السلام لیلۃ المعراج ۔ و قد قال اللّٰہ تعالیٰ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ" و اُجیب بان المراد الرؤیا بالعین و المعنیٰ : ما فقد جسدہ عن الروح بل کان مع روحہ فکان المعراج للروح و الجسد جمیعا ۔ و قولہ (بشخصہ) اشارۃ الیٰ الرد علیٰ من زعم انہ کان للروح فقط ۔ و لا یخفی ان المعراج فی المنام او بالروح لیس مما ینکر کل الانکار و الکفرۃ انکروا امر المعراج غایۃ الانکار بل کثیر من المسلمین قد ارتدوا بسبب ذلک ۔ و قولہ (الی السماء) اشارۃ الی الرد علیٰ من زعم ان المعراج فی الیقظۃ لم یکن الا الی بیت المقدس علی ما نطق بہ الکتاب ۔ و قولہ (ثم ما شاء اللّٰہ تعالیٰ) اشارۃ الی اختلاف اقوال السلف فقیل الی الجنۃ و قیل الی العرش و قیل الی فوق العرش و قیل الی طرف العالم ۔ " فالاسراء" هو من المسجد الحرام الی بیت المقدس قطعی ثبت بالکتاب ، و "المعراج" من الارض الی السماء مشہور و من السماء الیٰ الجنۃ او الیٰ العرش او غیر ذلک آحاد ۔ شرح فقہ اکبر مصنفہ ملا علی قاری میں ہے : (و خبر

المعراج) ای بجسد المصطفیٰ صلّی اللہ علیہ و سلّم یقظۃ الی السماء ثم الی ما شاء اللہ تعالیٰ فی المقامات العلیٰ (حق) ای حدیثہ ثابت بطرق متعددۃ (فمن ردہ) ای ذلک الخبر و لم یؤمن بمقتضیٰ ذلک الاثر (فھو ضالٌ مبتدع) معراج میں رؤیت الٰہی آپ کو آنکھ سے ہوئی یا دل سے اس میں علماء کا اختلاف ہے ۔ بعض آنکھ سے دیکھنے کے قائل ہیں اور بعض دل سے ۔ ہر ایک فریق نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ درج ہیں ۔ تفسیر در منثور جلد ۶ صفحہ ۱۲۳ تفسیر سورہ و النجم میں ہے : و اخرج الترمذی و حسّنہ و الطبرانی و ابن مردویہ و البیہقی فی الاسماء و الصفات عن ابن عباسؓ فی قولہ تعالیٰ " لقد رآہ نزلۃ اخریٰ " قال ابن عباس قد رأی النبیُّ صلی اللہ علیہ و سلم ربّہ عز و جل ۔ اسی صفحہ میں ہے : و اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم رآیٰ ربہ بعینہ ۔ دوسرے صفحہ میں ہے : و اخرج عبد بن حمید و ابن المنذر و ابن ابی حاتم عن محمد بن کعب القرظی عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال قالوا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و سلم) ھل رأیتَ ربک ؛ قال لم أرہ بعینی و رأیتہ بفؤادی مرتین ثم تلا " ثم دنیٰ فتدلیٰ " ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ عبد الماجد مؤلف کتاب "فلسفہ اجتماع" نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم و حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں جن الفاظ کا استعمال کیا ہے درج ذیل ہیں ، ایسے شخص اور ایسی کتاب کے لئے کیا حکم ہے؟ اور اسلامی حکومت کو ایسی تصنیف کے ساتھ کیا کرنا چاہئے ؟

" کتاب مذکور کے صفحہ ۱۳۳ میں ہے " ہماری مراد شارع اسلام سے حضرت محمدؐ سے ہے ۔ خوب غور کرکے دیکھو کہ ان کا سا بے تن مذہب شخص اپنی سطوت کی بقاء و تحفظ کیلئے ناگزیرانہ کیا کیا وسائل اختیار کرتا ہے"۔ صفحہ ۱۵۰ میں ہے "جس نے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ کو دنیا سے اس کی رسالت تسلیم کرانے اور قائدین عظام کی صف میں اسے اس قدر ممتاز جگہ دینے میں اس کی تمام خصوصیات سے زیادہ مدد دی"۔ صفحہ ۱۸۶ میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے " بیت اللحم میں ایک مجہول النسب بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی والدہ کی عصمت کو اہل وطن مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں"۔ اسی صفحہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی شان میں ہے "اسی طرح سر زمین حجاز میں ایک یتیم بچہ پیدا ہوتا ہے جسے مکتب کی معمولی تعلیم تک نصیب نہیں ہوتی"۔ پھر صفحہ ۲۲۳ میں ہے "حضرت محمد کے متعلق بہت سی روایات اس قسم کی مشہور ہیں کہ جب وہ دوسروں کے ساتھ چلتے تو سب میں بڑے وہی معلوم ہوتے تھے۔ خوش اعتقادیوں کے حصہ کو حذف کرنے کے بعد اس طرح کی تمام روایات کا منبع قائدین کی اسی سطوت کا وجود ٹھہرتا ہے"۔ صفحہ ۲۳۰ میں ہے "محمد، مسیح، بدھ، سکندر، سیزر، نپولین، اور ایک خاص حیثیت سے فیثاغورس، افلاطون، ارسطو، کینٹ ، ڈاروِن، وغیرہ صرف گنتی کے چند اشخاص اب تک دنیا میں ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اول درجہ کے قائدین نے "لقب" کے مصداق

ہوسکتے ہیں۔ کیا زمانہ اس پایہ کے اشخاص روز پیدا کرسکتا ہے؟ کیا تاریخ میں ان کی نظیر آسانی سے مل سکتی ہے۔"؟

الجواب

عبد الماجد بی۔ اے۔ کی کتاب فلسفہ اجتماع کے وہ صفحات جن میں مندرجہ بالا عبارات درج ہیں دیکھے گئے۔ صاحب موصوف کا آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی شان میں یہ لکھنا کہ ان کا سا ہمہ تن مذہب شخص اپنی سطوت کی بقاء و تحفظ کیلئے ناگزیرانہ کیا کیا وسائل اختیار کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اشاعتِ اسلام کے وسائل کو اپنی نفسانی سطوت کے قائم کرنے کیلئے اختیار کیا ہے! حالانکہ یہ قول آیتِ کریمہ "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" کے خلاف ہے۔ آپ کو اصلاً اپنی ذاتی سطوت و وقار ثابت کرنا منظور نہیں تھا۔ چنانچہ آیت کریمہ "أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ" سے واضح ہے، بلکہ مقصود یہ تھا کہ خداوند عالم کی طرف سے جو بھی کچھ حکم نازل ہو وہ مسلمانوں کو سنا دیا جائے اور اپنا ذرہ برابر بھی لگاؤ نہ رہے۔ اگرچہ آپ کا فرض عین ہدایت تھا مگر باوجود اس کے آپ کو صاف یہ سنا دیا گیا کہ "إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ" اور یہ حکم ہوا کہ "إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ" یعنی آپ محض پہنچانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ "لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ" یعنی آپ ان پر مسلط نہیں ہیں کہ جار و ناچار ان کو مسلمان کریں۔ دوسری جگہ یہ ارشاد ہے "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا" یعنی آپ حسرت و اندوہ سے کیا اپنی جان ہلاک کریں گے کہ یہ کفار آپ کے کہنے پر ایمان نہیں لاتے۔ پس ان آیات سے واضح ہے کہ آپ اپنی ذاتی سطوت کی بقاء و تحفظ کیلئے نہ مامور تھے اور نہ ناگزیرانہ آپ کو اس کے وسائل اختیار کرنا پڑا تھا۔ مصنف صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ کلام پاک کے خلاف اور شان رسالت کے منافی ہے۔ مصنف صاحب نے آپ کی شان میں جو "مدبر" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ بھی خلاف ادب ہے، کیونکہ اردو کی اصطلاح میں اس لفظ کا استعمال عام اشخاص کیلئے کیا جاتا ہے اِس وقت اِس لفظ کی ایسی وقعت نہیں ہے کہ یہ اپنے اصلی معنی کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات ستودہ صفات پر استعمال کیا جائے۔ اگرچہ خود مصنف نے آنحضرت کی تعظیم و تکریم میں صفحہ ۱۲۵ سے ۱۳۰ تک تین ورق مسلسل مضمون لکھا ہے اور تقریباً اکثر آیات تعظیم و ادب ان صفحات میں جمع کردیے ہیں مگر خود اسپر عمل کرنے سے قاصر ہے۔

آیت کریمہ "لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا" سے واضح ہے کہ خدائے پاک نے آپ کو ان معمولی الفاظ سے پکارنے کی ممانعت کردی جیسے مسلمان ایک دوسرے کو آپس میں پکارا کرتے تھے۔ اور آیت کریمہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا" میں مسلمانوں کو منع فرما دیا کہ تم جو آپ کو "راعنا" کہتے ہو اگرچہ اس کے معنی تمہارے پاس یہ ہیں کہ اے رسول پاک ہماری طرف توجہ فرمائیے! مگر کفار کے پاس یہ لفظ گالی ہے وہ بھی اس کو آپ پر استعمال کرتے ہیں مگر مقصود ان کا کچھ اور ہوتا ہے، اس لئے اس لفظ کو چھوڑ دو اور اس کی بجائے اس کا مرادف لفظ "انظرنا"

استعمال کرو۔

مصنف صاحب نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو "مجہول النسب" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ بھی آیات قرآنی کے خلاف ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے "اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ" ○ دوسری جگہ ہے "قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" ○ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق آدم علیہ السلام کی طرح محض ہمارے امر "کن" سے ہوئی ہے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا وجود اور انسانوں کی طرح نہیں تھا بلکہ آپ کی ایک مقدس ہستی تھی جو قدرت الٰہی کا مجسم نمونہ تھی۔ ان آیات بینات کے باوجود کسی مسلمان کا آپ کو "مجہول النسب" جیسے سخت و ناگوار لفظ سے منسوب کرنا خلاف ادب ہے۔ اصطلاح میں "مجہول النسب" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی انسان کی نسل سے ہو اور وہ انسان نامعلوم ہو، یا معلوم ہو مگر اس کا نکاح مولود کی ماں کے ساتھ نہ ہوا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان بہ حکم خداوند تعالیٰ قطعی طور پر اس عیب سے منزہ و مبرا ہے۔ پھر دیدہ دانستہ اس لفظ کو برتنا مسلمان کی شان سے بعید ہے۔

مصنف صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے اس معجزہ کے متعلق کہ آپ چلتے وقت سب سے قد میں بلند معلوم ہوتے تھے یہ لکھا ہے کہ "اس قسم کی روایات آپ کے متعلق مشہور ہیں خوش اعتقادیوں کے حصہ کو حذف کرنے کے بعد اس کا اصل سطوت تھرتی ہے" معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب اس معجزہ پر معترض ہیں اور مسلمانوں کی خوش اعتقادی تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بھی بڑے معجزے آپ کے روئے زمین کے مسلمانوں کے پاس مسلّم الثبوت ہیں۔ مصنف صاحب نے صفحہ ۲۳۰ کی تحریر میں آپ کو بدھ، سیزر، نپولین، سکندر وغیرہ کے مماثل بتایا ہے، حالانکہ آپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا ان مذکرہ اشخاص سے کسی کو اسلام نے محترم نہیں مانا، اور نہ ان کی شان انبیاء علیہم السلام کی طرح ہو سکتی۔

غرض بہ وجوہ بالا یہ کتاب اس قابل نہیں ہے کہ عام مسلمانوں میں اس کی اشاعت کی جائے جس سے کہ ان کے عقائد میں فرق آئے۔ مصنف صاحب کو چاہئے کہ اس گفتار سے توبہ کریں۔ اور اسلامی ریاست پر لازم ہے کہ اس کی اشاعت کو ممنوع قرار دے، ایسا نہ ہو کہ مسلمان اس کو دیکھ کر انبیاء علیہم السلام کی شان میں ایسے الفاظ برتنے لگیں اور ایمان میں فرق آئے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر کوئی عیب لگانا یا ان کیلئے کسر شان کے الفاظ کا استعمال کرنا جس میں ان کی خفت و ہتک ہو شرعاً کفر ہے۔ بزازیہ کی کتاب السیر و الجہاد باب ثالث میں ہے: و لو عاب نبیا کفر۔ قاضی خان کی کتاب السیر و الجہاد میں ہے: و اذا عاب الرجل النبی علیہ السلام فی شیء کان کافرا۔ البحر الرائق کی جلد ۵ باب المرتد میں ہے: و یکفر بعدم الاقرار ببعض الأنبیاء علیھم السلام او عیب نبیا بشیء۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب السیر میں ہے: سئل عمن ینسب الی الأنبیاء الفواحش کعزمھم علی الزنا و نحوہ الذی یقولہ الحشویۃ فی یوسف علیہ السلام قال یکفر لأنہ شتم لھم و استخفاف لھم۔ البحر الرائق باب المرتد میں ہے: و فی

السایرۃ و لاعتبار التعظیم المنافی للاستخفاف کفر الحنفیۃ بالفاظ کثیرۃ و افعال تصدر من المتھتکین لدلالتھا علی الاستخفاف بالدین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند عالم زید کو اس کے وجود کے پہلے نہیں جانتا تھا یعنی خداوندِ عالم کو معدوم و ممتنع کا علم نہیں ہے ۔ کیا ایسا شخص شرعاً کافر ہے یا نہیں؟ اور اہل سنت کا اس بارے میں کیا عقیدہ ہے ؟

الجواب

جو شخص ایسا کہتا ہے اہل سنت کے پاس وہ کافر ہے ۔ کیونکہ اس نے خداوند عالم کی طرف جہل و لاعلمی کی نسبت کی ہے اور بہتیری آیات قرآنی کا انکار کیا ہے۔ البحر الرائق جلد ۵ کتاب السیر باب المرتد میں ہے : فیکفر اذا وصف اللہ تعالی بما لا یلیق بہ او سخر باسم من اسمائہ او بأمر من أوامرہ او انکر وعدہ او وعیدہ او جعل لہ شریکا او ولدا او زوجۃ او نسبہ الی الجھل او العجز او النقص۔ صفحہ ۱۳۰ میں ہے ۔ و یکفر بقولہ المعدوم لیس بمعلوم اللہ تعالی ۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب السیر باب تاسع فی احکام المرتدین منھا ما یتعلق بالقرآن میں ہے : اذا انکر الرجل آیۃ من القرآن او تسخر بآیۃ من القرآن و فی الخزانۃ او عاب کفر کذا فی التاتارخانیۃ ۔ اہل سنت و الجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ خداوندِ عالم کا علم بےانتہا ہے یعنی وہ موجود معدوم ممکن، ممتنع جزئی، کلی، ظاہر، باطن، حاضر، غائب ہر چیز کو جانتا ہے کوئی شئی اس کے علم سے خارج نہیں ہے جیسا کہ آیات کریمہ " وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیءٍ علیمٌ ○ عالِمُ الغَیبِ و الشَّھادۃِ لا یَعزُبُ عنہ مثقالُ ذَرَّۃٍ ○ یَعلَم خائِنَۃَ الاَعیُنِ و مَا تُخفِی الصُّدُورُ ○ یَعلَمُ ما یُسِرُّونَ و ما یُعلِنُونَ " ○ اور آیت کریمہ " اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلمُ الساعۃِ و یُنَزِّلُ الغَیثَ وَ یَعلَمُ ما فِی الاَرحامِ وَ مَا تَدرِی نَفسٌ مَاذا تَکسِبُ غَداً وَ ما تدرِی نَفسٌ بِاَیِّ اَرضٍ تَمُوتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیمٌ خَبِیرٌ ○ اور دیگر آیات بینات سے واضح ہے۔ شرح فقہ اکبر مطبوعہ گلزار محمدی صفحہ ۱۴ میں ہے : فاللہ تعالیٰ عالِمٌ بجمیع الموجودات لا یعزب عن علمہ مثقال ذرۃ فی العلویات و السفلیات و انہ تعالیٰ یعلم الجھر و السر و ما یکون اخفیٰ منہ من المغیبات بل احاط بکل شیء علما من الجزئیات و الکلیات و الموجودات و المعدومات و الممکنات و المستحیلات فھو بکل شیء علیم من الذوات و الصفات بعلم قدیم لم یزل موصوفا بہ علی وجہ الکمال لا بعلم حادث فی ذاتہ بالقبول و الانفعال و التغیر و الانتقال ۔ تعالیٰ اللہ عن ذلک شانہ و تعظم عما نھاک برھانہ ۔ اور صفحہ ۱۵ میں ہے : ثم ھذا العام مخصوص بقولہ تعالی " وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شیءٍ علیمٌ " فانہ باقٍ علی العموم و شامل للموجود و المعدوم و المحال و الموھوم کما بینہ الامام الاعظم بقولہ : یعلم

اللّٰہ تعالیٰ المعدوم فی حال عدمہ معدوما ، ای بوصف المعدومیۃ انہ کیف یکون اذا اوجدہ ای عالم الربوبیۃ بل و یعلم ان شیئا لا یکون و لو کان کیف یکون و یعلم اللّٰہ تعالیٰ الموجود فی حال وجودہ موجودا ای بعد ان علمہ حال عدمہ معدوما ۔ شرح مقاصد مصری کے صفحہ ۷۲ جلد ۲ میں ہے : علم اللّٰہ تعالیٰ غیر متناہٍ بمعنیٰ انہ لا ینقطع و لا یصیر بحیث لا یتعلق بالمعلوم و محیط بما ہو غیر متناہ کالاعداد و الاشکال و نعیم الجنان و شامل لجمیع الموجودات و المعدومات الممکنۃ و الممتنعۃ و جمیع الکلیات و الجزئیات اما سمعا فمثل قولہ تعالیٰ : وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّہَادَۃِ ۝ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ ۝ یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَ مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ۝ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝ الیٰ غیر ذلک ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خداوند عالم کی صفات اس کی عین ذات ہیں یا غیر ؟ اور علم خداوند عالم کی ذاتی صفت ہے یا نہیں؟ اور جو شخص خداوند عالم کے علم کو ذاتی نہ جانے کیا وہ کافر ہے یا مسلمان؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

خداوند عالم کی صفات دو قسم کی ہیں ، ایک ذاتی دوسرے فعلی ۔ ذاتی صفات وہ ہیں کہ موصوف جب ان سے متصف ہوجاتا ہے تو پھر ان صفات کا ضد اس میں نہیں آسکتا ، جیسے علم و قدرت و عزت و عظمت ۔ خداوند عالم چونکہ ان صفات سے موصوف ہے اس لئے اب اس میں ان کا ضد یعنی جہل، عجز، ذلت کبھی نہیں آسکتے ۔ اور صفات فعلی وہ ہیں کہ موصوف کے ان صفات سے متصف ہونے کے بعد ان کے ضد سے بھی متصف ہو سکتا ہے ، جیسے رافت ، رحمت ، سخط ، غضب ۔ یعنی جس طرح کہ خداوند عالم نرمی و مہربانی سے موصوف ہے اسی طرح اس کے ضد سختی و غضب کے ساتھ بھی موصوف ہے ۔ شرح فقہ اکبر کے صفحہ ۴۳ میں ہے : و عندنا ان کل ما وصف بہ و لا یجوز ان یوصف بضدہ فہو من صفات الذات کالقدرۃ و العلم و العزۃ و العظمۃ ، و کل ما یجوز ان یوصف بہ و بضدہ فہو من صفات الفعل کالرافۃ و الرحمۃ و السخط و الغضب ۔

اہل سنت کے پاس خداوند عالم کا علم اس کی صفات ذاتیہ سے ہے ۔ شرح فقہ اکبر کے صفحہ ۱۹ میں ہے : و صفاتہ الذاتیۃ کالعلم و الحیوٰۃ و الکلام ۔ خداوند عالم کی صفات عین ذات ہونے کے متعلق اختلاف ہے ۔ متکلمین اہل سنت و الجماعت کا یہ مذہب ہے کہ خداوند عالم کی صفات نہ اس کی عین ذات ہیں اور نہ غیر ۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی کے صفحہ ۱۰۰ میں ہے : و ہی لا ہو و لا غیر یعنی ان صفات اللّٰہ تعالیٰ لیست عین الذات و لا غیر الذات ۔ پس صورت مسئولہ میں جن اشخاص کے عقائد

مندرجۂ بالا عقائد کے خلاف ہوں ان پر کفر کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان کا عقیدہ کسی ظاہری نص کے خلاف نہ ہو اور جس سے کسی نص کا انکار لازم نہ آتا ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند عالم کو معدوم لیس بشئ کا علم نہیں ہے، کیونکہ قرآن شریف میں "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" وارد ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ جو "شئ" ہے اس کا علم خداوند عالم کو ہے اور جو "لیس بشئ" ہے اس کا علم نہیں۔ ایسا اعتقاد رکھنے والا شرعاً کافر ہے مؤمن؟

الجواب

معدوم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ممکن الوجود یعنی جس کا ہونا ممکن ہے جیسے زید عمرو وغیرہ۔ دوسری ممتنع الوجود یعنی جس کا پیدا ہونا محال ہے جیسے خدا کا شریک وغیرہ۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند عالم، معدوم ممکن الوجود و معدوم ممتنع الوجود دونوں کو جانتا ہے۔ اور جو یہ کہے کہ خداوند عالم معدوم کو نہیں جانتا وہ کافر ہے۔ شرح فقہ اکبر مطبوعہ گلزار محمدی کے صفحہ ۱۰ میں ہے: فاللّٰہ تعالیٰ عالِم بجمیع الموجودات لا یعزب عن علمہ مثقال ذرۃ فی العلویات و السفلیات، و انہ تعالیٰ یعلم الجھرَ و السِرَّ و ما یکون اخفیٰ منہ من المغیبات، بل احاط بکل شیء علما من الجزئیات و الکلیات و الموجودات و المعدومات و الممکنات و المستحیلات فھو بکل شیء علیم۔ البحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۱۳۰ کتاب السیر باب المرتدین میں ہے: و یکفر بقولہ المعدوم لیس بمعلوم اللہ تعالی۔ پس صورت مسئولہ میں قائل کی غرض معدوم لیس بشئ سے یا تو معدوم ممکن الوجود ہے یا ممتنع الوجود، ان ہر دو کے متعلق شان خداوندی میں یہ کہنا کہ وہ معدوم لیس بشئ کو یعنی معدوم ممکن یا ممتنع کو نہیں جانتا خدائے پاک کی طرف جہل و لا علمی کی نسبت کرنا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت کرتا ہے اہل سنت کے پاس کافر ہے۔ البحر الرائق کی جلد ۵ صفحہ ۱۲۹ باب المرتدین میں ہے: فیکفر اذا وصف اللہ تعالی بما لا یلیق بہ او سخر باسم من اسمائہ او بأمرہ او انکر وعدہ او وعیدہ او جعل لہ شریکا او ولدا او زوجۃ او نسبہ الی الجھل او العجز او النقص۔ قائل نے آیت کریمہ "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" کا مفہوم مخالف نکالکر خداوند عالم کو لیس بشئ کا عالِم نہ ہونا بیان کیا ہے یہ اس کا ذاتی اجتہاد ہے جو علماء اہل سنت کے مذہب و عقیدہ کے خلاف ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت نے کئی مسلمانوں کے روبرو اسلام قبول کیا،

پھر مرتد ہوکر اپنے سابق مذہب میں شامل ہوگئی، اس کے بعد دوبارہ مسلمان ہوئی۔ کیا اس کا اسلام شرعا مقبول ہے؟ اور کیا اس پر کوئی کفارہ لازم آئے گا؟

الجواب

اس عورت کا دوبارہ اسلام لانا شرعا مقبول ہے۔ عورت کو چاہئے کہ اپنے پچھلے فعل سے توبہ کرکے اقرار واثق کرے کہ آئندہ پھر کبھی مرتد نہ ہوگی۔ توبہ خود کفارہ ہے اس کے سوا اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو احکام اسلام سمجھائیں اور اس کا عقیدہ درست کریں تاکہ اس کے دل میں اسلام کی محبت اور پچھلے مذہب کی نفرت پیدا ہو۔ در مختار کے کتاب الجہاد باب المرتد میں ہے: و کل مسلم ارتد فتوبته مقبولة الا الکافر بسبّ نبیٍ او الشیخین او احدھما و السحر و الزندقة ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آمنہ بی نو مسلمہ جو کہ اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوئی اور قاضی کے حکم سے ایک سید کے ساتھ نکاح بھی کیا اور صاحب اولاد ہوئی۔ اب بارہ سال کے عرصہ کے بعد چند مفسدوں کے اغواء پر مرتد ہونا چاہتی ہے۔ اس کے متعلق شوہر کو کیا چارۂ کار اختیار کرنا چاہئے؟ اور کس محکمہ میں اس کی کاروائی کرنے کی ضرورت ہے؟

الجواب

آمنہ بی سے جب تک کوئی کلمہ کفر یا فعل کفر صادر نہ ہو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہے۔ آمنہ بی کی زبان سے کوئی کلمہ کفر نکلنے یا کسی فعل کفر کے مرتکب ہونے سے پہلے اس کے خاوند کو چاہئے کہ مفسدین و فتنہ پردازوں کو اس کے پاس آنے اور ملنے سے منع کرے، اور اس کے دل میں جو شبہات اسلام کے خلاف پیدا ہوئے ہیں ان کو دفع کرے۔ اگر یہ اس سے ناممکن ہو تو کسی عالم واقف مذہب کے پاس لیجاکر ان شبہات کی اصلاح کرائے تاکہ وہ مرتد ہونے کے ارادے سے باز آجائے۔

مفسدین و فتنہ پرداز اگر اس کے روکنے اور منع کرنے سے اپنے فعل سے باز نہ آئیں تو عدالت میں ان کے تمام اغواء و فریب کی نالش کرے تاکہ سرکار سے ان کی تنبیہ و تادیب ہو۔ آمنہ بی اگر باوجود کافی فہمائش کے اسلام سے مرتد ہوجائے یعنی کوئی کلمہ کفر زبان سے نکالے یا کسی فعل کفر کا ارتکاب کرے تو چاہئے کہ اس کو مرتد ہونے کے جرم میں عدالت میں پیش کرے۔ حاکم عدالت کو چاہئے کہ پہلے اس پر اسلام پیش کرکے ہدایت کرے اور جو شبہات کہ اس کے دل میں اسلام کے خلاف پیدا ہوگئے ہیں ان کو دفع کروائے۔ باوجود اس کے اگر آمنہ بی کفر سے باز نہ آئے اور اسلام کی طرف رجوع نہ ہو تو اس کو جب تک کہ وہ اسلام کی طرف رجوع نہ ہو قید رکھے۔ اور روزانہ تین کوڑے لگانے کا حکم دے۔ قید بھی

قید تنہائی دیجائے کہ کوئی اس سے بات نہ کرے اور کھانے وغیرہ میں شریک نہ ہو۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۳ صفحہ ۲۹۲ کتاب الجہاد باب المرتدین میں ہے: من ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا علی المذھب لبلوغہ الدعوۃ و تکشف شبھتہ۔ صفحہ ۳۱۳ میں ہے: و المرتدۃ و لو صغیرۃ او خنثی (بحر) تحبس ابدا و لا تجالس و لا تؤاکل (حقائق) حتی تسلم و لا تقتل۔ رد المحتار میں ہے: قولہ (تحبس) لم یذکر ضربھا فی ظاھر الروایۃ۔ و عن الامام انھا تضرب فی کل یوم ثلاثۃ اسواط۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

کتاب الطّہارۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک بڑا مینڈک ایسے کنویں میں گرا جو دہ در دہ نہیں ہے۔ اور یہ مینڈک خشکی سے اندر جاکر گرا ہے، جس سے پانی سڑ گیا اور بدبو پیدا ہوگئی۔ پس ایسی حالت میں پورا پانی کنویں سے نکالنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

الجواب

کنویں میں کسی حیوان کے گرکر سڑنے اور پھولنے سے تمام پانی نجس ہوجاتا ہے، جانور کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پس صورت مسئولہ میں کنویں کا تمام پانی خالی کردینا چاہئے۔ البحر الرائق جلد ۱ صفحہ ۱۲۰ کتاب الطہارۃ میں ہے: ینزح ماء البیر کلہ لأجل انتفاخ الحیوان الواقع فیھا او تفسخہ مطلقا صغر الحیوان او کبر کالفأرۃ و الآدمی۔ خشکی کا مینڈک مرنے سے بھی پانی نجس ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ کتاب الطہارۃ میں ہے: الا بریا لہ دم سائل و ھو ما لا سترۃ لہ بین اصابعہ فیفسد فی الاصح۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں حالت ناپاکی میں کلمہ پڑھ سکتی ہیں؟ بزرگان دین کے نام لے سکتی ہیں؟ اور کوئی چیز نیاز شریف یا تبرک بزرگان دین استعمال کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

اذکار اور دعاؤں کو بحالت ناپاکی پڑھنا شرعاً ممنوع نہیں ہے، مگر شرط یہ ہے کہ پڑھنے کے وقت وضوء کرلیا جائے بلا وضوء پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ شرح وقایہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۰ کتاب الطہارۃ میں ہے: و سائر الأدعیۃ و الأذکار لا بأس بھا۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۸ میں ہے: و یجوز للجنب و الحائض الدعوات و جواب الأذان و نحو ذلک کذا فی السراجیۃ۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ میں ہے: (لا یکرہ النظر الیہ) ای القرآن (لجنب و حائض و نفساء) لأن الجنابۃ لا تحل العین (ک) ما لا تکرہ (أدعیۃ) ای تحریما و الا فالوضوء لمطلق الذکر مندوب و ترکہ خلاف الاولیٰ و ھو مرجع کراھۃ التنزیھیۃ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں عورتوں کا بحالت نجاست وضوء کرکے ذکر کے طریقہ

پر کلمہ یا دعاء پڑھنا جائز ہے ۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا نام بر سبیل ذکر لینا شرعاً جائز ہے تو بزرگان دین کا نام لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے ۔ اگر بلحاظ ادب وضوء کرلیا جائے تو مناسب ہے ۔

ف حالت نجاست میں ہاتھ ، منہ دھوکر کھانا درست ہے ۔ فتاویٰ الدر المختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ باب الغسل میں ہے : (و لا) ای لا یکرہ (اکلہ و شربہ بعد غسل ید و فم) ۔ بنابریں ہاتھ منہ دھوکر بلکہ بلحاظ احتیاط و ادب وضوء کرنے کے بعد اگر بزرگان دین کی نیاز کا کھانا اور تبرک بھی کھایا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ کے لئے جو وضوء کیا جاتا ہے اس سے فرض نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

وضوء چاہے کسی غرض سے کیا جائے اس سے ہر قسم کی نماز فرض و نفل وغیرہ پڑھنا درست ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۹۰ کتاب الطہارۃ میں ہے : کل وضوء تصح بہ الصلاۃ ۔ اسی صفحہ میں ہے : ان الصلاۃ تصح عندنا بالوضوء و لو لم یکن منویا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حدیث شریف " اتی سباطۃ قوم ۔ الخ " میں ناصیۃ سے کیا مراد ہے ؟

الجواب

ناصیہ سر کے سامنے والے حصہ کے بالوں کا نام ہے جو پیشانی کے ختم ہونے پر ہوا کرتے ہیں ۔ مجمع البحار جلد سوم صفحہ ۳۶۵ میں ہے : فی نواصیہا الخیر ھی الشعر المسترسل فی مقدم الرأس ۔ الجواہر النیرۃ شرح قدوری جلد ۱ صفحہ ۴ میں ہے : و الناصیۃ ھی الشعر المائل الیٰ ناحیۃ الجبھۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بحالت جنابت و حیض و نفاس آیات قرآنی یا تسبیح و تہلیل و تحمید یا اسمائے الٰہی بغرض تبرک پڑھنا جیسے علوی سادات کے وظائف ہیں ، یا قواعد کی تعلیم میں آیات قرآنی کا بطور تمثیل پڑھنا جس سے کہ تلاوت مقصود نہیں ، از روئے مذہب شافعی درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب میں ناپاک کا قرآن شریف کو بغرض تلاوت ایک کلمہ یا ایک حرف بھی پڑھنا حرام ہے ، اور جو آیات کہ منسوخ التلاوۃ اور درود شریف و تسبیح و تہلیل و دیگر اذکار قرآن جن کے پڑھنے سے تلاوت مقصود نہیں ہے بلکہ محض برکت یا شکر کے لئے یا مصیبت کے وقت پڑھے جاتے ہیں جیسے کھانے کے وقت " بسم اللہ " اور کھانے کے بعد " الحمد للہ " اور مصیبت کے وقت " انا للہ " وغیرہ اور تعلیم اور تدریس و دعاء کے لئے قرآن شریف کو بحالت نجاست پڑھنا حرام نہیں ہے ۔ کتاب الانوار باب موجبات الغسل کے صفحہ ۳۲ میں ہے : و یحرم علی الجنب قراءۃ القرآن علی قصدہ و لو کلمۃ واحدۃ بل لو حرفا واحدا و لا یحرم تلاوۃ ما نسخت تلاوتہ و لا التسبیح و لا التھلیل و لا الصلاۃ علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ۔ حاشیہ عبد الحمید شرح منہاج کے جزو اول باب الغسل صفحہ ۲۷۰ میں ہے : و تحل لجنب و حائض و نفساء اذکارہ ای القرآن و مواعظہ و قصصہ و احکامہ لا بقصد القرآن کقولہ فی الاکل بسم اللہ ، و عند فراغہ الحمد للہ ، و عند رکوبہ سبحان الذی سخر لنا ھذا ، و عند المصیبۃ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ نہایۃ بغیۃ المسترشدین باب ما یحرم بالحدثین صفحہ ۲۴ میں ہے : و تحرم قراءۃ القرآن علی نحو جنب بقصد القراءۃ و لو مع غیرھا لا مع الاطلاق علی الراجح و لا بقصد غیر القراءۃ کرد غلط و تعلیم و تبرک و دعاء ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گردن کا مسح شرعاً واجب ہے یا مستحب یا مباح ؟

الجواب

گردن کا مسح مستحب ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۸۸ میں ہے : (و مستحبہ) التیامن (و مسح الرقبۃ) بظھر یدیہ (لا الحلقوم) لانہ بدعۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کنویں میں ایک بالشت سے چھوٹی مچھلی مر گئی اور پھول کر اوپر آئی ۔ پانی میں نہ بدبو ہے اور نہ رنگ بدلا ۔ احتیاطاً چالیس ڈول نکالے گئے ہیں ۔ کیا ایسا پانی شرعاً پاک ہے یا نہیں ؟

الجواب

مچھلی مینڈک وغیرہ جو پانی میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے پانی میں

مرجانے اور پھولنے پھٹنے سے پانی نجس نہیں ہوتا اس سے وضوء اور غسل جائز ہے ۔ مگر پھٹ جانے کے بعد جبکہ اس کے اجزاء متفرق ہوکر پانی میں مخلوط ہو جائیں تو اس پانی کا پینا یا کھانے پینے کی چیزوں میں ڈالنا درست نہیں ۔ کیونکہ پھولی پھٹی ہوئی مردار چیز کے اجزاء اس پانی میں شریک ہو جاتے ہیں جن کا کھانا حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۴ کتاب الطہارۃ میں ہے : و موت ما یعیش فی الماء فیه لا یفسد کالسمک و الضفدع و السرطان و فی غیر الماء قیل غیر السمک یفسده و قیل لا و هو الاصح و لا فرق بین المتفسخ و غیره الا انه یکره شرب الماء لانه لا یخلو عن اجزائه و هو غیر ماکول کذا فی محیط السرخسی ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ میں ہے : فلو تفتت فیه نحو ضفدع جاز الوضوء به لا شربه لحرمة لحمه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک حوض جو اوپر مقدار دہ در دہ (۱۰ × ۱۰) سے کم ہے لیکن تقریباً دو چار ہاتھ کے بعد نیچے جاکر دہ در دہ ہوگیا ہے ۔ اوپر کی سطح جو دہ در دہ سے بہت کم مذہب حنفی کے مطابق قابل وضوء اور غسل ہے یا نہیں ؟ بہت سے نمازیوں کے وضوء سے وہ پانی مستعمل ہوگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

پانی جبکہ حوض کے منہ تک بھرا رہے اس وقت اس میں ہاتھ ڈالکر استعمال کرنے اور وضوء کرنا بہتر نہیں ۔ بلکہ اس میں سے پانی لیکر علحدہ وضوء کرنا چاہئے کیونکہ منہ تک بھر جانے سے اس کا حکم چھوٹے حوض کا ہوجاتا ہے جس میں نجاست گرنے سے وضوء نا جائز ہے ۔ اور بر بنائے احتیاط ہاتھ ڈالکر استعمال کرنا درست نہیں ہے ۔ اور جب حوض کا پانی کم ہوکر اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے اس کی مقدار دہ در دہ ہے تو اس وقت اس کا استعمال ہاتھ ڈالکر کرنا درست ہے ۔ در مختار کتاب الطہارۃ باب المیاہ صفحہ ۱۳۵ میں ہے : و لو اعلاه عشراً و اسفله اقل جاز حتی یبلغ الاقل و لو بعکسه فوقع فیه نجس لم یجز حتی یبلغ العشر ۔ اسی باب میں رد المحتار صفحہ ۱۲۸ مطلب وضوء فی الفساقی میں ہے : و لکن الاحتیاط لا یخفی فینبغی لمن یبتلیٰ بذلک ان لا یغسل اعضاءه فی ذلک الحوض الصغیر بل یغترف منه و یغسل خارجه ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے جنابت کا غسل کرنے کے گھنٹہ دو گھنٹے کے بعد دیکھا کہ اس کے کان میں عطر کا پھایا رہ گیا ہے ۔ توکیا ایسی صورت میں پھایا نکالکر اس مقام کو تر کرلینا کافی ہے یا از سر نو غسل کرنے کی ضرورت ہوگی ؟

الجواب

بھاپا نکالکر اس مقام کو تر کرلینا کافی ہے۔ اور اگر کوئی فرض نماز اس غسل کے بعد ادا کی ہے تو اس کا اعادہ کرنا چاہئے۔ کبیری شرح منیۃ المصلی مطبوعہ محمدی کے صفحہ ۴۸ میں ہے: و لو ترکھا ای ترک المضمضة او الاستنشاق او لمعة من ای موضع کان من البدن ناسیا فصلی ثم تذکر ذلک یتمضمض او یستنشق او یغسل اللمعة و یعید ما صلیٰ ان کان فرضا لعدم صحته و ان کان نفلا لا لعدم صحة شروعه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسلمان کے مکان میں خنزیر آیا اور مٹی کے برتن میں پانی پیکر برتن کو پلید کردیا۔ کیا برتن کا مالک خنزیر کے مالک مشرک سے اس برتن کا تاوان لے سکتا ہے نہیں؟

الجواب

مٹی کا برتن جب نجس ہو جائے تو اس کو پانی سے اچھی طرح دھوکر خشک کرلینا چاہئے۔ اگر تین مرتبہ ایسا کیا جائے تو برتن پاک ہوجاتا ہے۔ پس صورت مسئولہ میں مسلمان کو چاہئے کہ برتن کو اس طرح دھوکر پاک کرلے اور آئندہ کے لئے مشرک کو تنبیہ کرے۔ جب برتن دھونے سے پاک ہوجائے تو اس کا تاوان درست نہیں ہے۔ رد المحتار جلد ۱ کتاب الطہارۃ باب الانجاس میں ہے: و ان علم تشربه کالخزف الجدید و الدھن المدبوغ بدھن نجس و الحنطة المنتفخة بالنجس فعند محمد لا یطھر ابدا و عند ابی یوسف ینقع فی الماء ثلاثا و یجفف کل مرة و الاول اقیس و الثانی اوسع۔ اھ۔ و به یفتی درر۔ اسی جگہ در مختار میں ہے: و قدر بتثلیث جفاف ای انقطاع تقاطر فی غیرہ ای غیر منعصر مما یتشرب النجاسة۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص لواطت کرے یا احتلام یا جلق سے ناپاک ہوجائے توکیا اس پر غسل واجب ہے یا نہیں؟ اور اس غسل کی ہیئت کیا ہے؟

الجواب

جنابت یعنی ناپاکی دو وجہ سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ منی شہوت کے ساتھ کودتی ہوئی شرمگاہ سے خارج ہو۔ پس منی اگر عورت کو چھونے سے یا دیکھنے سے یا احتلام سے یا جلق سے بیداری میں یا نیند میں نکلے تو اس سے انسان ناپاک ہوجاتا ہے اور اس پر غسل واجب ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مرد اپنے آلۂ تناسل کو عورت یا مرد کی شرمگاہ میں اس طرح داخل کرے کہ حشفہ یعنی آلہ کا سرا شرمگاہ میں

غائب ہوجائے تو اس سے بھی فاعل و مفعول دونوں پر منی نکلے یا نہ نکلے غسل واجب ہوجاتا ہے ۔ شریعت میں ان سب صورتوں کو " جنابت " کہتے ہیں ، اور اس کے غسل کی نیت یہ ہے " نویت ان اغتسل لرفع الجنابۃ " ترجمہ : میں نے نیت کی کہ ناپاکی دور ہونے کے لئے غسل کروں ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب الغسل فصل ثالث فی المعانی الموجبۃ للغسل و ھی ثلاثۃ میں ہے : و منھا الجنابۃ و ھی تثبت بسببین احدھما خروج المنی علی وجہ الدفق و الشھوۃ من غیر ایلاج باللمس او النظر او الاحتلام او الاستمناء کذا فی محیط السرخسی من الرجل و المرأۃ فی النوم و الیقظۃ کذی فی الھدایۃ ۔ صفحہ ۱۵۰ میں ہے : (السبب الثانی الایلاج) الإیلاج فی احد السبیلین اذا توارت الحشفۃ یوجب الغسل علی الفاعل و المفعول بہ انزل او لم ینزل وھذا ھو المذھب لعلمائنا کذا فی المحیط و ھو الصحیح کذی فی فتاوی قاضی خان ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے خواب میں وطی کی اور اس کو لذت بھی حاصل ہوئی ، مگر بیداری کے بعد کپڑے پر کوئی دھبہ نظر نہیں آیا اور نہ اس سے منی یا مذی خارج ہوئی ۔ اور عمرو نے میت یا حیوان سے وطی کی مگر انزال نہیں ہوا ۔ تو کیا ان دونوں صورتوں میں از روئے مذہب حنفی زید و عمرو پر غسل واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

دونوں صورتوں میں زید و عمرو پر غسل واجب نہیں ہے ۔ کبیری شرح منیۃ المصلی مطبوعہ لاہور کے صفحہ ۴۲ میں ہے : و ان احتلم و لم یخرج منہ شیء فلا غسل علیہ اجماعا ۔ اور صفحہ ۴۰ میں ہے : و لو اولج فی البھیمۃ و المیتۃ و الصغیرۃ التی لا یجامع مثلھا فلا یجب علیہ الغسل ما لم ینزل ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتابُ الصّلاۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک ہی امام کا دو مسجدوں میں نماز تراویح پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

کتب معتبرہ مندرجہ ذیل کے حوالہ سے یہ ثابت ہے کہ امام کا دو مسجدوں میں تراویح پڑھانا ناجائز ہے۔ کیونکہ دوسرے وقت کی نماز اس کے لئے نفل ہے اور سنت پڑھنے والا مقتدی بر بناء عدم جواز اقتداء قوی با ضعیف نفل پڑھنے والے کی اقتداء نہیں کرسکتا۔ اور اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیریہ جلد اول مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۶ میں ہے۔ امام یصلی التراویح فی مسجدین فی کل مسجد علی الکمال لا یجوز کذا فی محیط السرخسی و الفتویٰ علیٰ ذٰلک کذا فی المضمرات۔ اور فتاویٰ سراجیہ صفحہ ۲۰ باب التراویح میں ہے: الامام یصلی التراویح فی المسجدین فی کل مسجد علی الکمال لا یجوز بخلاف ما اذا اقتدی بغیرہ فی المسجد الثانی۔ و فی خزانۃ الروایۃ صفحۃ ۸۲ و روایۃ نصاب الفقہ: و لو صلی الامام التراویح فی المسجد لا یجوز لہ ان یفعل لان التراویح سنۃ و سائر السنن لا تتکرر لکمالھا فی الوقت الواحد فاذا فعل ذٰلک لا یکون سنۃ و الفتوی علی ذٰلک۔ مگر صاحب خزانۃ الروایۃ آخر میں جواز کی یہ صورت لکھتے ہیں کہ اگر امام دوسری تراویح پڑھانے کے وقت بیس رکعت تراویح مع ختم قرآن اپنے پر نذر کرلے تو اس کے لئے دوبارہ امامت کی اجازت ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: الا ان ینذر الختم فی ضمن النذر بالتراویح بأن یقول للّٰہ علیّ ان اُصلّی التراویح مع الختم۔ نذر اس طرح کرنی چاہئے کہ: میں اللہ تعالیٰ کیلئے بیس رکعت نماز تراویح مع ختم قرآن بطور نذر اپنے پر واجب کرتا ہوں۔ پس مصلیوں کو چاہئے کہ جب ایسے امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کی ضرورت داعی ہو تو قبل نماز اپنے سامنے اس سے روزانہ بیس رکعت تراویح مع ختم کی نذر کرالیں پھر اس کے بعد اس کی اقتداء کی جائے۔ یا ابتدائے رمضان میں جتنے روز اس کے پیچھے تراویح پڑھنا ہو اس سے اس طرح نذر کرالی جائے کہ: میں اتنے دن تک علاوہ مسنون تراویح کے بیس رکعت مع ختم پڑھنے کی نذر کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

زید کسی مسجد کا امام ہے، اور اس پر چند روز سے آثار مرض جذام ظاہر ہو گئے ہیں، آیا ایسا شخص

شرعاً قابل امامت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

ایسے شخص کی امامت شرعاً مکروہ ہے، کیونکہ اس قسم کے مرض والوں سے عموماً قوم کو نفرت ہوتی ہے۔ اس لئے فقہاء کرام نے بر بناء کراہت قوم اس کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اول صفحہ ۳۹۵ میں ہے: (قوله و مفلوج و ابرص شاع برصه) و كذلك اعرج يقوم ببعض قدمه فالاقتداء بغيره اولى (تاتارخانيه) و كذا اجذم (برجندي) و مجبوب و حاقن و من له يد واحدة (فتاوى الصوفية عن التحفة) و الظاهر ان العلة النفرة۔ بلکہ فقہاء نے تو ایسے شخص کے امام ہونے کو جسکو کہ قوم بوجہ کسی فساد کے مکروہ جانتی ہے اور باوجود نفرت پھر وہ قوم کی امامت کرتا ہے بر بناء حدیث ابی داود شریف "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما و هم له كارهون" یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو ایسے لوگوں کی امامت کے لئے آگے بڑھے جو اس کو ناپسند کرتے ہوں، مکروہ تحریمی تحریر کیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی کے جلد اول صفحہ ۳۹۲ میں ہے: (و لو امّ قوما و هم له كارهون لفساد فيه او لأنهم احق بالإمامة كره) له ذلك تحريما لحديث ابى داود " لا يقبل الله صلاة من تقدّم قوماً و هم له كارهون"۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بے نمازی کس کو کہتے ہیں؟ اور اگر کوئی شخص عمر بھر میں ایک نماز یا دو نماز پڑھے تو اس پر بےنمازی کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ بےنمازی کے معنی کوئی دوسرے بھی ہوسکتے ہیں یا کیا؟ اور اس پر کیا احکام نافذ ہوں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

بے نمازی کو عربی زبان میں "تارک الصلاۃ" کہتے ہیں۔ جو شخص ایک وقت کی نماز ترک کرتا ہے اس کو بھی ترک نماز کے اعتبار سے بےنمازی کہا جائیگا اور جو عمر بھر نہیں پڑھتا وہ تو تمام عمر کا بےنمازی ہے بلکہ اس کو عربی میں "مُصِر علی ترک الصلاۃ" کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی بار بار نماز کو ترک کرنے اور ترک پر اصرار کرنے والا ہے۔ یعنی جس طرح ایک دفعہ چوری کرنے والے اور ایک دفعہ شراب پینے والے اور زنا کرنے والے کو محض سارق و شارب و زانی کہتے ہیں اور بار بار کرنے والے کو سارق مُصِر و شارب مُصِر و زانی مُصِر کہتے ہیں، اسی طرح بےنمازی کا حال ہے۔ بلکہ حضرت عمر اور عبد الرحمن بن عوف و معاذ بن جبل و ابو ہریرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر ایک وقت کی نماز ترک کرے اور وقت گذرنے تک بیٹھا رہے وہ کافر و مرتد ہے۔ مشکاۃ شریف مطبوعہ نظامی دہلی صفحہ ۴۹ کے حاشیہ پر ترغیب و ترہیب امام منذری سے نقل ہے: قال ابو محمد بن

حزم و قد جاء عن عمر و عبد الرحمن بن عوف و معاذ بن جبل و ابی ہریرۃ و غیرہم من الصحابۃ رضی اللہ عنہم ان من ترک صلاۃ فرض واحدۃ متعمدا حتی یخرج وقتھا فھو کافر مرتد و لا نعلم لھٰؤلاء من الصحابۃ مخالفا ۔ قال الحافظ عبد العظیم قد ذھب جماعۃ من الصحابۃ و من بعدھم الی تکفیر من ترک الصلاۃ متعمدا لترکھا حتی یخرج جمیع وقتھا منھم عمر بن الخطاب و عبد اللہ بن عباس و عبد اللہ بن مسعود و معاذ بن جبل و جابر بن عبد اللہ و ابو الدرداء رضی اللہ عنھم و من غیر الصحابۃ احمد بن حنبل و اسحاق بن راھویہ و عبد اللہ بن مبارک و النخعی و الحکم بن عتبۃ و ایوب السختیانی و ابو داود الطیالسی و ابو بکر بن ابی شیبۃ و زھیر بن حرب و غیرھم رحمھم اللہ ۔ مگر شافعی و حنفی و مالکی و جمہور سلف و خلف کے پاس جان بوجھ کر سستی اور کاہلی سے نماز ترک کرنے والا فاسق ہے، کافر نہیں ۔ صحابہ کرام سے جو روایات کفر و ارتداد کے متعلق مروی ہیں وہ زجر و توبیخ پر محمول ہیں ۔ الدر المختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۲۴۶ کتاب الصلاۃ میں ہے : و تارکھا عمدا مجانۃ ای تکاسلا فاسق ۔

نفع المفتی و السائل میں ہے : و قد اختلف الصحابۃ و التابعون فی کفر من ترک الصلاۃ متعمدا و جزائہ ۔ الخ ۔ و عندنا لا یکفر و لا یقتل ، و یعزر تعزیرا ، بل الاحادیث الدالۃ علی کفر التارک محمولۃ علی الزجر و التوبیخ ۔ شرح مسلم للامام نووی جلد ۱ باب من ترک الصلاۃ متعمدا میں ہے : و اما تارک الصلاۃ فان کان منکرا لوجوبھا فھو کافر لاجماع المسلمین خارج عن ملۃ الاسلام ، الا ان یکون قریب عھد بالاسلام او لم یخالط المسلمین مدۃ یبلغہ فیھا وجوب الصلاۃ ، و ان کان ترکہ تکاسلا مع اعتقادہ وجوبھا کما ھو حال کثیر من الناس فقد اختلف العلماء فیہ ، فذھب مالک و الشافعی و الجماھیر رحمھم اللہ تعالی من السلف و الخلف الی انہ لا یکفر بل یفسق و یستتاب ، فان تاب و الا قتلناہ حدا کالزانی المحصن ، و لکنہ یقتل بالسیف ۔ فذھب جماعۃ من السلف الی انہ یکفر و ھو مروی عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ و ھو احدی الروایتین عن احمد بن حنبل و بہ قال عبد اللہ بن مبارک و اسحاق بن راھویہ ، و ھو وجہ لبعض اصحاب الشافعی ۔ ایسے شخص کے متعلق شرعا یہ حکم ہے کہ وہ قید کیا جائے تاکہ نماز کا پابند ہوجائے ، چنانچہ الدر المختار کے اسی صفحہ میں ہے : یحبس حتی یصلی لانہ یحبس لحق العبد فحق الحق احق ۔ شرح مسلم للنووی جلد ۱ میں لکھا ہے : و ذھب ابو حنیفۃ رحمہ اللہ و جماعۃ من اھل الکوفۃ و المزنی صاحب الشافعی انہ لا یکفر و لا یقتل بل یعزر و یحبس حتی یصلی ۔ اور بعض علماء ایسے شخص کو خون نکلنے تک مارنے کا حکم دیتے ہیں، بلکہ امام شافعی تو ایک نماز کے اس طریقہ سے ترک کرنے پر بھی قتل کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ الدر المختار کے صفحہ ۲۴۶ میں ہے : و قیل یضرب حتی یسیل منہ الدم ، و عند الشافعی یقتل لصلاۃ واحدۃ حدا و قیل کفرا ۔ اور جب کہ توبہ کرکے پچھلی نمازیں قضاء کرے اور آئندہ کے لئے پابند ہو جائے تو پھر اس پر آئندہ سے بے نمازی کا اطلاق

نہیں ہوگا، کیونکہ یہ شخص فاسق یعنی مرتکب گناہ کبیرہ ہے جس کی توبہ واثق عند اللہ مقبول ہے۔

نفع المفتی و السائل مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۲۳ میں ہے: و بالجملۃ من ترک الصلاۃ فقد اتی کبیرۃ عظیمۃ یعاقب علیہا عقابا شدیدا ان لم یتب، فقد ورد ان اول ما یحاسب العبد یوم القیامۃ الصلاۃ۔

پس صورت مسئولہ میں عمر بھر میں ایک دفعہ یا دو دفعہ نماز پڑھنے والا بلکہ تمام عمر پڑھکر ایک دفعہ سستی سے نماز ترک کرنے والا یہ سب شرعا بےنمازی ہیں اور ان پر حسب تفصیل سابق احکام نافذ ہونگے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص نماز میں "و لا الضالین" کی جگہ "و لا الطالین" یا "و لا الذالین" یا "و لا الزالین" یا "و لا الدالین" پڑھے یا "انعمت" کو "انامت" پڑھے یا "صراط الذین" کو "ثراط الذین" پڑھے بہر صورت کسی حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ بدلکر پڑھے تو اسکی نماز جائز ہے یا باطل؟ اگر جواز یا بطلان کی شکل مشروط ہے تو ان شروط کو بالتفصیل صاف صاف بیان فرمایئے اور یہ مشروط نہیں ہے تو اس سے بھی آگاہ فرمایئے۔ جواب اقوال مجتہدین یا حوالہ کتب معتبرہ متداولہ حنفیہ سے مدلل ہو۔

الجواب

صورت مسئولہ میں تبدیل حرف اگر اس طریقہ سے ہو کہ جس سے اس لفظ کے معنی بدل جائیں اور ان دو حرفوں کے مخرج میں بدون دشواری فصل بھی ہو سکتا ہے جیسے طاء و صاد میں، تو ایسی صورت میں باوجود بآسانی فرق حاصل ہونے کے تغیر و تبدل کرنے سے سب کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فتاوی عالمگیریہ مطبوعہ مصری جلد ۱ صفحہ ۹۰ میں ہے: و ان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقۃ کالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مکان الصالحات تفسد صلاتہ عند الکل۔

اور اگر ایسے حروف ہیں کہ جن کے مخارج و ادائی میں دشواری سے تمیز ہوتی ہے جیسے ظاء ضاد، سین صاد، طاء تاء، تو ایسی صورت میں اکثر فقہاء کا قول ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور قاضی امام ابو الحسن رحمہ اللہ تعالی اور قاضی امام عاصم رحمہ اللہ تعالی کا قول ہے کہ اگر مصلی نے عمداً اس قسم کی تبدیلی کی ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی، اور اگر اتفاقاً اس کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا ہے یا اس کو مخارج کی تمیز ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی، یہی عمدہ قول اور مذہب مختار ہے جیسا کہ فتاوی عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۹۰ میں لکھا ہے: و ان کان لا یمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقۃ کالظاء مع الضاد و الصاد مع السین و الطاء مع التاء اختلف المشایخ، قال اکثرہم لا تفسد الصلاۃ۔ ہکذا فی فتاوی قاضی خان و کثیر من المشایخ افتوا بہ، قال القاضی الامام ابو الحسن و القاضی الامام ابو عاصم رحمہما اللہ تعالی ان تعمد فسدت، و ان جری علی لسانہ او کان لا یعرف التمیز

لا تفسد و ھو اعدل الاقاویل و المختار ھکذا فی الوجیز للکردی ۔ اسی طرح شرح وہبانیہ صفحہ ۲۰ میں مذکور ہے : و لو ابدلت ضاد بظاء فمفسد ☆ و من قال صحت فھو یعذر

و قال القاضی ابو الحسن و ابو عاصم ان تعمد فسدت ، و ان جری علی لسانہ او لم یعرف التمیز لا تفسد ، و ھو اعدل الاقاویل و المختار ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص قراءت قرآن میں اس طرح غلطی کرتا ہے کہ اس کی زبان سے اداۓ مخرج کے وقت " و لا الظالین " یا " و لا الذالین " یا " و لا الدالین " یا " و لا الزالین " اور " انعمت " کی جگہ " انامت " اداء ہوتا ہے ۔ آیا ایسے شخص کی امامت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

شرعا ایسے شخص کیلئے یہ حکم ہے کہ وہ اداۓ حروف میں کوشش کرے اور اپنے کو معذور نہ بنائے ۔ اگر بعض حروف ایسے ہیں کہ اس کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتے تو اس کو چاہئے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد ایسی آیتیں پڑھا کرے کہ جن میں وہ حروف نہیں ہیں ۔ اور سورہ فاتحہ ہر حالت میں واجب ہے ۔ اور اگر اسکو ایسی آیتیں قرآن شریف میں نہیں ملتی ہیں اس لئے وہ انھیں کو پڑھتا ہے تو ایسی حالت میں تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کی نماز تو جائز ہے مگر امامت جائز نہیں ۔ اگر وہ ان آیتوں کے ملتے ہوئے ایسی آیات نماز میں پڑھتا ہے کہ جن میں وہ حروف ہیں جو اس کی زبان سے صاف اداء نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں بعض فقہاء کا یہ قول ہے کہ اس کی نماز جائز نہیں ہے ۔ اور یہی صحیح مذہب ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۹۰ میں مسطور ہے : و من لا یحسن بعض الحروف ینبغی ان یجھد و لا یعذر فی ذلک فان کان لا ینطق لسانہ فی بعض الحروف ان لم یجد آیۃ لیس فیھا تلک الحروف تجوز صلاتہ و لا یؤم غیرہ ، و ان وجد آیۃ لیس فیھا تلک الحروف فقرأھا جازت صلاتہ عند الکل ، و ان قرأ الآیۃ التی فیھا تلک الحروف قال بعضھم لا تجوز صلاتہ ھکذا فی فتاوی قاضی خان ، ھو الصحیح ۔ کذا فی المحیط ۔

یہ اس شخص کا حال ہے جس کی زبان میں لثغہ یعنی لکنت نہیں ہے بلکہ فطرتا اس کی زبان ایسی سخت ہے جس سے بخوبی اداۓ مخارج دشوار ہے ۔ لیکن وہ شخص جس کی زبان میں لکنت ہے تو ایسے شخص کا صاف زبان والوں کی امامت کرنا غیر صحیح اور فاسد ہے ۔ فتاویٰ خیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۰ میں مذکور ہے :

الراجح المفتی بہ عدم صحۃ امامۃ الالثغ لغیرہ ممن لیس لہ لثغۃ ، شعر :

امامۃ الالثغ بالفصیح ☆ فاسدۃ فی الراجح الفصیح

اگر لکنت بہت ہی خفیف اور تھوڑی ہے تو اس کیلئے شیخ الاسلام زکریا شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ موثر

نہیں ہے ۔ فتاویٰ خیریہ جلد ۱ میں لکھا ہے : قال شیخ الاسلام زکریاہ لو کانت لثغته یسیرة بأن یأتی الحروف غیر صاف لم تؤثر و مثله لابن حجر و الرملی رحمة اللّٰه تعالی علیهم اجمعین ۔ واللہ اعلم

الاستفتاء

عیدین کی نماز میں اگر سجدہ سہو لازم آجائے تو کیا سجدہ سہو اداء کرنا شرعاً ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب

عید و جمعہ کی نماز میں اگر کوئی سہو ہوجائے تو شرعاً اس کیلئے سجدہ سہو اداء کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ میں ہے : السهو فی الجمعة و العیدین و المکتوبة و المتطوع واحد الا ان مشایخنا قالوا لا یسجد للسهو فی العیدین و الجمعة لئلا یقع الناس فی فتنة کذا فی المضمرات ناقلا عن المحیط ۔ در مختار صفحہ ۱۱۹ میں مذکور ہے : و السهو فی صلاة العید و الجمعة و المکتوبة و التطوع سواء و المختار عند المتأخرین عدمه فی الاولیین لدفع الفتنة کما فی جمعة البحر ۔ اقره المصنف رحمه اللّٰه تعالی و به جزم فی الدرر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

امام سے مقتدی ناراض ہو اور ہر دو کے دلوں میں کدورت ہو اور وہ کدورت مذہبی ہو پس ایسی صورت میں اس امام کے پیچھے وہ مقتدی نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں ؟ ایسے اختلاف کی صورت میں اس مقتدی کی نماز اس امام کے پیچھے جائز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مقتدی جبکہ امام میں کسی واقعی فساد شرعی کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی اقتداء سے ناراض ہوں تو ایسی حالت میں امام کی نماز مکروہ تحریمی ہے ۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۹۲ میں مذکور ہے : (و لو امّ قوما و هم له کارهون) ان الکراهة (لفساد فیه او لأنهم احق بالإمامة کره) له ذلک تحریما لحدیث ابی داود " لا یقبل اللّٰه صلاة من تقدم قوما و هم له کارهون " ۔ اور جو نماز کہ کراہت تحریمی سے اداء کیجاتی ہے شرعاً اس کا اعادہ واجب ہے ۔ فتاویٰ الدر المختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۲۰ میں ہے : و کذا کل صلاة ادیت مع کراهة التحریم تجب اعادتها ۔ پس صورت مستورہ میں مقتدی کو چاہئے کہ جمعہ و عید کے سوا جو نماز اس امام کے پیچھے پڑھی ہے اس کا اعادہ کرلے ، اور جمعہ و عید میں بھی اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ امام و قوم نے اس نماز کا اعادہ کرلیا ہے تو ایسی صورت میں اس پر بھی اعادہ لازم ہے ۔ فتاویٰ رد محتار شامی جلد ۱ صفحہ ۳۲۰ میں ہے : قوله (کذا کل

صلاۃ امہ) الظاهر انه یشمل نحو مدافعة الاخبثین مما لم یوجب سجودا اصلا و ان النقص اذا دخل فی صلاۃ الامام و لم یجبروا وجبت الاعادۃ علی المقتدی ایضا و انه یستثنی منه الجمعة و العید اذا ادیت مع کراهة التحریم الا اذا اعادها الامام و القوم جمیعا فلیراجع ۔

اور اگر امام میں کوئی واقعی اور شرعی فساد نہیں ہے اور امام امامت کے لئے مقتدیوں سے افضل بھی ہے تو ایسی صورت میں شرعا امام ہی امامت کا مستحق ہے ۔ اور جو مقتدی اس سے ناراض ہیں اس کراہت اور ناراضی کا وبال انہیں پر ہے امام پر اس کا کچھ اثر نہیں ، کیونکہ اس وقت ان کی ناراضی حقانیت پر مبنی نہیں ہے اس لئے نفسانیت پر محمول کی جائے گی ۔ چنانچہ در مختار کے اسی صفحہ میں ہے : (و ان هو احق لا) و الکراهة علیهم ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

قصبہ گوپال پیٹھ ضلع محبوب نگر میں قدیم سے عیدگاہ موجود ہے مگر کوئی قاضی یا حاکم شرع موجود نہیں ہے ۔ یہاں کے حاکم ہندو ہیں ۔ سالہا سال گذرے کہ مسلمانوں نے یہاں جمعہ قائم کرلیا ہے ۔ اور تین سال سے اہل اسلام نے یہاں ایک جامع مسجد چندہ بنالی ہے ۔ پس ایسی حالت میں جب کہ جمعہ کا قیام اور مسجد و منبر کی تعمیر کسی حاکم شرع کے اذن سے نہیں ہے اور نہ یہاں کوئی خطیب و مؤذن مقرر ہے نماز جمعہ درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جن بلاد کے والی کفار ہیں وہاں مسلمانوں کو جمعہ قائم کرنے کی اجازت ہے ۔ اور قاضی کے متعلق شرعا یہ حکم ہے کہ مسلمان اپنی رضامندی سے کسی متقی کو قاضی مقرر کرلیں جو کہ انکے جملہ امور دین کی اقامت کا والی ہو ۔ فتاوی عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۴۶ میں ہے : بلاد علیها ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامة الجمعة و یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین و یجب علیهم ان یلتمسوا والیا مسلما کذا فی معراج الدرایة اور مجموع الفتاوی مولانا عبد الحی مرحوم کے صفحہ ۲۹۶ میں رد المحتار سے منقول ہے ، لو مات الوالی او لم یحضر لفتنة او لم یوجد احد ممن له حق التقدم فی اقامة الجمعة نصب العامة لهم خطیبا مع انه لا امیر ثمه و لا قاضی ۔ اور اسی میں مجمع الفتاوی سے منقول ہے : غلب علی المسلمین ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامة الجمعة و الاعیاد ۔ فتاوی رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۵۷۳ میں ہے : فی معراج الدرایة عن المبسوط ، البلاد التی فی ایدی الکفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانهم لم یظهروا فیها حکم الکفر بل القضاۃ و الولاۃ مسلمون یطیعونهم عن ضرورۃ او بدونها و کل مصر فیه وال من جهتهم یجوز له اقامة الجمع و الاعیاد و الحدود و تقلید القضاۃ لاستیلاء المسلم علیهم فلو کانت الولاۃ کفارا یجوز للمسلمین اقامة الجمعة و یصیر القاضی قاضیا بتراضی

المسلمين و يجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلما۔ بناء بریں قصبہ کوپال پیٹھ کے مسلمانوں کو چاہئے کہ کسی متقی و ذی علم شخص کو اپنا قاضی و خطیب مقرر کرکے جمعہ و عید کی نماز اس کی اقتداء سے قائم کریں اور تمام احکام شرعیہ کے اجراء میں اسی کی طرف رجوع کیا کریں۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ صبی لا یعقل کی اذان جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو اس کا اعادہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

صبی لا یعقل کی اذان جائز نہیں ہے اور اس کا اعادہ لازم ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۵۴ میں ہے: و اذان الصبي الذي لا يعقل لا يجوز و يعاد، و كذا المجنون۔ هكذا في النهاية۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ نماز عشاء کی دوسری رکعت میں ایک مصلی شریک جماعت ہوا، جب امام دوسری اور چوتھی رکعت میں بیٹھے گا تو اس نئے شخص کو اس وقت بیٹھکر کیا پڑھنا چاہئے؟ اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت جو اسکی رہ گئی ہے اس کو کس طرح ادا کرنا چاہئے؟ یعنی سورہ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورۃ ملانی چاہئے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

ایسے شخص پر امام کے قعدہ اولیٰ کے وقت قعود واجب ہے، اور اس وقت اس کو تین قعود کرنا ہوگا جن میں اخیر فرض اور پہلے دو واجب ہیں۔ البحر الرائق جلد ۱ صفحہ ۳۱۸ میں ہے: فان المسبوق بثلاث من الرباعية يقعد ثلاث قعدات كل من الاولى و الثانية واجب و الثالثة هي الاخيرة و هي فرض۔ اور چونکہ ہر ہر قاعدہ میں تشہد واجب کیا گیا ہے اس لئے اس پر ہر ایک قعدہ میں تشہد پڑھنا واجب ہے۔ البحر الرائق کے اسی صفحہ میں ہے: كل تشهد يكون في الصلاة فهو واجب سواء كان اثنين او اكثر كما علمته في القعود۔ اور قاعدہ اخیرہ میں اتباعاً للامام صرف تشہد پڑھنا کافی ہے، درود و دعاء کی ضرورت نہیں۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۹۱ میں ہے: ان المسبوق ببعض الركعات يتابع للامام في التشهد الاخير و اذا تشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات۔ اور تشہد کو بھی اس قدر دراز پڑھنا چاہئے کہ امام کے سلام تک پہنچ جائے چنانچہ اسی مقام میں ہے: ثم ماذا يفعل تكلموا فيه و الصحيح ان المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام كذا في الوجيز للكردي و فتاوى قاضي

خان و ھکذا فی الخلاصۃ و فتح القدیر ۔ باقی رکعتوں میں قراءۃ کا یہ حکم ہے کہ بعد فراغ امام جب وہ قضاء کرنے کیلئے کھڑا ہو تو پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ضم سورہ بھی کرے جیسے تنہا نماز پڑھنے کے وقت کرتا ہے اور باقی بلا ضم سورہ تمام کرے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ کے صفحہ ۱۹ میں ہے : (و منھا) انہ یقضی اول صلاتہ فی حق القراءۃ و آخرھا فی حق التشھد ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان شریف میں نماز عشاء ختم ہونے کے بعد ایک شخص تراویح میں شریک جماعت ہوگیا ۔ تراویح ختم ہونے کے بعد جب وتر کی نوبت آئے تو اس شخص کو جماعت کے ساتھ وتر پڑھنا چاہیے یا علیحدہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جو شخص امام کے ساتھ فرض نہ اداء کرے اس کو وتر علحدہ پڑھنی چاہیے ۔ فتاویٰ رد المختار جلد ۱ صفحہ ۴۹۰ میں قہستانی سے منقول ہے : اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کو وتر پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کن شروط سے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شافعی امام کے پیچھے وتر پڑھنی اس وقت جائز ہے جبکہ شافعی امام وتر کی تینوں رکعتیں متصل پڑھے یعنی دو رکعت کے بعد سلام نہ پھیرے ۔ جو شافعی کہ دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے ہیں حنفی کا انکی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے ۔ فتاویٰ امداد الفتاح المعروف بہ فتاویٰ شرنبلالیہ صفحہ ۴۲۸ میں ہے : یشترط لصحۃ الاقتداء بالشافعی و نحوہ فی الوتر وصل رکعاتہ الثلاثۃ فیؤدیہ بتسلیمۃ واحدۃ ، فلو سلم علی رأس رکعتین منہ لا یصح و ھو قول الاکثر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شافعی امام کے پیچھے فجر کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کیا شروط ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شافعی امام کے پیچھے فجر کی نماز پڑھنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ جب امام دعاء قنوت شروع کرے اس

وقت حنفی مقتدی کو چاہئے کہ دونوں ہاتھ اپنے دونوں طرف چھوڑکر چپ چاپ کھڑا رہے، جب امام قنوت سے فارغ ہو کر سجدہ میں جائے تب اس کے ساتھ یہ بھی سجدہ کرے۔ فتاوی امداد الفتاح المعروف بہ فتاوی شرنبلالیہ صفحہ ۳۲۷ میں ہے: و اذا اقتدی بمن یقنت فی الفجر (کشافعی) قام معه فی (حال) قنوته ساکتا فی الاظهر و یرسل یدیه فی جنبیه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ ایک گروہ غیر مقلدین جو حنفیوں کو بدعتی مشرک اور کافر علانیہ کہتا ہے، اور مذہب حنفی کے خلاف اپنے خیالات کی اشاعت کرتا ہے، وہ حنفیوں کے محلہ میں باوجود کثرت و قربت دیگر مساجد ایک نئی مسجد کی بنیاد اس غرض سے قائم کرنی چاہتا ہے کہ اس میں اپنے فرقہ کے لوگوں کی بخوبی تعلیم ہو اور فرقہ مقلدین کی برائی اور اس پر اعتراض بیان کئے جائیں جس سے مقلدوں کا فرقہ متفرق ہو جائے اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کیا جائے۔ آیا ایسے لوگوں کا ان اغراض کیلئے جدید مسجد کی تعمیر کرنی شرعا جائز ہے یا نہیں؟ اور ان غیر مقلدوں کی اقتداء حنفیوں کیلئے جائز ہے یا نہیں؟ اور مال مغصوبہ سے مسجد کی تعمیر کرنی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی شرعا جو مسجد کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے یا لوگوں کو دکھانے اور فخر کرنے کیلئے یا کسی ایسی غرض کے لئے بنائی جاتی ہے جو خالصا لوجہ اللہ نہیں ہے یا کسی ناجائز مال سے بنائی جاتی ہے شرعا ایسی مسجد "مسجد ضرار" کا حکم رکھتی ہے جس کی بنیاد ابتداء ہی سے ناجائز و ممنوع ہے۔ خزانۃ الروایۃ کے صفحہ ۳۷ باب المساجد میں اور تفسیر احمدی کے صفحہ ۴۷۷ میں تفسیر مدارک سے منقول ہے: کل مسجد بُنی مباهاةً او ریاءً او سمعةً او لغرض سوای ابتغاء وجه اللّٰه او بمال غیر طیب فهو لاحق بمسجد الضرار۔ بدیں وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانہ میں جو مسجد کہ منافقین نے تفریق و ریاء وغیرہ اغراض کی تکمیل کیلئے تعمیر کی تھی اس کو آنحضرت علیہ السلام نے وحشیؓ و معنؓ بن عدی وغیرہ اصحاب کو بھیجکر منہدم فرمادیا اور آپ کے حکم سے وہ مقام گھورا یعنی نجاست و غلاظت ڈالنے کی جگہ بنادیا گیا۔ چنانچہ تفسیر احمدی کے صفحہ ۴۷۶ اور خزانۃ الروایۃ کے صفحہ ۳۷ باب المساجد اور تفسیر بیضاوی و تفسیر مدارک میں لکھا ہے: قال علیه السلام لوحشی۔ قاتل حمزة۔ و معن بن عدی و غیرهما انطلقوا الی هذا المسجد الظالم اهله فاهدموه و احرقوه ففعل و امر ان یتخذ مکانه کناسة یلقی فیه الجیف و القمامة۔

بناء بریں صاحب کشاف، عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ جب خدائے تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو شہروں و ملکوں پر نمایاں فتح دی تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو یہ حکم فرماتے تھے کہ کسی شہر میں دو ایسی مسجدیں نہ بنائی جائیں جو ایک دوسرے کو ضرر رساں ہو۔

اس کے بعد صاحب کشاف اپنے زمانہ کے ان لوگوں پر جو ریاء و تعصب و نام آوری وغیرہ اغراض سے ہر طرف مساجد تیار کرتے تھے طعن کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے اور اس موقعہ پر خیال نہیں لاتے۔ چنانچہ تفسیر احمدی کے صفحہ ۳۷۷ میں ہے: و قال صاحب الكشاف و عن عطاء لما فتح الله الامصار على عمر رضي الله عنه امر المسلمين ان يبنوا المساجد و ان لا يتخذوا في مدينة مسجدين يضار احدهما صاحبه، هذا لفظه. فالعجب من المشايخين المتعصبين في زماننا يبنون في كل ناحية مساجد طلبا للاسم و الرسم و استعلاء لشانهم و اقتداء بآبائهم و لم يتاملوا ما في هذه الآية و القصه من شناعة مآلهم و سوء فعالهم۔ پس ایسی حالت میں گروہ غیر مقلدین کا اغراض مذکور صدر کی تکمیل کیلئے جدید مسجد قائم کرنا جو کہ موجب تفریق مومنین ہے شرعا ناجائز ہے۔

مال مغصوبہ مال غیر طیب ہے، کیونکہ غاصب کے غصب کرلے سے شئی مغصوبہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتی بلکہ غصب میں بھی اصل مالک ہی کی مملوک ہے، بناء بریں غاصب کا اس میں تصرف کرنا شرعا حرام ہے۔ اور مال غیر طیب ہونے کے سبب اس سے مسجد کی تعمیر بھی درست نہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت و بمال غیر طیب سے ظاہر ہے۔

مذاہب اربعہ اہل سنت و جماعت کے سوا کسی نو ایجاد مذہب کا اتباع بدلیل اجماع ممنوع ہے۔ تفسیر احمدی میں ہے: قد وقع الاجماع على ان الاتباع انما يجوز للاربع فلا يجوز الاتباع لمن حدث مجتهدا مخالفا لهم۔ بناء بریں مقلدین کیلئے غیر مقلدین کا اتباع ناجائز اور نماز میں بھی اقتداء نامناسب ہے۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سود خوار امامت اور مسجد کا انتظام کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

سود خوار چونکہ فاسق ہے اس لئے اس کی امامت مکروہ ہے، اور انتظام مسجد بھی اس سے متعلق کرنا درست نہیں۔ در مختار بر حاشیہ رد محتار کے جلد ۱ صفحہ ۳۹۳ میں ہے: و يكره (تنزيها) امامة عبد و اعرابي و فاسق و اعمىٰ۔ رد محتار کے اسی صفحہ ۳۹۳ میں ہے: الفسق الخروج عن الاستقامة و لعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر و الزاني و آكل الربوا و نحو ذلك كذا في البرجندي۔ در مختار بر حاشیہ رد محتار کی جلد ۳ صفحہ ۳۹۶ میں ہے: (و ينزع) وجوبا (لو) الواقف۔ درر، فغيره بالاولى (غير مأمون) او عاجزا الخ او ظهر به فسق كشرب الخمر و نحوه فتح۔ والله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مصلی نے پہلی رکعت میں سورہ اخلاص پڑھی اور دوسری میں سورہ ناس پڑھی تو اس میں کچھ کراہت تو نہیں ہے؟ اور ایک نے اس کے بالکل برعکس کیا اس کے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نماز میں خلاف ترتیب آیتیں پڑھنی یعنی بعد والی سورۃ کو پہلے اور پہلی سورۃ کو بعد پڑھنا اور اسی طرح کسی آیت کو آگے پیچھے پڑھنا یا ایک ہی رکعت میں دو ایسی آیتوں کو جمع کرنا جن کے درمیان ایک آیت یا کئی آیتیں رہ گئی ہوں یا دو رکعتوں میں ایسا عمل کرنا جیسا کہ سائل نے استفسار کیا ہے مکروہ ہے۔ فتاوی عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۷۸ میں ہے: و اذا قرأ في ركعة سورة و في الركعة الاخرى او في تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره و كذا اذا قرأ في ركعة آية ثم قرأ في الركعة الاخرى او في تلك الركعة آية اخرى فوق تلك الآية و اذا جمع بين آيتين بينهما آيات او آية واحدة في ركعة واحدة او في ركعتين فهو على ما ذكرنا في السور كذا في المحيط۔ لیکن یہ کراہت صرف فرض نماز میں ہے، سنت یا نوافل میں اگر ایسا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ اسی مقام میں ہے: هذا كله في الفرائض و اما في السنن فلا يكره هكذا في المحيط۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شہر احمدآباد محلہ پانچ پیلی میں چند برادران اسلام نے ایک مسجد بنام "نگینہ" تیار کی جس کو دو ماہ کا عرصہ ہوا اس میں نماز وغیرہ بھی شروع ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرے چند برادران اسلام نے اس کے متصل و ملحق ایک دوسری مسجد تیار کرنی شروع کی جس کی دیواریں تیار ہو گئیں ہے اور بہت کام ناتمام ہے۔ اب استفتاء یہ ہے کہ ایک مسجد کے متصل دوسری مسجد بنانی شرعا درست ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی پوشیدہ نہ رہے کہ دوسری مسجد بنانے والے لوگ ضد اور عداوت سے یہ کام کر رہے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی "مسجد نگینہ" کے متصل و ملحق جو مسجد کہ بنائی جارہی ہے وہ شرعا "مسجد ضرار" ہے کیونکہ اس کی بنیاد حسبۃً للہ نہیں ہے بلکہ بنانے والوں کو اس کے بنانے سے ضد اور عداوت مقصود ہے۔ اور جو مسجد کہ فخر و ریاء یا دیگر اغراض نفسانی سے بنائی جاتی ہے شرعاً وہ "مسجد ضرار" کہی جاتی ہے۔ تفسیر احمدی کے صفحہ ۴۷۰ میں تفسیر مدارک سے اور خزانۃ الروایۃ کے صفحہ ۴۷۰ باب المساجد میں تحریر ہے: كل مسجد بُنِي مباهاةً او رياءً او سمعةً او لغرض سوى ابتغاء وجه الله

تعالی او من مال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عام مسلمانوں کو یہ حکم دیدیا تھا کہ کسی شہر میں دو ایسی مسجدیں نہ بنائی جائیں جو ایک دوسرے کو ضرر دے ۔ چنانچہ تفسیر کشاف سے منقول ہے : قال صاحب الکشاف لما فتح اللہ الامصار علی عمر رضی اللہ عنہ امر المسلمین ان یبنوا مساجد و ان لا یتخذوا فی مدینۃ مسجدین یضار احدھما صاحبہ ۔ اور مسجد ضرار کے متعلق شرعاً یہ حکم ہے کہ ایسی مسجد کو جلاکر منہدم کردیا جائے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانہ میں تو حضرت علیہ السلام کے حکم سے مسجد ضرار جلاکر منہدم کرلے کے بعد اس کی زمین نجاست و غلاظت ڈالنے کیلئے مقرر کی گئی تھی ۔ تفسیر احمدی کے صفحہ ۴۷۶ میں بیضاوی و مدارک سے اور خزانۃ الروایۃ کے صفحہ ۳۷ میں ہے : قال علیہ السلام لوحشی قاتل حمزۃ و معن بن عدی و غیرھما " انطلقوا الی ھذا المسجد الظالم اھلہ فاھدموہ و احرقوہ " ففعل و امر ان یتخذوا مکانہ کناسۃ یلقی فیہ الجیف و القمامۃ ۔ بناء بریں اس وقت مسجد نگینہ کے مقابل و ملحق عند اور عداوت سے جو مسجد بنائی جا رہی ہے وہ شرعاً قابلِ انہدام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمیٰ سید شاہ کریم اللہ قادری نے موضع کیل میں اپنی ذاتی زمین میں بکوشش چندہ اور ذاتی رقم سے ایک مسجد کی بنیاد قائم کی اور اس کے اخراجات کیلئے ایک ایکر زمین تری اپنے ذاتی انعام میں سے مقرر کی ہے ۔ مرحوم کے انتقال کے بعد بھی ان کی اولاد نے حسب دستور سابق و وصیت اسی طریقہ کو جاری رکھا ۔ پس ایسی مسجد میں غیر شخص یا چندہ دہندہ بغیر اجازتِ متولی باوجود امام موجود ہونے کے خطبہ و نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

شرعاً امامت کیلئے ہر وقت اس مسجد کا رات دن نماز پڑھانے والا امام اولیٰ ہے ۔ دوسرے شخص کو اگرچہ وہ امام سے بڑا عالم اور قاری کیوں نہ ہو امام مسجد کی موجودگی میں بدون اجازت اس کے اس مسجد میں امامت کرنا بہتر نہیں ہے ۔ فتاوی الدر المختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۹۲ میں مذکور ہے : (و) اعلم ان (صاحب البیت) و مثلہ امام المسجد الراتب (اولیٰ بالإمامۃ من غیرہ) مطلقا ۔ رد المحتار میں مسطور ہے : ای و ان کان غیرہ من الحاضرین من ھو أعلم و أقرأ منہ ۔ اور فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۸۳ میں ہے : دخل المسجد من ھو اولی بالامامۃ من امام المحلۃ فامام المحلۃ اولی کذا فی القنیۃ ۔ اگر اس مسجد میں بادشاہ وقت یا قاضی (حاکم) آجائے تو امام راتب کے مسجد میں ہوتے ہوئے ان دونوں کے لئے بغیر اجازت اس کے امامت کرنی جائز ہے ۔ چنانچہ اسی جگہ در مختار میں ہے : (الا ان یکون معہ سلطان او قاضی فیقدم علیہ) لعموم ولایتھما و صرح الحدادی بتقدیم الوالی علی الراتب ۔ بناء بریں چندہ دہندہ یا کسی اور شخص کا جو امام سے علم میں بہتر بھی ہو امام راتب موجود ہونے کی صورت میں بدون اجازت اس کے امامت کرنی شرعاً بہتر نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

ما قولکم دلم فضلکم ایہا العلماء اس مسئلہ میں کہ ایک قریہ میں جہاں ایک مسجد ہے جس میں مصلی پنجگانہ نماز پڑھتے ہیں اور اس کے دو امام ہیں، ایک تو کبھی نماز نہیں پڑھتا اور بعض اوقات شراب وغیرہ کے نشہ میں مخمور رہتا ہے اور ہنود کی جاترا کے میلے میں شریک حال رہکر چندہ وغیرہ وصول کرتا پھرتا ہے اور محرم شریف میں شدے بٹھاکر فاتحہ دیتا ہے۔ اب صرف عیدین میں امامت کا دعوی کرتا ہے۔ اور دوسرا امام نماز پنجوقتہ پڑھاتا ہے اور خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا اور مسائل فقہ سے بقدر ضرورت اچھی طرح واقف ہے۔ اب ان دونوں میں مستحق امامت کون ہے بیان فرمایا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرعا امامت کیلئے وہی شخص زیادہ مستحق ہے جو مسائل نماز سے واقف ومتقی ہو یعنی حرام چیزوں اور بدعتوں سے پرہیز کرتا ہو۔ اور جو شراب خوار اور ہنود کی جاترا میں مدد دیتا اور شدے بٹھاتا ہے وہ شرعا فاسق اور بدعتی ہے ایسے شخص کی امامت مکروہ ہے۔ پس جو امام کہ پابند شریعت و واقف مسائل نماز ہے وہی امامت کرنے کا مستحق ہے، نماز پنجگانہ و عیدین کیلئے بھی اسی کو مقرر کیا جائے۔ اور جو شراب خوار ہے اور پابند شریعت نہیں ہے وہ امامت سے موقوف کیا جائے۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۳۹۱ میں ہے: (و الاحق بالامامۃ) تقدیما بل نصبا. رد المحتار میں ہے: ای للامام الراتب (الاعلم باحکام الصلاۃ) فقط صحۃ و فسادا بشرط اجتنابہ للفواحش الظاہرۃ و حفظہ قدر فرض (ثم الاحسن تلاوۃ) و تجویدا (للقراءۃ ثم الاورع) ای الاکثر اتقاءً للشبہات و التقوی اتقاء المحرمات۔ اور اسی صفحہ ۳۹۳ میں ہے: و یکرہ امامۃ عبد و اعرابی و فاسق و اعمیٰ و مبتدع۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز تراویح میں ترویحہ کے وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو نام لئے جاتے ہیں جائز ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ فقہی کتابوں کا حوالہ دیا جائے، اور جو شخص اس سے انکار کرے اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

کتب فقہیہ سے اسی قدر ثابت ہے کہ ترویحہ میں مصلیوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ تسبیح پڑھیں یا قراءت قرآن کریں یا خاموش رہیں یا تنہا نماز پڑھیں۔ در مختار بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۴۹۶ میں مذکور ہے: و یخیرون بین تسبیح و قراءۃ و سکوت و صلاۃ فرادیٰ۔ اور رد محتار کے اسی صفحہ ۴۹۶ میں قہستانی سے منقول ہے کہ ہر ترویحہ میں تین مرتبہ یہ تسبیح پڑھی جائے چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے: قال القہستانی فیقال ثلاث مرات سبحان ذی الملک و الملکوت، سبحان ذی العزۃ و العظمۃ و القدرۃ

و الکبریاء و الجبروت ، سبحان الملک الحیّ الذی لا یموت ، سبوح قدوس رب الملائکۃ و الروح ، لا الٰہ الا اللّٰہ نستغفر اللّٰہ ، اللّٰہم نسئلک الجنۃ و نعوذ بک من النار۔ بناء بریں ہر ترویحہ کے بعد جو تسبیح پڑھی جاتی ہے وہ مناسب ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم و صحابہ کرام کے نام جو یکے بعد دیگرے ترویحہ میں حسب ترتیب لئے جاتے ہیں کتب معتبرہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ عرب و عجم کی ایسی عادت ہے، بلکہ ہندستان میں بھی اس کا رواج منافی نہیں دیتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابتداءً کسی نے پانچ ترویحہ کی تعداد یاد رکھنے کیلئے ان پانچ ناموں کو یعنی آنحضرت علیہ السلام اور چاروں خلفاء کے اسمائے گرامی کو سلسلہ وار لینے کی بنیاد قائم کی ہے جس سے ترویحوں کی تعداد بھی یاد رہتی ہے اور ان حضرات کا ذکر خیر بھی ہوجاتا ہے جو خدائے تعالیٰ کی تسبیح کے بعد موجب برکت ہے۔ موطأ امام محمد علیہ الرحمۃ طبع مصطفائی کے صفحہ ۱۴۰ کی حدیث صحیح ہے؛ و قد روی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم انہ قال " ما رآہ المؤمنون حسنا فھو عند اللّٰہ حسن و ما رآہ المسلمون قبیحا فھو عند اللّٰہ قبیح "۔ اس سے ثابت ہے کہ جس کام کو مسلمانوں نے اچھا سمجھا وہ اللہ کے پاس بھی اچھا ہے اور جس کو مسلمانوں نے برا جانا وہ اللہ کے پاس بھی برا ہے۔ لہٰذا جبکہ چند مسلمانوں نے نیک نیتی سے ایک اچھے کام کی بناء ڈالی ہے تو اس کا قائم رکھنا مناسب ہے اور اس سے انکار کرنا موجبِ عتاب بھی نہیں۔

الاستفتاء

ان مسائل میں علمائے دین و مفتیان شرع متین کیا ارشاد فرماتے ہیں:

سوال اول:۔ زید مسجد کا امام ہے وہ اپنے آپ کو مستحق امامت اور مختار موروثی سمجھتا ہے۔ نماز کا وقت ہو تو اول جماعت کی امامت بجز اپنے دوسرے شخص کو نہیں کرنے دیتا، ایسی حالت میں اگر نماز مغرب کا ٹھیک وقت ہوجائے تو زید کی دیر رہی یا غیر حاضری میں دوسرا شخص امامت کرے تو جائز ہوگا یا نہیں؟

سوال دوم:۔ مصلیان مسجد ایک عالم و فاضل مصلی کو اپنا امام مقرر کرکے نماز مغرب اداء کرنا چاہیں، مؤذن تکبیر و اقامت کہدے اور امام تکبیر تحریمہ کرکے ادائی نماز کا آغاز کرچکا ہو اور مصلیوں میں سے کچھ اقتداء بھی کرچکے ہوں اور کچھ نہ کئے ہوں اس اثناء میں زید جو مسجد کا امام ہے آئے اور غضب ناک ہوکر مصلی پر سے جو شخص رکعت باندھ چکا ہے اس کو دھکا دیکر امامت سے علیحدہ کردے اور خود کھڑا ہوکر ارکان نماز مغرب بہت عجلت سے اداء کرے۔ کیا نماز کل مصلیوں کی صحت کے ساتھ اداء ہوئی یا نہیں؟ یا تکبیر و اقامت ثانی مؤذن سے کہلواکر تجدید نماز کا اعادہ کرنا زید پر واجب تھا یا نہیں؟

کیونکہ امام اول کی اقتداء مصلی کرچکے تھے زید بعد آکر بغیر تکبیر و اقامت کہلوانے کے کھڑا ہوگیا اور مقتدیوں کو زید کا علم نہیں تھا۔ کیا یہ فعل و حرکت زید کی قابل نفریں و ملامت ہے یا نہیں؟ صراحت سے جواب مرحمت ہو۔

سوال سوم:۔ نماز مغرب کا وقت بہت تنگ ہوتا ہے کیا زید جو مسجد کا امام ہے اس کا فریضہ ہے

کہ ہر وقت مسجد میں حاضر رہے ؟ یا مصلیان انتظار میں نماز مغرب کا وقت فوت کردیں ؟ اور کس قدر انتظار مصلیوں کو کرنا درست ہوگا ؟ اگر مصلیان مسجد بعد انتظار کسی کو اپنا امام بنالیں تو زید کا جبری طور پر امامت سے دھکا دیکر ہٹا دینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال چہارم :- حدیث شریف میں وارد ہے کہ امام ، ضامن اور مؤذن اس کا امین ہے تو اس کی اجازت سے ایک شخص امامت پر کھڑا ہووے تو امام مسجد پر جو دیر سے آیا ہے اقتداء امام کی واجب تھی یا اسے غضبناک ہوکر بحالت غصہ جماعت فاسد کرالنے کا حق حاصل تھا؟ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) روزمرہ نماز پڑھانے والے امام کو "امام راتب" کہتے ہیں اور شرعاً امام راتب کی غیر حاضری و دیرسی میں بلا اجازت اس کے مصلیوں کو یہ حق ہے کہ کسی متقی شخص کو اپنا امام بنا کر نماز ادا کرلیں ۔ خصوصاً جبکہ نماز کا وقت تنگ ہو تو ایسی حالت میں امام راتب کے انتظار کی کوئی ضرورت نہیں ۔ چنانچہ آں سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ و سلم جس وقت بنی عمرو بن عوف کی صلح کے لئے تشریف لے گئے تھے اور نماز عصر کا وقت آپہنچا تب صحابہ کرام نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہم کو امام بناکر نماز عصر ادا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کا انتظار نہیں کیا گیا ۔ بناء بریں عینی شرح بخاری مصری کی جلد ۲ صفحہ ۴۰، میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے : ان الامام الراتب اذا غاب یستخلف غیرہ ۔

(۲) جب مصلیوں نے در صورت دیرسی امام ایک متقی شخص کو اپنا امام بنالیا تھا اور وہ تکبیر تحریمہ کہکر داخل نماز ہوگیا اور بعض مصلیوں نے بھی اس کی اقتداء کرلی ، تو ایسی حالت میں امام راتب کا دیر سے آکر اس پر غضبناک ہونا اور حالت نماز میں دھکا دیکر مصلے سے ہٹا دینا اس میں احکم شرعیہ کا انہاک یعنی احکام شرعیہ کی پردہ دری اور بےعزتی اور ایک شریف اور ذی عزت شخص کی تذلیل ہے جو شرعاً معصیت اور حرام ہے ، اور جو شخص اس قسم کے کام کرتا ہے اس کیلئے شرعاً تعزیر یعنی تادیب مقرر کی گئی ہے ۔ شرع میں تعزیر کرنے کا حق چونکہ قاضی (حاکم) کو دیا گیا ہے اور کئی طریقہ سے تعزیر بتائی گئی ہے یعنی قاضی کو چاہیئے کہ حسب حیثیت کسی کو مار سے اور قید سے اور کسی کو گردنی یا گوشمال یا زبان سے تنبیہ و تعزیر کرے ۔ اس لئے صورت مسئولہ میں جبکہ امام راتب خدمت پر مامور ہونے کے سبب شرعاً شریف اور ذی عزت ہے تو اس کو قاضی کے پاس پیش کرکے زبانی تادیب و تنبیہ کرائی جائے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار مصری جلد ۳ صفحہ ۱۸۷ میں ہے : و عزر کل مرتکب منکر او مؤذی مسلم بغیر حق بقول او فعل و لو بغمز العین ۔ اور صفحہ ۱۸۳ میں ہے ، التعزیر (ھو تأدیب دون الحد اکثرہ تسعۃ و ثلاثون سوطا و اقلہ ثلاثۃ و لا یفرق الضرب فیہ و یکون بہ و) بالحبس و (بالصفع) علی العنق (و فرک الاذن و بالکلام العنیف و بنظر القاضی لہ بوجہ عبوس و شتم غیر القذف لا یأخذ مال فی المذھب و) التعزیر (لیس فیہ تقدیر بل ھو مفوّض الیٰ رأی القاضی) و علیہ مشائخنا زیلعی، و لان المقصود منہ الزجر و احوال الناس فیہ مختلفۃ ۔

مصلیوں میں جن اشخاص نے امام اول کی اقتداء کی نیت کرلی تھی اور امام ثانی کی اقتداء کی نیت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس خیال سے (کہ ہمارا وہی پہلا امام نماز پڑھا رہا ہے) اپنی نماز اخیر تک دوسرے امام کے پیچھے پوری کرلی ہے تو ان مصلیوں کی نماز نہیں ہوئی۔ ان کا اعادہ کرلینا چاہیے کیونکہ امام راتب نے جب اس امام کو دھکا دیکر مصلیٰ سے ہٹا دیا ہے تو ضرور اس امام سے عمل کثیر صادر ہوا ہے جس سے اس امام کی نماز فاسد ہوئی۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۴۲۸ میں ہے: (و) یفسدها (کل عمل کثیر) لیس من اعمالها و لا لاصلاحها۔ چونکہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو متضمن ہے اور شامل ہے اس لئے مقتدیوں کی نماز کا صحیح ہونا اور فاسد ہونا امام کی نماز کی صحت و فساد پر موقوف ہے۔ پس صورت مسئولہ میں جب امام کی نماز فاسد ہوئی ہے تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہے۔ بناء بریں مقتدیوں پر اعادہ نماز کا واجب ہے۔ چنانچہ در مختار بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۳۱۵ میں لکھا ہے: (و اذا ظهر حدث امامه) و كذا كل مفسد في رأي مقتد (بطلت فيلزم اعادتها) لتضمنها صلاة المؤتم و صحة و فسادا۔ اور جن مقتدیوں نے نئی تکبیر تحریمہ کہکر دوسرے امام کی اقتداء کی نیت کرلی ہے انکی نماز پوری ہوئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ف:۔ تیسرے سوال کا جواب اول و دوم کے جواب سے حاصل ہے۔

(۴) امام راتب پر واجب ہے کہ جب قوم یعنی مصلیوں نے دیر رسی امام کی وجہ سے ایک متقی شخص کو نماز کیلئے مقرر کرلیا ہے اور اس نے نماز بھی شروع کردی ہے تو یہ بھی اور مصلیوں کی طرح اس کی اقتداء کرکے نماز میں شریک ہو جائے۔ چنانچہ شرح بخاری للعینی کے صفحہ ۲۰۰ میں مسطور ہے: قوله ايضا ان الامام الراتب اذا غاب يستخلف غيره مسلم ايضا، و قوله و انه اذا حضر بعد ان دخل نائبه في الصلاة يتخير بين ان يأتم به او يؤم هو و يصير النائب ماموما من غير ان يقطع الصلاة و لا يبطل شيء من ذلك صلاة احد من المامومين غير مسلم و احتجاج من يذهب الى هذا بهذا الحديث غير صحيح لان ذلك من خصائص النبي صلى الله عليه و سلم ذكر ذلك ابن عبد البر و ادعى الاجماع على عدم جواز ذلك لغيره۔ پس امام راتب کو قوم کے مقرر کردہ امام کو ہٹانے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ جیسا کہ سوال دوم میں تفصیل سے مذکور ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص ایک جگہ خطبہ پڑھے اور دوسری جگہ جاکر نماز جمعہ پڑھاوے۔ یا اول نماز پڑھاکر دوسری جگہ خطبہ پڑھاوے تو جائز ہے یا نہیں؟ بحوالۂ کتب معتبرہ جواب ادا ہو۔

الجواب

واضح ہو کہ جمعہ میں ایک شخص کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا نماز پڑھانا سزاوار اور بہتر نہیں ہے،

کیونکہ خطبہ اور نماز شرعاً ایک ہی سمجھی گئی ہے ، اس لئے دو شخصوں کا ایک چیز کو انجام دینا مناسب نہیں بلکہ ایک ہی شخص کو چاہیئے کہ خطبہ پڑھے اور نماز بھی پڑھاوے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۰۹ میں مذکور ہے : (لا ینبغی ان یصلی غیر الخطیب) لانہما کشیء واحد ۔ بناء بریں کسی شخص کا ایک جگہ خطبہ پڑھکر دوسری جگہ جاکر نماز پڑھانا یا ایک جگہ نماز پڑھاکر اس کے بعد دوسری جگہ جاکر خطبہ پڑھنا سزاوار اور مناسب نہیں ہے ، اگر کسی عذر شرعی سے ایسا کیا گیا ہے تو جائز ہے۔ چنانچہ در مختار میں اسی مقام میں ہے : (فلو فعل بان خطب صبی باذن السلطان و صلی بالغ جاز) ھو المختار ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمی زید امام مسجد ہے جس کی قراءۃ میں مخارج و اعراب غلط ہونے کے علاوہ وہ سود خوار ہے تو کیا ایسی صورت میں اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

فاسق کی امامت شرعاً مکروہ ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المختار مصری جلد ۱ صفحہ ۳۹۳ میں مذکور ہے : و (یکرہ) تنزیہا امامۃ عبد و اعرابی و فاسق و اعمیٰ ۔ چونکہ فاسق گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کہا جاتا ہے، سود خوار بھی فاسق ہے ۔ رد مختار مصری جلد ۱ صفحہ ۳۹۳ میں مسطور ہے : الفسق الخروج عن الاستقامۃ و لعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر و الزانی و آکل الربوا و نحو ذلک کذا فی السراجیۃ ۔ روزمرہ کی امامت کرنے والے کیلئے شرعاً یہ شرط رکھی گئی ہے کہ امام ، نماز کے صحیح اور فاسد ہونے کے متعلق جملہ احکام سے واقف ہو ، اور ظاہری برے کاموں سے بچا رہے۔ اور بقدر فرض حافظ قرآن ہو، اگر ایسا شخص نہ ملے وہ شخص امامت پر مامور ہو جو تجوید سے اداء کرے اگر ایسا بھی نہ ملے تو اورع امام بنایا جائے یعنی وہ شخص جو ہمیشہ محرمات و مشتبہات سے بچتا ہے ، رد مختار کی جلد ۱ صفحہ ۳۹۱ حاشیہ پر در مختار میں مذکور ہے : (و الاحق بالامامۃ) تقدیما بل نصبا ۔ رد مختار میں لکھا ہے : ای للامام الراتب (الاعلم باحکام الصلاۃ) فقط صحۃ و فسادا بشرط اجتنابہ للفواحش الظاہرۃ و حفظہ قدر فرض (ثم الاحسن تلاوۃ) و تجویدا (للقراءۃ ثم الاورع) ای الاکثر اتقاء للشبہات و التقوی اتقاء المحرمات ۔ پس مصلیان مسجد کو چاہیئے کہ زید کو ان شروط مذکورہ کے موافق اپنے کو قابل امامت بنانے کیلئے ہدایت کریں ۔ اگر زید ان اوصاف سے آراستہ ہو جائے تو وہی اس خدمت پر بحال رہنے کا مستحق ہے ، ورنہ دوسرا شخص جو ان شروط کے موافق امامت پر مامور کیا جائے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

جو سجدہ تلاوت کہ نماز میں لازم ہوگیا تھا وہ اندرون نماز اداء نہ ہونے کی صورت میں بعد سلام کے کسی مقتدی کی اس طرح تعلیم سے کہ "اب اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرلو کافی ہے" سجدہ تلاوت متذکرہ کی قضاء درست

ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جو سجدہ تلاوت کہ نماز میں واجب ہوتا ہے ، چونکہ وہ نماز کا جزو ہے اس لئے اس کو فوراً بحالت نماز اداء کرلے کا حکم ہے اور تاخیر میں گناہ ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۳۰ میں مذکور ہے : فعلی الفور لصیرورتها جزءاً منها ثم بتأخیرها ۔ رد محتار میں لکھا ہے : فان کانت صلویة فعلی الفور۔ اور در مختار صفحہ ۵۳۱ میں ہے : فلو تلاها فی الصلاة سجدها فیها لا خارجها ۔ اگر کسی نے نماز میں آیت سجدہ پڑھنے کے بعد عمداً یعنی جان بوجھکر سجدہ تلاوت ترک کرکے فوراً آیت سجدہ کے ایک یا دو یا تین آیات کے بعد نماز کیلئے رکوع کیا اور اس میں سجدہ تلاوت کی بھی نیت کرلی ، یا آیت سجدہ کی تلاوت کے ساتھ ہی رکوع کرکے بلا نیت سجدہ تلاوت نماز کے لئے سجدہ میں گیا تو ان دونوں صورتوں میں نماز کے رکوع و سجود میں اس کا سجدہ تلاوت بھی اداء ہو جاتا ہے ۔ در مختار صفحہ ۵۳۱ میں ہے : (و تؤدی برکوع صلاة) اذا کان الرکوع (علی الفور من قراءة آیة) او آیتین و کذلک لثلاث علی الظاهر کما فی البحر (ان نواه) ای کون الرکوع لسجود التلاوة علی الراجح (و) تؤدی (بسجودها کذلک) ای علی الفور (و ان لم ینو) بالاجماع ۔ اگر اس نے نہ تو اس کے بعد نماز کیلئے رکوع و سجود کیا اور نہ وقت تلاوت اس کو اداء کیا بلکہ سجدہ تلاوت پڑھکر بہت دیر بعد رکوع و سجود کیا اور نماز ختم کردی تو ایسا شخص گناہگار ہے جس کو توبہ کرنا لازم ہے اور اس کے لئے اس سجدہ کی قضاء نہیں ہے ۔ در مختار کے صفحہ ۵۳۱ میں بدائع سے منقول ہے : و اذا لم یسجد اثم فتلزمه التوبة ۔ رد محتار میں ہے : افاد انه لا یقضیها قال فی شرح المنیة و کل سجدة وجبت فی الصلاة و لم تؤد فیها سقطت ای لم یبق السجود لها مشروعا لفوات محله اهـ ، اقول و هذا اذا لم یرکع بعدها علی الفور و الا دخلت فی السجود و ان لم ینوها کما سیأتی و هو مقید ایضا بما اذا ترکها عمدا حتی سلم و خرج من حرمة الصلاة۔

اگر مصلی نے نماز میں آیت سجدہ پڑھنے کے بعد سہو سے سجدہ تلاوت ترک کیا ہے اور فوراً آیت سجدہ کے ایک یا دو یا تین آیت بعد نیت سجدہ سے نماز کیلئے رکوع یا اس کے بعد بلا نیت سجدہ تلاوت نماز کیلئے سجود نہیں کیا جیسا کہ ابھی سابق میں مذکور ہوا ہے ، بلکہ اس نے نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کے چار یا اس سے زیادہ آیات کے بعد رکوع و سجود کیا تو اس کیلئے نماز میں رہنے تک جب یاد آجائے سجدہ تلاوت بجا لانا واجب ہے ۔ اور اگر نماز سے سلام پھیرلے کے بعد بھی اس کو سجدہ تلاوت یاد آئے تو اس کو جب تک مسجد سے خارج نہو اور کوئی فعل مثل گفتگو و حدث وغیرہ جو نماز کے منافی ہیں اس سے صادر نہوں سجدہ تلاوت کی قضاء کرنی چاہئے ، اور سجدہ سہو بھی اداء کرنا چاہئے ۔ چنانچہ در مختار صفحہ ۵۳۰ میں ہے : و یقضیها ما دام فی حرمة الصلاة و لو بعد السلام ۔ رد المحتار میں ہے : ای ناسیا ما دام فی المسجد ۔ اور رد المحتار صفحہ ۵۳۱ میں ہے : اما لو سهوا و تذکرها و لو بعد السلام قبل ان یفعل منافیا یأتی بها و یسجد للسهو کما قدمناه ۔ و اللّٰه اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نابالغ لڑکے کے پیچھے تراویح اور سنت میں اقتداء شرعا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

عاقل اور سمجھدار لڑکے کے پیچھے تراویح اور نوافل پڑھنے کی بعض فقہاء نے اگرچہ اجازت دی ہے ۔ مگر عامہ فقہاء ناجائز کہتے ہیں اور یہی اصح اور مختار مذہب ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۸۶ میں مذکور ہے : و امامة الصبي العاقل في التراويح و النوافل المطلقة تجوز عند بعضهم و لا تجوز عند عامتهم كذا في محيط السرخسي ۔ البحر الرائق جلد ۱ صفحہ ۳۸۱ میں ہے : و لهذا كان المختار عدم جواز الاقتداء به في كل صلاة ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۴۰۵ میں ہے : (و لا يصح اقتداء رجل بامرأة) و خنثى (و صبي مطلقا) و لو في جنازة و نفل على الاصح ۔ رد المحتار میں تحت قول و نفل على الاصح ہدایہ سے منقول ہے : قال في الهداية و في التراويح و السنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ و لم يجوزه مشايخنا و منهم من حقق الخلاف في النفل المطلق بين ابي يوسف و محمد ، و المختار انه لا يجوز في الصلوات كلها اهـ ۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جس بلاد میں چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہو اس مقام پر صلاۃ و صوم کے کیا احکام ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جن علاقوں میں چھ مہینے مسلسل دن رہتا ہے اور رات نہیں ہوتی ایسے مقام کے رہنے والوں پر بھی رات کی تمام نمازیں اداء کرنا فرض ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار ۲۵۲ میں ہے : و فاقد وقتهما مكلف بهما ۔ اور رد مختار صفحہ ۲۵۵ میں ہے : و الحاصل انهما قولان مصححان و يتأيد القول بالوجوب بانه قال به امام مجتهد و هو الامام الشافعي كما نقله في الحلية عن المتولي عنه ۔ مگر چونکہ اداء کیلئے وقت نہیں ہے اس لئے ان نمازوں کو بطریق قضاء پڑھنا چاہئے ۔ فتاوی رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ میں ہے : اذا علمت ذلك ظهر لك ان من قال بالوجوب يقول به على سبيل القضاء لا الاداء ۔ اس کے بعد دوسری سطر میں ہے : مع ان القائلين عندنا بالوجوب صرحوا بانها قضاء و يفقد وقت الاداء ۔ لیکن روزہ زکاۃ و حج و عدۃ و بیع و سلم و اجارہ کی میعاد و اقات کے متعلق ان لوگوں کو اس پاس کے شہروں کے دن رات کا اندازہ کرکے اداء کرنا چاہئے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ میں ہے : قال في امداد الفتاح قلت و كذلك يقدر لجميع الآجال كالصوم و الزكاة و الحج و العدة و آجال البيع و السلم و الاجارة ، و ينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الاربعة بحسب ما يكون كل

یوم من الزیادۃ و النقص کذا فی کتب الائمۃ الشافعیۃ و نحن نقول بمثلہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشرکین ہنود کے مال سے مسجد بنانا یا اس کی تعمیر کرنی شرعا جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا توجروا

الجواب

مال خبیث و غیر طیب سے یا اس مال سے جو ناجائز و جائز دونوں طریقوں سے بالاشتراک حاصل ہوا ہے مسجد بنانا یا اس کی تعمیر کرنی شرعا مکروہ تحریمی ہے ۔ فتاویٰ شامی جلد ۱ صفحہ ۴۶۲ میں ہے : قال تاج الشریعۃ اما لو انفق فی ذلک مالا خبیثا و مالا سببہ الخبیث و الطیب فیکرہ لأن اللہ تعالی لا یقبل الا الطیب فیکرہ تلویث بیتہ بما لا یقبلہ ۔ خزانۃ الروایۃ قلمی صفحہ ۴۸ میں ہے : و قیل کل مسجد بُنِی مباھاۃً او ریاءً او سمعۃ او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللہ تعالی او من مال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار ۔ چونکہ مشرکین کی اکثر آمدنی سود یا سود کی آمیزش سے ہوا کرتی ہے ۔ اس لئے ان کے روپیہ سے مسجد کی تعمیر کرنی شرعا درست نہیں ہے جیسا کہ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۳۵۳ آیت " ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ " کی تفسیر میں ہے : فان اراد کافر ان یبنی مساجد و یعمرھا یمنع منہ و ھو المفھوم من النص و ان لم یدل علیہ روایۃ ۔

بناء بریں اگر کوئی مشرک اپنے مکان کو مسجد بنادے یا اپنی جانب سے حج کرنے کیلئے کسی جائداد کو وقف کرکے وصیت کرے تو یہ وقف شرعا باطل ہے کیونکہ مشرکین کے پاس مذہباً ایسے کاموں سے اللہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ اسعاف فی احکام الاوقاف صفحہ ۱۱۹ میں ہے : و کذا لو جعل دارہ مسجدا للمسلمین او اوصی ان یحج عنہ یکون الوقف باطلا لکونہ لیس مما یتقرب بہ اھل الذمۃ الی اللہ تعالی ۔

البتہ اگر کسی خاص جماعت مسلمین کے لئے اپنے گھر کو مسجد بنا دے یا کسی خاص شخص کو حج کرنے کیلئے روپیہ دے تو چونکہ اس نے خاص شخص یا اشخاص کیلئے وقف کیا ہے اس لئے جائز ہے جیسا کہ اسعاف کے اسی صفحہ ۱۱۹ میں ہے : و لو اوصی الذمی ان تبنی دارہ مسجدا لقوم بأعیانھم او لأھل محلۃ بأعیانھم جاز استحسانا لکونہ وصیۃ لقوم بأعیانھم ، و کذلک یصح الایصاء بمال لرجل بعینہ لیحج بہ لکونہ وصیۃ لمعین ثم ان شاء حج بذلک و ان شاء ترک ۔ پس صورت مسئولہ میں مشرک کے مال سے مسجد بنانی یا تعمیر کرنی ناجائز ہے ۔ اگر مشرک اس روپیہ کو کسی مسلمان کو ہبہ کردے اور وہ مسلمان بطور خود اس رقم سے مسجد کی تعمیر کرے تو شرعا جائز ہو سکتا ہے جیسا کہ اسعاف کی سابق الذکر عبارت سے ظاہر ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مصلی چار رکعت والی فرض نماز میں تیسری یا چوتھی یا دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ بھی ضم کرے تو کیا اس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر کوئی مصلی چار رکعت والی فرض نماز کی تیسری یا چوتھی یا دونوں رکعت میں سہو سے سورہ ضم کرے تو اس پر شرعاً سجدہ سہو لازم نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیریہ صفحہ ۱۲۶ جلد ۱ باب سہو میں ہے: و لو قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة لا یلزمه السهو و هو الاصح۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ غیر مقلدین، مقلدوں کے محلہ میں مسجد بنانا چاہتے ہیں جہاں اور بھی مسجدیں ہیں۔ اور مقلد ان کو اس خیال سے منع کرتے ہیں کہ ان کی بری تعلیم کا برا اثر اپنے بچوں پر پڑے گا اور فساد ہوگا۔ اس صورت میں کیا مقلدوں کا مسجد بنانے سے ان کو روکنا درست ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئول میں جب کہ محلہ میں ادائی نماز پنجگانہ کیلئے مساجد موجود ہیں اور غیر مقلدین کے ان مساجد کے علاوہ جدید مسجد تعمیر کرنے سے مقلدین کو فساد کا اندیشہ ہے تو ایسی حالت میں غیر مقلدین کی جدید مسجد شرعاً مسجد ضرار کا حکم رکھتی ہے جس کی تعمیر شرعاً ناجائز ہے۔ آیت کریمہ " و الذین اتخذوا مسجداً ضراراً و کفراً و تفریقاً بین المؤمنین و ارصاداً لمن حارب الله و رسوله من قبل و لیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ و الله یشهد انهم لکاذبون لا تقم فیه ابداً" سے ظاہر ہے کہ جو مسجد مسلمانوں کو ضرر دینے اور خاص اپنے لوگوں کی عبادت کیلئے بنائی جاتی ہے وہ ہرگز قابل اقامت صلوٰۃ نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے بموجب بنو غنم بن عوف کی بنائی ہوئی مسجد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے منہدم کرکے کناسہ یعنی کوڑا و غلاظت ڈالنے کا مقام بنانے کیلئے حکم فرمایا۔ تفسیر احمدی کے صفحہ ۴۲۹ میں ہے: فقال علیه السلام لوحشی قاتل حمزة و معن بن عدی وغیرهما " انطلقوا الی هذا المسجد الظالم اهله فاهدموه و احرقوه " ففعل و امر ان یتخذ مکانه کناسة یلقی فیه الجیف و القمامة۔ بناء بریں بر وقت فتح امصار جبکہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو تعمیر مساجد کا حکم فرمایا اس بات کی ممانعت فرمادی کہ کسی شہر میں دو ایسی مسجدیں جو کہ ایک دوسرے کو ضرر دیں ہرگز نہ بنائی جائیں، جیسا کہ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی صفحہ ۴۷۰ میں لکھا ہے: و قال صاحب الکشاف و عن عطاء لما فتح الله الامصار علی عمر رضی الله عنه امر المسلمین ان یبنوا المساجد و ان لا

یتخذوا فی مدینۃ مسجدین یضار احدھما صاحبہ ۔ اور خزانۃ الروایۃ قلمی کے صفحہ ۳۰ میں ہے کہ جو مسجد فخر یا ریاء یا کسی اور ذاتی غرض کیلئے تعمیر کیجاتی ہے وہ مسجد ضرار ہے عبارتہ ھکذا : کل مسجد بُنِی مباھاۃً او ریاءً او سمعۃً او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللّٰہ او من مال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید جو تارک الصلاۃ تھا انتقال کیا ۔ آیا از روئے شریعت اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمایا جاوے ۔ بینوا توجروا

الجواب

تارک الصلاۃ شرعاً فاسق و فاجر ہے اور اہل سنت و جماعت کے عقیدہ میں از روئے اجماع امت یہ بات ثابت ہے کہ جو فاجر و فاسق با ایمان انتقال کرے اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے ۔ چنانچہ شرح عقائد نسفی مطبوعہ یوسفی کے صفحہ ۹۵ میں ہے : (و یصلی علی کل بَرٍّ و فاجرٍ) اذا مات علی الایمان للاجماع و لقولہ علیہ السلام " لا تدعوا الصلاۃ علی من مات من اھل القبلۃ" ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد میں جماعت اولیٰ کے بعد متعدد جماعتوں سے وقتی نماز اداء کرنا شرعاً جائز ہے نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

جماعتِ اولیٰ کے بعد متعدد جماعتوں سے نماز وقتی اداء کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ دوسری جماعتوں کا امام محراب کی محاذات میں جہاں جماعت اولیٰ کا امام کھڑا ہوا تھا نہ کھڑا رہے ۔ بلکہ اس سے ہٹکر کسی اور جگہ اگر جماعت ثانیہ و ثالثہ وغیرہ قائم کیجائے تو کوئی حرج نہیں ۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو بیشک مکروہ ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۳۷۹ و صفحہ ۳۸۸ میں ہے : و عن ابی یوسف رحمہ اللّٰہ اذا لم تکن الجماعۃ علی الھیئۃ الاولی لا تکرہ و الا تکرہ و ھو الصحیح ، و بالعدول عن المحراب تختلف الھیئۃ کذا فی البزازیۃ انتھی ، و فی التاتارخانیۃ عن الولوالجیۃ و بہ نأخذ ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص ماہ رمضان شریف میں نماز کے وقت عشاء کی جماعت میں شامل نہ ہو تو وہ وتر کی جماعت میں شامل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

رمضان شریف میں جبکہ کوئی شخص امام کے ساتھ فرض عشاء میں شامل نہ ہو تو اس کا وتر میں امام کے ساتھ شامل ہونا درست نہیں ہے ۔ فتاوی رد المحتار جلد ۱ مطبوعہ مصری صفحہ ۴۹۰ میں لکھا ہے : لکن فی التاتارخانیة عن التتمة انه سئل علی ابن احمد عمن صلی الفرض و التراویح وحده او التراویح فقط هل یصلی الوتر مع الامام فقال لا ثم رأیت القهستانی ذکر تصحیح ما ذکره المصنف ثم قال لکنه اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر ۔ جامع الرموز کشوری کے صفحہ ۹۰ میں مذکور ہے : لکنه اذا لم یصل الفرض معه لا یتبعه فی الوتر کما فی المنیة ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محلہ راج نگی کی مسجد کلاں میں نماز تراویح حسب ذیل طریقوں پر پڑھائی جاتی ہے :

۱۔ بعد فرض عشاء کے صف اول میں پیش امام صاحب کے پیچھے ایک مقتدی بیٹھا ہوا قرآن مجید دیکھکر سماعت کرتا ہے اور دوسرا شخص اس کے بازو میں بیٹھا ہوا ورق گردانی کرتا ہے ۔ جہاں امام سے غلطی ہوئی فوراً بتادیا ۔ مقتدیوں میں صرف ایک شخص جو ورق گرداتا ہے اور رکوع و سجود کے وقت قرآن مجید سامع کے سامنے سے بازو ہٹاتا ہے وہ نماز میں نہیں ہوتا محض اسی کام کیلئے بیٹھا رہتا ہے ۔ اس طریقے پر تخمیناً چار سال سے اب تک نماز پڑھائی گئی ۔

۲۔ صف اول میں ایک مقتدی بیٹھا ہوا قرآن مجید دیکھکر سماعت کرتا ہے اور دوسرا بازو بیٹھا ہوا رکوع و سجود کے وقت سامع کے سامنے سے قرآن بازو ہٹاتا ہے ۔ پہلی رکعت میں قرآن مجید اور دوسری میں سورہ اخلاص پڑھا جاتا ہے ۔ رکوع و سجود کے وقت سامع کے پاس والا بھی قرآن مجید ہٹاکر شریک نماز ہو جاتا ہے ۔ اس طرح پر تخمیناً پانچ سال تک نماز تراویح پڑھائی گئی ۔

۳۔ پیش امام صاحب خود سامنے قرآن مجید رکھکر نماز تراویح پڑھاتے ہیں یعنی ان کے مصلے کے آگے جائے سجدہ کے قریب ایک ٹیبل یا کرسی پر قرآن مجید کھولکر رکھدیتے ہیں اور اس کے بازو روشنی کیلئے دو قندیلیں بھی رکھ دی جاتی ہیں ۔ قیام میں جہاں تک صاف حفظ سے پڑھا گیا وہاں تک تو پڑھتے جاتے ہیں اور جس جگہ غلطی ہوئی دیکھکر آگے چلتے ہیں ۔ ہر ایک رکعت میں ایک صفحہ جو کھلا ہوا رہتا ہے پڑھ لیتے ہیں اور دوسرے دوگانہ میں کھڑے ہوتے وقت ورق الٹایا جاتا ہے ۔ اس طرح گذشتہ رمضان شریف اور اب کے سال بھی نماز پڑھائی جاتی ہے ۔ پیش امام صاحب کو بائیس یا پچیس پارے حفظ ہیں ۔ گذشتہ رمضان شریف میں ایک مولوی صاحب سے میں نے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اوپر کی دونوں صورتیں مفسد صلاۃ ہیں اور تیسری مکروہ ۔ اس لئے آپ کی خدمت عالی میں یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے جو امر صحیح ہو اس سے مطلع فرمائیے ۔

الجواب

شخص خارج از نماز اگر نمازی کو لقمہ دے اور نمازی اس کا لقمہ لے لے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔
عالمگیریہ جلد اول باب فیما یفسد الصلاۃ میں ہے : و ان فتح غیر المصلي علی المصلي فاخذہ بفتحہ تفسد کذا فی منیۃ المصلي۔ پس پہلے اور دوسرے سوال میں چونکہ خارج نماز شخص نے امام کو لقمہ دیا ہے اس لئے جن نمازوں میں امام نے اس کا لقمہ لیا وہ سب فاسد ہو گئیں۔ امام و مقتدیوں پر ان کا اعادہ واجب ہے۔
حافظ قرآن امام اگر بحالت نماز قرآن شریف سامنے رکھکر اس سے اپنی غلطی صاف کرلے تو نماز میں فساد نہیں آتا۔ در مختار کے مفسدات صلاۃ میں ہے : (و قراءۃ من مصحف) ای ما فیہ قرآن (مطلقا) لانہ تعلم الا اذا کان حافظا لما قرأہ بلا حمل۔ عالمگیریہ کے مفسدات صلاۃ میں ہے : و لو کان یحفظ القرآن و قرأہ من مکتوب من غیر حمل المصحف قالوا لا تفسد صلاتہ لعدم الأمرین و لم یفصل فی المختصر و لا فی الجامع الصغیر بین ما اذا قرأ قلیلا او أکثر من المصحف۔ پس صورت مسئولہ میں امام کو جتنے پارے یاد ہیں ان کی غلطی کو اگر سامنے رکھکر صاف کرلے تو اس میں فساد نہیں ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے قرآن شریف کے ورق گردانی نہ کرے بلکہ باریک خط یا بڑی تقطیع کا ایسا قرآن شریف روبرو رکھے جس کے دو صفحوں میں دو رکعت میں پڑھنے کی مقدار آیات ہوں۔ اور جہاں سے امام کو یاد نہیں ہے اس کو قرآن شریف میں دیکھکر پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک قطعہ زمین باجازت سرکار حاصل کی، اور اس پر اپنے ذاتی مصارف سے خس پوش مسجد تعمیر کی جس میں با جماعت نماز ہونے لگی۔ اور خود متولی مصارف مسجد کا کفیل رہا۔ ایک عرصہ بعد زید نے اپنے بھائی عمرو کو اپنا قائم مقام و متولی مقرر کیا، اور اس کے چار سال بعد وہ مسجد محلہ والوں کے چندہ سے سفال پوش کردی گئی۔ پھر اٹھارہ سال بعد ایک اور شخص نے محلہ داروں کی درخواست پر اس کو پختہ بنادیا۔ پس بصورت موجودہ مسجد مذکور کا متولی بانی مسجد کا قائم مقام یعنی عمرو سمجھا جائیگا یا وہ شخص جس نے اخیر میں مسجد کو پختہ تعمیر کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

عالمگیریہ کی پہلی جلد فصل کرہ غلق باب المسجد میں ہے : رجل بنی مسجدا و جعلہ للّٰہ تعالی فھو احق الناس بمرمتہ و عمارتہ و بسط البواری و الحصر و القنادیل و الاذان و الاقامۃ و الامامۃ ان کان اھلا لذلک و ان لم یکن اھلا فالرأی فی ذلک الیہ۔ یعنی جو شخص مسجد کی بنیاد قائم کرتا ہے وہی اہل ہونے کی صورت میں متولی ہونے کا مستحق ہے، اور اہل نہ ہونے کی صورت میں اسی کو حق ہے کہ کسی دوسرے شخص کو جو اس کا اہل ہو مقرر کرے۔ "بناء" کے معنی خالی زمین پر بنیاد رکھنے کے ہیں، مُغرب لغت فقہ کے صفحہ ۴۰ میں ہے : (بنی) الدار بناء و قولہ و ان کان رجل اخذ ارضا

[و بناها) ای بنی فیها دارا او نحوها و فی موضع آخر اشتراها غیر مبنیة ای غیر مبنی فیها۔ پس صورت مسئولہ میں مسجد کو پختہ بنانے والا شخص مسجد کا بانی نہیں ہے بلکہ بانی وہی شخص ہے جس نے اس کی ابتداء میں بنیاد قائم کی ہے اور اسی کو اس کی تولیت کا حق ہے۔ بانی نے عمرو کو جو اپنا قائم مقام و متولی بنایا ہے اگر عمرو اس خدمت کا اہل ہے تو یہی تولیت کا مستحق ہے، پختہ بنانے والے کو اس کے مقابل میں کوئی حق نہیں۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد میں اگر جماعت اولیٰ محراب سے علیحدہ ادا کی جائے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نماز کے وقت امام کا محراب کے مقابل کھڑا ہونا مسنون اور محراب سے ہٹکر کھڑے ہونا مکروہ ہے۔ رد المحتار کی کتاب الصلاۃ باب الامامۃ میں ہے: قال فی المعراج و فی مبسوط بکر السنة ان یقوم الامام فی المحراب لیعتدل الطرفان۔ اسی صفحہ میں ہے: یفهم من قوله او الی سارية كراهة قيام الامام فی غیر المحراب۔ یہ حکم اس امام کا ہے جو جماعتِ اولیٰ کی امامت کرتا ہے کیونکہ جماعتِ اولیٰ کے بعد جماعت ثانیہ کیلئے امام کو محراب سے علیحدہ کھڑا ہونا چاہئے، تاکہ تکرار جماعت کی کراہت دفع ہو جائے۔ رد المحتار کے باب الامامت مطلب فی تکرار الجماعۃ فی المسجد میں ہے: و قدمنا فی باب الاذان عن آخر شرح المنیة عن ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالى انه اذا لم تكن الجماعة على الهيئة الاولى لا تكره و الا تكره و هو الصحيح و بالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا فی البزازية۔ اھ۔ و فی التاتارخانية عن الولوالجية و به نأخذ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام کے ناشائستہ و خلاف شرع افعال کے سبب اکثر مصلی اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے ناراض ہیں تو کیا ایسی حالت میں اسکی امامت درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جب امام میں فساد ہونے کے سبب مقتدی اس کی اقتداء سے ناراض ہیں تو امام کا ان مقتدیوں کو نماز پڑھانا شرعاً مکروہ تحریمی ہے۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الامامۃ میں ہے: (و لو امّ قوما و هم له كارهون) ان الكراهة (لفساد فيه او لأنهم احق بالامامة منه) كره له ذلك تحريما لحديث ابی داود " لا يقبل اللّٰه صلاة من تقدم قوماً و هم له كارهون "۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خطبۂ جمعہ میں امام دوسرے خطبہ کے وقت جو منبر سے ایک درجہ اتر کر پھر واپس ہوجاتا ہے شرعاً درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

بدعت شنیعہ ہے ۔ اس لئے قابل احتراز و اجتناب ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۵۰۶ کتاب الصلاۃ باب الجمعہ میں ہے : قال ابن حجر فی التحفۃ و بحث بعضھم ان ما اعتید الآن من النزول فی الخطبۃ الثانیۃ الی درجۃ سفلیٰ ثم العود بدعۃ قبیحۃ شنیعۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جمعہ کے دونوں خطبے نماز جمعہ سے طویل پڑھے جائیں یا کم؟

الجواب

نماز جمعہ سے کم پڑھے جائیں ۔ مراقی الفلاح کتاب الصلاۃ باب الجمعۃ میں ہے : و یسن تخفیف الخطبتین قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ طول الصلاۃ و قصرالخطبۃ من فقہ الرجل ۔ طحطاوی حاشیہ شرح مراقی الفلاح میں ہے : و فی الفتح و من الفقہ و السنۃ تقصیر الخطبۃ و تطویل الصلاۃ۔ خزانۃ الروایۃ باب الجمعۃ میں ہے : و فیہ (ای الکافی) ایضا قصر الخطبۃ مندوب الیہ قال علیہ السلام : من فقہ الرجل طول الصلاۃ و قصر الخطبۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خطبہ جمعہ و عیدین صدہا سال سے عربی میں پڑھا جاتا ہے ۔ خطبہ نصیحت ہے ۔ عام مسلمان عربی زبان نہیں سمجھتے بلکہ ان کی مادری زبان اردو ہے اس لئے وہ نصیحت سے مستفید جب ہی ہونگے کہ خطبہ بجائے عربی زبان کے اردو میں سنایا جائے یا عربی کے ساتھ اردو ترجمہ کردیا جائے ۔ کیا شریعت نبویؐ میں ایسے عمل کی اجازت ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتب معتبرہ حنفیہ جواب مرحمت ہو۔

الجواب

قرآن شریف کو بحالت نماز غیر زبان عربی میں پڑھنا ہمارے ائمہ ثلاثہ کے پاس در صورت عجز جائز رکھا گیا ہے ۔ اور جب پڑھنے والا عربی میں پڑھنے پر قادر ہو تو پھر غیر زبان میں پڑھنے کی اجازت نہیں ۔ اس مسئلے میں اگرچہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے صاحبین سے خلاف فرمایا ہے مگر تمام علماء احناف کے پاس صاحبین کے قول ہی پر فتویٰ ہے ۔ اور اصح روایات میں امام اعظم رحمہ اللہ کا بھی صاحبین کے قول کی

طرف رجوع کرنا ثابت ہے ۔ قرائۃ قرآن کے سوا خطبہ جمعہ و عیدین و تشہد و قنوت وغیرہ اذکار نماز میں بھی ہمارے ائمہ ثلاثہ کی یہی رائے ہے ۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : و شرطا عجزہ و علی ھذا الخلاف الخطبۃ و جمیع اذکار الصلاۃ ۔ اسی جگہ ہے : قید القراءۃ بالعجز لان الاصح رجوعہ الی قولھما و علیہ الفتوی ۔ رد المحتار میں ہے : و فی الھدایۃ و شرح المجمع و علیہ الاعتماد ۔ ہدایہ کی کتاب الصلاۃ باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : و یروی رجوعہ فی اصل المسئلۃ الی قولھما (و علیہ الاعتماد) و الخطبۃ و التشہد علی ھذا الخلاف ۔ اسی جگہ عنایۃ میں ہے : قولہ (و یروی رجوعہ) روی ابو بکر الرازی ان ابا حنیفۃ رجع الی قولھما (و علیہ الاعتماد) لتنزلہ منزلۃ الاجماع ۔ عالمگیریہ کتاب الصلاۃ باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : و علی ھذا الخلاف جمیع اذکار الصلاۃ من التشہد و القنوت و الدعاء و تسبیحات الرکوع و السجود ۔ و کذا کل ما لیس بعربیۃ کالترکیۃ و الزنجیۃ و الحبشیۃ و النبطیۃ ھکذا فی فتاوی قاضی خان ۔ فوائد اسمیہ جلد اول باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : و قولھما ھو المعول علیہ و علیہ عامۃ المحققین و بہ یفتی ۔ ملتقی الابحر فصل فی صفۃ الشروع میں ہے : و الیہ صح رجوع الامام و علیہ الفتوی قالہ العینی و غیرہ ۔ اسی جگہ ہے : و غیر الفارسیۃ من الالسن مثلھا ، ھو الصحیح ۔

خطبۂ اول کی ابتداء میں خداوندِ عالم کی شان کے موافق حمد و ثناء اس کے بعد کلمہ شہادت پھر درود شریف اور موعظہ حسنہ جس میں قرآن شریف کی کوئی آیت بھی ہو مسنون ہے ۔ اس کے بعد تین آیت کی مقدار بیٹھنا ، پھر خطبہ ثانیہ میں بھی حمد و ثناء و کلمہ شہادت پھر درود شریف کا اعادہ کرنا اور موعظہ حسنہ کی جگہ مؤمنین و مؤمنات کیلئے دعاء و استغفار کرنا مسنون ہے ۔ اور دعاء کے پہلے خلفاء راشدین اور عمین مکرمین حمزہ و عباس رضی اللہ عنہم کا ذکر مستحسن ہے ۔

ان تمام سنتوں کے باوجود دونوں خطبوں کو اس قدر مختصر پڑھنا مسنون ہے کہ قرآن شریف کے طوال مفصل سوروں سے کسی سورۃ کے برابر اور نماز جمعہ سے کم ہو ۔ خطبہ کو طویل پڑھنا اور مذکورہ سنتوں میں سے کسی سنت کو ترک کرنا مکروہ ہے ۔ مراقی الفلاح مصری باب الجمعۃ میں ہے : و یسن بداءتہ بحمد اللّٰہ و الثناء علیہ بما ھو اھلہ و الشہادتان و صلاۃ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم و العظۃ و التذکیر و قراءۃ آیۃ من القرآن و (سن خطبتان و الجلوس بین الخطبتین) جلسۃ خفیفۃ و ظاھر الروایۃ مقدار ثلاث آیات (و سن اعادۃ الحمد و الثناء و الصلاۃ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی ابتداء الخطبۃ الثانیۃ و ذکر الخلفاء الراشدین و العمین مستحسن بذلک جری التوارث (و سن الدعاء فیھا) ای الخطبۃ الثانیۃ (للمؤمنین و المؤمنات) مکان الوعظ (بالاستغفار لھم و یسن ان یسمع القوم الخطبۃ و یسن تخفیف الخطبتین) قال ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ طول الصلاۃ و قصر الخطبۃ من فقہ الرجل (بقدر سورۃ من طوال المفصل) کذا فی معراج الدرایۃ و لکن یراعی الحال بما ھو دون ذلک فانہ اذا جاء بذکر و ان قل یکون خطبۃ (و یکرہ التطویل) من غیر قید بزمن فی الشتاء لقصر الزمان و فی الصیف للضرر بالزحام و الحر (و

ترک شیء من السنن التي بینّاها)۔

نصاب الاحتساب کے باب سابع عاشر میں ہے: ذکر في شرح الکرخي قال ابو الحسن رحمه الله تعالی لا یطول الخطبة فانه صلی الله علیه و سلم امر بقصر الخطبة و قد قال الحسن عن ابي حنیفة رحمه الله تعالی یخطب خطبة خفیفة یفتتح بالحمد و یثني علیه و یتشهد و یصلي علی النبي صلی الله علیه و سلم و یعظ و یذکر و یقرأ سورة و یجلس جلسة خفیفة ثمّ یقوم فیخطب اخری یفتتح بالحمد لله و یثني علیه و یتشهد و یصلي علی النبي علیه السلام و یدعو للمؤمنین و المؤمنات و یکون قدر الخطبتین قدر سورة من الطوال المفصل۔ پس جبکہ خطبہ میں اس قدر سنتوں کا لحاظ ضروری ہے تو مسنون خطبہ عربی زبان میں پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ اردو میں کرنا طوالت و مضرت سامعین کے باعث مکروہ ہے۔ خصوصاً اردو اشعار میں خطبہ کا ترجمہ منبر پر پڑھا جانا نہایت نازیبا و قبیح ہے۔

نصاب الاحتساب کے باب الثالث و الستون میں ہے: في الحدیث "من اشراط الساعة ان تُوضَع الاَخیار و تُرفَع الاَشرار و ان تُقرأ المثناة علی رؤس الناس" و المثناة هي التي تسمی بالفارسیة دو بیتي۔ من الصحاح۔ و الفقه في منعه انه غناء و انه حرام في غیر المنبر فما ظنّک في موضع مستعد للوعظ و النصیحة۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سجدۂ تلاوت رکوع میں اداء ہوتا ہے یا نہیں؟ اور رکوع کے وقت اس کے لئے نیت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

آیت سجدہ اگر ختم سورہ میں ہے تو اس کو پڑھکر نماز کیلئے رکوع کرنا بہتر ہے۔ اگر سجدۂ تلاوت اداء کرکے کھڑا ہو جائے تو چاہئے کہ دوسری سورۃ کی کچھ آیات اس کے ساتھ ملا کر نماز کیلئے رکوع کرے۔ اگر آیت سجدہ سورۃ میں ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کی چند آیات کے بعد سورۃ ختم ہوتی ہے تو ایسی حالت میں مصلی کو اختیار ہے کہ آیت سجدہ ہی پر رکوع کرکے سجدے کو اسی میں اداء کردے یا سجدہ تلاوت کے بعد کھڑا ہوجائے اور باقی آیتیں پڑھکر رکوع کرے۔ مبسوط السرخسی جلد ثانی باب السجدۃ میں ہے: و ان کانت السجدة عند ختم السورة فان رکع لها فحسن و ان سجد لها ثمّ قام فلا بد ان یقرأ آیات من سورة اخری ثمّ یرکع۔ اسی صفحہ میں ہے: و اذا قرأها في صلاته و هو في آخر السورة الا آیات بقین بعدها فان شاء رکع و ان شاء سجد لها۔ عالمگیریہ باب السجدۃ میں ہے: ثمّ یقوم و یختم السورة و یرکع۔ رکوع میں سجدہ تلاوت اس وقت اداء ہوتا ہے جبکہ رکوع کے پہلے سجدہ کی بھی نیت کرلے۔ اگر بغیر نیت کے رکوع میں چلا جائے اور بحالت رکوع سجدہ کی نیت کرے تو اس سے سجدہ اداء نہیں ہوتا۔ عالمگیریہ

کے باب السجدۃ میں ہے : و لو قرأ آیۃ السجدۃ فی الصلاۃ فأراد ان یرکع بھا یحتاج الی النیۃ عند الرکوع فان لم توجد منہ النیۃ عند الرکوع لا یجزیہ عن السجدۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آیتِ سجدہ کی عبارت پڑھے بغیر اگر دیکھکر معنی سمجھے جائیں تو اس سے سجدہ لازم آتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

سجدۂ تلاوت ، آیت سجدہ کے حروف کو صحیح اور آواز سے پڑھے بغیر واجب نہیں ہوتا ۔ اگر ایسی خفیف آواز سے پڑھا کہ جس کو خود سنتا ہے یا کوئی دوسرا اگر اس کے منہ کے پاس کان رکھے تو وہ سن سکتا ہے تو اس سے سجدہ لازم آتا ہے ۔ بغیر آواز کے محض لب ہلانے سے سجدہ لازم نہیں آتا ۔ عالمگیریہ کے باب سجدہ تلاوۃ میں ہے : رجل قرأ آیۃ السجدۃ لا یلزمہ السجدۃ بتحریک الشفتین و انما تجب اذا صحح الحروف و حصل بہ صوت مسموع ھو او غیرہ اذا قرب اذنہ الی فمہ کذا فی فتاوی قاضی خان ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آیت سجدہ پڑھتے ہی فی الفور سجدہ کرنا ضروری ہے یا بعد میں بھی کرسکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

آیتِ سجدہ پڑھتے ہی فی الفور سجدہ کرنا لازم نہیں ہے ، تاخیر و توقف سے بھی اداء کرنا جائز ہے ۔ عالمگیریہ میں ہے : و فی الغیاثیۃ اداؤھا لیس علی الفور حتی لو اداً ھا فی ای وقت کان یکون مؤدیاً لا قاضیا کذا فی التاتارخانیۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گراموفون (ریڈیو ، ٹی۔وی۔) وغیرہ غیر ذی عقل و غیر ذی روح اشیاء سے اگر آیت سجدہ کی آواز سننے میں آئے تو کیا سامع پر سجدہ لازم آئے گا یا نہیں ؟

الجواب

گراموفون اور صدائے کوہ (بازگشت) یا پرندہ وغیرہ غیر ذی روح و غیر ذی عقل سے اگر آیت سجدہ

سن جائے تو سجدہ لازم نہیں آتا۔ خلاصہ کے باب السجدة میں ہے: و لا یجب اذا سمعها من طیر هو المختار۔ اسی جگہ میں ہے: و ان سمعها من الصدی لا یجب علیه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ تلاوت کرنے والے یا نماز پڑھنے والے کے قریب جب لوگ بیٹھے ہوں تو اس کو آیت سجدہ آہستہ پڑھنی چاہیے یا آواز سے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اگر لوگ با وضوء اور سجدہ کرنے کے قابل ہیں اور فی الحال ان کو سجدہ کرنا کوئی بار نہیں ہے تو ایسی حالت میں نماز پڑھنے والے یا تلاوت کرنے والے کے لئے آیت سجدہ آواز سے پڑھنا سزاوار ہے۔ اور اگر حاضرین بے وضوء ہیں اور یہ شخص جانتا ہے کہ آیت سجدہ سنکر یہ لوگ سجدہ نہیں کریں گے تو آہستہ پڑھنا چاہیے۔ فتاوی خلاصہ کے باب السجدة میں ہے: القاریٔ اذا کان عنده قوما ان کانوا متهیئین للسجود و یقع فی قلبه انه لا یشق علیهم اداء السجدة ینبغی ان یقرأ جهراً و ان کانوا محدثین و یظن انهم یسمعون و لا یسجدون ینبغی ان یقرأ فی نفسه سواء کان فی الصلاة او خارج الصلاة۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سنت مؤکدہ قبل الفرض و بعد الفرض کے درمیان بات کرنا یا کوئی وظیفہ پڑھنا یا کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟

۲۔ فرض کے بعد صف توڑکر سنت کے لئے جگہ بدلنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

"سنت قبلی" یعنی فرض کے پہلے کی سنت اور "سنت بعدی" یعنی فرض کے بعد کی سنت ان دونوں سنتوں کے اور فرض کے درمیان بات کرنا یا کھانا پینا یا کوئی اور فعل جو تحریمۂ صلاۃ کے منافی ہو کرنا۔ یا فرض و سنت بعدی کے درمیان سوائے مقدار "اللّٰهم انت السلام و منک السلام تبارکتَ یا ذا الجلال و الإکرام" کے کوئی وظیفہ یا درود پڑھنا سنت کے ثواب کو ناقص و کم کردیتا ہے۔ در مختار کتاب الصلاۃ باب الوتر و النوافل میں ہے: و لو تکلم بین السنة و الفرض لا یسقطها و لکن ینقص ثوابها و کذا کل عمل ینافی التحریمة علی الاصح۔ عالمگیریہ کی کتاب الصلاۃ باب النوافل میں ہے: و لو تکلم بعد الفریضة هل تسقط السنة قیل تسقط و قیل لا و لکن ینقص ثوابه قبل التکلم کذا فی النهایة۔ قنیہ کے باب السنن میں ہے: الکلام بعد الفرض لا یسقط السنة و لکن ینقص ثوابها و کل عمل ینافی التحریمة ایضا قال رضی اللہ عنه هو الاصح۔ رد المحتار کی کتاب الصلاۃ باب صفۃ الصلاۃ میں

ہے : قوله الا بقدر " اللهم انت السلام و منک السلام " لما رواه مسلم و الترمذی عن عائشة رضی الله عنها : کان رسول الله صلی الله علیه و سلم لا یقعد الا بقدر " اَللّٰهم انتَ السلامُ و مِنکَ السلام تبارکتَ یا ذا الجلالِ و الاِکرام "۔ و اما ما ورد من الاحادیث فی الاَذکار عقیب الصلاة فلا دلالة فیه علی الاتیان بها قبل السنة بل یحمل علی الاتیان بها بعدها لاَنّ السنة من لواحق الفریضة و توابعها و مکملاتها فلم تکن اجنبیة عنها فما یفعل بعدها یطلق علیه انه عقیب الفریضة ۔ و قول عائشة رضی الله عنها لا یفید انه کان یقول ذلک بعینه بل کان یقعد بمقدار ما یسعه و نحوه فلا ینافی ما فی الصحیحین من انه صلیٰ الله علیه و سلم یقول فی دبر کل صلاة مکتوبة " لا اِلٰه اِلا اللهُ وَحدَہٗ لا شریکَ لَہٗ ۔ الخ " کذا فی الفتح باب الوتر و النوافل ۔

۲ ۔ ادائے فرض کے بعد صف توڑنا مستحب ہے اور سنت دوسری جگہ پڑھنا بہتر ہے ۔ در مختار میں ہے : یستحب کسر الصفوف ۔ اور رد المحتار میں ہے : و نص فی المحیط علی انه سنة کما فی الحلیة ۔ اور عالمگیریہ کی کتاب الصلاۃ باب النوافل میں ہے : و اما السنن التی بعد الفرائض فیأتی بها فی المسجد فی مکان صلیٰ فیه فرضه و الأولی ان یتخطی خطوة ، و الامام یتأخر عن مکان صلیٰ فیه فرضه کذا فی الکافی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دعاء بین الخطبتین مستحب ہے یا جائز ؟ اور بحالت سجدہ پیر اٹھالینے سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اگرچیکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس خطیب کے خطبۂ جمعہ میں دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کے وقت کلام کرنا مباح ہے، مگر امام محمد رحمہ اللہ اس کو مکروہ فرماتے ہیں ۔ اس لئے جمعہ کی ساعت اجابت فوت نہونے کے لحاظ سے اگر بین الخطبتین دعاء مانگی جائے تو دل میں مانگنا چاہئے ۔ فتاوی برجندی کشوری کے صفحہ ۱۱۰ فصل الجمعۃ میں ہے : و قال ابو یوسف رحمه الله لا اری باسا بالکلام اذا قعد الامام بین الخطبتین و قال محمد رحمه الله اکره ذلک کذا فی الظهیریة ۔ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح کے باب الجمعۃ میں ہے : و اختلفا فی جلوسه اذا سکت فعند ابی یوسف رحمه الله یباح و عند محمد رحمه الله لا یباح ۔ اسی صفحہ میں ہے : و الدعاء المستجاب وقت الاقامة یحصل بالقلب لا باللسان ۔ حاشیہ طحطاوی میں ہے : قوله و الدعاء الخ ای یوم الجمعة او فی ساعة الجمعة المفسرة علی الصحیح بانها من خروج الامام الی فراغه من الصلاة ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۵۷۸ باب الجمعۃ میں ہے : قال فی معراج الدرایة فیسنّ الدعاء بقلبه لا بلسانه لأنه مأمور بالسکوت ۔

بحالت سجدہ دونوں پیر اٹھالے سے سجدہ جائز نہیں ہوتا ۔ فتاویٰ شرنبلالیہ کے صفحہ ۲۴۹ باب ارکان الصلاۃ

میں ہے : و فی مختصر الکرخی سجد و رفع اصابع رجلیه عن الارض لا یجوز کذا فی الخلاصة و البزازی وضع القدم بوضع اصابعه و ان وضع اصبعا واحداً و لا یکون وضعا الا بتوجیهها نحو القبلة لیتحقق السجود بها و الاخر و وضع ظاهر القدم سواه و هو غیر معتبر ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام سورہ جمعہ میں "ان کنتم تعلمون" کو "تعملون" دو دفعہ کہکر پھر اس کی صحت کرلے اور " و اذکروا اللہ کثیرا" کی جگہ "یذکرکم" دو تین دفعہ کہکر پھر اس کی صحت کرلے توکیا اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اعادہ کی ضرورت ہے؟ یا سجدۂ سہو لازم آتا ہے ؟

الجواب

نماز میں اگر کوئی شخص قرآن کے کسی لفظ یا کسی اعراب کو غلط پڑھکر پھر اس کی اصلاح کرلے تو اس سے نماز نہ فاسد ہوتی ہے نہ سجدۂ سہو لازم آتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الصلاۃ فصل زلۃ القاری میں ہے : ذکر فی الفوائد لو قرأ فی الصلاۃ بخطأ فاحش ثم رجع و قرأ صحیحاً قال عندی صلاته جائزة و کذلک الإعراب ، و لو قرأ النصب مکان الرفع و الرفع مکان النصب او الخفض مکان الرفع او النصب لا تفسد صلاته ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ تصور شیخ بحالت نماز شرعا درست ہے یا نہیں؟ اور اس تصور سے اگر کسی کو نماز کی حالت میں وجد و بےخودی اس درجہ لاحق ہو کہ کانپ کر گر پڑے یا آواز سے رودے توکیا نماز باقی رہیگی یا فاسد ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مصلی کو چاہئے کہ نماز میں خداوندِ عالَم کا تصور کرے اور دل کو تمام علائق دنیا سے خالی کرکے معبود حقیقی کی طرف اس طرح متوجہ کرے کہ گویا مصلی خداوند عالم کو دیکھ رہا ہے اور اس کے روبرو نہایت مؤدب کھڑا رہے ۔ اگر یہ تصور قائم نہیں ہو سکتا تو اس طرح تصور کرے کہ گویا خداوند عالم اس کو دیکھ رہا ہے اس لئے اس کی عبادت میں اس طرح کھڑا ہو جیسے شہنشاہ اعظم کے روبرو نہایت عجز و انکساری و ادب کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے ، اور تمام حرکات و سکنات میں اسی کا خیال رکھتا ہے ۔ حدیث احسان "اَن تعبدَ اللہَ کَاَنَّکَ تراہُ فَاِن لَم تکن تراہُ فَاِنَّہٗ یَراکَ" کی شرح میں عینی کی شرح بخاری جلد ا صفحہ ۲۲۵ میں ہے : قوله " کانک تراہُ فان لم تکن تراہُ فانه یراک" قال النووی هذا اصل عظیم من اصول الدین و قاعدة مهمة من قواعد المسلمین و عمدة الصدیقین و بغیة السالکین و کنز العارفین و

آداب الصالحین ۔ و تلخیص معناه ان تعبد اللّٰه عبادة من یری اللّٰه تعالی و یراه اللّٰه تعالی فانه لا یستبقی شیئا من الخضوع و الاخلاص و حفظ القلب و الجوارح و مراعاة الآداب ما دام فی عبادته ۔ و قوله " فان لم تکن تراه فانه یراک " یعنی انک انما تراعی الادب اذا رأیته و رآک لکونه یراک لا لکونک تراه ، و هذا المعنی موجود و ان لم تره لانه یراک ۔ و حاصله الحث علی کمال الاخلاص فی العبادة و نهایة المراقبة فیها ۔ فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۱ میں ہے : احسان العبادة الاخلاص فیها و الخشوع و فراغ البال حال التلبس بها و مراقبة المعبود و اشار فی الجواب الی حالتین ارفعهما ان یغلب علیه مشاهدة الحق بقلبه حتی کأنه یراه بعینه و هو قوله " کأنک تراه" ای و هو یراک و الثانیة ان یستحضر ان الحق مطلع علیه یری کل ما یعمل و هو قوله "فانه یراک" و هاتان الحالتان یثمرهما معرفة اللّٰه تعالی و خشیته ۔

پس صورت مسئولہ میں بحالت نماز خداوند عالم کے سوا کسی چیز کا تصور درست نہیں ۔ البتہ خارج از نماز اوراد و وظائف میں شیخ کا تصور کرنا مشائخ چشتیہ کے پاس رکن اعظم سمجھا گیا ہے ، چنانچہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالی محدث دہلوی "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" میں مشائخ چشتیہ کے اشغال و اذکار ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں : قالوا الرکن الاعظم ربط القلب بالشیخ علی وصف المحبة و التعظیم و ملاحظة صورته ۔ مگر مولانا نے ایسے موقعہ میں بھی توجہ الی اللہ ہی کو لازم و ضروری گردانا ہے ، چنانچہ اسی عبارت کے متصل فرماتے ہیں : قلت ان للّٰه تعالی مظاهرا کثیرةً (الی قوله) فلا علیک ان لا تتوجه الا الی اللّٰه و لا تربط قلبک الا به ۔

بے خودی و بے ہوشی اور پکار کر رونے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے ۔ در مختار کے مفسدات صلاۃ میں ہے : بقی من المفسدات ارتداد بقلبه و موته و جنون و اغماء ۔ اسی فصل میں ہے : (و الأنین و التاوه و البکاء بصوت) یحصل به حروف لوجع او مصیبة ۔ صورت مسئولہ میں تصور شیخ سے بے خود و بے ہوش ہو کر گر پڑنا یا آواز سے اس طرح رونا کہ اس میں کچھ الفاظ بھی زبان سے نکلیں شرعا مفسد نماز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمیٰ حسین بن عبد اللہ جامع مسجد تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد کا پیش امام ہے جس کے اعتقادات حسب ذیل ہیں ۔ اور شخص مذکور تعلقہ میں نائب قاضی بھی ہے ، تو اس شخص کے اسلام میں اہل سنت و جماعت کا کیا خیال ہے؟ اور کیا ایسے شخص کی امامت درست ہے یا نہیں؟ اور کیا اس کو ہماری مساجد و مجالس میں آنے دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا ایسے شخص سے سلام و کلام کے روابط رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور حاکم اسلام کو اس کی نسبت کیا کرنا چاہئے ؟ :

(۱) ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ۔ تقلید کرنا بدعت ہے ، بلکہ جو قول قوی ہو اس پر عمل کرنا چاہئے ۔

(۲) ندائے غیر اللہ جائز نہیں ۔ اس لئے " یا رسول اللہ " ، " یا محمد " کہنا کفر و شرک ہے ۔

(۳) توسل و استعانہ و استمداد بالکل ناجائز ہے ۔

(۴) مولود شریف پڑھنا بدعت اور ناجائز ہے کیونکہ ایک وقت میں مولود شریف مختلف مقامات میں ہوتا رہتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ آپ کی ایک روح (مبارک) ان مختلف مقامات میں آسکے ۔

(۵) اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو تین طلاق دے تو وہ اس کو پھر رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ بمنزلہ ایک طلاق کے ہے ۔ چنانچہ اسی کی بناء پر شخص مذکور نے بعض مسلمانوں کو اس قسم کا فتوی بھی دیدیا اور انہوں نے اپنی عورتوں کو تین طلاق دینے کے بعد واپس بھی کر لیا ۔

(۶) بزرگوں کے نام سے جو نیاز کی جاتی ہے اور کھانا پکایا جاتا ہے اس کے کھانے سے نجاست کھانا اچھا ہے

(۷) مسجد میں ایک طغرا لگا ہوا تھا جس میں یہ لکھا ہوا تھا ۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ، اللہ ، محمد ، علی ، فاطمہ ، حسن ، حسین ۔ شخص مذکور نے اس طغرے کو چاک کردیا اور یہ کہا کہ اللہ تعالی کے ناموں کے ساتھ اس کا رکھنا شرک ہے ۔

(۸) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے اور چلے گئے ۔ اب منجملہ مُردوں کے وہ بھی ایک مُردہ ہیں اور مردے اپنی قبر کا غلاف تک درست نہیں کر سکتے اور وہ اپنی ذات کو نفع نہیں پہنچا سکتے ہیں تو زندوں کو توسل سے کیا نفع پہنچا سکتے ہیں ؟

(۹) شخص مذکور اور اس کا مرشد مولوی عباس ولایتی کبھی کبھی دورہ کرتے ہوئے آکر مسلمانان تعلقہ مذکورہ کو اپنے اعتقادات کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں تم ہماری اتباع کرو ، اور توسل استمداد و تقلید ائمہ سے بچو کیونکہ یہ جائز نہیں ؟!

الجواب

جو لوگ ائمہ اربعہ کی تقلید کے منکر ہیں اور تقلید کو بدعت جانتے ہیں ، اور توسل و استغاثہ و استمداد بزرگان کو ناجائز و نذر و نیاز کے کھانے کو نجس مانتے ہیں ، اور نداء غیر اللہ مثلاً "یا رسول اللہ" و " یا محمد" کو شرک و کفر کہتے ہیں ایسے لوگ اہل سنت و جماعت سے خارج اور متبعین محمد بن عبد الوہاب نجدی ہیں ۔ اہل سنت ان کو "غیر مقلدین" و "وھابیہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں ، اور ان کا مذہب باطل ہونے کے سبب اہل سنت کے پاس نماز و غیر نماز میں ان کی اقتداء و اتباع درست نہیں ۔ پس اہل سنت کو چاہئے کہ ایسے اشخاص کو اپنی مساجد سے خارج اور آنے سے منع کریں اور ان کے ساتھ میل جول نہ کریں، کیونکہ ان کی ملاقات سے عقائد میں فرق آنے کا اندیشہ ہے ۔ تفسیر احمدی میں ہے : قد وقع الإجماع علیٰ أن الاتباع انما یجوز للأربع فلا یجوز الإتباع لمن حدث مجتهدا مخالفا لهم ۔ الاشباہ و النظائر میں ہے : و من خالف الائمة الاربعة مخالف للاجماع و قد صرح في التحرير ان الاجماع انعقد علی عدم العمل لمذهب مخالف الاربعة لانضباط مذاهبهم و كثرة اتباعهم ۔ در مختار مطبوعہ مجیدی کے صفحہ ۱۰۳ میں ہے : و يمنع منه و كذا كل مؤذ فلو بلسانه ۔ اسی صفحہ میں

ہے : بل و لأهل المحلة منع من ليس منهم عن الصلاة في المسجد ـ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک امام بعد فرض نماز کے اپنے تمام مقتدیوں کو مسجد میں ذکر " لا الٰہ الا اللہ " پکار کر کہنے کیلئے حکم کرتا ہے ، جس سے مسجد میں شور و غل رہتا ہے ۔ اور دوسرے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے ۔ کیا شرعا یہ فعل درست ہے یا نہیں ؟

(۲) داڑھی کس قدر لمبی رکھنے کا حکم ہے ؟

(۳) بچوں کو نماز کیلئے مسجد میں آنے کی اجازت ہے یا نہیں ؟

الجواب

مسجد میں اس طرح پکار کر ذکر کرنا کہ جس سے دوسرے نمازیوں کی نماز اور قراءت میں خلل آئے شرعا مکروہ ہے ۔ در مختار کتاب الصلاۃ باب ما یکرہ فی الصلاۃ میں ہے : و يكره رفع صوت بذكر ۔ اسی جگہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۴۳ میں ہے : اجمع العلماء سلفا و خلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد و غيرها الا ان يشوش جهرهم على نائم او مصلٍ او قارئٍ ۔ الخ ۔

(۲) داڑھی ایک مشت لمبی رکھنے کا حکم ہے اس سے زائد ہو جائے تو کترنے کی اجازت ہے ۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۶۹ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : (قوله و السنة فيها القبض) و هو ان يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه كذا ذكر محمد في كتاب الآثار عن الامام قال و به نأخذ ۔ (محيط) ۔

(۳) بچوں کو نماز سکھلانے کا چونکہ شریعت میں حکم ہے اس لئے اگر اوقات نماز میں سات برس سے زیادہ عمر کے بچے ہاتھ پیر دھوکر نماز کیلئے مسجد میں آئیں تو درست ہے ۔ خارج اوقات نماز بچوں کو روکنا چاہئے کیونکہ ان کی بےاحتیاطی و بےطہارتی سے فرش مسجد کے نجس ہونے کا اندیشہ ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۲۱ کتاب الحظر و الاباحۃ الباب الخامس میں ہے : و الرابع عشر ان ينزه عن النجاسات و الصبيان و المجانين و اقامة الحدود ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جماعت کے لحاظ سے اگر کوئی شخص سنت فجر ترک کردے تو اس کے بعد پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب

شیخین کے پاس سنت فجر کی تنہا قضاء نہیں ہے اور یہی قول قوی ہے ۔ ہدایہ کتاب الصلاۃ باب ادراک الفریضۃ میں ہے : و اذا فاتته ركعتا الفجر لا يقضيهما قبل طلوع الشمس و لا بعد ارتفاعها

عند ابی حنیفة و ابی یوسف رحمہما اللّٰہ و قال محمد رحمہ اللّٰہ احب ان یقضیہما الی وقت الزوال ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد میں میت کو غسل دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

مسجد کو نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے ۔ لہذا مسجد و صحن مسجد کی اس حد میں جہاں نماز ہوا کرتی ہے میت کو غسل دینا درست نہیں ہے ۔ البتہ احاطہ مسجد کے کسی کنارہ میں جہاں کسی وقت نماز نہیں ہوتی بلکہ محض نمازیوں کے حوائج ضروریہ رفع کرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے اگر میت کو غسل دیا جائے تو مضائقہ نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۲۱ کتاب الحظر و الاباحة الباب الخامس میں ہے : و الرابع عشر ان ینزہ عن النجاسات و الصبیان و المجانین و اقامة الحدود ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میت کو صندوق میں بند کرکے زمین میں اس خیال سے سونپا گیا تھا کہ چند ماہ بعد اس کو منتقل کرکے دوسرے مقام میں دفن کیا جائیگا ۔ پھر اس خیال سے درگذر کرکے اب یہ چاہتے ہیں کہ اسی مقام میں دفن کریں ۔ پس میت کو صندوق سے علیحدہ کرکے دفن کرنا چاہئے؟ یا صندوق کے ساتھ ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

چونکہ شریعت میں ضرورت کے وقت میت کو صندوق میں رکھکر دفن کرلے کی اجازت ہے ۔ اس لئے صورت مسئولہ میں صندوق کے ساتھ دفن کرنا مناسب ہے ۔ در مختار کی کتاب الجنائز میں ہے : (و لا بأس باتخاذ تابوت) و لو من حجر او حدید (لہ عند الحاجة) کرخاوة الارض ۔ منتہی الارب مصطفائی لاھور کی جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ میں ہے : (تابوت) صندوق ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسافر تین روز کے سفر میں دو شب راہ میں رہا اور تیسرے روز اپنے وطن میں یا جہاں جانا تھا پہنچا ۔ یا دو شب درمیان منزل میں گذریں اور تیسرے روز دوپہر کو جہاں کا ارادہ تھا وہاں پہنچا ۔ اس صورت میں نماز قصر پڑھے یا حضر ؟

کامل تین روز میں اور دو و نیم روز میں فرق ہے یا دونوں برابر ہیں ؟ حیدرآباد دکن میں کتنے کوس کی

مسافت میں مسافر پر قصر کا حکم دیا جاتا ہے ؟ تیس یا پچیس کوس کی مسافت ایسی ہے کہ وہاں انسان ریل پر دوپہر میں پہنچتا ہے اور اگر میانہ روی سے پیدل جائے تو دس کوس کی منزل کرتا ہوا تیسرے روز پہنچتا ہے ۔ کیا ایسی مسافت کیلئے بھی قصر ہے یا نہیں ؟

الجواب

شرع میں مسافر اس شخص کو کہتے ہیں جو تین دن کی مسافت طے کرنے کے ارادے سے اپنے مقام اقامت کی آبادی سے باہر ہو جائے ۔ ایسے شخص پر آبادی سے باہر ہوتے ہی قصر پڑھنا واجب ہے ۔ سفر میں قصر کرنے کیلئے محض تین دن چلنے کی مسافت کا لحاظ کیا گیا ہے ۔ یعنی وہ مسافت ایسی ہو کہ جس میں انسان پیدل یا اونٹ کی سواری پر عادت کے موافق آرام لیتے ہوئے متوسط چال سے صبح سے زوال تک چلتا ہے ۔ پس ایسے تین روز کی مسافت طے کرنے کے ارادے سے کوئی شخص آبادی سے باہر ہوجائے تو وہ شرعا مسافر ہے ۔ اب اس مسافت کو وہ جلدی سے دو دن میں یا کرامت سے ایک ساعت میں طے کرلے یا کسی عذر سے اس مسافت کے طے کرنے میں اس کو تین روز سے زیادہ صرف ہوجائیں اور پندرہ روز تک راستے میں کسی جگہ اقامت کرنے کا ارادہ بھی نہ کرلے تو ایسے شخص پر شرعا قصر کرنا لازم ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار باب المسافر جلد ۱ صفحہ ۵۴۸ میں ہے : (المسافر من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ قاصداً مسیرۃَ ثلاثۃِ ایام و لیالھا) و لا یشترط سفر کل یوم الیٰ اللیل بل الیٰ الزوال و لا اعتبار بالفراسخ علی المذھب (بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادۃ) حتی لو اسرع فوصل فی یومین قصر، و لو لموضع طریقان احدھما مدۃ السفر و الآخر اقل قصر فی الاول لا الثانی ۔ اور رد المحتار صفحہ ۵۵۰ میں ہے : (قولہ بالسیر الوسط) ای سیر الابل و مشی الاقدام و یعتبر فی الجبل بما یناسبہ من السیر لانہ یکون صعودا و ھبوطا و مضیقا و وعرا فیکون مشی الإبل و الأقدام فیہ دون سیرھما فی السھل ، و فی البحر یعتبر اعتدال الریح علی المفتیٰ بہ (امداد) فیعتبر فی کل ذلک السیر المعتاد فیہ و ذلک معلوم عند الناس فیرجع الیھم عند الاشتباہ (بدائع) و خرج سیر البقر بجر العجلۃ و نحوہ لانہ أبطأ السیر کما ان أسرعہ سیر الفرس و البرید (بحر)۔ اور اسی صفحہ میں رد المحتار میں ہے : (قولہ فوصل) ای الی مکان مسافۃ ثلاثۃ ایام بالسیر المعتاد (بحر) و ظاھرہ انہ کذلک لو وصل الیہ فی زمن یسیر بکرامۃ ۔ اور در مختار میں صفحہ ۵۵۱ میں ہے : (حتی یدخل موضع مقامہ او ینوی اقامۃ نصف شھر بموضع صالح لھا فیقصر ان نویٰ فی اقل منہ) ای من نصف شھر (و فیہ لکن فی) غیر صالح ۔ بناء بریں سفر میں قصر کیلئے عجلت سے ایک دو دن میں مسافت کے طے کرنے کا لحاظ نہیں ہے بلکہ اس مسافت کا حسب تصریح بالا تین دن میں اداء ہونے کے قابل ہونا ضروری ہے ۔ پس حیدرآباد دکن سے جو مقام کہ اس قدر فاصلے پر ہے جہاں اس طرح چلنے میں تین روز صرف ہوتے ہیں اس مقام کے ارادہ سفر میں مسافر پر قصر واجب ہے ، اور جو اس سے نزدیک ہے اس کے سفر کے لئے قصر نہیں ہے ۔

ریل کے سفر میں بھی یہی لحاظ ہے ، جس مقام تک مسافر حسب تصریح بالا رفتار سے تین روز میں پہنچتا ہے اگر وہاں ریل میں ایک گھنٹہ میں پہنچ جائے تو اس گھنٹہ میں جو رباعی نماز پڑھے اس کو قصر کرنا لازم ہے کیونکہ شرعا تیز رفتاری کا کوئی لحاظ نہیں ہے ، جیسا کہ تصریح سابق سے ثابت ہے ۔ مولوی محمد ایوب صاحب حنفی پشاوری نے بھی اسی استدلال پر عمل کیا ہے ، چنانچہ ان کے رسالہ " سفر القصر فی الریل " میں ہے ، فنقول لما ثبت ان المعتبر عندنا فی سفر القصر لیس الا مسافة ثلاثة ایام بالسیر الوسط و هو سیر الإبل و مشی الأقدام فی البر ظهر انه لا معتبر بسیر الریل الذی هو أعجل السیر فلا یکون میزانا لمسافة القصر فمن رکبه قاصدا سیر ثلاثة ایام بسیر الابل و مشی الاقدام قصر الرباعی وجوبا و افطر ان شاء اذا جاوز بیوت مصره و لا یضره قطع تلک المسافة فی اقل من ثلاثة ایام کما لا یخفی ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز تراویح میں امام نے سورہ فاتحہ کے بعد جو سورہ پڑھنے کا ارادہ کیا تھا اس کو بھولکر دوسری سورہ یعنی " لایلاف " صرف اتنا پڑھکر پھر بھولی ہوئی سورہ پڑھنا شروع کیا ۔ اس غلطی پر سجدۂ سہو کرنا لازم ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کسی سورۃ کی ایک دو آیت یا ایک دو لفظ پڑھکر پھر اس کو چھوڑدینا اور دوسری سورۃ شروع کرنا شرعا مکروہ ہے ، اس سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۹۰ میں ہے : افتتح سورة و قصد سورة اخریٰ فلما قرأ آية او آيتين اراد ان يترک السورة و يفتتح التی ارادها يکره ، و کذا لو قرأ أقلّ من آية و ان کان حرفا ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جماعت کھڑی ہوئی ہے ایک شخص بعد میں آیا اور صف پوری ہے اب یہ شخص اکیلا پیچھے رہ گیا ایسی حالت میں کیا یہ شخص صف کے داہنے یا بائیں بازو میں سے کسی کو اپنے ساتھ پیچھے لے سکتا ہے یا نہیں ؟ اگر نہیں لے سکتا ہے تو صف کے پیچھے اکیلے اس کی نماز ہوتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

صف پوری ہونے کی صورت میں پیچھے آنے والے کو چاہیئے کہ امام کے رکوع میں جانے کے قریب

تک انتظار کرے تاکہ کوئی اور مصلی اس کے بعد آجائے اور یہ دونوں پیچھے کھڑے ہوں ۔ اگر امام رکوع میں جانے کے قریب ہوجائے اور اس کو کوئی دوسرا مصلی نہ ملے تو چاہئے کہ صف میں سے ایسے شخص کو کھینچے جو اس مسئلہ سے واقف ہو ۔ اگر ایسا شخص صف میں نہیں ہے تو صف کے پیچھے امام کے برابر اکیلا کھڑا ہو جائے ۔ صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہونے سے حنفیوں کے پاس نماز صحیح ہوجاتی ہے ۔ رد المحتار کی جلد سوم صفحہ ۳۹۹ باب الامامۃ میں ہے : و ان وجد فی الصف فرجۃ سدھا و الا انتظر حتی یجیٔ آخر فیقفان خلفہ ، و ان لم یجیٔ حتیٰ رکع الامام یختار اَعلم الناس بھذہ المسئلۃ فیجذبہ و یقفان خلفہ ، و لو لم یجد عالما یقف خلف الصف بحذاء الامام للضرورۃ ، و لو وقف منفردا بغیر عذر تصح صلاتہ عندنا ۔ البحر الرائق مصری کی جلد ۱ صفحہ ۲۰۳ میں ہے : و فی القنیۃ و القیام وحدہ اولیٰ فی زماننا لغلبۃ الجھل علی العوام ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کہ میں ایک آنکھ والا شخص جس کی دوسری آنکھ میں موتیا بند ہے اور اس سے نظر نہیں آتا ہے امامت کرسکتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

شرع میں اندھے کی امامت اس وجہ سے مکروہ ہے کہ وہ اچھی طرح اپنے کو نجاست سے نہیں بچا سکتا ۔ رد المحتار کی جلد ۱ صفحہ ۳۹۳ باب الامامۃ میں ہے : و ھذا ذکرہ فی النھر بحثاً آخذا من تعلیل الأعمیٰ بانّہ لا یتوقی النجاسۃ ۔ بایں کراہت اگر اندھا موجودہ بینا اشخاص سے علم میں زیادہ ہے تو اس وقت امامت کیلئے وہی بہتر ہے ۔ چنانچہ اسی صفحہ میں در مختار میں ہے : (و فاسق و اعمیٰ) و نحوہ الأعشیٰ نھر (الا ان یکون) ای غیر الفاسق (اعلم القوم) فھو اولیٰ ۔ پس صورت مسئولہ میں ایک آنکھ والا شخص اگر اس کی باقی ماندہ آنکھ میں اچھی طرح بینائی ہے اور وہ اس کی وجہ سے اپنے کو بینا شخص کی طرح نجاست سے بچاتا ہے تو اس کی امامت شرعا بلا کراہت جائز ہے ۔ اور اگر باقی ماندہ آنکھ میں بھی کوئی قصور ہے تو پھر وہ اعشیٰ یعنی ضعیف البصر ہے جس کی امامت مکروہ ہے ۔ جیسا کہ عبارت سابقہ میں لفظ و نحوہ الأعشیٰ سے ثابت ہے ۔ بریں ہم کانا اگر دیگر موجودہ اشخاص سے علم دین و احکام نماز سے زیادہ واقف ہے تو پھر امامت کیلئے وہی سب سے بہتر ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سلطان لے جس شخص کو عیدین اور جمعہ اور پنجگانہ نماز

پڑھانے کیلئے حکم اور اجازت دی ہے اس کی بغیر اجازت کوئی دوسرا شخص ان نمازوں کو پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر پڑھایا تو نماز درست ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نماز عید اور نماز جمعہ کی شروط شرح میں ایک ہی ہیں، البتہ خطبہ عید میں نماز کے بعد مسنون ہے۔ در مختار جلد ۱ صفحہ ۵۰۹ میں ہے: تجب صلاتهما على من تجب عليه الجمعة بشرائطها سوى الخطبة فانها سنة بعدها۔ بناء بریں جمعہ اور عید کی نماز کیلئے سلطان وقت یا اس کا مقرر کیا ہوا خطیب یا خطیب کا نائب یعنی خطیب سے اجازت حاصل کیا ہوا امام ضروری ہے، اجنبی شخص جس کو کسی سے اجازت نہیں ہے ان نمازوں کو نہیں پڑھا سکتا، اور در صورت پڑھانے کے نماز صحیح نہیں ہوگی۔ مگر جبکہ سلطان یا خطیب یا اس کا نائب جس کو جمعہ و عید کی اجازت دی گئی ہے اس کی اقتداء کرلے تو پھر نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ فتاویٰ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۹۲ میں ہے: و حاصله انه لا تصح اقامتها الا من اذن له السلطان بواسطة او بدونها اما بدون ذلک فلا۔ اور اسی جگہ صفحہ ۵۹۳ میں در مختار میں ہے: و في السراجية لو صلىٰ احد بغير اذن الخطيب لايجوز الا اذا اقتدىٰ به من له ولاية الجمعة۔

نماز پنجگانہ کے لئے امام راتب یعنی مقرر کردہ امام کی غیر حاضری میں مصلیوں کو یہ اجازت ہے کہ کسی متقی شخص کو اپنا امام بنا کر نماز ادا کرلیں اور خصوصاً جبکہ نماز کا وقت تنگ ہو اس وقت امام راتب کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے بلا اجازت بھی اس اجنبی کے پیچھے ان کی نماز صحیح ہے۔ عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۰ میں ہے: ان الامام الراتب اذا غاب يستخلف غيره۔ اور امام راتب کی موجودگی میں اس کا امامت کرنا دوسرے شخص کی بہ نسبت بہتر ہے، مگر سلطان وقت یا قاضی (یعنی حاکم) امام راتب کے ہوتے امامت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۹۲ میں ہے: (و) اعلم ان (صاحب البيت) و مثله امام المسجد الراتب (اولىٰ بالامامة من غيره) مطلقا الا ان يكون سلطان او قاضي فيقدم عليه۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ کی جلد ۱ صفحہ ۸۳ میں ہے: دخل المسجد من هو اولىٰ بالامامة من امام المحلة فامام المحلة اولىٰ كذا في القنية۔ امام راتب کے ہوتے ہوئے بلا اجازت اس کے اجنبی شخص کا نماز پڑھانا بہتر نہیں ہے، اور اگر نماز پڑھادے تو شرعاً نماز میں کوئی فساد نہیں آتا جیسا کہ عبارت سابقہ میں لفظ "اولیٰ" سے ظاہر ہے۔

اگر اس وقت مصلیوں میں کوئی شخص امام راتب سے زیادہ مسائل صلاۃ جاننے والا علم و فضل یا قراءت و پرہیزگاری وغیرہ سب میں بہتر موجود ہو تو ایسی حالت میں امام راتب کو چاہیئے کہ اس شخص کو امامت کیلئے آگے بڑھائے اور خود پیچھے ہوجائے، کیونکہ شرعاً امامت کیلئے مسائل نماز کو زیادہ جاننے والا، اس کے بعد قاری، اس کے بعد متقی وغیرہ سب سے بہتر اور مستحق ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۳۹۱

میں ہے : (و الأحقّ بالإمامة) تقديما بل نصبا ، مجمع الانهر (الأعلم بأحكام الصلاة ثمّ الأحسن تلاوته) و تجويدا (للقراءة ثمّ الأورع) ۔

اور اسی طرح امام راجب اگر اپنے میں کوئی فساد رکھکر قوم کی امامت کرنا چاہے اور قوم اس سے ناراض ہو ، یا قوم میں کوئی شخص اس سے بہتر موجود ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنے کو امام بنانا چاہتا ہے تو ایسے وقت میں اس کی امامت شرعاً مکروہ تحریمی ہے ۔ چنانچہ در مختار میں اسی جگہ صفحہ ۳۹۲ میں ہے : (و لو أمّ قوماً و هم له كارهون ان) الكراهة (لفساد فيه او لأنهم أحقّ بالإمامة منه كره) له ذلك تحريما لحديث ابى داود "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما و هم له كارهون" و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سلطان نے جس کو عیدین اور جمعہ پڑھانے کیلئے حکم دیا ہے اگر اس کے بغیر اجازت کوئی دوسرا شخص پڑھائے تو جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جو شرائط جمعہ کی ہیں وہی عید کیلئے ہیں ، مگر عید میں خطبہ بعد نماز سنت ہے ۔ عالمگیریہ جلد اول صفحہ ۱۵۰ باب صلاۃ العیدین میں ہے : تجب صلاة العيد على كل من تجب عليه صلاة الجمعة كذا في النهاية و يشترط للعيد ما يشترط للجمعة الا الخطبة كذا في الخلاصة فانها سنة بعد الصلاة ۔ در مختار مطبوعہ کلکتہ کے صفحہ ۱۳۲ میں ہے : تجب صلاتها في الأصح على من تجب عليه الجمعة بشرائطها سوى الخطبة فانها سنة بعدها ۔ جمعہ صحیح ہونے کے شرائط میں سلطان کا ہونا بھی ہے ، سلطان چاہے عادل ہو یا جابر ۔ یا وہ شخص جس کو سلطان نے حکم دیا ہو جیسے امیر ، قاضی ، خطیب ، یا ان کا نائب ۔ عالمگیریہ طبع مصطفائی کی جلد اول صفحہ ۱۲۵ باب الجمعہ میں ہے : و منها السلطان عادلا كان او جائرا ، هكذا في التاتارخانية ناقلا عن النصاب ۔ او من امره السلطان و هو الامير او القاضي او الخطباء كذا في العيني شرح الهداية حتى لا تجوز اقامتها بغير امر السلطان و امر نائبه كذا في السرخسي ۔ رجل خطب يوم الجمعة بغير اذن الامام و الامام حاضر لا يجوز ذلك الا ان يكون الامام امره بذلك كذا في فتاوى قاضي خان ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر کوئی بدون اجازت خطیب کے نماز عیدین و جمعہ پڑھائے تو نماز درست نہیں ، مگر جبکہ وہ شخص جس کو اختیار اقامتِ جمعہ کا ہے اس کی اقتداء کرلے تو نماز ہوجاتی ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار مصری جلد اول صفحہ ۵۱۲ میں ہے : و حاصله انه لا تصح اقامتها الا لمن اذن له السلطان بواسطة او بدونها اما بدون ذلك فلا ۔ اور صفحہ ۵۱۳ میں در مختار میں

ہے : و فی السراجیۃ لو صلیٰ احد بغیر اذن الخطیب لا یجوز الا اذا اقتدیٰ بہ من لہ ولایۃ الجمعۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قصبۂ بلوارم رسالہ بازار میں ایک مسجد زیادہ وسیع و خوشنما ہے جو قدیم علماء کی رائے سے "جمعہ مسجد" قرار دی گئی ہے اور جس کی سند امور مذہبی سرکار نظام و رزیڈنسی میں موجود ہے ۔ رسالہ بازار کے تمام مسلمانوں کے اتفاق سے تخمیناً پندرہ بیس سال سے اس مسجد میں نماز جمعہ اداء کی جاتی ہے ۔ اس مسجد سے تخمیناً سو گز فاصلہ پر ایک دوسری مسجد ہے جو رسالے کے حدود میں حصار کے اندر واقع ہے اور اس مسجد میں رسالے والوں کے سوا کسی دوسرے کو آنے کی اجازت نہیں ، رسالے کی پولیس و پہرہ کا ہمیشہ یہاں انتظام و نگرانی رہتی ہے ، اور اس میں زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے ۔ حال میں رسالے کے چند مسلمانوں کا یہ ارادہ ہوا ہے کہ آئندہ سے رسالہ بازار کی جمعہ مسجد میں جمعہ نہ پڑھیں بلکہ نماز جمعہ حصار کے اندر والی چھوٹی مسجد میں پڑھا کریں ۔ اور چند مسلمان و قاضی رسالہ کی یہ رائے ہے کہ جب اس مسجد میں روک ٹوک ہے اور اذن عام نہیں ہے علاوہ بریں مسجد چھوٹی ہونے کی وجہ سے جماعت بھی قلیل ہوتی ہے اور رسالہ بازار کی جمعہ مسجد میں اذن عام کے سوا جماعت کثیر کا بھی ثواب حاصل ہے ، اس لئے جمعہ مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کریں ۔ ان دونوں فریقین سے کس کا ارادہ از روئے شرع صحیح و درست ہے ؟

(۲) بوجہ عدم صحتِ ادائِ جمعہ اگر چار رکعت احتیاطی پڑھی جائیں تو کیا گناہ ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورت صداقت مستفتی جمعہ کے صحیح ہونے کی شروط سے اذن عام بھی ہے ، اذن عام کے معنی یہ ہیں کہ نماز جمعہ اداء کرنے کے مقام میں عام مسلمانوں کو حاضر ہونے کی اجازت دیجائے اور کوئی روک ٹوک نہ ہو ، اور یہ شرط اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ جمعہ جماعتوں کے جمع ہونے کا نام ہے ، اور جب ممانعت ہو تو مسلمانوں کی جماعتوں کا آنا ممکن نہیں ۔ اور نماز جمعہ میں اذان اس واسطے شروع کی گئی ہے کہ اس نماز کی مسلمانوں کو اذان کے ذریعے سے شہرت دی جائے تاکہ ہر طرف سے اذان کی آواز سن کر جمع ہوں ۔ اور ممانعت کی صورت میں اذان کی غرضِ شرعی فوت ہوجاتی ہے ۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۶۹ میں ہے : (و) السابع (الاذن العام) ۔ رد محتار میں ہے : (قولہ الاذن العام) ای ان یأذن للناس اذنا عاما بأن لا یمنع احدا ممن تصح منہ الجمعۃ عن دخول الموضع

الذی تصلی فیه و هذا مراد من فسر الاذن العام بالاشتهار کذا فی البرجندی اسماعیل ، و انما کان هذا شرطا لان الله تعالی شرع النداء لصلاۃ الجمعة بقوله " فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ " و النداء الاشتهار و کذا تسمیٰ "جمعة" لاجتماع الجماعات فیها فاقتضیٰ ان تکون الجماعات کلها مأذونین بالحضور تحقیقا لمعنی الاسم ۔ بدائع ۔ اور عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۴۸ میں ہے : (و منها الاذن العام) و هو ان تفتح ابواب الجامع فیؤذن للناس کافة ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں حصار کے اندر والی مسجد میں چونکہ پہرے اور پولیس کے انتظام کی وجہ سے عام مسلمانوں کو نماز جمعہ کیلئے اندر جانے کی ممانعت ہے اس لئے وہاں نماز جمعہ صحیح نہیں ۔

(۲) نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد احتیاطاً ظہر پڑھنا ! اس مسئلہ کی بنیاد اس اختلاف پر ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ جو لوگ اس کو جائز نہیں رکھتے انہوں نے بعد جمعہ احتیاطاً چار رکعت کو آخر ظہر کی نیت سے ادا کرنے کو کہا ہے ۔ فی الحقیقت یہ نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنت ، بلکہ بعض متاخرین نے اس کی ایجاد کی ہے ۔ مذهب صحیح و مختار و مفتیٰ بہ یہ ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ پڑھنا مطلقا جائز ہے ۔ فتح المعین مصری جلد ۱ صفحہ ۳۱۳ میں ہے : سئل السید الحموی عن الاربع رکعات التی بعد صلاۃ الجمعة و تسمی آخر الظهر عندهم اذا اختلت بعض شروط الجمعة هل هی فرض او واجبة او مستحبة او لیست واحدة منها ، و ما کیفیة نیة الظهر علی القول بها ؟ فاجاب بأنها لیست فرضا و لا واجبة و لا سنة بل و لا اصل لها فی المذهب و انما وضعها بعض المتأخرین عند الشک فی صحة الجمعة بسبب روایة عدم جواز تعددها فی مصر واحد فقال یندب ان یصلی بعد صلاۃ الجمعة اربع رکعات ینوی بها " آخر الظهر ادرکت وقته و لم اصله ۔ و غیر خاف ان الندب هنا بالمعنیٰ اللغوی و هو الطلب لا الندب بالمعنیٰ المصطلح علیه عند الفقهاء و هو ما فعله النبی علیه السلام مرة و ترکه اخریٰ او کان مرغبا فیه من جهة الشارع ۔ و لیست هذه الروایة التی بنی علیها کلامه بالمختارة بل المختار جواز تعددها فی مواضع کثیرة کما فی الزیلعی ۔ البحر الرائق مصری جلد ۲ صفحہ ۱۵۴ میں ہے : و ذکر الامام السرخسی ان الصحیح من مذهب ابی حنیفة جواز اقامتها فی مصر واحد فی مسجدین و اکثر و به نأخذ لإطلاق "لا جمعة الا فی مصر" شرط المصر فقط ۔ و فی فتح القدیر الأصح الجواز مطلقا خصوصا اذا کان مصرا کبیرا کمصر فان فی الزام اتحاد الموضع حرجاً بیّناً لاستدعاء تطویل المسافة علی الاکثر ۔ و ذکر فی باب الامامة ان الفتویٰ علی جواز التعدد مطلقا ۔ بناء بریں جمعہ کے بعد عدم جواز تعدد جمعہ کا لحاظ کرتے ہوئے احتیاطاً ظہر پڑھنا ٹھیک نہیں ہے ، بلکہ اس میں عام لوگوں کو فساد و اشتباہ میں ڈالنا ہے کیونکہ عام لوگ ایسے موقعہ میں جمعہ کو فرض ہی نہیں سمجھیں گے اور جمعہ ترک کرکے گھر میں صرف ظہر پڑھکر بیٹھ

جائیں گے ۔ بلکہ اس لحاظ سے تو ایسی ظہر کے ترک کرنے ہی میں احتیاط ہے ۔ البحر الرائق کے اسی صفحہ میں ہے : مبنی کله علی القول الضعیف المخالف للمذهب فلیس الاحتیاط فی فعلها لأنه العمل بأقوی الدلیلین و قد علمت ان مقتضی الدلیل هو الاطلاق ۔ اس کے بعد والے صفحہ میں ہے : مع ما لزم من فعلها فی زماننا من المفسدة العظیمة و هو اعتقاد الجهلة ان الجمعة لیست بفرض فیتکاسلون عن اداء الجمعة فکان الاحتیاط فی ترکها و علی تقدیر فعلها ممن لا یخاف علیه مفسدة فیها فالأولی ان تکون فی بیته خفیة خوفا من مفسدة فعلها ۔

مگر صورت مسئولہ میں اگر حصار والی رسالہ کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھی گئی ہے اور اس کے بعد احتیاطا ظہر پڑھی گئی ہے تو یہ فعل مناسب ہوا ، کیونکہ اس مسجد میں اذن عام نہ ہونے کی وجہ سے جمعہ صحیح نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد میں متعدد اشخاص بغرض ادائی نماز جمع ہیں جن میں اکثر لا علم ہیں اور بعض صاحب علم بھی ہیں ، ان میں ایک شخص صاحب علم و پابند صوم صلاۃ ہے لیکن اس کو تقاطر بول کی شکایت ہے جو دس پانچ منٹ کے وقفہ سے ہوا کرتا ہے ۔ امامت کے لئے ہر شخص کو انکار ہے ، کل اشخاص اسی شکایت والے شخص کی اقتداء کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر وہ امامت نہ کرے تو نماز بغیر جماعت کے فردا فردا ہوتی ہے اور ہر شخص جماعت کے ثواب سے محروم ہوجاتا ہے ۔ پس ایسی صورت میں کیا اس شخص کی امامت شرعا جائز ہوگی یا نہیں ؟ جمعہ کی نماز کا بھی یہی حال ہے ؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی ، طاہر یعنی پاک و تندرست شخص کی نماز بیماری والے معذور کے پیچھے فاسد ہے ۔ کنز الدقائق مجتبائی کے صفحہ ۲۷ باب الامامۃ میں ہے : و فسد اقتداء طاهر بمعذور ۔ اسی طرح تندرست آدمی کا سلسل البول والے کی اقتداء کرنا ناجائز ہے ۔ قدوری مجتبائی صفحہ ۱۹ کتاب الجماعۃ میں ہے : و لا یصلی طاهر خلف من به سلسل البول و الرعاف الدائم ۔ پس صورت مسئولہ میں تندرست اشخاص کا تقاطر بول والے کی اقتداء کرنا درست نہیں ہے ، اگر اقتداء کی جائے تو نماز فاسد ہوجاتی ہے جس کا اعادہ واجب ہے ۔ اس مسجد کے مصلیوں کو چاہیئے کہ حاضرین میں سے کسی تندرست اور سب میں بہتر شخص کو امام بنائیں ۔ مسجد میں جمع ہو جانے کے بعد اگر فردا فردا نماز ادا کی جائے گی تو ترک جماعت کی وجہ سے ہر ایک گنہگار ہوگا ۔

جمعہ کی نماز سرکار کی جانب سے مقرر کئے ہوئے یا سرکاری امام سے اجازت پائے ہوئے شخص کے پیچھے صحیح ہوتی ہے ، بلا اجازت امام سرکاری کے کوئی اجنبی شخص جمعہ نہیں پڑھاسکتا ۔ تقاطر بول والا شخص اگر سرکاری امام ہے تو درخواست دے کر اس کو بدل دینا چاہئے ۔ اگر شخص اجنبی ہے تو مصلیوں کو چاہئے کہ اجازت یافتہ امام کے پیچھے جمعہ اداء کریں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کے متصل عاشورخانہ ہے جس میں تعزیہ و علم استادہ کئے جاتے ہیں ، جس کا الاوہ صحن مسجد میں کھدا ہوا ہے ۔ ایام محرم میں علم کی نقل و حرکت میں جس قدر ازدحام و شور ہوتا ہے اور باجے بجائے جاتے ہیں ، یہ سب صحن مسجد میں ہوتا ہے جس سے مسجد کی بےحرمتی ہوتی ہے اور بوقت صلوٰۃ مصلیوں کیلئے خلل انداز ہے ۔ پس از روئے شرع شریف عاشور خانہ احاطہ مسجد سے منتقل کرنے کے قابل ہے یا نہیں ؟ اور منتقل کیا جائے تو کتنے فاصلہ پر رکھا جائے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورت صداقت مستفتی مسجد کی متصل زمین جس کو " فناء مسجد " کہا جاتا ہے مسجد کے تابع ہے ، اس زمین میں خلاف شرع افعال کا ارتکاب باعث بےحرمتی مسجد ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۲۹۳ کتاب الوقف میں ہے : قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فی فنائه لأن المسجد اذا جعل حانوتا و مسکنا تسقط حرمته و هذا لا یجوز ۔ و الفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۹۱ احکام المساجد میں ہے : (قوله کفناء مسجد) هو المکان المتصل به لیس بینه و بین المسجد طریق ۔ اور مسجد میں ہر ایک فعل جو کہ مصلیوں کو ایذاء و تکلیف دیتا ہو شرعا ممنوع ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۴۹۳ میں ہے : و کذا کل موذ و لو بلسانه ۔ بناء بریں مسجد کے متصل عاشورخانہ رکھنا جس کی وجہ سے صحن مسجد میں (جو فناء مسجد ہونے کی وجہ سے مسجد کے تابع ہے) ایام محرم میں شور و غوغا ہوتا ہے باعث بےحرمتی مسجد و ایذاء مصلیان ہے جو شرعاً درست نہیں ۔ بہتر یہ ہے کہ عاشور خانہ مسجد سے اس قدر فاصلہ پر رکھا جائے کہ اس کا شور و غوغا مسجد تک نہ پہنچے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب پر نماز جہری میں تسمیہ بالجہر و سورہ فاتحہ مع ضم سورہ قراءۃ کرنا چاہئے یا نہیں ؟ اگر کوئی حنفی المذہب تسمیہ بالجہر

پڑھتا ہو تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں ؟ اور وہ شخص امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے موافق سمجھا جائیگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

بر بنائے مذہب حنفی نماز میں چاہے جہری ہو یا سری سراً یعنی آہستہ بسم اللہ پڑھنا سنت ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۳۲ کتاب الصلاۃ میں ہے ؛ (و سننها رفع اليدين للتحريمة و نشر الأصابع و ان لا يطأطأ رأسه عند التكبير و جهر الامام بالتكبير و الثناء و التعوذ و التسمية و التأمين) و كونهن (سرا) ۔ رد محتار میں ہے ؛ ان الاسرار بها سنة اخرى ۔ اور جان بوجھ کر سنت کو ترک کرنے سے نماز میں کوئی فساد یا سہو لازم نہیں آتا مگر شرعاً یہ فعل قبیح اور کرنے والا چھوٹے گناہ کا مرتکب ضرور ہے ، اس لئے عمداً بسم اللہ جہر سے پڑھی جائے یا بھولے سے مصلی کیلئے نماز کا اعادہ کرلینا مستحب ہے ۔ اسی جگہ در مختار میں ہے ؛ ترك السنة لا يوجب فسادا و لا سهوا بل اساءة لو عامدا غير مستخف ۔ رد محتار میں ہے ؛ صرح ابن نجيم في شرح المنار بأن الإساءة أفحش من الكراهة ۔ في النهر عن الكشف الكبير معزيا الى اصول ابي البشر حكم السنة ان يندب الى تحصيلها و يلام على تركها مع لحوق اثم يسير ۔ (قوله لو عامدا غير مستخف) فلو غير عامد فلا إساءة ايضا بل تندب اعادة الصلاة ۔ پس صورت مسئولہ میں حنفیوں کے پاس سورہ فاتحہ کے ساتھ دوسرا سورہ ضم کرنا ضروری ہے ، مگر بسم اللہ پکار کر پڑھنا سنت نہیں ہے ، بلکہ آہستہ پڑھنا سنت ہے ۔ اور جو عمداً پکار کر پڑھے یا بھولے سے تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ نماز کا اعادہ کرلے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مشرک مسجد کے سائبان یا دروازہ وغیرہ کی تعمیر کرنے کیلئے یا جانماز یا بوریا بدلنے کیلئے کچھ روپیہ دے ، تو اس روپیہ سے مسجد کے ایسے کام کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟ اور اگر اس روپیہ سے تعمیر ہوجائے تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

مال خبیث و غیر طیب سے ، یا اس مال سے جو کہ جائز و ناجائز طریقوں سے بالاشتراک حاصل ہوا ہے مسجد بنانا یا اس کی تعمیر کرنا شرعاً مکروہ تحریمی ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے ؛ قال تاج الشريعة اما لو انفق في ذلك مالاً خبيثا و مالا سببه الخبث و الطيب فيكره لأن الله تعالىٰ لا يقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بما لا يقبله ۔ خزانة الرواية قلمی کے صفحہ ۲۰ میں ہے ؛ كل

مسجد بنی مباھاۃً او ریاءً او سمعۃً او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللّٰہ او من مال غیر طیب فھو لاحقٌ بمسجد الضرار۔ چونکہ مشرکین کی اکثر آمدنی سود یا سود کی آمیزش سے ہوا کرتی ہے اس لئے ان کے روپے سے مسجد کی تعمیر کرنا شرعا درست نہیں۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۴۰۳ میں تحت آیت " مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ " کی تفسیر میں ہے: فان اراد الکفر ان یبنی مساجد او یعمرھا یمنع منہ و ھو المفھوم من النص و ان لم یدل علیہ روایۃ۔

اسی طرح اگر کوئی مشرک اپنے مکان کو مسجد بنادے یا اپنی جانب سے کسی جائداد کو وقف کرکے وصیت کرے تو یہ وقف شرعا باطل ہے کیونکہ مشرکین کو ان کے مذہب کی رو سے ایسے کاموں سے اللہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اسعاف کے صفحہ ۱۱۹ میں ہے: و کذا لو جعل دارہ مسجدا للمسلمین او اوصیٰ ان یحج عنہ یکون الوقف باطلا لکونہ لیس مما یتقرب بہ اھل الذمۃ الیٰ اللّٰہ تعالیٰ۔

البتہ اگر کوئی مشرک مسلمانوں کی کسی خاص جماعت کیلئے اپنے گھر کو یا کسی خاص شخص کو حج کرنے کیلئے روپیہ دے تو چونکہ اس نے خاص شخص یا اشخاص کیلئے وقف کیا ہے اس لئے جائز ہے۔ اسعاف کے اسی صفحہ میں ہے: و لو اوصی الذمی لن تبنی دارہ مسجدا لقوم باعیانھم و کذلک یصح الایصاء بمال للرجل بعینہ لیحج بہ لکونہ وصیۃ لمعین ثم ان شاء حج بذلک و ان شاء ترک۔

بناء بریں صورت مسئول میں مشرک کے روپے سے مسجد کا سائبان یا دروازہ وغیرہ تعمیر کرنا یا مسجد کیلئے جانماز و بوریا خریدنا شرعاً ناجائز ہے۔ اگر مشرک قبل تعمیر اس روپے کو کسی مسلمان کو ہبہ کردے اور وہ مسلمان بطور خود اس رقم سے مسجد کی ضروریات کی تکمیل کرے تو شرعا جائز ہے۔ اور بعد تعمیر مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کے روپے سے بنائے ہوئے سائبان وغیرہ کو اس مشرک سے کہکر کسی مسلمان کے لئے ہبہ کروالیں اور وہ مسلمان ہبہ و قبضہ ہوجانے کے بعد اس کو مسجد کیلئے وقف کردے تو ایسی حالت میں یہ تمام چیزیں مسجد کی ہیں اور نماز بھی درست ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص صاحب ترتیب نہو، تو صاحب ترتیب ہونے کیلئے کیا کرنا چاہیے؟ اور اگر کسی کو یاد نہو کہ کس قدر نمازیں اس کی فوت ہوئی ہیں، تو ان کی قضا کس طرح کی جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اگر کسی شخص کی چھ (۶) نمازیں فوت ہوجائیں تو شرعاً صاحب ترتیب نہیں رہتا، اور جس کی چھ (۶)

سے کم نمازیں فوت ہوئی ہیں وہ صاحب ترتیب ہے ۔ جس کی نمازیں چھ یا چھ سے زیادہ فوت ہو گئی ہیں اس کو صاحب ترتیب ہونے کیلئے پوری نمازیں قضاء کرنا ہوگا ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ باب قضاء الفوائت میں ہے : و یسقط الترتیب عند کثرۃ الفوائت و ھو الصحیح ھکذا فی محیط السرخسی ، و حد الکثرۃ ان تصیر الفوائت ستا بخروج وقت السادسۃ و عن محمد رحمہ اللہ تعالی انہ اعتبر دخول الوقت و الاول ھو الصحیح کذا فی الھدایۃ ۔ شرح وقایہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۸ میں ہے : فرض الترتیب بین الفروض الخمسۃ و الوتر الا اذا ضاق الوقت او نسیت او فاتت ستۃ حدیثۃ کانت او قدیمۃ ۔ اور صفحہ ۲۱۹ میں ہے : فانہ لما قضی صلوات الشھر الا فرضا او فرضین قلت الفوائت بعد الکثرۃ من یعود الترتیب الا ان یقضی الکل و عند بعض المشایخ ان قلت بعد الکثرۃ یعود الترتیب و اختار الامام السرخسی الاول و قال صاحب المحیط و علیہ الفتوی ۔

جس شخص کی نمازیں اس قدر قضاء ہو گئی ہیں کہ اس کو ان کی تعداد یاد نہیں ہے ، تو اس کو چاہئے کہ اپنی قضاء نمازوں کا تخمینہ کرلے ، اور بعد تخمین اس پر اپنی طرف سے احتیاطاً اس قدر نمازیں اضافہ کرے جس سے اس کو یہ یقین ہوجائے کہ اس قدر نمازیں قضاء کرلے کے بعد پھر کوئی نماز میرے ذمہ باقی نہیں رہیگی ۔ ایسی حالت میں اس کی جملہ قضاء نمازیں اداء ہوجانے کے بعد جو فاضل رہیں گی وہ اس کی جانب سے نفل ہوجائیں گی اور کسی فرض کا مؤاخذہ اس سے نہیں ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اکثر لوگ موسم گرما میں صحن مسجد میں فرض نماز اداء کرتے ہیں ، بعض علماء کہتے ہیں کہ منبر و محراب یعنی اصل مصلیٰ سے علیحدہ نماز پڑھنے سے نماز کی افضلیت فوت ہوجاتی ہے ۔ اور بعض کا قول ہے کہ مسجد کا صحن داخل مسجد ہے اس لئے دونوں برابر ہیں ۔ یہ بات ظاہر ہے کہ نماز خواہ داخل مسجد ہو یا خارج مسجد سب جگہ اداء ہوجاتی ہے ، مگر جبکہ مسجد و مصلیٰ بنا کر منبر و محراب قائم کیا گیا ہے تو اس سے ضرور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصل مصلے پر نماز پڑھنے میں فضیلت ہے ۔ لہذا گزارش ہے کہ بعد تحقیق اس کا مدلل و شافی جواب سرفراز ہو ۔ بینوا توجروا ۔

الجواب

مساجد میں منبر تو خطیب کے خطبہ پڑھنے کیلئے قائم کئے گئے ہیں ، تا کہ مرتفع مقام پر کھڑے ہونے سے اس کی آواز دور دور تک جائے اور تمام حاضرین کو خطبہ سنائی دے ۔ وسط مسجد میں محراب قائم کرنے کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ امام صف کے وسط میں قیام کرے ، کیونکہ امام کا صف کے کسی ایک جانب میں کھڑا ہونا اور برابر وسط میں نہ ہونا خلاف سنت اور مکروہ ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۴۹۹ میں ہے : قال فی

المعراج و فی مبسوط بکر السنۃ ان یقوم فی المحراب یعتدل الطرفان و لو قام فی احد جانبی الصف یکرہ ۔ اور اسی صفحہ میں ہے : السنۃ ان یقوم الامام ازاء وسط الصف الا تری ان المحاریب ما نصبت الا وسط المساجد و ھی قد عینت لمقام الامام ۔ امام کا محراب میں یا اس کے مقابل کھڑا ہونا اسی وقت ضروری سمجھا گیا ہے جبکہ جماعت کثیر ہو اور امام کے محراب میں کھڑے نہ ہونے سے امام کے وسط میں نہ ہونے کا اندیشہ و شبہ ہوتا ہو ۔ اور اگر یہ اندیشہ نہیں ہے تو امام محراب کے سوا ہر جگہ وسطِ صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھا سکتا ہے ۔ چنانچہ رد محتار کے اسی صفحہ میں ہے : و الظاہر ان ھذا فی الامام الراتب لجماعۃ کثیرۃ لئلا یلزم عدم قیامہ فی الوسط ۔ فلو لم یلزم ذلک لا یکرہ ۔

مگر یہ امر بھی ضروری اور قابل لحاظ ہے کہ امام مسجد کے دو ستونوں کے درمیان یا کسی گوشے یا کنارے میں یا کسی ستون کے متصل نہ کھڑا ہو بلکہ وسط میں ایسی جگہ کھڑا ہو کہ اس کے پیچھے مصلیوں کی صف دونوں جانب برابر آسکے ۔ رد محتار میں اسی صفحہ میں ہے : و الاصح ما روی عن ابی حنیفۃ انہ قال اکرہ ان یقوم بین الساریتین او فی زاویۃ او فی ناحیۃ او الی ساریۃ لانہ خلاف عمل الامۃ قال علیہ الصلاۃ و السلام " توسطوا الامامَ و سدّوا الخلل " ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں جبکہ صحن مسجد داخل مسجد ہے اور امام کا محراب میں کھڑے ہونا محض وسط صف میں ہونے کیلئے لازمی ہے ۔ تو ایسی حالت میں اگر مصلیان مسجد موسم گرما میں بغرض راحت و حضور قلب امام کو محراب کے مقابل مسجد کے ستون سے علیحدہ کھڑا کرکے نماز پڑھا کریں تو اس میں زوال فضیلت کا اندیشہ نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ شرائط جمعہ منصوص ہیں یا غیر منصوص ؟ اگر منصوص ہیں تو جملہ شرائط آج موجود ہیں یا مفقود ؟ اور اگر یہ شرائط اجتہادی ہیں تو ان کا تقرر کس مصلحت اور غرض سے ہوا ہے ؟ اور ان شرائط کا ماخذ اصول شرع سے کونسی اصل ہے ؟ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم نے کن شروط سے جمعہ اداء فرمایا تھا ؟ احناف جن شروط کو مانتے ہیں وہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے اجتہادی ہیں ۔ ان کے اجتہاد سے پہلے جن مسلمانوں نے نماز جمعہ اداء کی ہے ان کا جمعہ صحیح تھا یا نہیں ؟

(۲) اگر بکر خالد کو صرف جمعہ نہ پڑھنے کے سبب قرابت داروں سے علیحدہ کردے اور سلام و کلام و دعوت و تہنیت و تعزیت کی شرکت سے باز رکھے اور اس کے ہاتھ کا پانی نہ پئے تو بکر کیلئے کیا حکم ہے ؟

الجواب

حنفی مذہب میں جمعہ واجب ہونے کی شرائط مصلی کے لئے تو : حر یعنی آزاد ہونا ، مرد ہونا ، مقیم ہونا ، تندرست ہونا ، پیر اور آنکھ کا صحیح و سالم رہنا ہے ۔ اس کے علاوہ دوسری شروط : شہر ، جماعت ، خطبہ ، سلطان ، وقت ، اذن عام ہیں ۔ فتح القدیر مصری جلد ۲ صفحہ ۲۲ باب صلاۃ الجمعہ میں ہے : و لوجوبھا شرائط فی المصلی الحریۃ و الذکورۃ و الاقامۃ و الصحۃ و سلامۃ الرجلین و العینین ،

و شرائط فی غیرہ المصر و الجماعۃ و الخطبۃ و السلطان و الوقت و الاذن العام ۔ مصلی کی شروط کا ماخذ حدیث ابو داود ہے جو طارق ابن شہاب سے مروی ہے ۔ فتح القدیر کی جلد ۲ صفحہ ۲۱ میں ہے : قال صلی اللّٰہ علیہ و سلم " الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا اربعۃ مملوک او امرأۃ او صبی او مریض " رواہ ابو داود عن طارق بن شہاب ۔ اس حدیث سے غلام اور عورت اور بچے اور بیمار پر جمعہ کا واجب نہ ہونا ثابت ہے ۔ اور مسافر کیلئے دوسری حدیث بیہقی کی تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے : و اخرج البیہقی من طریق البخاری عن تمیم الداری عنہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال " الجمعۃ واجبۃ الا علیٰ صبی او مملوک او مسافر" رواہ الطبرانی عن الحکم بن عمرویہ و زاد فیہ المراۃ و المریض ۔ مسافر اور مریض پر قیاس کرکے اندھا اور لنگڑا دفع حرج و تکلیف کے لحاظ سے وجوب جمعہ سے خارج کردیا گیا ۔ اور وجوب جمعہ کیلئے سلامت رِجلین و عینین کی شرط لگائی گئی ۔

ہدایہ اولین مصطفائی کے صفحہ ۱۴۹ باب صلاۃ الجمعہ میں ہے : فعذروا دفعا للحرج و الضرر ۔

جمعہ کیلئے مصر (شہر) کی جو شرط لگائی گئی ہے اس کا ماخذ حدیث علی رضی اللہ عنہ ہے جو ابن ابی شیبہ سے مروی ہے ۔ فتح القدیر کی جلد ۲ صفحہ ۲۲ باب الجمعہ میں ہے : رواہ ابن ابی شیبۃ موقوفا علیٰ علیّ رضی اللّٰہ عنہ " لا جمعۃ و لا تشریق و لا صلاۃ و لا فطر و لا اضحیٰ الا فی مصر جامع او فی مدینۃ عظیمۃ " صححہ ابن حزم ۔ ہدایہ کے باب جمعہ میں ہے : لقولہ علیہ السلام " لا جمعۃ و لا تشریق و لا فطر و لا اضحیٰ الا فی مصر جامع " ۔

جماعت کی شرط اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ جمعہ جماعت سے مشتق ہے ۔ تنہا پڑھنے پر جمعہ صادق نہیں آتا ۔ اور آیت قرآنی میں " فاسعوا " جمع کا صیغہ ہے جس سے جماعت کے ساتھ ادا کرنا ثابت ہوتا ہے ۔ ہدایہ میں ہے : و من شرائطہا الجماعۃ لأن الجمعۃ مشتقۃ منہا ۔ اور فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۳۱ میں ہے : و ہما قالا بل الشرط ذلک لأن قولہ تعالیٰ "فاسعَوا" صیغۃ الجمع فقد طلب الحضور معلقا بلفظ الجمع و ہو الواو الی ذکر یستلزم ذاکرا فلزم کون الشرط جمعا ہو مسمی لفظ الجمع مع الامام و ہو المطلوب ۔ اور سابق الذکر حدیث ابو داود : قال علیہ السلام "الجمعۃ واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا اربعۃ ۔ الی آخرہ" میں لفظ (فی جماعۃ) سے بھی اس کا شرط ہونا ثابت ہے ۔

جمعہ میں خطبہ اس لئے شرط ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنی تمام عمر میں کبھی بھی جمعہ کی نماز کو بدون خطبہ کے ادا نہیں فرمایا ۔ اگر یہ شرط نہ ہوتی تو جواز ترک معلوم کرانے کیلئے آپ بھی ضرور ترک فرماتے یا ترک کرنے کی اجازت دیتے ۔ اور یہ تا حال کسی روایت سے ثابت نہیں ۔ ہدایہ مصطفائی کے باب الجمعہ میں ہے : و منہا الخطبۃ لأن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم ما صلاّھا بدون الخطبۃ فی عمرہ ۔ اور بین السطور ہے : فلو لم یکن واجبا لترکہ تعلیما للجواز ۔

سلطان یا نائب سلطان کی اس واسطے شرط لگائی گئی ہے کہ جمعہ چونکہ جماعت کثیرہ سے ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہر ایک شخص اپنی شان و شوکت کیلئے اس کی امامت چاہتا ہے جو جھگڑے اور فساد کا باعث ہے ۔ جب حاکم وقت سے اس کی اقامت ہو تو اس میں کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ ہدایہ میں

ہے: و لا یجوز اقامتها الا للسلطان او لمن امره السلطان لأنها تقام بجمع عظیم و قد تقع المنازعة فی التقدم و التقدیم و قد تقع فی غیره فلا بدّ منه تتمیما لامرها ۔ اور ابن ماجہ کی حدیث سے بھی اس کا اشتراط سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۲۷ میں ہے: فیبقی قوله صلی اللّٰه علیه و سلم "من ترکها و له امام جائر او عادل فلا جمع اللّٰه شمله و لا بارک له فی امره و لا صلاة له" الحدیث رواه ابن ماجه و غیره حیث شرط فی لزومها الامام کما یفیده قید الجملة الواقعة حالا مع ما عیناه من المعنی سالمین من المعارض، و قال الحسن اربع الی السلطان و ذکر منها الجمعة و العیدین ۔ عینی شرح بخاری مصری جلد ۳ صفحہ ۲۹۸ میں ہے: و العجب من هذا القائل انه یستدل علی عدم اذن السلطان لاقامة الجمعة بالایماء و یترک ما دل علی ذلک حدیث جابر اخرجه ابن ماجه و فیه "من ترکها فی حیاتی و له امام عادل او جائر استخفافا بها و جحودا لها فلا جمع اللّٰه شمله و لا بارک له فی امره، الا و لا صلاة له و لا زکاة له و لا حج له و لا صوم له و لا برّ له" الحدیث رواه البزاز ایضا و رواه الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر مثله ۔

جمعہ میں وقت ظہر کی شرط مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے لگائی گئی ہے ۔ ہدایہ باب الجمعۃ میں ہے: و من شرائطها الوقت فتصح فی وقت الظهر و لا تصح بعده لقوله علیه السلام: اذا مالت الشمس فصلِّ بالناس الجمعة ۔ فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۷ باب الجمعۃ میں ہے: و روی انه صلی اللّٰه علیه و سلم لما بعث مصعب ابن عمیر الی المدینة قال "اذا مالت الشمس فصلِّ بالناس الجمعة" و فی البخاری عن انس رضی اللّٰه عنه: کان صلی اللّٰه علیه و سلم یصلی الجمعة حین تمیل الشمس ۔

اور اذن عام کی شرط آیت کریمہ "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ" سے لی گئی ہے، کیونکہ ندائے صلاۃ تمام مسلمانوں میں شہرت کیلئے ہوا کرتی ہے اور جبکہ آیت کریمہ میں نداء کو "سعی الی الجمعۃ" کے لئے شرط گردانا گیا ہے تو بدون اذن عام کے جمعہ درست نہیں ہے ۔ فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۳۲ باب الجمعۃ میں ہے: حتیٰ لو ان والیا اغلق باب بلد و جمع بحشمه و خدمه و منع الناس من الدخول لم یجز اخذاً من اشارة قوله تعالیٰ "نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ" فانه آی تشهیر ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۵۴۰ باب الجمعۃ میں ہے: و انما کان هذا شرطا لأن اللّٰه تعالیٰ شرع النداء لصلاة الجمعة بقوله تعالیٰ "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ" و النداء للاشتهار ۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم بھی انہیں شروط کے ساتھ جمعہ ادا فرماتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے ۔ ائمہ مجتہدین سے پہلے صحابہ و تابعین بھی اس کے پابند رہے ہیں، اور انہیں حضرات کی پابندی اکثر امور اجتہادی میں ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کے لئے باعث تقویت ہوا کرتی ہے ۔ اور اگر کوئی امر اجتہادی بعض صحابہ و تابعین کے عمل کے خلاف ثابت ہو تو مقلد کو چاہیے کہ اپنے امام کے ماخذ استدلال کی تلاش کرکے اس خلاف کی تاویل معلوم کرے ۔ چنانچہ جمعہ کی شرط اقامۃ السلطان کے خلاف یہ روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محصور ہونے کے زمانہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے لوگوں کے ساتھ جمعہ قائم کیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا

اجازت سلطان اقامت جمعہ کی ہے ، مگر حنفیہ اس کی تاویل کرتے ہیں کہ اس روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اقامتِ جمعہ کے متعلق اجازت لینا یا نہ لینا کچھ ثابت نہیں ، جس طرح اجازت نہ لینے کا احتمال قائم کیا گیا ہے اسی طرح اجازت لینے کا بھی احتمال قائم ہے ، ایسی حالت میں ایک احتمال کو ترجیح دینا اور دوسرے کو ترک کرنا ترجیح بلا مُرجّح ہے ۔ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۲۷ باب الجمعہ میں ہے : و ما روی ان علیا رضی اللّٰہ عنہ اقام بالناس و عثمان رضی اللّٰہ عنہ محصور واقعۃ حال فیجوز کونہ عن اذنہ کما یجوز کونہ عن غیرہ فلا حجۃ فیہ لفریق فیبقی قولہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم "من ترکھا و لہ امام جائر او عادل ۔ الخ "۔

موجودہ زمانے میں اسلامی بڑے بڑے شہروں میں تو ان شروط کے برابر پائے جانے سے جمعہ یقیناً صحیح ہے ۔ البتہ ہندستان میں انگریزی حکومت کی وجہ سے اقامت سلطان منتفی ہے ، جس کے متعلق متاخرین نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جن شہروں میں کفار حکومت کرتے ہوں وہاں مسلمان اقامتِ جمعہ کے لئے اگر اپنی رضامندی و اتفاق سے ایک قاضی (حاکم) مقرر کرلیں اور اس کے حکم سے جمعہ قائم کریں تو جائز ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۳۹ باب الجمعہ میں ہے : بلاد علیھا ولاۃ کفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ و یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین و یجب علیھم ان یلتمسوا والیا مسلما کذا فی معراج الدرایۃ ۔

(۲) نماز جمعہ شریعت میں نماز پنجگانہ کی طرح فرض عین ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ باب الجمعہ میں ہے : و ھی فرض کذا فی التھذیب ۔ اس کی فرضیت قرآن و حدیث و اجماع سے ثابت ہے ، اور فرض کا منکر شرعاً کافر ، اور تارک فاسق ہے ۔ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۲۱ باب الجمعہ" میں ہے : و اعلم اولا ان الجمعۃ فریضۃ محکمۃ بالکتاب و السنۃ و الاجماع یکفر جاحدھا ۔ بناء بریں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے مقام سکونت میں شروط پائے جانے کی تحقیق کریں ، اور آبادی و وسعت مقامی وغیرہ بالتفصیل تحریر کرکے علماء سے اس مقام میں جمعہ قائم کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فتوی حاصل کرکے عمل پیرا ہوں ۔

پس صورت مسئولہ میں بکر کیلئے (خالد کو نماز جمعہ اداء نہ کرنے کی وجہ سے ترک تعلق کرنے کے متعلق) جو حکم شرعی پوچھا گیا ہے اس کا جواب بکر و خالد کے مقام سکونت کی تفصیل معلوم ہونے پر موقوف ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد وقف ہے یا نہیں ؟ اور شئ موقوفہ کب تک وقف رہتی ہے ؟ زید نے ایک کہنہ مسجد کو منہدم کرکے اس کی جگہ ایک جدید مسجد اس طرح تعمیر کی کہ قدیم مسجد کی زمین سے ایک صف کی زمین جانب مشرق چھوڑدی گئی ۔ تا حال وہ زمین افتادہ ہے اور اس میں مصلی نماز نہیں پڑھتے بلکہ جوتے چھوڑتے ہیں ، پس یہ زمین مسجد میں داخل ہے یا نہیں ؟ اور اس میں جوتے اتارنا ، جانور کھڑے کرنا ، یا مکان مسکونہ بنانا درست ہے یا نہیں ؟ مسجد کی طرح ہر بات میں اس کا بھی

ادب لازم ہے یا نہیں ؟ در صورت لزوم اس کی بے عزتی کرنے والے کیلئے کیا حکم ہے ؟

(۲) بعض احادیث سے جوتا پہنکر نماز پڑھنا ثابت ہوا ہے ۔ اگر اس پر قیاس کرکے کوئی شخص جوتا پہنکر مسجد میں آئے اور ہمیشہ جوتا چھوڑے تو جائز ہوگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورت صداقت مستفتی ، بانی مسجد بنانے کے بعد لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدے اور اس میں نمازی جماعت کے ساتھ نماز اداء کریں تو وہ مسجد وقف ہوجاتی ہے اور مالک کی ملک میں نہیں رہتی ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۳ صفحہ ۳۸۰ کتاب الوقف میں ہے : و یزول ملکه عن المسجد و المصلی بالفعل و بقوله "جعلته مسجدا" عند الثانی و شرط محمد و الامام الصلاة فیه بجماعة ۔ چنانچہ امام اعظم اور امام یوسف کے پاس مسجد ویران و منہدم ہوجانے کے بعد بھی تا قیام قیامت مسجد ہی باقی رہتی ہے ۔ مالک کی ملک میں واپس نہیں ہوتی ۔ در مختار میں اسی جگہ صفحہ ۳۸۲ میں ہے : و لو خرب ما حوله و استغنی عنه یبقیٰ مسجدا عند الامام و الثانی ابداً الیٰ قیام الساعة ۔ رد محتار میں ہے : قوله (و لو خرب ما حوله) ای و لو مع بقائه عامرا و کذا لو خرب و لیس له ما یعمر به و قد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر ۔

مسجد کے اوپر آسمان تک اور نیچے تحت الثریٰ تک چونکہ مسجد ہی کا حکم ہے اس لئے مسجد کے اندر اور اوپر بول و براز و وطی وغیرہ مسجد کو نجس کرنے والے افعال جو مسجد کی شان و عظمت کے خلاف ہیں شرعا مکروہ تحریمی ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۶۹۰ کتاب الصلاۃ میں ہے : و کرہ تحریما الوطء فوقه و البول و التغوط لانه مسجد الیٰ عنان السماء ۔ رد محتار میں ہے : و کذا الی تحت الثریٰ (و اتخاذه طریقا بغیر عذر) وصرح فی القنیة لفسقه باعتباره (و ادخال نجاسة فیه و علیه) ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں جو زمین کہ مسجد قدیم سے جدید تعمیر کے وقت چھوڑ دی گئی ہے وہ تا قیام قیامت مسجد ہے ۔ مصلیوں کو چاہئے کہ اس پر گچ کا چبوترہ بناکر مسجد کی طرح اس کی حرمت و توقیر کریں ۔

جوتا اگر نیا ہو اور زمین پر اس کا استعمال نہ کیا گیا ہو تو چونکہ چمڑا دباغت کے بعد پاک ہوجاتا ہے اس لئے اس کو پہنکر نماز پڑھنی درست ہے ، مگر زمین پر چلنے کے بعد اختلاط نجاست کی وجہ سے اس کی طہارت زائل ہوجاتی ہے ۔ پس جو مسلمان کہ ایسے قبیح اور مسجد کو نجس کرنے والے افعال کے ارتکاب کی عادت کرلیتے ہیں ان کیلئے شرع میں فسق و فجور کا حکم لگایا گیا ہے ۔ جیسا کہ عبارت سابقہ (و صرح فی القنیة لفسقه باعتباره) سے ثابت ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ موسم گرما میں نماز ظہر کا ابراد یعنی ظہر کو موسم گرما میں

ٹھنڈے وقت میں پڑھنا ۔ یہ حکم تا حال قائم ہے یا منسوخ ہوگیا ہے ؟ اگر منسوخ ہوگیا ہے تو کس حدیث سے ؟ بیان فرمایا جائے ۔ زید کا بیان ہے کہ جتنے اکابر محدثین و فقہاء مثل امام احمد و امام بخاری و امام ترمذی و امام طحاوی و ابن ماجہ وغیرہ نے ابراد ظہر کے متعلق لکھا ہے یہ مفتری علی الرسول ہیں ۔ ان کا بیان ٹھیک نہیں ۔ انہوں نے اس مسئلہ میں رنگ لگایا ہے ۔ پس زید کا یہ بیان صحیح ہے یا غلط ؟

الجواب

ابراد بالظہر تا حال قائم بلکہ مستحب ہے ۔ اور اس کے ساتھ نماز فجر کو صبح روشن میں پڑھنا ۔ اور ظہر کو موسم سرما میں اول وقت پڑھنا ۔ اور عصر میں ہمیشہ اتنی تاخیر کرنا کہ آفتاب میں زردی نہ آجائے ۔ اور مغرب کو ہمیشہ جلدی پڑھنا ۔ اور عشاء کو رات کا تہائی حصہ گذرنے کے بعد پڑھنا یہ سب مستحب بتایا گیا ہے اور تمام مقلدین احناف کے پاس اس پر برابر عمل جاری ہے ۔ قدوری طبع مجتبائی کے صفحہ ۲۳ باب مواقیت الصلاۃ میں ہے : و یستحب الاسفار بالفجر و الابراد بالظھر فی الصیف و تقدیمھا فی الشتاء و تاخیر العصر ما لم تتغیر الشمس و تعجیل المغرب و تاخیر العشاء الی ما قبل ثلث اللیل ۔ اس استحباب کا ماخذ احادیث صحاح ہیں جو کتب صحاح میں موجود ہیں ۔ زید نے اس مسئلہ فقہیہ کے متعلق ائمہ مجتہدین و فقہاء محدثین پر جو طعن کی بالکل غلط اور لغو ہے ۔ جن اکابر و فضلاء کی احادیث و مسائل استنباطی پر مسلمانان عالم اور خصوصا علمائے کرام کا تا حال بلا خلاف اتفاق و عمل ہے ۔ اور جن کا مرتبہ امت مرحومہ میں متدین اور نیک نیت ہونا ان کی وفات سے اب تک حد تواتر کو پہنچ گیا ہے ۔ اور جن کے اقوال کی صحت ہر زمانے میں پایۂ ثبوت کو پہنچائی گئی ہے ۔ اور جو کہ حدیث شریف " علیکم بالسواد الاعظم " کے لحاظ سے تا قیام قیامت سواد اعظم یعنی جماعت حقہ کے پیشوا و مقتداء ہیں ۔ ان کی شان میں ایسی بےہودہ باتیں کہنا علانیہ زید کے بدمذہب ہونے کی دلیل ہے ۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے اشخاص کی باتوں پر ہرگز اعتبار نہ کریں ۔ اور جس بات میں شبہ پیدا ہو اس کو علماء کرام سے صاف کرلیں ۔ واللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک قدیم جامع مسجد ہے ۔ جس کیلئے شاہان سلف کے زمانے سے بعطائے اسناد و احکام مصرحہ پیش امام ۔ خطیب ۔ مؤذن ۔ فراش ۔ جاروب کش وغیرہ مقرر ہیں ۔ اور معاش مشروط الخدمت اسی زمانہ سے اب تک ان کیلئے جاری ہے ۔ معاش کی وجہ سے ہر ایک اپنی خدمت کو ادا کرتا ہے ۔ اور بانگ و صلاۃ و نماز جمعہ وغیرہ ہوتی رہتی ہے ۔ اس زمانے میں ایک نئی مسجد جامع مسجد سے پاؤ میل کے فاصلے پر بنام " محبوب شاہی " منجانب سرکار تیار کی گئی ہے ۔ حکام سرکار کا یہ ارادہ ہے کہ جامع مسجد کے خدمتیوں اور معاش کو جدید مسجد کیلئے منتقل کریں اور جامع مسجد بلا معاش و خدمتی چھوڑ دی جائے ۔ جس میں علانیہ جامع مسجد کی ویرانی ہے ۔ حالانکہ جامع مسجد آبادی میں واقع ہے اور نئی مسجد آبادی سے باہر ہے ۔ پس حکام سرکار کا یہ فعل شرعا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

واقف جن اغراض کیلئے وقف کرتا ہے اس کے اغراض کی تکمیل شریعت میں واجب ہے ۔ اور جو شرط واقف شئ موقوفہ کیلئے مقرر کرتا ہے اس کا حکم اتباع میں نص شارع کی طرح ہے ۔ یعنی جیسے نصوص شارع واجب العمل ہیں اسی طرح واقف کی شرط بھی واجب العمل ہے ۔ رد محتار جلد ۳ صفحہ ۴۲۶ کتاب الوقف میں ہے : انهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة ۔ اور صفحہ ۴۹۶ میں ہے ، شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه ۔ بناء بریں شاہان سلف نے جامع مسجد کیلئے جن اوقاف کو مقرر کیا ہے اور جو معاش اس کی خدمت کیلئے مشروط گردانی ہے اس کو نئی مسجد کی طرف منتقل کرنا درست نہیں ۔ بلکہ آیت کریمہ " وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ " سے ظاہر ہے کہ مساجد کی ویرانی کی کوشش کرنا باعث عذاب عظیم ہے ۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۳۲ پر آیت کریمہ کے ذیل میں لکھا ہے : و المقصود من ذكر الآية انها تدل على ان هدم المساجد و تخريبها ممنوع ۔ یعنی اس آیت کریمہ سے یہ مقصود ہے کہ مساجد کی ویرانی کی ہرگز فکر نہ کی جائے ۔ پس صورت مسئولہ میں حکام کا جامع مسجد کی معاش و خدمتیوں کو نئی مسجد کی طرف منتقل کرنا خلاف شریعت و باعث عذاب آخرت ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام نے کسی رکعت میں تیسرے سجدے کا قصد کیا ۔ مقتدیوں نے اس کو روکا مگر وہ باز نہ آکر تیسرے سجدے کا ارتکاب کیا ۔ کیا ایسی صورت میں مقتدی اپنے امام کی اقتداء کریں یا منتظر رہیں ؟ اگر اتباع کی جائے تو ایک رکن زائد کا عمداً ارتکاب لازم آتا ہے ۔ اور اگر انتظار کیا جائے تو اتباع چھوٹ جاتی ہے ۔ بینوا توجروا ۔

الجواب

امام اگر دو سجدوں پر زائد سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو مقتدی پر اس کی اتباع واجب نہیں ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۳۳۰ واجبات صلاۃ میں ہے : و انه ليس له ان يتابعه في البدعة و المنسوخ و ما لا تعلق له بالصلاة فلا يتابعه لو زاد سجدة ۔ الخ ؛ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ میں پہلی صف میں زیادہ ثواب ہے یا اخیر صف میں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اخیر صف میں زیادہ ثواب ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۴۰۰ باب الامامۃ میں ہے : (قوله في غير

جنازۃ) امّا فیہا فآخرھا اظہارا للتواضع لانہم شفعاء فہو احری بقبول شہادتہم و لان المطلوب فیہ تعدد الصفوف فلو فضل الاول امتنعوا عن التاخر عند قلتہم ۔ رحمتی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا اسقاط صلاۃ شرعاً جائز ہے ؟ اگر جائز ہے تو اس کا بہتر طریقہ کیا ہوسکتا ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اسقاط جائز ہے ، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ فائتہ نماز و روزے سے ہر ایک فرض نماز یا وتر یا روزے کے بدلے نصف صاع گیہوں جو صدقہ فطر کی مقدار ہے فقراء پر صدقہ کیا جائے ۔ میت اگر مالدار نہیں ہے تو اس کے وارث کو چاہئے کہ نصف صاع گیہوں ایک نماز یا ایک روزے کے معاوضہ میں فقیر کو دے ، پھر فقیر اس گیہوں کو وارث کو واپس دیدے ، اور یہ وارث اس گیہوں کو دوسری نماز کے معاوضہ میں فقیر کو دے ، پھر اسی طرح تمام نماز و روزے ختم ہونے تک ہر ایک کیلئے اس گیہوں کو فقیر کو دینا اور اس سے واپس لینا چاہئے ۔ اگر نصف صاع کے حساب سے کئی نمازوں کے گیہوں ایک دم دیکر واپس لی جائے تو بہت جلد تکمیل ہوجائے گی ۔ میت کے نادار ہونے کی حالت میں اگر اس کا کوئی وارث اپنی طرف سے گیہوں خرید کر اسقاط کروائے تو جائز ہے ۔ اور نصف صاع گیہوں کے بدلے اس کی قیمت دینا افضل ہے کیونکہ قیمت سے فقیر کی کئی حاجتیں پوری ہوتی ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۱۳ کتاب الصلاۃ میں ہے : (و لو مات و علیہ صلاۃ فائتۃ و اوصی بالکفارۃ یعطی لکل صلاۃ نصف صاع من بُر) کالفطرۃ (و کذا حکم الوتر) و الصوم و انما یعطی (من ثلث مالہ) و لو لم یترک مالا یستقرض وارثہ نصف صاع و یدفعہ لفقیر ثمّ یدفعہ الفقیرُ للوارث ثمّ و ثمّ حتیٰ یتم ۔ رد محتار میں ہے : (و قولہ نصف صاع من بر) ای او من دقیقہ او سویقہ او صاع تمر او زبیب او شعیر او قیمۃ و ھی افضل عندنا لاسراعہا بسد حاجۃ الفقیر (قولہ و لم یترک مالا الخ) ای اصلا او کان ما اوصی بہ لا یفی ۔ زاد فی الامداد او لم یوص بشیء و اراد الولی التبرع ۔ الخ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عیدین و جمعہ میں نماز و خطبہ ایک ہی شخص پڑھے ، یا خطبہ ایک شخص اور نماز دوسرا ؟

عیدین میں اقامت و اذان کہی جائے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جمعہ و عیدین میں ایک شخص کا نماز پڑھانا اور دوسرے کا خطبہ پڑھنا بہتر نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ

بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۱ صفحہ ۵۰۹ باب الجمعہ میں ہے: لا ینبغی ان یصلی غیر الخطیب لانہما کشیء واحد۔

عیدین میں اذان و اقامت مسنون و مشروع نہیں ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۲۹۹ باب الاذان میں ہے: لا یسن لغیرھا کعید۔ رد محتار میں ہے: ای وتر و جنازۃ و تراویح و سنن رواتب الخ۔ صفحہ ۵۸۷ میں ہے: و الاذان غیر مشروع فی العید۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز میں شہادت کی انگلی اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس حدیث سے اور کس فقہی روایت سے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرح وقایہ جلد اول کے باب صفۃ الصلاۃ میں شہادت کی انگلی اٹھانا ثابت ہے۔ چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے: وعن عندہ یعقد الخنصر و البنصر و یحلق الوسطیٰ و الابہام و یشیر بالسبابۃ عند التلفظ بالشہادتین و مثل ھذا جاء عن علمائنا ایضا۔ اور اٹھانے کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ کلمہ طیب لا الٰہ الا اللہ کے "لا" پر اٹھائے اور "الا اللہ" پر رکھے۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۵۰ باب صفۃ الصلاۃ میں ہے: و فی الشرنبلالیۃ عن البرھان الصحیح انہ یشیر بمسبحتہ وحدھا یرفعھا عند النفی و یضعھا عند الاثبات۔ موطأ امام محمد رحمہ اللہ باب العبث بالحصیٰ فی الصلاۃ میں ہے: قال کان رسول اللہ صلی اللہ و سلم اذا جلس فی الصلاۃ وضع کفہ الیمنیٰ علیٰ فخذہ الیمنیٰ و قبض اصابعہ کلھا واشار باصبعہ التی تلی الابہام و وضع کفہ الیسریٰ علی فخذہ الیسریٰ۔ قال محمد و بصنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نأخذ و ھو قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ۔ الخ: واللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خاص قصبہ ہنگولی میں مسلمانوں کی ایک خاص تعداد ہے۔ لیکن اس قصبے میں تین جگہ عید کی نماز ہوتی ہے۔ کیا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شریعت میں چونکہ خطبہ کے سوا جملہ شروط جمعہ و عیدین کے متحد ہیں۔ اس لئے نماز عید کی صحت کیلئے مصر اور سلطان یا نائب سلطان مشروط ہے۔ عالمگیریہ کے باب عیدین میں ہے: و یشترط للعید ما یشترط للجمعۃ الا الخطبۃ کذا فی الخلاصۃ۔ در مختار کے باب الجمعہ میں "مصر" یعنی شہر کی ملتی بہ یہ تعریف ہے: المصر و ھو ما لا یسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بھا و علیہ فتوی اکثر الفقہاء۔ مجتبیٰ: لظھور التوانی فی الاحکام۔ یعنی مصر ایسی آبادی کا نام ہے کہ وہاں مسلمان جن پر نماز جمعہ

فرض ہے اس قدر ہوں کہ اس مقام کی بڑی مسجد میں ان کے ایک دم جمع ہونے کی گنجائش نہ ہو۔ پس قصبہ ہنگولی میں اگر مسلمانوں کی ایسی تعداد ہے اور وہاں نائب سلطان یعنی امیر یا قاضی یا خطیب سرکاری بھی ہے تو اس کا حکم مصر یعنی شہر کا ہے جہاں نائب سلطان کی اجازت سے متعدد مقام میں نماز عید کی ادائی درست ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۵۸۶ باب العیدین میں ہے: و تؤدی بمصر واحد بمواضع کثیرۃ اتفاقا۔ عالمگیریہ کے باب الجمعہ میں ہے: و منها السلطان عادلا کان او جائرا کذا فی التاتارخانیة ناقلا عن النصاب، او من امرہ السلطان و ھو الأمیر او القاضی او الخطباء کذا فی العینی شرح الھدایة، حتی لا یجوز اقامتها بغیر امر السلطان و امر نائبه کذا فی محیط السرخسی۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شرعاً فناء شہر کی کیا تعریف ہے؟ اور شہر سے کتنی دور تک اس کی حد ہے؟ فناء اور عیدگاہ شہر کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب

• فناء البلد" شہر کے اطراف کی زمین کا نام ہے جس میں شہر کی ضروریات یعنی دفن اموات گھوڑ دوڑ و نشانہ اندازی وغیرہ کی تکمیل ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ کتب فتاویٰ میں اس کی مقدار تین فرسخ تک بتائی گئی ہے مگر صاحب رد المحتار نے اس کے متعلق یہ تصفیہ کیا ہے کہ اس کی مقدار متعین کرنا ٹھیک نہیں۔ بلکہ ہر شہر کی وسعت و آبادی کے لحاظ سے اس کے بیرون میں جس قدر زمین ایسی ضروریات کیلئے رکھی گئی ہے وہ سب اس شہر کی فناء ہے۔ چنانچہ رد المحتار کے باب الجمعہ میں تحت قول و المختار للفتوی مکتوب ہے: فالقول بالتحدید بمسافة یخالف التعریف المتفق علیٰ ما صدق علیه بأنه المعد لمصالح المصر فقد نص الائمة علی ان الفناء ما اعد لدفن الموتیٰ و حوائج المصر کرکض الخیل و الدواب و جمع العساکر و الخروج للرمی و غیر ذلک و ای موضع یحد بمسافة یسع عساکر مصر و یصلح میدانا للخیل و الفرسان و رمی النبل و البندق البارود و اختبار المدافع و ھذا یزید علی فراسخ فظھر ان التحدید بحسب الامصار۔

فناء شہر کا حکم شہر ہی کا ہے۔ اور عیدگاہ بھی چونکہ فناء شہر میں ہوتی ہے اس لئے اس کا حکم بھی شہر کا سا ہے۔ ملا مسکین کی شرائط جمعہ میں ہے: (او مصلاہ) عطف علی قوله "المصر" ای یؤدی الجمعة به مطلقا سواء کان بینهما مزارع او لا لأنه فی فنائه و فناؤہ ملحق به۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص رمضان شریف میں عشاء کی جماعت میں شریک نہیں تھا اور اس نے اس جماعت کے امام کی اقتداء نہیں کی ، تو کیا ایسا شخص بعد تراویح ، وتر کی جماعت میں اس امام کی اقتداء کرسکتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جو شخص امام کے ساتھ فرض نہ اداء کرے اس کو وتر علیحدہ پڑھنا چاہئے ۔ رد مختار کی جلد ۱ کتاب الصلاۃ مطلب فی کراھۃ الاقتداء فی النفل علی سبیل التداعی میں ہے : اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر مقتدی اپنے امام کو لقمہ دے اور امام نہ لے ، تو مقتدی کی نماز تمام ہوئی یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

صورت مسئولہ میں مقتدی کی نماز درست و کامل ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۹۹ میں ہے : و لمن فتح علی امامہ لم تفسد ۔ اور اسی جگہ ہے : و الصحیح انہا لا تفسد صلاۃ الفاتح بکل حال و لا صلاۃ الإمام لو اخذ منہ علی الصحیح کذا فی الکافی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بعد نماز وتر سوائے دو رکعت مستحب اور تہجد کے دیگر نوافل : و نیز شب قدر و شب برات و شب معراج میں دوگانے ادا کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

اوقات مکروھہ کے سوا ہر وقت چاہے دن ہو یا رات ، نفل پڑھنے کی اجازت ہے ۔ عالمگیریہ کی کتاب الصلاۃ باب النوافل میں ہے : التطوع المطلق یستحب اداؤہ فی کل وقت کذا فی محیط السرخسی ۔ شب قدر و شب برات و عیدین کی راتوں میں اور رمضان کے آخری دہے کی راتوں میں تمام رات یا رات کا اکثر حصہ نوافل پڑھنا یا کوئی عبادت کرنا مستحب ہے ۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الوتر و النوافل میں ہے : و من المندوبات احیاء لیلۃ العیدین و النصف من شعبان و العشر الأخیر من رمضان و الأول من ذی الحجۃ و یکون بکل عبادۃ تعم اللیل او اکثرہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے نماز تراویح میں ختم قرآن کے وقت سورہ اخلاص کے شروع میں بسم اللہ جہر سے ایک بار پڑھی ۔ کیا زید کے اس فعل سے نماز باطل ہوئی ؟ اور یہ جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

بسم اللہ قرآن شریف کی ایک مستقل آیت ہے ۔ تراویح میں تمام قرآن کے ساتھ اس کو ایک دفعہ کسی سورة کی ابتداء میں جہر سے پڑھنا ضروری ہے ۔ عالمگیریہ کی کتاب الصلاۃ فصل سنن الصلاۃ میں ہے : و ھی من القرآن آیۃ انزلت للفصل بین السور کذا فی الظھیریۃ ۔ اور در مختار کے سنن صلاۃ میں ہے : (و ھی آیۃ) واحدۃ من القرآن کلہ (انزلت للفصل بین السور) فما فی النمل بعض آیۃ اجماعا ۔ مولانا عبد الحی صاحب مرحوم مجموعہ فتاویٰ طبع یوسفی کی تیسری جلد کے صفحہ ۵۵ میں لکھتے ہیں : بسم اللہ آیتے است از قرآن مکرر کردہ شد بر سر ہر سورہ برائے فصل ۔ پس ہنگام ختم قرآن و تراویح یکمرتبہ بسم اللہ خواندن ضرور است بر سر ہر سورۃ کہ خواہد بخواند ۔ اگر ترک کردہ شد در ختم قرآن قصور است ۔ در تنویر المنار می آرد ، حنفیہ بر آنند کہ بسم اللہ آیت واحدہ است مکرر شدہ برائے فصل میان سُوَر ۔ پس قرآن عبارت است از یکصد و چہاردہ سُوَر و یک آیت ۔ پس در ختم قرآن یکبار بسم اللہ خواندن ضروری است بر سر ہر سورہ‌ای کہ خواہد ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مقتدی اپنے امام کو فرض نماز میں لقمہ دے سکتا ہے یا نہیں ؟ اگر دے سکتا ہے تو ما تجوز بہ الصلاۃ میں یا اس سے زائد میں بھی ؟ اگر مقتدی لقمہ دے اور امام نہ لے تو ان تمام صورتوں میں مقتدی یا امام کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مقتدی اپنے امام کو فرض و نفل ہر قسم کی جہری نماز میں لقمہ دے سکتا ہے ۔ لقمہ چاہے مقدار ما تجوز بہ الصلاۃ میں دے یا زائد میں ، بہر حال مقتدی کے اپنے امام کو لقمہ دینے سے مقتدی اور امام کسی کی بھی نماز فاسد نہیں ہوتی ۔ عالمگیریہ کے باب فیما یفسد الصلاۃ میں ہے : و ان فتح علی امامہ لم تفسد ، ثم قیل ینوی الفاتح بالفتح علی امامہ التلاوۃ و الصحیح ان ینوی الفتح علی امامہ دون القراءۃ قالوا ھذا اذا ارتج علیہ اخریٰ قبل ان یقرأ قدر ما یجوز بہ الصلاۃ او بعد ما قرأ و لم یتحول الی آیۃ اخریٰ ۔ و اما اذا قرأ و تحول ففتح علیہ تفسد صلاۃ الفاتح ، و الصحیح انھا لا تفسد صلاۃ الفاتح بکل حال و لا صلاۃ امام لو اخذ منہ علی الصحیح کذا فی الکافی ۔ مگر مقتدی کو چاہئے کہ لقمہ دینے میں جلدی نہ کرے ۔ ممکن ہے کہ امام کو اسی وقت بھولا ہوا لفظ یاد آجائے اور قراءت امام کے پیچھے بے ضرورت واقع ہو ۔ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : و یکرہ للمقتدی ان یفتح علی امامہ من ساعتہ لجواز ان یتذکر من ساعتہ فیصیر قارءاً خلف الامام من غیر حاجۃ کذا فی محیط السرخسی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نابالغ عاقل یعنی سمجھدار کا جمعہ اور عیدین میں خطبہ پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اگر نابالغ سمجھدار خطیب یا امام سرکار کی اجازت سے بوقت ضرورت خطبہ پڑھے تو درست ہے ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ نماز پڑھانے والا ہی خطبہ بھی پڑھے ۔ در مختار کے باب الجمعہ میں ہے : (لا ینبغی ان یصلی غیر الخطیب) لأنهما کشیء واحد (فلن فعل بأن خطب صبی باذن السلطان و صلیٰ بالغ جاز) و هو المختار ۔ رد المحتار میں تحت قول و هو المختار ہے : و فی الظهیریة لو خطب صبی اختلف المشایخ و الخلاف فی صبی یعقل اھ ، و الأکثر علی الجواز ۔ اسماعیل ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے دو فرزند ہیں ، خالد کلاں اور بکر خورد ، بکر اپنے برادر کلاں کے تمام اوصاف میں مساوی ثابت ہوا ، تو کیا وہ اپنے والد یا کسی مورث کی نماز جنازہ پڑھانے کا مستحق ہوگا یا خالد برادر کلاں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

خالد چونکہ برادر کلاں ہے اس لئے یہی اپنی موجودگی میں مورث کی نماز جنازہ پڑھانے کا حق رکھتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الصلاۃ فصل خامس میں ہے : فان تساوی ولیان فی درجة فاکبرهم سناً اولیٰ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک قدیم مسجد کی تعمیر از سر نو مسلمانوں اور ہنود کے چندہ سے کی گئی ، جس میں تین حصے مسلمانوں کا روپیہ ہے اور ایک حصہ ہنود کا ۔ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

جن ہندؤں نے چندہ دیا ہے ان سے یا ان کے ورثاء سے یہ لکھوا لیاجائے یا زبانی کہلوالیا جائے کہ ہم نے یہ چندہ اس محلہ کے مسلمانوں کو دیا یا فلاں فلاں اشخاص کو دیا ہے ۔ تو پس اس تحریر یا تقریر کے بعد اس مسجد میں نماز پڑھنا بلا شبہ درست ہے ۔ اسعاف کے صفحہ ۹۱ میں ہے : و لو اوصی الذمی ان تبنی داره مسجدا لقوم بأعیانهم او لأهل محلة بأعیانهم جاز استحسانا لکونه وصیة تقوم بأعیانهم و کذلک یصح الإیصاء بمال لرجل بعینه لیحج به لکونه وصیة لمعین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

چہ میفرمایند علمائے احناف اندریں مسئلہ کہ بہ زمانیکہ درمیان کفار و اہل اسلام جنگ و پیکار دائر باشد قنوت نازلہ اندرون نماز خواندن جائز است یا نہ ؟ اگر جائز باشد پس نسخ قنوت عند الاحناف چہ معنی دارد ؟ و دیگر اینکہ در ہمہ نمازہا خواندن باید یا در نمازہائے جہریہ یا صرف در نماز صبح ؟ و نیز پیش از رکوع خواندن باید یا پس آں ؟ امام و مقتدی ہمہ را خواندن باید یا خواندن امام کفایت میکند ؟ و منفرد ہم خواندن میتواند یا نے ؟ پس ہر چہ قول صحیح باشد حکم بفرمایند ۔

الجواب

ہرگاہ مسلمانان را آفتے رسد یا فتنہ یا مہمے پیش آید قنوت نازلہ خواندن نزد احناف جائز است ۔ ہمچنیں جنگ و پیکار کہ اشد فتنہ است دریں زمان قنوت نازلہ خواندن درست است ۔ اما قنوت کہ در مذہب احناف منسوخ است محمول است بر نسخ عموم یعنی در زمانیکہ فتنہ و بلاء نباشد قنوت خواندن نزد ما منسوخ است و بزمان فتنہ و بلاء مسنون ۔ اما در وقت فتنہ و بلایا در ہر نماز پنجگانہ خواندن قنوت نزد ما قول مفتیٰ بہ نیست ، بلکہ فتویٰ بریں است کہ در نماز صبح بعد رکوع رکعت ثانیہ قنوت نازلہ خواندہ شود ۔ اگر کسے نماز صبح تنہا میگذارد باید کہ قنوت نخواند ، و اگر باجماعت میگذارد و امام قنوت بجہر میخواند باید کہ آمین بگوید ، و اگر سراً میخواند باید کہ او ہم سراً بخواند ۔ چنانچہ در در مختار جلد ۱ در باب الوتر نوشتہ است : (و لا يقنت لغيره) الا النازلة فيقنت الامام في الجهرية و قيل في الكل ۔ و ہم دریں مقام در رد محتار آوردہ است : قوله (فيقنت الامام في الجهرية) يوافقه ما في البحر و الشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية ۔

و ان نزل بالمسلمين نازلة قنت الامام في الصلاة الجهرية و هو قول الثوري و احمد و كذا ما في شرح الشيخ اسماعيل عن النهاية اذا وقعت نازلة قنت الامام في الصلاة الجهرية ۔ لكن في الأشباه عن الغاية قنت في صلاة الفجر و يؤيده ما في شرح المنية حيث قال بعد كلام فتكون شرعيته اى شرعية القنوت في النوازل مستمرة و هو عمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته صلى الله عليه و سلم و هو مذهبنا و عليه الجمهور ۔ و قال الحافظ ابو جعفر الطحاوى انما لا يقنت عندنا في صلاة الفجر من غير بلية فان وقعت فتنة او بلية فلا بأس بما فعله رسول الله صلى الله عليه و سلم ۔ و اما القنوت في الصلوات كلها للنوازل فلم يقل به الا الشافعي رحمه الله تعالى و كأنهم حملوا ما روى عنه صلى الله عليه و سلم انه قنت في الظهر و العشاء كما في مسلم و انه قنت ايضا في المغرب كما في البخاري على النسخ لعدم ورود المواظبة و التكرار الوارد في الفجر عنه صلى الله عليه و سلم اهـ ۔ و هو صريح في القنوت النازلة عندنا تختص بصلاة الفجر دون غيرها من الصلاة الجهرية و السرية و مفاده ان قولهم بأن القنوت في الفجر منسوخ معناه نسخ عموم الحكم لا نسخ اصله كما نبه عليه نوح آفندى ۔ و ظاهر تقييدهم بالامام انه لا يقنت المنفرد ، و هل المقتدى مثله ام لا ؟ و هل القنوت ههنا قبل الركوع او بعده ؟ لم اره و الذي يظهر لي ان المقتدى يتابع امامه الا اذا جهر فيؤمن و انه يقنت بعد الركوع لا قبله بدليل ان ما استدل به الشافعي على قنوت الفجر و فيه التصريح بالقنوت بعد الركوع حمله علماؤنا على القنوت للنازلة ، ثم رأيت الشرنبلالية في مراقي الفلاح صرح بأنه بعده و استظهر الحموى انه قبله و الأظهر ما قلناه ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مسجد میں ایسے وقت میں داخل ہوا جبکہ وتر باجماعت

ہورہی تھی اور زید نے فرض عشاء ادا نہیں کی تھی۔ کیا ایسی حالت میں زید وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتا ہے؟ اور کیا وتر کو فرض عشاء پر مقدم کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

فرض عشاء اور وتر میں چونکہ ترتیب واجب ہے اس لئے زید کا بغیر فرض عشاء ادا کئے ہوئے وتر کی جماعت میں شریک ہونا درست نہیں۔ کنز الدقائق کی کتاب الصلاۃ میں ہے: و لا یقدم علی العشاء لوجوب الترتیب۔ البحر الرائق جلد ۱ صفحہ ۲۵۹ کتاب الصلاۃ میں ہے: ای لا یقدم الوتر علی العشاء لوجوب الترتیب بین العشاء و الوتر، لأنهما فرضان عند الامام و ان کان احدهما اعتقادا و الآخر عملا، فأفاد انه عند التذکر حتیٰ لو قدم الوتر ناسیا فانه یجوز۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد امام و مقتدی کو کتنی دیر تک ٹھہرنے اور کس مقدار میں دعاء مانگنے کا حکم ہے؟ بعض احادیث سے جو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور تینتیس (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس (۳۳) مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر اور ایک دفعہ کلمہ تمجید پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، کیا اس کو فرض نماز کے ساتھ ہی پڑھنا چاہئے یا سنت مؤکدہ ادا کرنے کے بعد؟ بینوا توجروا۔

الجواب

فرض نماز کے بعد دعاء ماثورہ "اللّٰھم انتَ السلام و منکَ السلام تبارکتَ یا ذا الجلال و الإکرام" کی مقدار دعاء مانگنے تک ٹھہرنے کا حکم ہے اس کے بعد سنت کے لئے کھڑے ہوجانا چاہئے۔ فرض کے بعد جس قدر وظائف احادیث سے ثابت ہیں وہ سب سنت مؤکدہ کے اداء کرنے کے بعد پڑھنا چاہئے۔ سنت چونکہ فرض کے توابع و لواحق سے ہے، اس لئے فرض و سنت کے مابین دعاء ماثورہ سے زیادہ توقف کرنا مکروہ ہے۔ کبیری شرح منیۃ المصلی مطبوعہ محمدی کے صفحہ ۳۳۱ میں ہے: فان کان بعدها ای بعد المکتوبة تطوع یقوم الی التطوع بلا فصل الا مقدار ان یقول اللهم انت السلام و منک السلام تبارکت یا ذا الجلال و الأکرام، و یکره تأخیر السنة عن حال اداء الفریضة بأکثر من نحو ذلک القدر۔ اسی صفحہ میں ہے: و اما ما روی من الأحادیث فی الأذکار عقیب الصلاة فلا دلالة فیها علی الإتیان بها عقیب الفرض قبل السنة بل یحمل علیٰ الإتیان بها بعد السنة و لا یخرجها تخلل السنة بینها و بین الفریضة عن کونها بعدها و عقیبها لأن السنة من لواحق الفریضة و توابعها و مکملاتها فلم تکن اجنبیة منها فما یفعل بعدها یطلق علیه انه فعل بعد الفریضة و عقیبها۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر سرکاری مسجد کا امام ہے، اور جس نے وکیل ہونے

کے ناطے سرکار میں جعلسازی و دھوکہ بازی نہ کرنے کا حلف اٹھایا ہے ۔ باوجود اس کے اس نے زید مؤذن کی ماہوار تنخواہ اس کی وفات کے دو سال بعد تک محکمہ سرکار سے اس کو زندہ بتاکر حاصل کرتا رہا ۔ کیا ایسا شخص امامت کرسکتا ہے ؟

الجواب

بکر اس فعل کی وجہ سے شرعا فاسق و فاجر ہے جس کی امامت مکروہ ہے ۔ در مختار جلد ۱ باب الامامۃ میں ہے : و یکرہ امامۃ عبد و اعرابی و فاسق و اعمی ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ و فاسق) من الفسق و هو الخروج عن الاستقامۃ و لعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر و آکل الربا و نحو ذلک کذا فی البرجندی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر خطیب خطبۂ اولیٰ میں صحابہ کرام و اہل بیت عظام رضوان اللہ علیہم کا نام لے اور خطبہ ثانیہ میں بھی ان کا نام لے تو اس سے کسی قسم کی کراہت تو نہیں ؟

الجواب

صحابۂ کرام وغیرہ کا نام خطبہ ثانیہ میں لینا چاہئے ۔ جیسا کہ عالمگیریہ اور مراقی الفلاح کی مندرجہ ذیل عبارت سے ثابت ہے ، عالمگیریہ جلد ۱ باب الجمعہ میں ہے : و ینبغی ان تکون الخطبۃ الثانیۃ " الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ـ الخ" و ذکر الخلفاء الراشدین و العمین رضوان اللہ علیهم اجمعین مستحسن و بذلک جری التوارث کذا فی التجنیس ، مراقی الفلاح شرح نور الایضاح مطبوعہ بر حاشیہ طحطاوی صفحہ ۲۹۹ میں ہے : و سن اعادۃ الحمد و اعادۃ الثناء و اعادۃ الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ و سلم کائنۃ تلک الإعادۃ فی ابتداء الخطبۃ الثانیۃ و ذکر الخلفاء الراشدین و العمین مستحسن بذلک جری التوارث ۔ جمعہ کے دونوں خطبے طوال مفصل میں سے کسی ایک سورہ کی مقدار دراز ہونے چاہئے اس سے زیادہ پڑھنا مکروہ ہے ۔ مراقی الفلاح میں اسی جگہ ہے : و یسن تخفیف الخطبتین بقدر سورۃ من طوال المفصل و یکرہ التطویل ۔ پس خطبہ ثانیہ کے علاوہ خطبۂ اولیٰ میں بھی صحابۂ کرام کا نام لینا بوجہ عدم ثبوت نا مشروع فعل ہے جو بوجہ طوالت موجب کراہت ہے ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک چھوٹا گاؤں ہے اس کا حاکم مسلمان ہے اور وہاں بازار بھی لگتا ہے ۔ اگر ایسے گاؤں میں مسلمان جمعہ قائم کریں تو کیا ان سے ظہر ساقط ہوجائے گی ؟

الجواب

اگر اس گاؤں میں مسلمان جن پر نماز جمعہ فرض ہے اتنے ہیں کہ وہ سب کے سب اس گاؤں کی سب سے بڑی مسجد میں اگر جمع ہوجائیں تو مسجد ان کیلئے کافی نہیں ہوتی تو ایسی حالت میں یہ گاؤں شرعا "مصر" کا حکم رکھتا ہے ۔ مسلمانوں کو اس میں بہ اجازت حاکم جمعہ اداء کرنا درست ہے ، اور بعد ادائی جمعہ

ان سے ظہر ساقط ہوجائیگی ۔ اگر مسلمان اتنے نہیں ہیں تو اس کا حکم مصر کا نہیں ہے ، جس میں جمعہ اداء کرنا درست نہیں ۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الجمعۃ میں ہے ؛ المصر و ھو ما لا یسع اکبر مساجدہ اھلہ المکلفین بھا و علیہ فتوی اکثر الفقہاء ۔ مجتبیٰ ، لظھور التوانی فی الاحکام ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید پیدائشی نابینا ہے جو حافظ قرآن اور مسائل ضروریہ ما تجوز بہ الصلاۃ سے واقف ہے اور نماز پنجگانہ جماعت سے اداء کرنے کا پابند ہے ۔ حتی الوسع طہارت کا بھی بخوبی خیال رکھتا ہے ، اس لئے تمام قوم خوشی سے اس کی اقتداء کرتی ہے ۔ اس کی امامت کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے ؟ جبکہ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا باوجود نابینا ہونے کے امامت کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے تو پھر نابینا کی امامت مکروہ ہونے کا کیا مطلب ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

حاضرین میں اگر کوئی شخص نابینا سے زیادہ علم والا نہیں ہے تو اس وقت نابینا ہی امامت کیلئے اولیٰ اور بہتر ہے ۔ عتبان و ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کو جو آں سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم نے مدینہ پر خلیفہ و امام مقرر فرمایا تھا اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ آپ کی روانگی کے وقت مدینہ میں رہنے والے صحابہؓ میں ان دونوں سے کوئی بہتر نہیں تھا ۔ اگر بہ وقت نماز کوئی بینا ، نابینا سے علم و فضل میں زائد موجود ہو تو ایسی حالت میں بینا ہی امامت کا مستحق ہوگا اس کے مقابل نابینا کی امامت مکروہ ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۱ صفحہ ۳۹۲ میں ہے ؛ و یکرہ امامۃ عبد و اعرابی او فاسق و اعمیٰ الا ان یکون اعلم القوم فھو اولیٰ ۔ رد مختار میں اسی جگہ ہے ؛ و ورد فی الاعمیٰ نص خاص ھو استخلافہ صلی اللہ علیہ و سلم ابنَ ام مکتوم و عتبان رضی اللہ عنھما علی المدینۃ و کانا اعمیین لأنہ لم یبق من الرجال من ھو اصلح منھما و ھذا ھو المناسب لاطلاقھم علی استثناء الأعمیٰ ۔ اھ ، و حاصلہ ان قولہ الا ان یکون اعلم القوم خاص بالأعمیٰ اما غیرہ فلا تنتفی الکراھۃ بعلمہ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بلدہ حیدرآباد میں سال کے بارہ مہینوں میں اوقات نماز کیا ہوں گے ؟ اس کی تفصیل تحریر فرمائی جائے تاکہ حسبہٗ عمل ہو ؟

الجواب

اس بارے میں مولوی محمود بن صبغت اللہ صاحب نے فصلی مہینوں کے حساب سے ایک جنتری لکھی ہے جو عملی طور پر تجربہ سے اکثر صحیح ثابت ہوئی ہے ، لہذا حیدرآباد کے لئے توپ کی گھڑی کے موافق ذیل کی جنتری میں فصلی مہینوں کے حساب سے اوقات نماز ہر مہینہ کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کے لکھدئے گئے ہیں ۔ باقی ایام اسی پر قیاس کر لئے جائیں ۔ اور اس میں لازمی طور پر ہر وقت پندرہ منٹ کی

رعایت ملحوظ رکھی جائے یعنی اوقات مظہرہ سے پندرہ منٹ بعد نماز قائم کی جائے تاکہ کمی و بیشی وقت کی ہمیشہ احتیاط رہے:

نشان شمار	مہینے و تاریخ	طلوع صبح صادق		استواء		ابتداء عصر		غروب شمس		ابتداء عشاء	
		گھنٹہ	منٹ	گھنٹہ	منٹ	گھنٹہ	منٹ	گھنٹہ	منٹ	گھنٹہ	منٹ
۱	یکم آذر	۴	۴۳	۱۲	۵	۴	۲۳	۵	۵۹	۷	۱۷
	۱۵ آذر	۴	۴۸	۱۲	۲	۴	۱۷	۵	۴۹	۷	۷
۲	یکم دی	۴	۵۳	۱۲	۱	۴	۹	۵	۴۱	۷	۰۰
	۱۵ دی	۴	۵۸	۱۲	۳	۴	۸	۵	۳۸	۷	۰۰
۳	یکم بہمن	۵	۵	۱۲	۸	۴	۷	۵	۳۹	۷	۰۰
	۱۵ بہمن	۵	۱۲	۱۲	۱۳	۴	۱۱	۵	۴۳	۷	۷
۴	یکم اسفندار	۵	۱۹	۱۲	۲۲	۴	۱۹	۵	۵۴	۷	۱۵
	۱۵ اسفندار	۵	۲۴	۱۲	۲۸	۴	۲۷	۶	۱	۷	۲۷
۵	یکم فروردی	۵	۲۴	۱۲	۳۱	۴	۳۹	۶	۸	۷	۳۱
	۱۵ فروردی	۵	۱۸	۱۲	۳۱	۴	۳۱	۶	۱۵	۷	۳۵
۶	یکم اردی بہشت	۵	۹	۱۲	۲۹	۴	۳۸	۶	۲۱	۷	۴۱
	۱۵ اردی بہشت	۴	۵۸	۱۲	۲۵	۴	۳۹	۶	۲۴	۷	۴۳
۷	یکم خورداد	۴	۴۳	۱۲	۲۰	۴	۳۵	۶	۲۸	۷	۴۶
	۱۵ خورداد	۴	۳۳	۱۲	۱۹	۴	۴۳	۶	۳۰	۷	۵۰
۸	یکم تیر	۴	۱۸	۱۲	۲۳	۴	۴۱	۶	۳۵	۸	۰۰
	۱۵ تیر	۴	۹	۱۲	۱۳	۴	۴۵	۶	۳۹	۸	۸
۹	یکم امرداد	۴	۵۰	۱۲	۱۵	۴	۵۰	۶	۳۵	۸	۱۹
	۱۵ امرداد	۴	۵۹	۱۲	۱۸	۴	۴۲	۶	۲۹	۸	۲۶
۱۰	یکم شہریور	۴	۶	۱۲	۲۱	۴	۴۷	۶	۵۱	۸	۲۳
	۱۵ شہریور	۴	۱۲	۱۲	۲۳	۴	۵۵	۶	۵۰	۸	۲۲
۱۱	یکم مہر	۴	۱۹	۱۲	۲۲	۴	۴۹	۶	۴۳	۸	۱
	۱۵ مہر	۴	۲۶	۱۲	۲۰	۴	۳۹	۶	۳۹	۸	۱
۱۲	یکم آبان	۴	۳۵	۱۲	۱۵	۴	۳۱	۶	۲۳	۷	۳۴
	۱۵ آبان	۴	۴۱	۱۲	۱۰	۴	۴۴	۶	۱۲	۷	۳۰

(واضح رہے کہ یکم آذر، یکم اکتوبر کے مساوی ہے۔ الخ)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جولاہی یا کوڑھی امام سے کوئی بہتر شخص بہ وقت نماز موجود نہیں ہے تو ایسی حالت میں کیا تنہا نماز پڑھنے سے اس کی اقتداء کرنا بہتر ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جبکہ کوئی شخص ان اشخاص سے بہتر موجود نہیں ہے تو تنہا نماز پڑھنے سے ان کی اقتداء کرنا اولیٰ و بہتر ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب الصلاۃ باب الامامۃ میں ہے : ثم قال فیکرہ لھم التقدم و یکرہ الاقتداء بھم تنزیھا ، فان امکن الصلاۃ خلف غیرھم فھو افضل و الا فالاقتداء اولیٰ من الانفراد ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد یا عیدگاہ کے صحن میں چند قبریں واقع ہیں ۔ جب مصلی نماز ادا کرتے ہیں تو یہ قبریں مصلیوں اور قبلہ کے درمیان ہوتی ہیں ۔ کیا اس طرح نماز جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

قبر کو سامنے رکھکر نماز پڑھنا مکروہ ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ کتاب الجنائز میں ہے : و قال فی الحلیۃ و تکرہ الصلاۃ علیہ و الیہ لورود النھی عن ذلک ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد سے ملحق راستہ ہے جس کے کنارہ پر مسجد کیلئے مختصر پیشاب خانہ بنالیا گیا ہے ۔ رفتہ رفتہ پیشاب خانہ وسیع کردیا گیا جس سے راستہ تنگ ہوگیا ہے اور اب راستہ پر دیوار اٹھاکر اس پیشاب خانہ کو منتقل کرکے مسجد کیلئے دوکانیں تیار کی گئی ہیں ۔ کیا ایسی زمین جو مسجد کے روپیہ سے نہ خریدی گئی ہو ۔ اور کسی نے اس کو مسجد کے لئے وقف بھی نہ کیا ہو ۔ اور جس کے مسجد میں شریک کرلے سے عام راستہ تنگ ہوتا ہو اور مسلمانان محلہ اس کی شرکت سے اپنا سخت حرج بتلاتے ہوں ، اور اس کے مسجد میں شامل نہ کرلے سے مسجد کا کوئی نقصان بھی نہ ہو ۔ کیا اس کا مسجد کی دوکانوں میں شریک کرنا شرعا درست ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جس زمین کے مسجد میں شریک کرلے سے راستہ تنگ ہوتا ہے اور راہ گیروں کو تکلیف ہوتی ہے ایسی زمین کو مسجد میں شریک کرنا درست نہیں ہے ۔ فتح القدیر مصری جلد ۵ صفحہ ۴۳۵ فصل فی احکام المسجد

میں ہے : فلو کان طریقا للعامة ادخل بعضه بشرط ان لا یضر بالطریق ۔ مجمع الانہر جلد ۱ صفحہ ۳۸، کتاب الوقف میں ہے : و لو ضاق المسجد علی المصلین و بجنبه طریق العامة یوسع المسجد منه ای من الطریق اذا لم یضر باصحاب الطریق ۔ فتاوی قاضی خان کتاب الوقف میں باب یجعل داره مسجدا میں ہے : قوم بنوا مسجدا و احتاجوا الی مکان لیتسع المسجد فأخذوا من الطریق و أدخلوه فی المسجد ان کان یضر ذلک باصحاب الطریق فلا یجوز و الا فلا بأس به ۔ پس صورت مسئولہ میں راستہ کی زمین کو مسجد کی دوکانوں میں شریک کرنا شرعا جائز نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک چبوترہ جس پر نہ چھت ہے نہ منار ، بیس پچیس سال سے اس پر محراب و منبر قائم کرکے نماز پنجگانہ اور جمعہ ادا کیا جاتا ہے ۔ کیا ایسا چبوترہ شرعاً مسجد سمجھا جائے گا یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مالک زمین نے اگر معینہ برس کیلئے اس چبوترہ پر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو یہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہے ۔ اور اگر بلا تعین مدت نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو یہ چبوترہ اس کی ملک سے خارج اور اوقاف میں داخل ہے ، دوسری مساجد کی طرح یہ بھی مسجد ہے ، چھت و منار مسجد کیلئے شرط نہیں ہے ۔ البحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۲۶۸ کتاب الصلاۃ فصل لما اختص المسجد میں ہے : و لو قال المصنف رحمہ اللہ " و من جعل ارضه مسجداً" بدل قوله " و من بنی" لکان أولیٰ لأنه لو کان له ساحة لا بناء فیها فامر قومه ان یصلوا فیها و لم یذکر "ابدا" الا انه اراد بها الابد ثم مات لا یکون میراثا عنه و ان امرهم بالصلاۃ شهرا او سنة ثم مات تکون میراثا عنه لأنه لا بد من التأبید و التوقیت ینافی التأبید ، کذا فی الخانیة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد کی خدمت کیلئے شاہان سلف سے پیش امام و مؤذن و جاروب کش کو مساوی معاش مقرر ہے ۔ متولی مسجد چاہتا ہے کہ اس مساوات کو منسوخ کرکے پیش امام کی معاش میں کچھ زیادتی کرے اور کچھ مسجد کی تعمیر و ترمیم میں صرف کرے ، جس سے مؤذن و جاروب کش ناخوش ہیں ۔ کیا متولی کو شرعاً ایسا حق حاصل ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اس قسم کی زیادتی و کمی کا حق شرعاً سلطانِ وقت کو حاصل ہے ، اس لئے متولی کو چاہیے کہ سرکار

سے اس کی منظوری حاصل کرے۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۲ صفحہ ۴۳۹ کتاب الوقف میں ہے: و یکون الارصاد لازما لا یجوز نقضه و لا اخراجه من ایدی مستحقه غیر انه لیس وقفا حقیقة فلا تراعی شروطه بالمعنی السابق و هو انه اذ رأی ولی الأمر المصلحة فی زیادة فیه او نقص فی مصارف الوقف المذکور یسوغ له ذلک۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بالغ ہے مگر اس کو داڑھی مونچھ نہیں ہے۔ کیا یہ امامت کے قابل ہے یا نہیں؟

الجواب

جس بالغ کی عمر اتنی ہے کہ ابھی اس کے داڑھی مونچھ نکلنے کا زمانہ ختم نہیں ہوا ہے تو اس کو امرد کہتے ہیں جس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، اور جس کے داڑھی مونچھ نکلنے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور اب تک نہیں نکلی ایسے شخص کی امامت بلا کراہت درست ہے۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الامامۃ میں ہے: و کذا تکرہ خلف امرد۔ رد المحتار میں ہے: الظاهر انها تنزیهیة ایضا و الظاهر ایضا کما قال الرحمتی ان المراد به صبیح الوجه لانه محل الفتنة۔ اسی صفحہ میں ہے: سئل العلامة الشیخ عبد الرحمن بن عیسی المرشدی عن شخص بلغ من السن عشرین سنة و تجاوز حد الانبات و لم ینبت عذاره فهل یخرج ذلک عن حد الأمردیة و خصوصا قد نبت له شعرات فی ذقنه تؤذن بأنه لیس من مستدیری اللحی فهل حکمه فی الإمامة کالرجال الکاملین ام لا، اجاب سئل العلامة الشیخ احمد بن یونس المعروف بابن الشبلی من متأخری علماء الحنفیة عن هذه المسئلة فأجاب بالجواز من غیر کراهة، و ناهیک به قدوة، و کذلک سئل عنها المفتی محمد تاج الدین القلعجی فأجاب کذلک۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب امام جمعہ کا خطبہ ثانیہ پڑھ رہا ہو اس وقت کسی قسم کی نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

امام کے خطبہ شروع کرنے کے بعد دونوں خطبے ختم کر لے تک بلکہ نماز جمعہ پڑھ لینے تک نفل یا سنت پڑھنا یا بات کرنا مکروہ ہے۔ در مختار کتاب الصلاۃ باب الجمعہ میں ہے: (و اذا خرج الامام) من الحجرة ان کان و الا فقیامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة) و لا کلام (الی تمامها)۔ رد المحتار میں ہے: و غایة البیان انهما یکرهان من حین یخرج الامام الی ان یفرغ من الصلاة۔ و اللہ اعلم

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا کار امامت کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

زنا کار کی امامت مکروہ ہے ۔ در مختار کتاب الصلاۃ باب الامامت میں ہے : و یکرہ امامۃ عبد و اعرابی و فاسق و اعمیٰ ۔ رد المحتار میں ہے : قولہ الفاسق من الفسق و ھو الخروج عن الاستقامۃ و لعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر و الزانی و آکل الربا و نحو ذلک کذا فی البرجندی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے مغرب کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قارعۃ شروع کی اور تین آیت پڑھکر بھول جانے سے ایک تسبیح کی مقدار سکوت کرکے پھر ابتداء سے شروع کیا ۔ سکوت کی حالت میں مقتدیوں نے اس کو لقمہ دیا مگر زید نے لقمہ نہیں لیا ۔ کیا ایسی صورت میں بلحاظ تکرار واجب و تاخیر رکن سجدہ سہو کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں سجدہ سہو کی ضرورت نہیں مگر نماز مکروہ ہوئی ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الصلاۃ باب سابع میں ہے : و یکرہ للمقتدی ان یفتح علی امامہ من ساعتہ لجواز ان یتذکر فیصیر قارءاً خلف الامام من غیر حاجۃ کذا فی محیط السرخسی ۔ و لا ینبغی للامام ان یُلجاُھم الی القراءۃ خلفہ و انہ مکروہ بل یرکع ان قرأ قدر ما تجوز بہ الصلاۃ و الا ینتقل الی آیۃ اخریٰ کذا فی الکافی ، و فی تفسیر الالجاء ان یردد الآیۃ او یقف ساکتا کذا فی النہایۃ ۔ عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ کے صفحہ ۱۹۱ باب ما یفسد الصلاۃ میں ہے : ینبغی للامام ان لا یلجأ الی الفتح بل یرکع ان کان قرأ قدر ما تجوز بہ الصلاۃ او ینتقل الی آیۃ اخری فان احوج الیٰ ذلک بأن وقف ساکتا او مکررا و لم یرکع و لم ینتقل کرہ ۔ و کذا یکرہ للمقتدی ان یعجل فی الفتح ما لم یُلجئہ الامام کذا فی القنیۃ و فتاویٰ قاضی خان ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بحالت نشہ بغرض ادائی نماز عیدگاہ میں آیا اور نشہ کی بدحواسی میں بدزبانی شروع کی ، مصلیان عیدگاہ نے محض اس نیت سے کہ ایسی حالت میں اس کی نماز درست نہ ہوگی بلکہ اس کی بدزبانی سے دوسرے مصلیوں کی نماز میں خلل ہوگا اس کو مسجد سے چلے جانے کی فہمائش کی جب اس نے باہر جانے سے انکار کیا تو مجبوراً اس کو جماعت سے علیحدہ کردیا گیا ۔ اب زید نے مصلیان مسجد پر عدالت فوجداری میں ازالہ حیثیتِ عرفی کی نالش دائر کی ہے ۔ کیا ایسی حالت میں

مصلیوں کا یہ فعل شرعا جائز تھا یا نہیں ؟

الجواب

مسجد یا عیدگاہ میں اگر کوئی شخص بدبودار چیز استعمال کرکے آئے جس کی بو سے مصلیوں کو تکلیف پہنچتی ہے یا کوئی شخص بدزبانی سے لوگوں کو ایذاء پہنچائے تو ایسے شخص کے متعلق مصلیوں کو یہ حق ہے کہ اس کو مسجد میں آنے سے منع کریں اور اگر آگیا ہے تو اس کو باہر کردیں ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں مصلیوں کا فعل درست ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ احکام مسجد میں ہے : و اکل نحو ثوم و یمنع منه و کذا کل مؤذ و لو بلسانه ۔ عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ میں ہے : و الحق بالحدیث کل من آذی الناس بلسانه فی المسجد و به افتی ابن عمر رضی اللہ عنہما و ھو اصل فی نفی کل من یتأذی به ۔ اسی صفحہ میں ہے : و فیه ترک الاتیان الی المسجد عند اکل الثوم و نحوه و ھو بعمومه یتناول المجامع کمصلی العید و الجنازۃ و مکان الولیمۃ و حکم رحبۃ المسجد حکمه لأنه منه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بلا عذر شرعی رمضان کے روزے ترک کرتا ہے اور بعض امور خلاف شرع کا ارتکاب کرتا ہے ۔ کیا ایسا شخص امامت کرسکتا ہے ؟ بینوا توجروا

الجواب

تارک صیام فرض فاسق ہے ۔ اور فاسق کی امامت مکروہ ہے ۔ در مختار کے باب الامامۃ میں ہے : و یکرہ امامۃ فاسق ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایسے پیش امام کے حق میں جو کہ اپنی ذاتی کدورت کی وجہ سے کسی مسلمان کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آنے سے منع کرے ۔ اور اگر وہ مسجد میں آجائے تو اس کو مسجد سے نکالدے ؟

الجواب

ایسا امام فاسق و فاجر ہے ۔ کیونکہ اس نے بمضمون آیت کریمہ " وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا " مسجد کی ویرانی کی فکر ہے اور ایسی حرکت کا ارتکاب کیا ہے جس کو تمام مسلمان ناگوار سمجھتے ہیں ۔ چونکہ یہ فعل شرعا ممنوع و خلاف مروت و کرم ہے اس لئے اس کا مرتکب فاسق یعنی مرتکب گناہ کبیرہ ہے ۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی صفحہ ۳۳ میں ہے : و المقصود من ذکر

الآية انها تدل على ان هدم المساجد و تخريبها ممنوع و كذا المنع عن الصلاة و العبادة و ان كان مملوكا للمانع و قد اوعد الله تعالىٰ عليه و شنّع عليه الفقهاء و تمسكوا بهذه الآية ۔ عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۳۵۰ کتاب الشہادۃ میں ہے : و اختلفوا في تفسير الكبائر و اصح ما قيل فيه ما نقل عن الشيخ الامام شمس الأئمة الحلوائي رحمة الله عليه انه قال ما كان شنيعا بين المسلمين و فيه هتك حرمة الله تعالىٰ و الدين فهو من جملة الكبائر و كذلك ما فيه نبذ المروة و الكرم فهو من جملة الكبائر ۔ شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۱۹۸ میں ہے : و الفسق هو الخروج عن طاعة الله تعالىٰ بارتكاب الكبيرة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام کو مقتدی کی نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب

امام کو مقتدی کی نیت کرنا ضروری نہیں ۔ مگر جبکہ جماعت میں عورتیں بھی ہوں تو ان کی نیت کرنا لازم ہے ۔ بشرطیکہ وہ کسی مرد کے محاذی یعنی برابر صف میں کھڑی ہوں ۔ اگر محاذی نہ ہوں تو بھی بر بنائے احتیاط نیت کرنا چاہئے ۔ کیونکہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے ۔ البتہ نماز جنازہ و عید و جمعہ میں عورتوں کے لئے نیت کی حاجت نہیں ہے ۔ در مختار باب شروط الصلاۃ میں ہے : و الامام ينوى صلاته فقط لا امامة المقتدى لو ام رجالا ۔ و ان امّ نساء فان اقتدت به محاذية لرجل في غير صلاة جنازة فلا بدّ من نية امامتها و ان لم تقتد محاذية اختلف فيه ۔ اسی جگہ ہے : الا كجنازة اجماعاً و كجمعة و عيد على الأصح ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بعد نماز پنجگانہ و جمعہ و عیدین دعاء پکار کر مانگنا بہتر ہے یا آہستہ ؟

الجواب

دعا مانگنی خواہ کسی حالت میں ہو سراً یعنی آہستہ سنت ہے ۔ بدائع و صنائع کی جلد ۱ صفحہ ۲۰۷ فصل السنن میں ہے : و السنة في الدعاء الإخفاء ۔ عنایہ شرح ہدایہ کے باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : (قوله لأنه دعاء فمبناه على الإخفاء) كما في خارج الصلاة قال الله تعالىٰ " اُدْعُوا رَبَّكُم تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً " تفسیر احمدی سورہ اعراف میں ہے : و قالو ان الاخفاء في الدعاء اسرع اجابة بدليل قوله تعالى " اِذْ نَادٰى رَبَّه نِدَاءً خَفِيًّا " و قوله تعالى " اُدْعُوا رَبَّكُم تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً " و هذا ايضاً بالاتفاق ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دو خطبوں کے درمیان امام کے بیٹھ جانے کے وقت ہاتھ اٹھاکر دعاء مانگنا مسنون ہے یا ناجائز ؟

الجواب

دو خطبوں کے درمیان دعاء مانگنا ہاتھ اٹھاکر یا بلا ہاتھ اٹھائے کے صرف زبان سے امام و سامعین کے لئے مکروہ ہے ۔ البتہ امام کے بیٹھے رہنے تک دل سے دعاء مانگ سکتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ا صفحہ ۵۰۳ باب الجمعہ میں ہے ؛ اذا خرج الامام فلا صلاۃ و لا کلام الی تمامہ ۔ رد المحتار میں ہے ؛ و محل الخلاف قبل الشروع اما بعدہ فالکلام مکروہ تحریما باقسامہ کما فی البدائع ۔ بحر و نہر ، و قال البقالی فی مختصرہ و اذا شرع فی الدعاء لا یجوز للقوم رفع الیدین و لا تامین باللسان جہرا فان فعلوا ذلک اثموا و قیل أساؤوا و لا اثم علیہم و الصحیح ہو الاول و علیہ الفتوی ۔ مبسوط سرخسی جلد ۲ باب الجمعہ میں ہے ؛ و وجوب الانصات غیر مقصور علی حال تشاغلہ بالخطبۃ حتی یکرہ الکلام فی حالۃ الجلسۃ بین الخطبتین ۔ فتاوی مولانا عبد الحی جلد ۳ صفحہ ۳۳ میں ہے ، ملا علی قاری در شرح مشکاۃ می آرد و کیف یدعو و ہو مأمور بالانصات ؟ اجیب لیس من شرط الدعاء التلفظ بہ بل استحضارہ بقلبہ کاف؛ انتہی ۔ اس کے چند سطر بعد ہے ، و در مشکاۃ می آرد عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال کان النبی علیہ السلام یخطب ثم یجلس و لا یتکلم ثم یقوم فیخطب انتہی ۔ اسی صفحہ میں ہے ؛ و فی الکافی شرح الوافی للامام حافظ الدین ابی البرکات النسفی و کراہۃ الکلام غیر مقصور حال الخطبۃ عند ابی حنیفۃ حتی یکرہ الکلام فی حال الجلسۃ بین الخطبتین لاطلاق الحدیث ۔ رد المحتار باب الجمعہ میں ہے ، قال فی المعراج فیسن الدعاء بقلبہ لا بلسانہ لأنہ مأمور بالسکوت ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جمعہ کے روز زوال کے وقت سنت یا نوافل پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جمعہ کے دن یا دوسرے ایام میں زوال کے وقت سنت و نوافل پڑھنا مکروہ ہے ۔ بدائع و صنائع فصل بیان مایکرہ التطوع میں ہے : ففی ہذا الاوقات الثلاثۃ یکرہ کل تطوع فی جمیع الأزمان یوم الجمعۃ و غیرہ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا انتقال اکسٹھ سال کی عمر میں ہوا جو فریضہ حج سے

فارغ تھی ۔ اب اس کے ورثہ چاہتے ہیں کہ مرحومہ کی نجات و بخشش کیلئے اس کے یوم بلوغ سے وفات تک کے تمام روزوں و نمازوں کا فدیہ دیں ۔ تو اس کیلئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرحومہ کے بلوغ سے وفات تک جملہ ایام سے حیض و نفاس کے ایام کی نماز وضع کردی جائے ۔ اس کے بعد جتنے دن رہتے ہیں ان میں ہر دن کی نماز پنجگانہ و وتر جملہ چھ نمازیں مقرر کیجائیں ۔ اور ہر نماز کے لئے سوا سیر گیہوں یا اس کی قیمت فقراء و مساکین کو دی جائے ۔ اس طرح ہر سال کے رمضان کے روزوں کیلئے ہر روزہ کا فدیہ سوا سیر گیہوں دیا جائے ۔ اور ہر سال کا صدقہ فطر بھی سوا سیر گیہوں یا اس کی قیمت دی جائے ۔

یہ حکم عبادت بدنی روزہ نماز کے فدیہ کا ہے ۔ اور عبادت مالی یعنی زکاۃ کیلئے یہ حکم ہے کہ مرحومہ کے مال کا حساب لگاکر جتنے سال کی زکاۃ کہ مرحومہ پر واجب تھی اُس قدر رقم فقراء و مساکین کو دی جائے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ کتاب الصوم میں ہے : و فدية صلاة و لو وترا كما مر في قضاء الفوائت كصوم يوم على المذهب و كذا الفطرة و الاعتكاف الواجب يطعم عنه لكل يوم كالفطرة و الواجبة و الحاصل ما كان عبادة بدنية فان الوصی يطعم عنه بعد موته عن كل واجب كالفطرة ـ و المالية كالزكاة يخرج القدر الواجب ـ اور صفحہ ۱۲۱ میں ہے : و ان لم يوص و تبرع وليه جاز ان شاء الله ـ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ یتیموں کا مال کھانے والے کے پیچھے نماز بلاخلل جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

یتیموں کا مال ناجائز طریقہ پر کھانا گناہ کبیرہ ہے ۔ شرح عقائد نسفی میں ہے : و الكبيرة قد اختلف الروايات فيها فروی عن ابن عمرؓ انها تسعة : الشرک بالله و قتل النفس بغير حق و قذف المحصنة و الزنا و الفرار من الزحف و السحر و اكل مال اليتيم ۔ اور کبیرہ کا مرتکب فاسق ہے جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے ۔ شرح عقائد نسفی میں ہے : الاول ان الامة بعد اتفاقهم على ان مرتكب الكبيرة فاسق اختلفوا في انه مؤمن و هو مذهب اهل السنة ـ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الامامت میں ہے : و يكره امامة عبد و اعرابی و فاسق ـ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حنفی مقتدی اگر امام کے پیچھے عمداً یا سہواً سورہ فاتحہ

پڑھے تو کیا مقتدی کی نماز فاسد ہوگی ؟ یا سجدہ سہو لازم آئے گا ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ پڑھنے سے مقتدی کی نماز مکروہ ہوتی ہے، فاسد نہیں ہوتی اور نہ سجدہ سہو لازم آتا ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ فصل ما یکرہ فی الصلاۃ میں ہے : و تکرہ القراءۃ خلف الامام عند ابی حنیفۃ و ابی یوسف رحمہما اللہ تعالی ھکذا فی الھدایۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

زید شاہان سلف کی عطاء کردہ اسناد کے بموجب خدمت خطابت پر مامور ہے ، جس کے ذمہ منجانب سرکار رویت ہلال کا اعلان کرکے نماز عید قائم کرنا بھی ہے ۔ اس کے مقابل ایک عامی شخص نے ضد و مخالفت سے بطور خود رویتِ ہلال کا اعلان کیا اور چند اشخاص کے ساتھ علیحدہ نماز عید پڑھی ۔ پھر زید نے بھی حسب معمول آمد قدیم جماعت کثیر کے ساتھ عید کی نماز اور خطبہ پڑھا ۔ کیا عامی شخص کی نماز عید مع اسکے رفقاء کے درست ہوئی یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نماز جمعہ و نماز عید کی شروط ایک ہی ہیں ، صرف فرق اتنا ہے کہ عیدین میں خطبہ نماز کے بعد مسنون ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۹۳ میں ہے : و یشترط للعید ما یشترط للجمعۃ الا الخطبۃ کذا فی الخلاصۃ فانھا سنۃ بعد الصلاۃ ۔ نماز جمعہ کے لئے بادشاہ وقت یا اس کا نائب یعنی قاضی یا خطیب وغیرہ ہونا شرط ہے ، ان کی اجازت کے بغیر جمعہ جائز نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۹۳ میں ہے : و منھا السلطان عادلاً کان او جائراً ھکذا فی التاتارخانیۃ ناقلا عن النصاب او من امرہ السلطان و ھو الامیر او القاضی او الخطیب کذا فی العینی شرح الھدایۃ حتی لا یجوز اقامتھا بغیر امر السلطان و امر نائبہ کذا فی السرخسی ۔ پس صورت مسئولہ میں جس شخص نے خطیب مقررہ سرکاری کی اجازت کے بغیر نماز عید پڑھی شرعاً درست نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام نے آیات " فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ " میں تقدیم و تاخیر کرکے پھر درست طور پر اس کا اعادہ کیا ۔ کیا نماز ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

ایسی تقدیم و تاخیر سے چونکہ معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور امام نے اس کا صحیح طور پر اعادہ بھی

کرلیا ہے اس لئے صورت مسئول میں نماز تمام ہوگئی ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الصلاۃ فصل زلۃ القاری میں ہے : و ان قدّم کلمة او اَخّر ان لم یتغیر المعنی لا تفسد ۔ دوسری جگہ ہے : و ان قدم کلمتین علی کلمتین ففیما یتغیر به المعنی تفسد و فیما لا یتغیر لا تفسد انتهی ملخصا ۔ خزانۃ الروایۃ کی فصل زلۃ القاری میں ہے : ذکر فی الفوائد و لو قرأ فی الصلاۃ بخطأٍ فاحش ثم رجع و قرأ صحیحا قال عندی صلاته جائزة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نفل نماز جماعت کے ساتھ اداء کرنا اور نوافل میں قراءت جہر سے پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

تراویح کے سوا دیگر نوافل جماعت سے پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ کتاب الصلاۃ باب الوتر و النوافل میں ہے : و النفل بالجماعة غیر مستحب لانه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان اھ ، و هو الصحیح فی انها کراهة تنزیه ۔

نفل نمازیں اگر دن میں پڑھی جائیں تو ان میں قراءت آہستہ پڑھی جائے اور اگر رات میں پڑھی جائیں تو آہستہ اور آواز سے دونوں طریقوں سے پڑھنا جائز ہے ۔ کنز الدقائق کے باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : و یسر فی غیرهما کمتنفل بالنهار و خیّر المنفرد فیما یجهر کمتنفل باللیل ۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نماز جمعہ و عید کے لئے ضروری ہدایات

یہ بات ظاہر ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائی سے ہر ایک مسلمان کی یہی غرض ہوتی ہے کہ حقوق شرعیہ سے سبکدوشی حاصل کرکے سرمایہ آخرت فراہم کیا جائے ۔ اور یہ غایت اس وقت حاصل ہوگی جبکہ ہر ایک فرض و واجب کی ادائی اس کے آداب و لوازمات مشروعہ کے ساتھ کی جائے ۔ نمازی عیدگاہ میں نماز عید کیلئے اور مساجد میں نماز جمعہ کیلئے جمع ہوتے ہیں ۔ مگر عیدگاہ و مسجد کے آداب و ضروریات نماز سے ناواقف ہونے کے سبب اکثر ایسے افعال ممنوعہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں جن سے بچنے کیلئے شریعت میں خوف دلایا گیا ہے ، اور صریح ممانعت کے ساتھ بعض کے متعلق یہ بھی ظاہر کردیا گیا ہے کہ ان امور کا مرتکب نفس نماز کے ثواب سے بھی محروم کردیا جاتا ہے ۔ حالانکہ حصول ثواب و تعمیل حکم ربانی میں ہر ایک مؤمن سارے مصائب برداشت کرتا ہے اور جب وہی حاصل نہ ہو تو پھر خسارہ آخرت یقینی ہے ۔ اسلئے بغرض افادہ عام چند احادیث اور ان کا سلیس اردو میں ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ مسلمان نصیحت حاصل کریں اور اپنی عبادات کے بےبہا سہ کو تھوڑی سی بےاحتیاطی میں ضائع نہ کریں :

خطبہ سننے کی ترغیب اور خطبے کے دوران بات کرنے کی ممانعت

عن عمر رضی اللہ عنہ قال : انما جعلت الخطبة موضع الرکعتین۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے۔ یعنی اگر کسی کا خطبہ فوت ہوگیا تو گویا اس کی دو رکعتیں گئیں۔

ھذا تأویل لما ورد بہ الأثر من ان الخطبة کشطر الصلاة فان مقتضاہ انہا قامت مقام رکعتین من الظہر کما قامت الجمعة مقام رکعتین۔

حدیث میں وارد ہے کہ خطبہ نماز کے نصف حصہ کے مانند ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ظہر کی چار رکعتوں میں سے دو رکعتیں تو نماز جمعہ کی ہیں اور باقی دو کے قائم مقام خطبہ ہے۔

قال سعد لرجل یوم الجمعة : لا صلاة لک۔ فذکر ذلک الرجل للنبی صلی اللہ علیہ و سلم فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان سعدا قال لا صلاة لک ! فقال النبی صلی اللہ علیہ و سلم لِمَ یا سعد ؟ قال : انہ تکلم و انت تخطب۔ فقال : صدق سعد۔

سعد رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن ایک شخص سے کہا کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے رسول اللہ علیہ السلام سے عرض کیا۔ آپ نے سعد سے پوچھا کہ تم نے کیوں ایسا کہا؟ سعد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے خطبہ پڑھنے کے وقت اس نے بات کی اس لئے میں نے کہا کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔ تب آپ نے فرمایا کہ سعد نے بالکل سچ کہا۔

عن ابی سلمة بن عبد الرحمٰن بن عوف قال کان ابو ذر الغفاری جالسا الی جنب اُبَیّ ابن کعب یوم الجمعة و رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یخطب، فتلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم آیة لم یکن ابو ذر سمعہا فقال ابو ذر لأُبَیّ : متیٰ انزلت ھذہ الآیة ، فلم یکلمہ فلما اقیمت الصلاة قال لہ ابو ذر : ما منعک ان تکلمنی حین سئلتک ، فقال لہ اُبَیّ : انہ لیس لک من جمعتک الا ما لغوت۔ فانطلق ابو ذر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فأخبرہ ، فقال : صدق اُبَیّ ، فقال ابو ذر : استغفر اللہ و اتوب الیہ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اللّٰھم اغفر لأبی ذر و تب علیہ۔

جمعہ کے دن خطبہ کے وقت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کے بازو میں بیٹھے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے خطبہ میں ایک آیت پڑھی جس کو حضرت ابو ذر نے نہیں سنا تھا تب آپ نے اُبَیّ بن کعب سے پوچھا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ اُبَیّ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جب نماز کھڑی ہوئی تب ان سے جواب نہ دینے کا سبب دریافت کیا ؟ تو اُبَیّ نے فرمایا کہ بحالت خطبہ بات کرنے میں تم کو جمعہ کے ثواب کے بدلے گناہ ملا۔ ابو ذر نے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ اُبَیّ بن کعب نے جو کہا ہے وہ سچ ہے۔ تب ابو ذر نے آنحضرت علیہ السلام کے روبرو توبہ و استغفار کی اور آپ نے بھی ان کیلئے قبول توبہ و مغفرت کی بارگاہ ایزدی میں دعاء فرمائی۔

عن صالح بن ابراهيم بن عبد الرحمن بن عوف قال دخل علينا انسٌ يوم الجمعة و الامام يخطب و نحن نتحدث فقال مه ؟ فلما اقيمت الصلاة قال : انى اخاف ان اكون ابطلت جمعتى بقولى لكم مه ، قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : من دنا فاستمع و لم ينصت كان عليه كفلان من الاثم و من دنا و لم يستمع و لم ينصت كان عليه كفل من الوزر و من قال " مه " فقد تكلم و من تكلم فلا جمعة له .

صالح بن ابراہیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن امام کے خطبہ پڑھتے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ آئے اور ہم اس وقت باتیں کررہے تھے انھوں نے ہم کو چپ رہنے فرمایا۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو فرمانے لگے کہ تم کو جو میں نے چپ رہنے کہا اس سے مجھے خوف ہے کہ میری نماز جمعہ باطل ہوگی ؟ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جو کوئی نماز جمعہ کیلئے آئے اور خطبہ سنتے وقت باتیں کرے اس پر گناہ کے دو بوجھ ہیں ۔ اور جو کہ خطبہ نہ سنکر باتیں کرے اس پر گناہ کا ایک بوجھ ہے۔ اور جو دوسرے کو چپ کہا اس نے بات کی اور بات کرنے والے کا جمعہ نہیں ہوتا۔

قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : من تكلم يوم الجمعة و الامام يخطب كالحمار يحمل اسفارا و الذي يقول له انصت ليس له جمعة .

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ جمعہ کے دن خطبہ کے وقت جو بات کرے وہ مثل گدھے کے ہے جس پر دفتر لدے ہوئے ہوں اور جو دوسرے بات کرنے والے کو چپ کہے اس کا جمعہ نہیں ۔

تخطی علی الرقاب یعنی لوگوں کی گردنوں پر سے پھلانگتے ہوئے آگے جانے کی سخت ممانعت

قال رسول الله صلى الله عليه و سلم لرجل : قد رأيتك تتخطى رقاب الناس و تؤذيهم ، من آذى المسلمين فقد آذانى و من آذانى فقد آذى الله عز و جل .

آنحضرت علیہ السلام کے روبرو ایک شخص لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے کی صف میں پہنچا آپنے اس کو فرمایا کہ میں نے تجھے دیکھا کہ تو لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا انکو ایذا دے رہا تھا جس نے مسلمانوں کو ایذاء دی مجھے ایذا دی ہے اور جسنے مجھے ایذاء دی اللہ تعالیٰ کو ایذاء دی ۔

قال النبى صلى الله عليه وسلم : الذى يتخطى رقاب الناس و يفرق الاثنين يوم الجمعة بعد خروج الامام كالجار قصبه فى النار .

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی جمعہ کے دن امام کے خطبہ کیلئے نکلنے کے بعد لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اور دو شخصوں کو جدا کرتے ہوئے آگے جاتے وہ اپنی آنتیں جہنم میں کھینچنے والے کی طرح ہے ۔

روى الترمذي عن معاذ بن جبل رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم من تخطى رقاب الناس يوم الجمعة اتخذ جسرا على النار .

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا ، جو کوئی جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے جائے وہ جہنم پر پل بنا دیا جائے گا ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یبطئ احدکم ثم یتخطی رقاب الناس و یؤذیھم ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ تم لوگ دیر سے آتے ہو اور لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر ان کو ایذا پہنچاتے ہو ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : من ترک الصف الاول مخافۃ ان یؤذی مسلما فصلی فی الصف الثانی او الثالث اضعف اللہ له اجر الصف الاول ۔

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی لوگوں کی ایذاء و تکلیف کے خیال سے گردنیں پھلانگ کر آگے نہ جائے بلکہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے تو خدائے پاک اس کو صف اول کے ثواب سے دوچند ثواب عطاء فرماتا ہے ۔

بحالت نماز صف سیدھی رکھنے کا حکم اور دور دور متفرق کھڑے ہونے کی ممانعت

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : من وصل صفاً وصله اللہ ، و من قطع صفا قطعه اللہ ۔

آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے صف کو ملایا خدا اس سے ملیگا اور جس نے صف کو دور کیا خدا اس سے دور ہوگا ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : لتسون صفوفکم فی صلاتکم او لیخالفن اللہ بین قلوبکم ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا اگر تم نماز میں صفیں سیدھی نہ رکھوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں خلاف ڈالدے گا ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : لتسون الصفوف او لتطمسنّ الوجوہ و لتغمضنّ ابصارکم ۔ او : لتخطفنّ ابصارکم ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا اگر تم نماز میں صفیں سیدھی نہ رکھوگے تو تمہارے چہرے بگاڑ دیے جائیں گے ۔ اگر تم نماز میں نظر نیچی نہ رکھوگے تو تمہاری بینائیاں چھین لی جائیں گی ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : راصّوا الصفوف فان الشیطان یقوم فی الخلل ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ صف میں جگہ مت چھوڑو اور بالکل ملے رہو ۔ کیونکہ شیطان خالی جگہ میں (وسوسہ ڈالنے کیلئے) کھڑا ہوجاتا ہے ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : سوّوا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلاۃ

آنحضرت علیہ الصلاۃ و السلام نے فرمایا کہ صفیں سیدھی رکھو کیونکہ صف سیدھی رکھنے میں نماز کی درستی ہے ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم : من حسن الصلاۃ اقامۃ الصف ۔

آنحضرت علیہ الصلاۃ و السلام نے فرمایا کہ صف سیدھی رکھنے میں نماز کی خوبی ہے ۔

قال عمر بن الخطاب : ان اللہ و ملائکته یصلون علی الذین یقیمون الصف ۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے صف سیدھی رکھنے والوں پر رحمت بھیجتے ہیں ۔

قال النبی علیه الصلاۃ و السلام : زین الصلاۃ الحذاء ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا : صف سیدھی رکھنے میں نماز کی زینت ہے ۔

کتاب الجنائز

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا انتقال ہوا اور اس کے پاس اس قدر مال موجود ہے کہ مصارف تجہیز و تکفین و فاتحہ دہم و چہلم پورے ہو سکیں۔ آیا یہ مصارف اس مال سے ادا کئے جائیں یا اس کے زوج کے ذمہ ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

زوجہ مالدار ہی کیوں نہ ہو اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف زوج کے ذمہ واجب ہیں، اور یہ قاعدہ کلیہ بتایا گیا ہے کہ زندگی میں جس پر نفقہ واجب ہے مرنے کے بعد بھی اسی پر تجہیز و تکفین واجب ہے۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۰۹ میں ہے: و اختلف فی الزوج و الفتویٰ علیٰ وجوب کفنھا و ان ترکت مالا۔ اور رد محتار کے اسی صفحہ میں ہے: و الاصل فیہ ان من یُجبر علیٰ نفقتہ فی حیاتہ یُجبر علیھا بعد موتہ۔

فاتحہ دہم و چہلم چونکہ ایصال ثواب میں داخل ہے اس لئے زوجہ کے مال سے کئے جائیں، زوج کو اس سے کچھ تعلق نہیں، کیونکہ شرعاً مصارف تجہیز و تکفین کے سوا دیگر زوائدات زوج پر واجب نہیں ہیں۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میت کو مقام موت سے دوسرے مقام میں لے جاکر دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف اٹھا لیجانا اگرچہ فعل انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا انتقال مصر میں ہوا تھا شام کی طرف آپ کا جنازہ منتقل کیا گیا، اور موسیٰ علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے تابوت کو ایک عرصہ دراز کے بعد مصر سے شام کی طرف ان کے آباء و اجداد کے ساتھ رکھنے کیلئے نقل کیا۔ مگر علماء احناف کا قوی قول یہ ہے کہ اگر جنازہ مقام موت سے ایک میل یا دو میل کے فاصلہ پر لے جاکر دفن کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر اس سے

زیادہ فاصلہ پر لیجائیں تو یہ مکروہ ہے ۔ یعقوب اور یوسف علیہما السلام کے جنازہ کا مصر سے شام تک منتقل کیا جانا ہمارے لئے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ پچھلی شریعت کے احکام ہیں جو ہمارے لئے واجب العمل نہیں ہیں ۔ علاوہ بریں یعقوب اور یوسف علیہما السلام دونوں ہی نبی تھے جن کے جسم نہایت لطیف اور فساد سے عاری تھے اور دیگر اجسام تو موت کے ساتھ ہی خراب ہونے لگتے ہیں ۔ اس لئے مقام موت ہی میں جہاں تک جلد ہو سکے دفن کرنا بہتر ہے ۔ فتح المعین جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : اما قبل الدفن فلا بأس ما لم یکن الیٰ ما فوق المیلین فیکرہ ظهیریة ۔ و ما فی التجنیس ان لا اثم فی النقل من بلد لأن یعقوب علیه السلام مات بمصر فنقل الی الشام و موسیٰ علیه السلام نقل تابوت یوسف علیه السلام بعد ما اتیٰ علیه زمان من مصر الی الشام لیکون مع آبائه ۔ رده الکمال بأنه شرع من قبلنا علی ان غیر الانبیاء علیهم الصلاۃ و السلام لا یقاس علیهم لأنهم اطیب ما یکون فی الموت کالحیاۃ لا یعتریهم تغیر ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۳۸ میں ہے : (قوله و لا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقا و قیل الی ما دون مدۃ السفر و قیده محمد بقدر میل او میلین لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فیکره فیما زاد قال فی النهر عن عقد الفرائد و هو الظاهر و اما نقله بعد دفنه فلا مطلقا ۔ قال فی الفتح و اتفقت کلمة المشایخ فی امرأۃ دفن ابنها و هی غائبة فی غیر بلدها فلم تصبر و ارادت نقله علی انه لا یسعها ذلک فتجویز شواذ بعض المتأخرین لا یلتفت الیه ۔ و اما نقل یعقوب و یوسف علیهما السلام من مصر الی الشام لیکونا مع آبائهما الکرام فهو شرع من قبلنا و لم یتوفر فیه شروط کونه شرعا لنا ۔ اسی صفحہ میں در مختار میں ہے : و یندب دفنه فی جهة موته و تعجیله ۔ اور رد محتار میں ہے : ای فی مقابر اهل المکان الذی مات فیه او قتل ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کہنہ قبر کو کسی کے دفن کے واسطے قصداً کھولنا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

قبر اگر اس قدر پرانی ہے کہ اس کے مُردے کی ہڈیوں کا گل کر مٹی ہوجانے کا یقین ہے تو ایسی حالت میں اس قبر کو کھولکر نیا مُردہ اس میں دفن کرسکتے ہیں ۔ اگر کھولنے کے بعد اس میں ہڈیاں نکل آئیں تو چاہیئے کہ ان کو ایک جگہ جمع کر کے نئے مردے اور ان ہڈیوں کے درمیان مٹی کی روک بنادی جائے ۔ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۶۲۳ باب صلاۃ الجنائز میں ہے : قال فی الفتح و لا یحفر قبر لدفن آخر الا ان بلی الاول فلم یبق له عظم الا ان یوجد فتضم عظام الاول و یجعل بینهما حاجز من تراب ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ باب الجنائز میں ہے : و لو بلی المیت و صار ترابا جاز دفن غیره

فی قبرہ و زرعہ و البناء علیہ کذا فی التبیین ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۶۲۸ باب صلاۃ الجنائز میں ہے : کما جاز زرعہ و البناء علیہ اذا بلی و صار ترابا زیلعی ۔ رد محتار میں ہے :
(قولہ کما جاز زرعہ) ای القبر و لو غیر مغصوب و کذا یجوز دفن غیرہ علیہ کما فی الزیلعی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ مسجد میں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی ؟ اگر تحریمی ہے تو اس کی علت کیا ہے ؟ اور تنزیہی ہے تو اس کی علت کیا ہے ؟ ان دونوں میں ترجیح کس کو ہے ؟ اور کن کن بزرگان دین کی نماز جنازہ مسجد میں ادا ہوئی ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نماز جنازہ کا مسجد میں ادا کرنا بعض فقہاء نے مکروہ تحریمی لکھا ہے ۔ اور بعض نے تنزیہی ۔ کراہت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مسجد نماز و ذکر الٰہی و تدریس علوم دینیہ کیلئے بنائی گئی ہے ۔ اس کے سوا اس میں دوسرے کام ٹھیک نہیں ۔ علاوہ بریں جنازے کے مسجد میں لانے سے تلویث مسجد یعنی مسجد کے نجس ہونے کا بھی اندیشہ ہے ۔ اور احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز جنازہ مسجد میں پڑھنے والے کو ثواب نہیں ملتا ۔ بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوتی ۔ ہدایہ طبع مصطفائی کے فصل صلاۃ علی المیت میں ہے : و لا یصلی علی میت فی مسجد جماعۃ لقول النبی صلی اللہ علیہ و سلم " مَن صلی علی جنازۃ فی المسجد فلا اجر لہ " و لأنہ بنی لأداء المکتوبات و لأنہ یحتمل تلویث المسجد ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۶۱۹ میں ہے : (و کرہت تحریما و قیل تنزیھا فی مسجد جماعۃ ھو فیہ و اختلف فی الخارجۃ و المختار الکراھۃ) مطلقا ۔ خلاصہ ، بناءً علیٰ ان المسجد انما بنی للمکتوبۃ و توابعھا کنافلۃ و ذکر و تدریس علم و ھو الموافق لاطلاق حدیث ابی داود " من صلی علی میت فی المسجد فلا صلاۃ لہ " ۔

مگر صاحب فتح القدیر نے اپنی رائے میں کراہت تنزیہی کو ترجیح دی ہے ۔ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۹۰ میں ہے : ثم ھی کراھۃ تحریم او تنزیہ روایتان و یظھر لی ان الاولیٰ کونھا تنزیھیۃ اذ الحدیث لیس ھو نھیا غیر مصروف و لا قرن الفعل بوعید بظنی بل سلب الاجر و سلب الاجر لا یستلزم ثبوت استحقاق العقاب لجواز الاباحۃ ۔ اور حدیث " لا صلاۃ لہ " عدم کمال پر محمول کی گئی ہے ۔ چنانچہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۲۰ میں ہے : و کذا یقال فی روایۃ " فلا صلاۃ لہ " لانہ علم قطعا انھا صحیحۃ فھی مثل " لا صلاۃ لجار المسجد الا فی المسجد " بل تأویل ھذہ الروایۃ اقرب ای لا صلاۃ کاملۃ ۔ بلا کسی عذر کے مسجد میں نماز پڑھانے کے متعلق یہ کراہت ہے ۔ اور اگر بارش یا کثرت ناس وغیرہ اعذار کی وجہ سے نماز جنازہ مسجد میں پڑھائی جائے تو بلا کراہت جائز ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱

صفحہ ۱۰۵ کتاب الجنائز میں ہے : و لا تکره بعذر المطر و نحوه کذا فی الکافی ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۹۲۰ میں ہے : انما تکره فی المسجد بلا عذر فان کان فلا ۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا بیضاء کے دونوں لڑکوں سہیل اور ان کے بھائی پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا احادیث میں مروی ہے ، مگر اس کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اعتکاف میں تھے اس لئے مسجد ہی میں نماز جنازہ ادا کی گئی ۔ بعض روایات میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے جنازوں پر بھی مسجد میں نماز پڑھنا بیان کیا گیا ہے ، مگر صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں کہ ان روایات سے صراحتاً ان دونوں کے جنازوں کا مسجد میں داخل کیا جانا ثابت نہیں ، ممکن ہے کہ جنازہ خارج مسجد تھا اور لوگ مسجد میں ہوں گے ۔ فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۹۱ میں ہے : و ما فی مسلم لما توفی سعد بن ابی وقاص قالت عائشة ادخلوا به المسجد حتی اصلی علیه فانکروا ذلک علیها فقالت واللّٰه لقد صلی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم علیٰ ابنی بیضاء فی المسجد سهیل و اخیه ۔ قلنا اولا واقعة حال لا عموم لها فیجوز کون ذلک لضرورة کونه کان معتکفا ۔ اسی صفحہ میں : و المروی من صلاتهم علی ابی بکر و عمر رضی اللّٰه عنهما لیس صریحا فی انهما ادخلاه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسلمانوں کی قبور اگر مسلمان کھودکر ہڈیاں نکالیں اور قبور کے نشانات اور چبوترے منہدم کردیں تو شرعاً ان کے حق میں قاضی (حاکم) کو کیا حکم دینا چاہئے ؟

الجواب

کہنہ قبر جس میں کہ مردہ گل کر مٹی ہوگیا ہو ، اگر مالک زمین اس کو توڑکر زمین کے برابر کردے اور اس میں زراعت یا مکان تعمیر کرے تو شرعاً درست ہے ۔ در مختار کے باب الجنائز میں ہے : جاز زرعه و البناء علیه اذا بلی و صار ترابا ۔ اسی طرح زمین مغصوبہ میں مردہ دفن کیا جائے تو مالک زمین کو یہ حق ہے کہ اس کو اپنی زمین سے نکلوادے یا قبر توڑکر زمین اپنے کام میں لائے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ فصل سادس میں ہے : اذا دفن المیت فی ارض غیره بغیر اذن مالکها فالمالک بالخیار ان شاء امر باخراج المیت و ان شاء سوی الارض و زرع فیها کذا فی التجنیس ۔ ان دو صورتوں کے سوا کسی مسلمان کا بلا وجہ شرعی مسلمان کی قبر توڑنا اور اس کی ہڈیاں نکالنا درست نہیں ، کیونکہ شریعت میں جس طرح مسلمان عین حیات قابل تعظیم و تکریم ہے مرنے کے بعد بھی اس کی وہی عظمت ہے ۔ فتح القدیر کے جلد ۱ فصل فی الدفن میں ہے : الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتا کحرمته حیا ۔

پس جو مسلمان کہ بلا وجہ شرعی اس فعل قبیح و منکر کا مرتکب ہو وہ مستحق تعزیر و تادیب ہے ۔ در مختار کے کتاب الحدود باب التعزیر میں ہے : و عُزِّرَ کُلّ مرتکب منکراً و مؤذی مسلمٍ بغیر حقٍ بقولٍ

او فعل ۔ تعزیر شریعت میں مندرجہ ذیل طریقوں سے دی جاتی ہے ، کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ انچالیس کوڑے مارنا ، یا قید کرنا ، یا گردنی دینا ، یا کان ملنا ، یا سخت و درشت باتیں سنانا ، یا قاضی کا اس کو ترش روی سے دیکھنا ۔ جرمانہ لینا خلاف مذہب ہے ۔ پس ان طریقوں کے متعلق قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ مجرم کی حالت و حیثیت کے مطابق اس پر تعزیر جاری کرے ۔ در مختار کے اسی باب میں ہے : (هو تأديب دون الحد أكثره تسعة و ثلاثون سوطا و اقله ثلاثة و لا يفرق الضرب فيه و يكون به) و بالحبس و (بالصفع) على العنق (و فرك الأذن و بالكلام العنيف و بنظر القاضي له بوجه عبوس و شتم غير القذف لا بأخذ مال في المذهب و) التعزير (ليس فيه تقدير بل هو مفوض الى رأى القاضي) و عليه مشايخنا ۔ زيلعي ۔ لأن المقصود منه الزجر و احوال الناس فيه مختلفة ۔ بحر ، و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زمین مملوکہ میں بلا اجازت عمرو نے غصبا اپنے ایک عزیز کی میت کو دفن کیا ۔ پس زمین مغصوبہ میں مردہ رہ سکتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

زید کو حق ہے کہ مردے کو اپنی زمین سے نکلوادے ، یا قبر کو زمین کے برابر کرکے زمین اپنے کام میں لائے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ الفصل السادس میں ہے : اذا دفن الميت في ارض غيره بغير اذن مالكها فالمالك بالخيار ان شاء امر باخراج الميت و ان شاء سوى الارض و زرع فيها كذا في التجنيس ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسبی عورتیں جو علانیہ کسب کرتی ہیں اور ان کے متعلقین و لواحقین جو خلاف ورزی احکام شرعی میں مبتلا ہیں ۔ کیا ان کی تجہیز و تکفین و صلاۃ جنازہ مسلمانوں پر واجب ہے یا نہیں ؟ اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ زندگی میں کیا برتاؤ رکھنا چاہئے ؟

الجواب

مرتکب گناہ کبیرہ شرعاً فاسق و فاجر ہے ۔ اہل سنت و جماعت کے پاس فسق و فجور سے انسان دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا ، اس لئے ہر فاسق و فاجر پر جبکہ اس کا ایمان پر خاتمہ ہو اس کے جنازے کی نماز پڑھنا اور مسلمانوں کے طریقے پر اس کی تجہیز و تکفین کرنا مسلمانوں پر لازم ہے ۔ عقائد نسفی میں ہے : و الكبيرة لا تخرج العبد المؤمن من الايمان و لا تدخله في الكفر ۔ اسی کتاب میں ہے : و يصلى على كل بر و فاجر ۔ شرح میں ہے : اذا مات على الايمان للاجماع ، و لقوله عليه السلام :

" لا تدعوا الصلاۃ علی من مات من اھل القبلۃ " ۔

زندگی کی حالت میں فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً نامعتبر ہے ، اور قابل حد و قابل تعزیر گناہوں پر حد لگائے جانے اور تنبیہ کئے جانے کا مستحق ہے ۔ قاضی کو چاہئے کہ اس کو توبہ کرنے کا حکم دے ۔ شرح مقاصد جلد دوم بحث ثامن میں ہے : و حکم الفاسق الحد فیما یجب فیہ الحد و التعزیر فی غیرہ و الامر بالتوبۃ و رد الشھادۃ و سلب الولایۃ علی اختلاف الفقھاء ۔ پس بہتر یہ ہے کہ مسلمان ایسے شخص سے احتراز کریں تا کہ ان کی صحبت کا اثر نہو ، اور ان کو ان احتراز و اجتناب سے عبرت و نصیحت حاصل ہو ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال بحالت سفر علاقہ خاندیس میں ہوا ، کیا اس کی لاش کو دفن کرنے کے بعد مقام دفن سے سات کوس کے فاصلہ پر دوسرے مقام کو منتقل کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

دفن کے بعد میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنا درست نہیں ہے ۔ در مختار طبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۸۲۸ کتاب الجنائز میں ہے : و لا یخرج منہ بعد اھالۃ التراب علیہ ۔ اور رد المحتار میں ہے : و اما نقلہ بعد دفنہ فلا مطلقا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کی تعمیر کے وقت زمین میں سے مردوں کی پرانی ہڈیاں برآمد ہوئیں اور یہ معلوم ہوا کہ یہاں زمانہ سابق میں قبرستان تھا ۔ کیا ایسی جگہ مسجد بنانا اور بن جانے کے بعد اس میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مقبرہ جبکہ اس قدر پرانا ہو جائے کہ مُردوں کی لاشیں گل کر مٹی ہوجائیں اور غلاظت و عفونت کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو اس پر مسجد بنانا اور نماز پڑھنا درست ہے ۔ پرانی ہڈیوں کا برآمد ہونا مسجد کی تعمیر کیلئے مانع نہیں ہے ۔ عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۵۹ میں ہے : و المقبرۃ اذا عفت و دثرت تعود ملکا لأربابھا فاذا عادت ملکا یجوز ان یبنی موضع المقبرۃ مسجدا و غیر ذلک ، فاذا لم یکن لھا ارباب یکون لبیت المال ۔ و فیہ ان القبر اذا لم یبق فیہ بقیۃ من المیت و من ترابہ المختلط بالصدید جازت الصلاۃ فیہ ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ کتاب الجنائز فصل سادس میں ہے : و لو بلی المیت و صار

ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ و زرعہ و البناء علیہ ، کذا فی التبیین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ حاملہ کے خاوند کا انتقال ہوکر ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے ۔ ہندہ اس وقت خاوند کے مکان مسکونہ ہی میں سکونت پذیر ہے ، مگر اس مکان میں ایک رشتہ دار کے علیل ہوجانے کی وجہ سے حکماء نے ہندہ کو تبدیل مکان کی رائے دی ہے ۔ کیا ایسی حالت میں ہندہ تبدیل مکان کرسکتی ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اگر ہندہ کو اپنی جان کا سخت خوف ہے تو تبدیل مکان کرسکتی ہے ، مگر شرط یہ ہے کہ اس مکان کے قریب کسی دوسرے مکان میں رہے ، دور نہ جائے ، اور جس مکان میں بھی جائے گی پھر وہاں سے بھی تا ختم عدت بلا خوف و خطر باہر جا نہیں سکتی ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۳۵ میں ہے : ان لم یکن الخوف شدیدا لیس لھا ان تنتقل من ذلک الموضع و ان کان الخوف شدیدا کان لھا ان تنتقل ۔ اسی صفحہ میں ہے : و اذا انتقلت لعذر یکون مسکنھا فی البیت الذی انتقلت الیہ بمنزلۃ کونھا فی المنزل الذی انتقلت منہ فی حرمۃ الخروج عنہ کذا فی البدائع ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۳۲ فصل الحداد میں ہے : فتخرج لاقرب موضع الیہ و فی الطلاق الی حیث شاء الزوج ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشائخین جو بزرگوں کی وفات کے دن ان کی مزاروں پر روشنی وغیرہ کرکے مجمع کرتے ہیں جس کا نام " عرس " ہے کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم ہر سال کی ابتداء میں شہداء احد کی قبور پر بغرض زیارت تشریف فرما ہوتے تھے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۳۰ باب الجنائز میں ہے : و فیہ یستحب ان یزور شھداء جبل احد لما روی ابن ابی شیبۃ ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم کان یاتی قبور الشھداء باحد علیٰ رأس کل حول فیقول " اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ " ۔ اور حدیث شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ سوال و جواب کے بعد نیک بندہ کی قبر چار ہزار تو سو ہاتھ کشادہ کردی جاتی ہے اور اس میں نور پھیلایا جاتا ہے ، پھر یہ کہا جاتا ہے کہ تو اس میں سو رہ ! جب وہ خوشی میں کہتا ہے کہ میں اپنے لوگوں کو اس انعام و افضال الٰہی کی خبر دیتا ہوں ۔ جب اس کو کہا جاتا ہے کہ تو میاں قیامت تک اس طرح سو رہ جیسے عروس یعنی دولھا سو رہتا ہے کہ اس کے محبوب کے سوا اس کو کوئی اور جگا نہیں سکتا ۔ اب خداوند عالم ہی اس جگہ سے اٹھائیگا ۔ ترمذی شریف مطبوعہ نظامی کے جلد ۱ صفحہ ۱۲۷

باب عذاب قبر کی طویل حدیث میں ہے: ثم یفسح له فی قبره سبعون ذراعا فی سبعین ثم ینور له فیه ثم یقال له نم فیقول ارجع الی اهلی فاخبرهم فیقولان نم کنومة العروس الذی لا یوقظه الا احب اهله حتی یبعثه الله من مضجعه ذلک۔ صورت مسئولہ میں مشائخین وغیرہ کا سال میں ایک دفعہ صالحین و اولیاء کبار کے قبور پر بغرض زیارت جمع ہونا یہ حدیث زیارت شہداء احد سے ثابت ہے۔ اور وفات کے دن کا نام عرس رکھنا یہ حدیث نم کنومة العروس سے مستفاد ہے۔ کیونکہ اس روز محبوب حقیقی کے وصال اور اس کے بےغایت انعام و افضال نے ان کو جو مسرور کیا ہے اس کی مثال دنیا میں اہل دنیا کی شادی کے دن کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔

اور ملک مغرب کے بعض مشائخین عظام کے اقوال سے ثابت ہے کہ بزرگوں کے عرس کے دن زائرین کو جو برکات و فیوض حاصل ہوتے ہیں وہ بہ نسبت دوسرے ایام کے بہت کچھ زائد ہوتے ہیں۔ ما ثبت بالسنۃ کے صفحہ ۶۸ میں مولانا شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فان قلت هل لهذا العرف الذی شاع فی دیارنا فی حفظ اعراس المشایخ فی ایام وفاتهم اصل فان کان عندک علم بذلک فاذکره؟ قلت قد سئل عن ذلک شیخنا الامام عبد الوهاب المتقی المکی فاجاب بأن ذلک من طریق المشایخ و عاداتهم و لهم فی ذلک نیات قلت کیف تعین الیوم دون سائر الأیام فقال الضیافة مسنونة علی الاطلاق فاقطعوا النظر عن تعیین الیوم و له نظائر کمصافحة بعض المشایخ بعد الصلاة و کالاکتحال یوم عاشوراء فانه سنة علی الاطلاق و بدعة من جهة الخصوصیة۔ ثم قال و قد ذکر بعض المتاخرین من مشایخ المغرب ان الیوم الذی وصلوا فیه الی جناب العزة و حظائر القدس یرجی فیه من الخیر و الکرامة و البرکة و النورانیة اکثر و اوفر من سائر الایام، ثم اطرق ملیا ثم رفع رأسه و قال و لم یکن فی زمن السلف شیء من ذلک و انما هو من مستحسنات المتاخرین۔

عرس کے دن صاحب عرس کی مزار پر حاضر ہوکر بغرض ایصال ثواب سورۂ فاتحہ و سورۂ اخلاص، اوائل سورۂ بقرہ، سورۂ تبارک، آمن الرسول، سورۂ یس، آیت الکرسی وغیرہ پڑھنا، فقراء و مساکین کو خیرات کرنا یا کھانا کھلانا موجب برکت و ثواب ہے۔ ایصال ثواب کرنے والے کو چاہئے کہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو خواہ زندہ ہوں یا مردہ اسی ثواب میں شریک کرے، خداوند عالم سب کو برابر ثواب پہنچاتا ہے۔

رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۳۱ باب الجنائز میں ہے: لما ورد من دخل المقابر فقرأ سورة یس خفف الله عنهم یومئذ و کان له بعدد من فیها حسنات (بحر) و فی شرح اللباب و یقرأ من القرآن ما تیسر له من الفاتحة و اوائل البقرة الی المفلحون و آیة الکرسی و آمن الرسول و سورة یس و تبارک الملک و سورة التکاثر و الاخلاص اثنی عشرة مرة او احدی عشر او سبعا او ثلاثا ثم یقول: "اللهم اوصل ثواب ما قرأناه الیٰ فلان او الیهم"۔ (تنبیه): صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغیر بأن للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلاة او صوما او صدقة او غیرها کذا فی الهدایة

بل فی زکاۃ التاتارخانیۃ عن المحیط الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین و المؤمنات لانہا تصل الیہم و لا ینقص من اجرہ شیء اھ ۔ ھو مذھب اھل السنۃ و الجماعۃ ۔ اسی صفحہ میں ہے : و فی البحر من صام او صلی او تصدق و جعل ثوابہ لغیرہ من الاموات و الاحیاء جاز و یصل ثوابہا الیہم عند اھل السنۃ و الجماعۃ کذا فی البدائع ۔ صفحہ ۳۲۰ میں ہے : اتخذ طعاما للفقراء کان حسنا ۔ عرس کے دن روشنی و دیگر تکلفات کرنا سلف صالحین و فقہاء اہل سنت کے اقوال سے ثابت نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ کیلئے جو وضوء کیا جاتا ہے کیا اس سے دوسری نمازیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نماز جنازہ کیلئے جو وضوء کیا جاتا ہے اس سے ہر قسم کی نماز فرض و نفل وغیرہ پڑھ سکتے ہیں ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۹، کتاب الطہارۃ میں ہے : و لعل الفرق بین التیمم و الوضوء ان کل وضوء تصح بہ الصلاۃ بخلاف التیمم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

نماز جنازہ چونکہ اور نمازوں کی طرح فرض عبادت ہے اس لئے طہارۃ مکان جس طرح نماز پنجگانہ کیلئے شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی شرط ہے ۔ مقبرہ میں ہر قسم کی نماز پڑھنا مکروہ ہے ۔ اس لحاظ سے نماز جنازہ بھی مقبرہ میں مکروہ ہے ۔

عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱ باب ما یکرہ الصلاۃ فی القبور میں ہے : و ذھب الثوری و ابو حنیفۃ و الاوزاعی الی کراھۃ الصلاۃ فی المقبرۃ ۔ بدائع و صنائع جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ کتاب الصلاۃ فصل شرائط الارکان میں ہے : و قد روی عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم انہ نہی عن الصلاۃ فی المزبلۃ و المجزرۃ و معاطن الابل و قوارع الطریق و الحمام و المقبرۃ ۔ عینی شرح بخاری کی جلد ۲ صفحہ ۳۶۹ میں ہے : عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم "الارض کلہا مسجد الا المقبرۃ و الحمام" ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ کتاب الصلاۃ میں ہے : و کذا تکرہ فی اماکن کفوق الکعبۃ و فی طریق و مزبلۃ و مجزرۃ و مقبرۃ ۔ اور ممانعت کی

وجہ بعض علماء نے یہ بتائی کہ مقبرے عموماً نجاستوں سے خالی نہیں ہوتے کیونکہ جاہل لوگ قبروں کی آڑ میں رفع حاجت کرتے ہیں ایسی حالت میں وہاں نماز مناسب نہیں ۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اموات کی حرمت و عزت کے خیال سے وہاں نماز مکروہ ہے ۔ عینی کی اسی جلد میں صفحہ ۳۵۲ میں ہے ؛ حکی اصحابنا اختلافا فی الحکمة فی النهی عن الصلاة فی المقبرة فقيل المعنى فيه ما تحت مصلاه من النجاسة ۔ اسی جگہ ہے ؛ و الذی دل عليه كلام القاضی ان الكراهة لحرمة الموتى ۔ بدائع صنائع کی جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ میں ہے ؛ و قيل معنى النهی ان المقابر لا تخلوا عن النجاسات لأن الجهال ليستترون بما شرف من القبور فيبولون و يتغوطون خلفه فعلىٰ هذا لا تجوز الصلاة لو كان فی موضع يفعلون ذلك لانعدام طهارة المكان ۔

البتہ اگر مقبرہ میں کوئی ایسی پاک جگہ ہے کہ جہاں نجاست وغیرہ نہ ہو اور اس میں کوئی قبر بھی نہ ہو اور نمازیوں کے سامنے بوقت نماز کوئی قبر بھی نہ آئے تو وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۲۸۷ کتاب الصلاۃ میں ہے ؛ و لا باس بالصلاة فيها اذا كان موضع اعد للصلاة و ليس فيه قبر و لا نجاسة كما فی الخانية و لا قبلته قبر ۔ حلية ۔

احادیث صحیحہ میں اگرچہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے بعض اموات کے دفن کے بعد ان کی قبر پر تشریف لیجاکر نماز پڑھی ہے جس سے مقبرہ میں نماز پڑھنا ثابت ہوتا ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی میت بلا نماز کے دفن کردی جائے تو اس کی قبر پر تین دن تک نماز پڑھنا درست ہے ۔ جس سے مقبرہ میں نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت ثابت ہوتی ہے ۔ مگر ایسا بربناء ضرورت ہے ۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کا کسی کی نماز جنازہ پڑھنا رحمت تھا اس لئے آپ نے بعض میت کے نماز پڑھاکر دفن کئے جانے کے بعد بھی اس کی قبر پر نماز پڑھی ہے اور یہ فرمایا کہ میری نماز رحمت ہے ۔ اور بلا نماز کے دفن کئے جانے کی صورت میں تو بربناء ضرورت قبر پر نماز پڑھنا ضروری ہے تاکہ ایک مسلم کی میت بلا نماز جنازہ نہ رہ جائے ۔ اور فقہ کا کلیہ ہے کہ الضرورة تبيح المحظورات ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ مسجد میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ اور کیا صحن مسجد داخل مسجد ہے یا خارج مسجد ؟ اور اس میں نماز جنازہ درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے ۔ اور مسجد کا صحن جو مسجد سے متصل ہے اس میں بھی نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ باب الامامۃ میں ہے ؛ و ذكر فی البحر عن المجتبىٰ ان فناء المسجد له حكم المسجد ۔ اسی صفحہ میں ہے ؛ لأن الصحن فناء المسجد ۔ اس کے چند سطر بعد ہے ؛ و فی

الخزانۃ فناء المسجد ما اتصل بہ و لیس بینہ و بینہ طریق۔
در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ باب الجنائز میں ہے: و کرھت تحریما و قیل تنزیھا فی مسجد جماعۃ ھو ای المیت فیہ وحدہ او مع القوم و اختلف فی الخارجۃ عن المسجد وحدہ او مع بعض القوم و المختار الکراھۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر چند موتیٰ جمع ہو جائیں جن میں بعض بالغ اور بعض نابالغ، بعض مرد اور بعض عورت ہوں، تو ایسی صورت میں سب کیلئے کیا ایک ہی نماز کافی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر کافی ہوسکتی ہے تو نماز جنازہ پڑھنے کیلئے یہ جنازے کس ترتیب سے رکھے جائیں؟

الجواب

ایسی صورت میں جدا جدا نماز پڑھنا بہتر ہے۔ اور اگر سب پر ایک ہی نماز پڑھی جائے تو بھی درست ہے۔ نماز جنازہ کے وقت جنازے صف باندھکر رکھ دیے جائیں اور امام ان سب میں افضل کے جنازہ پر کھڑا ہوکر نماز پڑھے تو ٹھیک ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ امام کے متصل مردوں کے جنازے رکھے جائیں، پھر لڑکوں کے، ان کے بعد خنثیٰ کے، پھر بالغہ عورتوں کے، پھر لڑکیوں کے۔ اسی ترتیب سے امام کے روبرو قبلہ اور امام کے درمیان تمام جنازے رکھے جائیں۔
در مختار کے باب الجنائز میں ہے: و اذا اجتمعت الجنائز فافراد الصلاۃ علیٰ کل واحدۃ اولیٰ من الجمع و تقدیم الافضل افضل و ان جمع جاز۔ ثم ان شاء جعل الجنائز صفا واحدا فقام عند افضلھم و ان شاء جعلھا صفا مما یلی القبلۃ واحدا خلف واحد بحیث یکون صدر کل جنازۃ مما یلی الامام لیقوم بحذاء صدر الکل و ان جعلھا درجا فحسن لحصول المقصود راعی الترتیب المعھود خلفہ حالۃ الحیاۃ فیقرب منہ الافضل فالافضل الرجل مما یلیہ فالصبی فالخنثیٰ فالبالغۃ فالمراھقۃ، و الصبی الحر یقدم علی العبد و العبد علی المرأۃ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جنازہ کے ساتھ پکار کر ذکر کرنا یا اشعار پڑھنا جائز یا نہیں؟

الجواب

میت کو لے جاتے وقت اس کے ساتھ پکار کر کلمہ طیبہ پڑھنا یا کوئی اور ذکر کرنا یا اشعار و قصائد پڑھنا مکروہ ہے۔ در مختار کے باب الجنائز میں ہے: کما کرہ فیھا رفع الصوت بذکر او قراءۃ (فتح)۔ اسی جگہ

رد المحتار میں ہے : قوله كما كره الخ قيل تحريما و قيل تنزيها كما في البحر عن الغاية ، و فيه عنها ، و ينبغي لمن تبع الجنازة ان يطيل الصمت ، و فيه عن الظهيرية : فان اراد ان يذكر الله تعالى يذكره في نفسه لقوله تعالى " إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ " اى الجاهرين بالدعاء و الذكر فما ظنك بالغناء الحادث في هذا الزمان ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے اور اپنی اولاد کے دفن کیلئے ایک زمین خریدکر مدفن بنایا ، جس میں خود بھی دفن ہوا اور اب اس کی اولاد دفن ہوتی رہتی ہے ۔ بکر نے زید کے مدفن میں اس کی اولاد کی اجازت کے بغیر اپنے ایک عزیز کو جبراً دفن کردیا ۔ زید کی اولاد چاہتی ہے کہ اپنے مدفن سے اس اجنبی کو نکال دے ۔ کیا شرعاً زید کی اولاد کو یہ حق حاصل ہے ؟

الجواب

میت اگر غیر کی زمین میں بلا اجازت دفن کردی جائے تو زمین کے مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو نکلوادے ، یا قبر کا نشان مٹاکر زمین کو بیرونی استعمال میں لے لے ۔ در مختار باب الجنائز میں ہے : و لا يخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمي كان تكون الارض مغصوبة او اخذت بشفعة و يخير المالك بين اخراجه و مساواته بالارض كما جاز زرعه و البناء عليه اذا بلى و صار ترابا ۔ زيلعي ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قبروں پر پھول ڈالنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

قبروں پر پھول ڈالنا یا سبزی یا درخت لگانا درست ہے ۔ رد المحتار کے کتاب الجنائز میں ہے : و يكره ايضا قطع النبات الرطب و الحشيش من المقبرة دون اليابس كما في البحر و الدرر و شرح المنية و علله في الامداد بانه ما دام رطبا يسبح الله تعالى فيؤنس الميت و تنزل بذكره الرحمة اه ۔ و نحوه في الخانية ۔ اقول و دليله ما ورد في الحديث من وضعه عليه الصلاة و السلام الجريد الخضراء بعد شقها نصفين على القبرين اللذين يعذبان و تعليله بالتخفيف عنهما ما لم ييبسا اى يخفف عنهما ببركة تسبيحهما اذ هو اكمل من تسبيح اليابس لما في الاخضر من نوع حياة و عليه فكراهة قطع ذلك و ان نبت بنفسه و لم يملك لان فيه تفويت حق الميت ۔ و يؤخذ من ذلك و من الحديث ندب وضع ذلك للاتباع و يقاس عليه ما اعتيد في زماننا من وضع اغصان الآس و نحوه و صرح بذلك ايضا جماعة من الشافعية ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسلمانوں کی قبروں پر بیٹھکر سیندھی فروخت کرنا اور استعمال کرنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

مسلمانوں کی قبروں کے پاس نجس افعال کا ارتکاب کرنا یا نجس اشیاء لاکر رکھنا اور ڈالنا شرعا ممنوع ہے ۔ جیسا کہ عالمگیریہ جلد ۱ فصل سادس کی اس روایت سے مستفاد ہے : و یکرہ ان یبنی علی القبر او یقعد او ینام علیہ او یوطأ علیہ او یقضی حاجۃ الانسان من بول او غائط ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عیدگاہ کے چبوترہ کی توسیع کی جارہی ہے ۔ چبوترہ کے متصل جانب شمال چند قبور ہیں جو منہدم ہوکر زمین کے برابر ہوگئی ہیں ۔ کیا ان قبروں کو چبوترہ میں شریک کرکے اس پر نماز پڑھنا شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

قبریں اگر اس قدر پرانی ہیں کہ ان کے مُردوں کی لاشیں گل کر مٹی کے برابر ہوگئی ہیں اور غلاظت و عفونت کا کوئی اثر باقی نہیں ہے تو ان پر مسجد یا چبوترہ کی تعمیر کرکے نماز پڑھنا درست ہے ۔ مگر تعمیر کیلئے شرط یہ ہے کہ صاحب قبر کے ورثاء سے اس پر تعمیر کرنے کی اجازت لے لیجائے کیونکہ قبر بوسیدہ ہونے کے بعد (زمین کے حکم میں) مالک کی ملک میں آجاتی ہے جس پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص تصرف نہیں کرسکتا ۔ اگر ان کا کوئی مالک باقی نہیں ہے تو یہ بیت المال کی ملک ہیں جن پر سرکار کی اجازت سے تعمیر ہوسکتی ہے ۔ عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۵۹ میں ہے : المقبرۃ اذا عفت و دثرت تعود ملکا لاربابھا فاذا عادت ملکا یجوز ان یبنی موضع المقبرۃ مسجدا و غیر ذلک فاذا لم یکن لھا ارباب یکون لبیت المال ۔ و فیہ ان القبر اذا لم یبق فیہ بقیۃ من المیت و من ترابہ المختلط بالصدید جازت الصلاۃ فیہ ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الجنائز فصل سادس میں ہے : و لو بلی المیت و صار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ و زرعہ و البناء علیہ کذا فی التبیین ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ کی تیمارداری اور تجہیز و تکفین کے مصارف شوہر کے ذمہ ہیں یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کی تجہیز و تکفین کے مصارف زوج پر واجب ہیں ۔ زوجہ بیماری کی حالت میں اگر شوہر کے مکان میں رہے یا اس کی اجازت سے اپنے عزیز و اقارب کے پاس چلی جائے تو ان دونوں صورتوں میں شوہر پر صرف اس کے کھانے کپڑے کے مصارف لازم ہیں ۔ دواء کا خرچ اور طبیب کی اجرت وغیرہ شوہر پر واجب نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ باب الجنائز میں ہے : و اختلف فی الزوج و الفتویٰ علیٰ وجوب کفنها علیه و ان ترکت مالا ۔ در مختار میں ہے : و الاصل فیه ان من یجبر علی نفقة فی حیاته یجبر علیها بعد موته ۔ در مختار کی کتاب الطلاق باب النفقہ میں ہے : او مرضت فی بیت الزوج فلن النفقة استحسانا لقیام الاحتباس و کذا لو مرضت ثم الیه نقلت او فی منزلها بقیت و لنفسها ما منعت و علیه الفتویٰ ۔ اسی صفحہ میں ہے : کما لا یلزمه مداواتها ۔ رد المحتار میں ہے : ای اتیانه لها بدواء المرض و لا اجرة الطبیب و لا الفصد و لا الحجامة ، هندیة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل میں کیا فرماتے ہیں ؟

(۱) غسل و کفن کے بعد میت کی پیشانی اور سینہ پر عبیر ڈالکر یا عطر سے کلمہ شہادت اور بسم اللہ وغیرہ لکھنا درست ہے یا نہیں ؟

(۲) میت کے کفن میں دعاء یا آیت یا شجرہ وغیرہ پیر و مرشد کا دیا ہوا رکھنا درست ہے یا نہیں ؟

(۳) مرد کی میت کو سرپوش و غلاف ڈھانک کر قبر تک لیجانا درست ہے یا نہیں ؟

(۴) دفن کے بعد قبر سے چالیس قدم ہٹ کر اذان کہنا درست ہے یا نہیں ؟

(۵) اگر کوئی ان امور کو فرض و واجب یا سنت یا مستحب جانے تو کیا یہ عقیدہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب

۱ ۔ میت کی پیشانی پر انگشت شہادت سے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنا اور سینہ پر کلمہ طیبہ لکھنا یا کفن و عمامہ پر خداوند عالم کے اسماء و کلمہ طیبہ وغیرہ جس کو عہدنامہ کہتے ہیں لکھنا مباح و مستحب ہے ۔ بعض بزرگوں نے اپنے سینہ اور پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کی وصیت کی تھی ۔ چنانچہ حسب وصیت لکھدیا گیا ۔ دفن کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا اور یہ پوچھا کہ اس کے لکھنے سے آپ کو کوئی فائدہ ہوا ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب میں قبر میں رکھا گیا تو عذاب کے فرشتے میرے پاس آئے مگر میری پیشانی پر جو بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا پایا تو میں عذاب سے امن میں رہا ۔ در مختار کی کتاب الصلاۃ باب صلاۃ الجنائز میں ہے : کتب علی جبهة المیت او عمامته او کفنه عهد نامه یرجی ان یغفر اللہ للمیت اوصی بعضهم ان یکتب فی جبهته و صدره بسم اللہ الرحمن الرحیم ففعل ثم رئی فی المنام فسئل فقال لما وضعت فی القبر جائتنی ملائکة العذاب فلما رأو مکتوبا علی جبهتی بسم

اللّٰہ الرحمن الرحیم قالوا امنت من عذاب اللّٰہ ۔ رد المحتار میں ہے: قولہ یرجی الخ مفادہ الاباحۃ او الندب و فی البزازیۃ قبیل کتاب الجنایات و ذکر الامام الصفار لو کتب علی جبھۃ المیت او علی عمامتہ او کفنہ عھدنامہ یرجی ان یغفر اللّٰہ تعالیٰ للمیت و یجعلہ آمنا من عذاب القبر قال نصیر ھذہ روایۃ فی تجویز ذلک و قد روی انہ کان مکتوبا علی افخاذ افراس فی اصطبل الفاروق "حبیس فی سبیل اللّٰہ تعالیٰ" و فی فتاوی المحقق ابن الحجر المکی الشافعی سئل عن کتابۃ العھد علی الکفن و ھو: لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد لا الہ الا اللّٰہ و لا حول و لا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم ۔ و قیل انہ: اللھم فاطر السماوات و الارض عالم الغیب و الشھادۃ الرحمن الرحیم انی اعھد الیک فی ھذہ الحیاۃ الدنیا انی اشھد انک انت اللّٰہ لا الہ الا انت وحدک لا شریک لک و ان محمدا عبدک و رسولک صلی اللّٰہ علیہ و سلم فلا تکلنی الی نفسی تقربنی من الشر و تبعدنی من الخیر و انا لا اثق الا برحمتک فاجعل لی عھدا عندک توفینیہ یوم القیامۃ انک لا تخلف المیعاد ۔ ھل یجوز و لذلک اصل؟ فاجاب بقولہ: نقل بعضھم عن نوادر الاصول للترمذی ما یقتضی ان ھذا الدعاء لہ اصل و ان الفقیہ ابن عجیل کان یامر بہ ثم افتی بجواز کتابتہ قیاسا علی کتابۃ "للّٰہ" فی ابل الزکاۃ و اقرہ بعضھم ۔ اس کے بعد دوسرے صفحہ میں ہے: نقل بعض المحشین عن فوائد الشرجی ان مما یکتب علی جبھۃ المیت بغیر مداد بالاصبع المسبحۃ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم و علی الصدر لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ و ذلک بعد الغسل قبل التکفین ۔ اس کے قبل کے صفحہ میں ہے: قولہ عھدنامہ بفتح المیم و سکون الھاء و معناہ بالفارسیۃ الرسالۃ و المعنی رسالۃ العھد و المعنی ان یکتب شیء مما یدل انہ علی العھد الازلی الذی بینہ بین ربہ یوم اخذ المیثاق من الایمان و التوحید و التبرک باسمائہ تعالیٰ و نحو ذلک ۔

۲ ۔ پیر کے دیے ہوئے شجرہ وغیرہ کا کفن میں رکھنا کتب فتاویٰ سے ثابت نہیں ہے ۔

۳ ۔ جنازہ پر جو لکڑی کا سرپوش ڈھانکا جاتا ہے اس کو عربی میں ۔ نعش " کہتے ہیں ۔ سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وفات کے قبل اس کا رواج نہ تھا ۔ آپ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ میرا جنازہ ڈھانکا جائے! چنانچہ آپ کی وفات کے بعد کھجور کی ڈالیوں کا سرپوش بناکر آپ کے جنازہ پر ڈھانکا گیا اور اسی وقت سے اس کا رواج بطریقہ سنت قائم ہوا ۔ چونکہ عورتوں کو مردوں کی نظروں سے چھپانا ضروری ہے اس لئے اس کا استعمال عورتوں کے جنازہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے مردوں کیلئے نہیں ۔ کفایہ شرح ہدایہ کی جلد ۲ باب الجنائز فصل فی الدفن میں ہے: الا تری انھا خصت بالنعش علی جنازتھا و ھو الشبیہ المحفۃ مشبک یطبق علی المراۃ اذا وضعت علی الجنازۃ و قد صح ان قبر فاطمۃ رضی اللّٰہ عنھا سجی بثوب و نعش علی جنازتھا و لم یکن النعش فی جنازۃ النساء حتی ماتت فاطمۃ فاوصت قبل موتھا ان تستر جنازتھا فاتخذوا لھا نعشا من جرید النخل فبقی سنۃ ھکذا فی جمیع النساء ۔ جنازہ پر کپڑا ڈالکر لے جانا اور دفن کے وقت قبر کو کپڑے سے ڈھانکنا عورتوں ہی کے ساتھ مخصوص

ہے ۔ کیونکہ دفن وغیرہ میں بعض اوقات عورت کے جنازہ کی بے ستری کا اندیشہ رہتا ہے ۔ اور مردوں کے جنازہ میں یہ احتمال نہیں ہے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ ایک مرد کی قبر پر کپڑا تانے ہوئے تھے ۔ تو آپ نے کپڑا ہٹا دیا اور یہ فرمایا کہ اس کو عورت کے مشابہ مت بناؤ ۔

بدائع صنائع جلد ۱ فصل دفن میں ہے : و یسجی قبر المرأة بثوب لما روی ان فاطمة رضی اللہ عنها سجی قبرها بثوب و نعش علی جنازتها لأن مبنی حالها علی الستر فلو لم یسج ربما انكشفت عورة المرأة فيقع بصر الرجال عليها و لهذا یوضع النعش علی جنازتها دون جنازة الرجال ۔ محیط سرخسی جلد ۱ باب الدفن میں ہے : ألا تری ان جنازتها خصت بوضع النعش عليها و لهذا استحسن مشایخنا اتخاذ التابوت للنساء فانه اقرب الی الستر و الی التحرز عن مسها عند الوضع فی القبر ۔ فأما مبنی حال الرجال علی الانكشاف فلا یسجی قبره بثوب كما لا ینعش علی جنازته لأنه ممنوع عن التشبه حال حیاته فلا یشبه ایضا بعد مماته ۔ کشف الحقائق جلد ۱ میں ہے : لا قبره لما روی عن علی رضی اللہ عنه انه مر علی قوم قد دفنوا میتا و بسطوا علی قبره ثوبا فجذبه و قال انما یصنع هذا للنساء ۔

کفایہ جلد ۲ باب الجنائز فصل فی الدفن میں ہے : قوله لا یسجی قبر الرجل لان علیا رضی اللہ عنه رأی قبر رجل سجی بثوب فنحی الثوب و قال لا تشبهوه بالنساء ۔

۴ ۔ دفن کے بعد میت کی اُمت کے واسطے اس کے لئے دعاء و استغفار کرتے ہوئے اونٹ کو ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کرنے کی مقدار تک قبر کے اطراف ٹھہرنا اور منکر و نکیر کے سوال میں اس کے ثابت قدم رہنے کی اللہ سے دعاء مانگنا مستحب ہے ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے دفن کے بعد قبر پر سورہ بقرہ کی پہلی آیتیں اور ختم کی آیتیں یعنی " الم " سے " مفلحون " تک اور " آمن الرسول " سے ختم سورہ تک پڑھنا مستحب بیان فرمایا ہے ۔ در مختار کے باب الجنائز مطلب فی دفن المیت میں ہے : و یستحب حثیه من قبل رأسه ثلاثا و جلوس ساعة بعد دفنه لدعاء و قراءة بقدر ما ینحر الجزور و یفرق لحمها ۔ رد المحتار میں ہے : قوله و جلوس بقدر الخ لما فی سنن ابی داود : كان النبی صلی اللہ علیه و سلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره و قال " استغفروا لأخیكم و اسألوا اللہ له التثبیت فانه الآن یسئل " و كان ابن عمر یستحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة و خاتمتها و روی ان عمرو بن العاص قال و هو فی سیاق الموت : اذا انا مت فلا تصحبنی نائحة و لا نار فاذا دفنتمونی فشنوا علی التراب شنا ثم اقیموا حول قبری قدر ما ینحر جزور و یقسم لحمها حتی استأنس بكم و انظر ماذا اراجع رسل ربی (جوهرة) ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب الجنائز فصل سادس میں ہے : و یستحب اذا دفن المیت ان یجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ینحر جزور و یقسم لحمها یتلون القرآن و یدعون للمیت كذا فی الجواهر النیرة ۔ قبر سے چالیس قدم ہٹ کر اذان کہنا فقہ کی مشہور کتابوں میں نہیں ہے ۔

۵ ۔ جو امور کہ کتب فقہ سے حسب تفصیل بالا مستحب یا سنت ہیں یا مباح ہیں ان کے مستحب یا

سنت یا مباح ہونے کا عقیدہ رکھنا لازم ہے ۔ اور جو امور ثابت نہیں ہیں ان کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بزرگوں کے نام سے قرآن شریف وغیرہ پڑھوانا اور فقراء کو کھانا کھلانا جس کا نام عرس ہے اور اس سے ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے ۔ اگر اس کو صاحب عرس کی مزار پر نہ کرکے کسی اور مقام پر کیا جائے تو شرعا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

ایصال ثواب کے لئے کوئی جگہ معین نہیں ہے ۔ ہر جگہ سے ایصال ثواب ہوسکتا ہے ۔ مگر مزار پر کرنے میں حاضرین کو زیارت قبر کا بھی موقعہ ملتا ہے جو شرعا مستحب ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ باب الجنائز میں ہے : قوله لا بأس بزيارة القبور اى لا بأس بها بل تندب كما فى البحر عن المجتبىٰ ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مرد اور عورت کی تجہیز و تکفین کے مصارف کم از کم کیا ہوسکتے ہیں ؟

الجواب

مرد کیلئے مسنون کفن تین کپڑے ہیں ۔ اور عورت کیلئے پانچ ۔ اور کپڑے کی نوعیت میت کی زندگی کے لباس پر رکھی گئی ہے کہ وہ زندگی میں جس قیمت کا لباس پہنا کرتا تھا اسی انداز کا کفن دینا چاہئے ۔

سراجی نظامی کے حاشیہ میں تنویر سے منقول ہے : اما قیمته فلن المیت اذا لبس فی حالة الحیاة اثوابا قیمتها عشرة دنانیر فالزیادة و النقصان منها فی الکفن تبذیر و تقتیر ۔ دفن میں بھی اس کی حیثیت کا لحاظ رکھنا چاہئے اور مسنون طریقہ پر ہونا چاہئے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

کتاب الزکاۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ والدین و اولاد کو زکاۃ و صدقہ فطر و کفارات و نذر وغیرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اپنے والدین پر اگرچہ وہ کتنے ہی اونچے درجہ کے ہوں یعنی دادا دادیاں، اور اپنی اولاد پر اگرچہ نیچے درجہ کے ہوں یعنی پوتے پوتیاں، زکاۃ و صدقہ فطر و نذر و کفارہ کا صرف کرنا اور ان کو دینا جائز نہیں۔ فتاویٰ رد المحتار شامی جلد ۲ صفحہ ۶۵ میں ہے: (و لا إلى من بينهما ولاد) اي بينه و بين المدفوع اليه ولاد اي اصله و ان علا كأبويه و اجداده و جداته من قبلهما و فرعه و ان سفل كأولاد الأولاد و كذا كل صدقة واجبة كالفطرة و النذر و الكفارة، و اما التطوع فيجوز بل هو اولى۔

الاستفتاء

ایک شخص پر دین مہر واجب الاداء ہے جس کی تعداد تخمیناً گیارہ ہزار روپیہ ہے، اور اس کے پاس تخمیناً ایک ہزار روپیہ کا سرمایہ اس کی ضروریات سے فاضل موجود ہے، اور اس کی یہ نیت ہے کہ اس زر مہر کو موجودہ سرمایہ کی افزائش سے یا کسی اور طریقہ سے کامل رقم جمع ہوجانے کے بعد یکمشت ادا کردے۔ ایسا شخص زکاۃ خود بھی ادا کرتا ہے اور لیتا بھی ہے۔ آیا اس شخص کو از روئے شرع شریف زکاۃ لینا جائز ہے؟ اور دینا واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی چونکہ یہ شخص ایسے دین کا مدیون ہے جو اس کے سرمایہ سے زیادہ ہے اس لئے اس پر ادائے زکاۃ واجب نہیں ہے۔ شارع نے مہر دین کو بھی دین واجب الاداء قرار دیا ہے۔ اور اس کا مدیون شارع کے نزدیک عام مدیون کی طرح اس وقت سمجھا گیا ہے جب کہ زوج اس مہر مؤجل کی ادائی کی نیت رکھتا ہو، اور در صورت نیت نہ رکھنے کے اس پر زکاۃ واجب ہے۔ چنانچہ الاشباہ و النظائر کی کتاب الزکاۃ صفحہ ۱۳۶ میں ہے: دین العباد مانع من وجوبها الا المهر المؤجل اذا كان الزوج لا يريد اداءه۔ بلکہ یہ مہر شرعاً دین نہیں سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ حموی کتاب الزکاۃ صفحہ ۱۳۶ میں مذکور ہے: في شرح

الجامع الصغیر للتمرتاشی ذکر البزدوی فی جامعه عن البعض دین المهر لا یمنع اذا لم یکن الزوج علی عزم الاداء لانه لا یعد دینا ۔

مگر چونکہ صورت مسئولہ میں زوج ادائی مہر کی نیت رکھتا ہے اس لئے وہ شرعاً مدیون ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۲ میں مذکور ہے : کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکاة ۔ اور صفحہ ۱۷۳ میں ہے : کذلک المهر یمنع مؤجلا کان او معجلا لأنه مطالَبٌ به ۔ اسی طرح محیط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۹۵ میں مسطور ہے ۔ اور ایسے شخص کیلئے زکاۃ لینا اس شرط سے جائز ہے کہ اس رقم زکاۃ کو ادائی دین مہر میں صرف کرے ، کیونکہ فقہاء نے مصارف زکاۃ میں اس مدیون کو بھی شامل فرمایا ہے جس کے پاس دین سے فاضل نصاب موجود نہ ہو ۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ صفحہ ۱۸۸ جلد ۱ میں ہے : و منها الغارم و هو من لزمه دین و لا یملک نصابا فاضلا عن دینه کذا فی التبیین ۔ اور جامع الرموز صفحہ ۱۳۸ میں ہے : مدیون لا یملک نصابا فاضلا عن دینه ۔ اور محیط سرخسی صفحہ ۹۲ میں ہے : و الغارمون المدیونون اذا لم یفضل لهم عند الدین قدر النصاب ۔ بلکہ ایسے شخص کو زکاۃ دینے کیلئے فقیر پر ترجیح دی گئی ہے ۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۸ میں ہے : و الدفع الی من علیه دین اولی من الدفع الی الفقیر کذا فی المضمرات ۔ جامع الرموز صفحہ ۱۳۸ میں ہے : تقدیمه علی الفقیر اولیٰ من حیث انه اولیٰ منه بالدفع ۔

اور مدیون مصرف زکاۃ میں فقہاء کے پاس عام ہے کسی خاص قسم کے مدیون کی تخصیص نہیں کی گئی ۔ چنانچہ جامع الرموز کے مصرف زکاۃ صفحہ ۱۳۸ میں ہے : و المراد من علیه الدین من ای جهة کان ۔ شارع نے مدیون کو مستحقین زکاۃ میں اس وجہ سے شمار کیا ہے کہ مدیون جس کے پاس قرض سے فاضل نصاب موجود نہیں ہے ، اس رقم زکاۃ سے اس قرض کی ادائی کرکے اپنے کو سبکدوش کرے ، چنانچہ قرآن شریف میں مصرف زکاۃ کے موقعہ پر مدیون کیلئے " وَ الْغَارِمِیْنَ " کا لفظ وارد ہوا ہے اور غارم لغت میں اس کو کہتے ہیں جس پر قرض ہو اور ادائی کیلئے اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو ۔ چنانچہ البحر الرائق جلد ۲ صفحہ ۲۴۰ میں ہے : (الغارم) و هو فی اللغة من علیه دین و لا یجد قضاءه کما ذکره القتبی ۔ اور رد المحتار شامی کی جلد ۲ صفحہ ۹۳ کتاب الزکاۃ میں ہے : قال القتبی الغارم من علیه الدین و لا یجد وفاء ۔

پس صورت مسئولہ میں اگر سائل اس رقم زکاۃ کو دین مہر میں اداء کرنے کیلئے لیتا ہے اور اداء بھی کرتا جاتا ہے ، یا بغرض ادائی اس کو اپنے مال سے علیحدہ جمع کرتا ہے تو اس کیلئے اس غرض سے زکاۃ لینا جائز ہے ، ورنہ حرام ، کیونکہ غنی ہے اور غنی کیلئے صدقات حرام ہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ طلبائے علم دین کے مصارف کیلئے کسی دینی مدرسہ میں زکاۃ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

طالبان علم دین کو اگرچہ وہ غنی ہوں زکاۃ دینا جائز ہے ۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۹۰ میں ہے : و بهذا التعليل يقوى ما نسب للواقعات من ان طالب العلم ۔ رد المحتار میں ہے : (ای الشرعی) یجوز له اخذ الزکاة و لو غنیا اذا فرغ نفسه لافادة العلم و استفادته لعجزه عن الکسب و الحاجة داعیة الی ما لا بد منه کذا ذکره المصنف ۔ اور اسی صفحہ پر رد المحتار میں ہے : و فی المبسوط لا یجوز دفع الزکاة الی من یملک نصابا الا الی طالب العلم و الغازی و منقطع الحج لقوله علیه الصلاة و السلام یجوز دفع الزکاة لطالب العلم و ان کان له نفقة اربعین سنة ۔ بناء علیہ کسی دینی مدرسہ میں انتظام حوائج کیلئے زکاۃ دینا شرعا جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص ہند میں رہتا ہے اور اس کا مال بھی ہند ہی میں ہے ۔ مگر اس نے ملک عرب میں ایک شخص کو وکیل کیا ہوا ہے کہ اس کے مال کی زکاۃ عرب کے فقراء پر تقسیم کرے ۔ اور وکیل نے اس مال کی غیر جنس سے زکاۃ ادا کی یا پھر اسی مال کی جنس سے ۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جس شہر میں مال زکاۃ ہے اور زکاۃ واجب ہوتی ہے اسی شہر میں زکاۃ نکالنا چاہئے ۔ چونکہ وجوب زکاۃ کے ساتھ ہی اس شہر کے فقراء کا حق اس مال و زکاۃ کے ساتھ متعلق ہوجاتا ہے اس لئے دوسرے شہر میں جہاں یہ مال نہیں اس کی زکاۃ نکالنا اور وہاں کے فقراء پر تقسیم کرنا مکروہ ہے ۔ در مختار کتاب الزکاۃ باب المصرف میں ہے : و المعتبر فقراء مکان المال و فی الوصیة مکان الموصی و فی الفطرة مکان المؤدی عند محمد رحمه الله و هو الأصح لأن رؤوسهم تبع لرأسه ۔ رد المحتار میں ہے : قوله (و المعتبر الخ) ای لا مکان المزکی حتی لو کان هو فی بلد و ماله فی آخر یفرق فی موضع المال ۔ ابن کمال ، ای فی جمیع الروایات ۔ بحر ، و ظاهره انه لو فرق فی مکان نفسه یکره کما فی مسئلة نقلها ۔ اسی جگہ حاشیہ میں ہے ، قال شیخنا الظاهر اخراج زکاته لفقراء البلدة التی کان المال فیها لان قولهم و المعتبر مکان المال ای مکان وقت الوجوب لا وقت الإخراج لأنه بالوجوب فی بلدة تعلق حق فقرائها بزکاته ۔

جس مال کی زکاۃ ادا کررہا ہے اگر وہ مال ربوی نہیں ہے تو اس کی زکاۃ غیر جنس سے ادا کرسکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ زکاۃ واجبہ کی قیمت کے موافق مال دے یا اس کی قیمت ادا کرے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۸۰ کتاب الزکاۃ الفصل الثانی فی العروض میں ہے ، المال الذی تجب فیه الزکاة ان ادی زکاته من خلاف جنسه ادی قدر قیمة الواجب اجماعا و کذا اذا ادی زکاته من جنسه و کان مما لا

یجری فیہ الربا ۔ و اما اذا ادی من جنسہ و کان ردویا فابو حنیفۃ و ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ یعتبران القدر لا القیمۃ ھکذا فی شرح الطحاوی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر زید کا دَین کسی غریب و مفلس شخص کے ذمہ ہو اور اس سے رقم دین وصول ہونے کی کم امید ہو ۔ تو زید اگر ادائے زکاۃ کی نیت سے اس کو دین معاف کردے تو زکاۃ ادا ہوگی یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نقد رقم کی زکاۃ میں رقم دَین مدیون کو معاف کرنا درست نہیں ۔ البتہ یہ صورت جائز ہے کہ اس کو زکاۃ کی رقم دیدے اور پھر اس سے قرض میں واپس لے لے ۔ در مختار میں ہے : و اعلم ان اداء الدین عن الدین و العین عن العین و عن الدین یجوز ، و اداء الدین عن العین و عن دَین سیقبض لا یجوز ، و حیلۃ الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکاتہ ثم یأخذھا عن دَینہ و لو امتنع المدیون مدّ یدہ و اخذھا لکونہ ظفر بجنس حقہ فان مانعہ رفعہ للقاضی ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ و حیلۃ الجواز) ای فیما اذا کان لہ دَین علی معسر و اراد ان یجعلہ زکاۃ عن عین عندہ او عن دَین لہ علی آخر سیقبض ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر زید وقت واحد میں کل رقم زکاۃ ادا نہیں کرسکتا تو کیا یہ جائز ہے کہ بدفعات اس کو ادا کرے ؟

الجواب

سال ختم ہوتے ہی فوراً زکاۃ ادا کرنا واجب ہے ۔ بلا عذر تاخیر سے انسان گنہگار ہوتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۰ کتاب الزکاۃ میں ہے : و تجب علی الفور عند تمام الحول حتی یأثم بتأخیرہ من غیر عذر و فی روایۃ الرازی علی التراخی حتی یأثم عند الموت و الاول اصح کذا فی التھذیب ۔ اداء کرنے کی شرط یہ ہے کہ زکاۃ دینے والا یا تو دینے کے وقت زکاۃ کی نیت کرے یا مال میں سے رقم زکاۃ علیحدہ کرنے کے وقت ادائے زکاۃ کی نیت کرلے پھر فقیروں کو دیتا جائے ۔ فقیروں کو چونکہ متفرق اوقات میں بدفعات دینا پڑتا ہے اور ہر وقت تمام مال سے زکاۃ کی نیت سے تھوڑی تھوڑی رقم نکالکر فقیر کو دیتے جانا مشقت و تکلیف کا باعث ہے اس لئے شارع نے علیحدہ کرنے کے وقت زکاۃ کی نیت کو کافی اور ضروری قرار دیا ہے ۔ پھر اس کے بعد ہر وقت ضرورت بدفعات فقیروں کو بلا نیت کے بھی ادا کرے تو درست

ہے۔ اسی جگہ عالمگیریہ میں ہے: و اما شرط ادائها فنیة مقارنة للاداء او لعزل ما وجب هکذا فی الکنز۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق جلد ۱ صفحہ ۲۵۶ کتاب الزکاۃ میں ہے: و الحاصل فیه الاقتران بالأداء کسائر العبادات الا ان الدفع یتفرق فیحرج باستحضار النیة عند کل دفع فاکتفی لوجودها حالة العزل دفعا للحرج۔

بناء بریں صورت مسئولہ میں بدفعات ادائی زکاۃ اس وقت درست ہے جبکہ ہمیشہ فقیر کو دینے کے وقت ادائے زکاۃ کی نیت کی جائے۔ چونکہ سال ختم ہوتے ہی فوراً زکاۃ اداء کرنا فرض ہے۔ اس لئے چاہئے کہ رقم نصاب سے فوراً مقدار زکاۃ علیحدہ کرکے فقراء و مساکین پر تقسیم کردی جائے۔ اگر نصاب میں سونے چاندی کے زیورات یا ٹکڑے ہیں جن کا فروخت کرنا مقصود نہیں اور نہ اس کو شکست کرکے فقراء پر تقسیم کر سکتے ہیں تو ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زکاۃ کی مقدار رقم قرض لےکر فقراء پر فوراً تقسیم کردی جائے اور اپنی آمدنی سے اس کی ادائی کرلی جائے تا کہ تاخیر کے گناہ سے نجات ملے اور فوری وجوب اداء ذمہ سے ساقط ہوجائے۔ بر وقت ضرورت قرض لےکر رقم زکاۃ اداء کرنا۔ اور قرض کی ادائی کرنا شرعاً درست ہے۔ عالمگیریہ کتاب الزکاۃ صفحہ ۱۸۲ مسائل شتیٰ میں ہے: و لو اخر زکاۃ المال حتی مرض یؤدی سرا من الورثة و ان لم یکن عنده مال و اراد ان یستقرض لأداء الزکاۃ فان کان فی اکبر رأیه انه اذا استقرض و ادی الزکاۃ و اجتهد لقضاء دینه یقدر علی ذلک کان الافضل له ان یستقرض۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو وغیرہ مال زکاۃ فریضہ بغرض امداد مجروحین و ایتام و ارامل ترک کو روانہ کرنا چاہیں تو آیا ان کی زکاۃ اداء ہوگی یا نہیں؟

اور چرم قربانی اگر بہ نیت زکاۃ دیں تو ان کی زکاۃ اداء ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرع میں زکاۃ کا مصرف فقراء و مساکین و غازی بےسامان وغیرہ بتلائے گئے ہیں۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۰ باب مصرف زکاۃ میں ہے: هو فقیر و هو من له ادنی شیء۔ و مسکین من لا شیء له۔ و عامل فیعطی بقدر عمله۔ و مکاتب۔ و مدیون لا یملک نصابا فاضلا عن دینه۔ و فی سبیل الله و هو منقطع الغزاۃ۔ اور رد محتار تحت قول و هو منقطع الغزاۃ مکتوب ہے: ای الذین عجزوا عن اللحوق بجیش الاسلام لفقرهم بهلاک النفقة و الدابة و غیرهما فتحل لهم الصدقات و ان کانوا کاسبین اذ الکسب یقعدهم عن الجهاد۔ قهستانی۔ بناء بریں مجاہدین ترک کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں جو کہ اپنے سرپرستوں کے شہید ہوجانے سے فقیر و مسکین ہوگئے ہیں۔ اور مجروح غازی جو بوجہ ناداری اپنے علاج سے عاجز ہیں۔ اور وہ غازی جو بے سرو سامانی کے سبب جہاد سے قاصر ہیں۔ یہ تمام از روئے شرع زکاۃ کے مستحق ہیں۔

قربانی کے چمڑے (کھال) اور گوشت دونوں کا شرع میں ایک ہی حکم ہے ۔ اور گوشت کو اگر کوئی شخص زکاۃ کی نیت سے فقیر کو دے تو اس کی زکاۃ اداء نہیں ہوتی ۔ ہدایہ جلد رابع مصطفائی کے صفحہ ۴۳۲ کتاب الاضحیہ میں ہے : و اللحم بمنزلة الجلد فی الصحیح ۔ اسی طرح عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۰۱ میں ہے اور رد المختار جلد ۵ صفحہ ۲۱۹ میں ہے : و اذا دفع اللحم الی فقیر بنیة الزکاۃ لا یحسب عنها فی ظاهر الروایة ۔ اور عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۲۰۸ کتاب اضحیہ میں ہے : تصدق بلحم الأضحیة علی الفقراء بنیة الزکاۃ لا یجزئه فی ظاهر الروایة ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں چرم قربانی اگر زکاۃ کی نیت سے فقراء کو دیئے جائیں تو شرعا زکاۃ اداء نہیں ہوتی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زمین سرکاری میں جو غلہ کہ بویا جاتا ہے اور اس کی مالگذاری بھی سرکار کو اداء کیجاتی ہے ایسے غلہ میں زکاۃ واجب ہے یا نہیں ؟ حسب مذہب شافعی و حنفی اس کا جواب اداء فرمائیے ۔

الجواب

مذہب شافعی میں خراج و اجرت اداء کرنے کے بعد بھی زمین مزروعہ کے غلے میں زکاۃ یعنی عشر واجب ہے ۔ حاشیہ عبد الحمید علی التحفہ صفحہ ۲۳۲ باب زکاۃ النبات میں ہے : و علی زراع ارض فیها خراج و اجرة الزکاة و لا یسقطها وجوبها لاختلاف الجهة ۔ الروض میں ہے : و تجب (ای الزکاة) و ان کانت الارض مستاجرة او ذات خراج ۔ اور اسی کی شرح میں ہے : فتجب الزکاة مع الاجرة او الخراج ۔ نہایہ میں ہے : و لا فرق فی وجوب العشر او نصفه بین الارض المستاجرة او ذات الخراج و غیرهما لعموم الاخبار ۔

مذہب حنفیہ میں سرکاری زمین میں (جو کہ مزارعین کو دی جاتی ہے اور ان سے مالگذاری لی جاتی ہے) زکاۃ یعنی عشر نہیں ہے ۔ رد المختار جلد ۲ صفحہ ۵۰ کتاب الزکاۃ میں ہے : فی التاتارخانیة السلطان اذا دفع اراضی لا مالک لها و هی التی تسمی الاراضی المملکة الی قوم لیعطوا الخراج جاز و طریق الجواز احد الشیئین اما اقامتهم مقام الملاک فی الزراعة و اعطاء الخراج او الاجارة بقدر الخراج و یکون المأخوذ منهم خراجا فی حق الامام اجرة فی حقهم اه و من هذا القبیل الاراضی المصریة و الشامیة کما قدمناه و یؤخذ من هذا انه لا عشر علی المزارعین فی بلادنا اذا کانت اراضیهم غیر مملوکة لهم لان ما یأخذه منهم نائب السلطان و هو المسمی بالزعیم او التیماری ان کان عشرا فلا شیء علیهم غیره و ان کان خراجا فکذلک لأنه لا یجتمع مع العشر و ان کان اجرة فکذلک علی قول الامام من انه لا عشر علی المستأجر و اما علیٰ قولهما فالظاهر انه کذلک لما علمت من ان المأخوذ لیس اجرة من کل وجه لانه خراج فی حق الامام ۔ پس صورت مسئولہ

میں سرکاری زمینوں کے غلے میں بعد ادائی مالگذاری مذہب شافعیہ میں زکاۃ واجب ہے، اور مذہب حنفیہ میں واجب نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی کی رقم کسی پر قرض حسنہ ہو تو مالک پر زکاۃ اس رقم کی واجب الاداء ہے یا نہیں ؟

الجواب

رقم قرضہ بمقدار نصابِ زکاۃ ہے تو ایک سال گزرجانے کے بعد مالک پر اس کی زکاۃ واجب ہے، مگر اس کی ادائی اس وقت کرے جبکہ وہ وصول ہوجائے ۔ اگر بدفعات وصول ہوتی ہے تو جب اس مقدار پر وصول ہو کہ جس کی زکاۃ میں درہم سے کم دینا پڑتا ہے تو یہ معاف ہے ۔ اور اگر ایک درہم سے اس وصول شدہ رقم کی زکاۃ ہوتی ہے تو رقم کے وصول ہوتے ہی اس کا اداء کرنا واجب ہے ۔ ایسا ہی جس قدر رقم وصول ہوتی جائے زکاۃ میں پورے درہموں کی مقدار واجب الاداء ہے ۔ اور از روئے حساب ایک درہم یا کئی درہموں کی مقدار پر زکاۃ کی جو کسر آتی ہے وہ معاف یعنی واجب الاداء نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۶ کتاب الزکاۃ میں ہے : (و) اعلم ان الدیون عند الامام ثلاثۃ قوی و متوسط و ضعیف (فتجب) زکاتہا اذا تم نصابا و حال الحول لکن لا فوراً بل (عند قبض اربعین درھما من الدین القوی) کقرض و مال تجارۃ فلما قبض اربعین درھما یلزمہ درھم ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ عند قبض اربعین درھما) قال فی المحیط لأن الزکاۃ لا تجب فی الکسور من النصاب الثانی عندہ ما لم یبلغ اربعین للحرج فکذلک لا یجب الأداء ما لم یبلغ اربعین للحرج ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوج کے پاس اس کی زوجہ مرحومہ کے زیورات ہیں ۔ کیا اس کی زکاۃ واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب

انسان کے مرجانے کے بعد اس کا تمام مال متروکہ کہلاتا ہے ۔ اس سے میت کی تجہیز و تکفین و قرض و وصیت کی ادائی کی جاتی ہے، اور باقی بحیثیت میراث حسب فرائض ورثہ کی ملک میں آجاتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۶ صفحہ ۴۴۷ کتاب الفرائض میں ہے : الترکۃ تتعلق بہا حقوق اربعۃ جہاز المیت و دفنہ و الدین و الوصیۃ و المیراث ۔ اور میراث کی تعریف اسی صفحہ میں اس طرح کی گئی ہے : و الإرث فی اللغۃ البقاء و فی الشرع انتقال مال الغیر الی الغیر علی سبیل الخلافۃ کذا فی خزانۃ المفتین ۔ صورت مسئولہ میں زوجہ کی تجہیز و تکفین تو مالدار ہونے کی حالت میں بھی زوج ہی کے ذمہ ہے جیسا کہ در

مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۰۲ باب الجنائز میں ہے : و اختلف فی زوج و الفتویٰ علیٰ وجوب کفنھا علیہ و ان ترکت مالا ۔ مگر اس کے متروکات سے ادائے قرضہ اور ثلث مال میں وصیت کا جاری کرنا ضروری ہے ۔ اس کے بعد جو مال باقی رہے وہ اور قرض و وصیت نہ ہونے کی صورت میں کل مال بحیثیت میراث ورثہ کی ملک ہے ۔ چاہیئے کہ حسب فرائض تقسیم کردیا جائے ۔ ہر ایک وارث کو اس مال سے جس قدر حصہ ملے گا شرائط زکاۃ پوری ہونے کے بعد اس وارث پر اس مال کی زکاۃ واجب ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے سکونتی مکان کے علاوہ اور مکانات بھی ہیں جن کا کرایہ زید کو وصول ہوتا ہے ۔ کیا ان مکانوں کی مالیت کے لحاظ سے زید پر زکاۃ ادا کرنا واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب

مکان مسکونہ کے علاوہ کرایہ حاصل کرنے کے مکان اگر ان کی تجارت مقصود نہیں ہے بلکہ محض کرایہ وصول کرنے کیلئے خریدے گئے ہیں تو وہ کتنی ہی زیادہ مالیت کے کیوں نہ ہوں ان میں زکاۃ نہیں ہے ۔ فتح المعین جلد ۱ صفحہ ۳۰۲ کتاب الزکاۃ میں ہے : و لا فرق بین ما لو کانت للسکنیٰ او لم تکن سکنیٰ کانت للاستغلال حتیٰ لو اشتریٰ دارا بقصد استغلال اجرتھا لا تجب علیہ الزکاۃ و ان کانت قیمتھا نصابا ۔ شرح وقایہ مجتبائی جلد ۱ صفحہ ۲۶۸ کتاب الزکاۃ میں ہے ، حتیٰ لو کان لہ عبد لا للخدمۃ او دار لا للسکنی و لم ینو التجارۃ لا تجب فیھما الزکاۃ و ان حال علیہ الحول ۔ فتاوی قاضی خاں مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ کتاب الزکاۃ میں ہے : و لو اشتری قدورا من صفر یمسکھا او یؤاجرھا لا تجب فیھا الزکاۃ کما لا تجب فی بیوت الغلۃ ۔ مغرب کے صفحہ ۷۷ میں ہے : (الغلۃ) کل ما یحصل من ریع ارض او کرائھا او اجرۃ او نحو ذلک ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زمانہ موجودہ کے لحاظ سے سادات کو زکاۃ دے سکتے ہیں؟ اور وہ لینے کے مجاز ہیں یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اگرچیکہ بعض متاخرین نے موجودہ زمانے کے لحاظ سے سادات کو زکاۃ دینے کی اجازت دی ہے ، مگر صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ ناجائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۹۸ کتاب الزکاۃ میں ہے : ثم ظاھر المذھب اطلاق المنع و قول العینی و الھاشمی یجوز لہ دفع زکاتہ لمثلہ صوابہ لا یجوز ۔ البحر الرائق جلد ۲ صفحہ ۲۶۶ میں ہے : و اطلق الحکم فی بنی ھاشم و لم یقیدہ بزمان و لا

بشخص للاشارة الى رد رواية ابى عصمة عن الامام انه يجوز الدفع الى بنى هاشم فى زمانه و للاشارة الى رد الرواية بأن الهاشمي يجوز له ان يدفع زكاته الى هاشمي مثله لأن ظاهر الرواية المنع مطلقا ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۹ میں ہے : و لا يدفع الى بنى هاشم و هم آل علي و آل عباس و آل جعفر و آل عقيل و آل الحارث بن عبد المطلب و يجوز الدفع الى من عداهم كذرية ابى لهب لأنهم لم ينصروا النبى صلى الله عليه و سلم كذا فى السراج الوهاج ۔ زکاۃ اور نذر و عشر و کفارات کے سوا دوسرے جو نفل صدقات ہیں اگر سادات و بنی ہاشم کو دئے جائیں تو جائز ہے ۔ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : هذا فى الواجبات كالزكاة و النذر و العشر و الكفارة فأما التطوع فيجوز الصرف اليهم كذا فى الكافي ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سکۂ عثمانیہ مروجہ ریاست حیدرآباد دکن کے لحاظ سے زکاۃ کا نصاب کس قدر ہے ؟ اور سونے اور چاندی میں تولوں کے حساب سے زکاۃ کے نصاب کی کیا مقدار ہے ؟ اور حیدرآباد کے مروجہ سیر سے صدقۂ فطر کتنا ہوگا ؟

الجواب

چاندی کا نصاب صاحب جواہر اخلاطی اور مولانا معین الدین محشی شرح کنز الدقائق نے ساڑھے باون تولے بیان کیا ہے ۔ اور سونے کا ساڑھے سات تولے ۔ مالا بدکی کتاب الزکاۃ میں حاشیہ پر جواہر اخلاطی کی یہ عبارت ہے : فتكون ماتنا درهم اثنين و خمسين تولجة من الفضة ۔ خزانۃ الروایۃ کی کتاب الزکاۃ میں ہے : و فى حاشية الكنز لمولانا معين الدين من الشرح و القيراط و اربعة اخماس حبة فيكون وزن الدرهم خمسة و عشرين حبة و خمسا حبة و كل تولجة ثلاثة دراهم و عشرون حبة و خمسا حبة لان تولجة اليوم ستة و تسعون حبة لان كل تولجة فى اصطلاحنا اثنا عشرة ماهجة و كل ماهجة ثمانية حبة فعلي هذا يكون نصاب الفضة بوزن بلادنا اثنين و خمسين تولجة و نصف تولجة و الواجب تولجة و ست حبات ، و نصاب الذهب بوزن بلادنا سبع تولجات و نصف تولجة و الواجب ثمن تولجة و نصف ثمن تولجة و ذلك بالماهجة ماهجتان و ربع ماهجة و هو التحقيق فى هذا الباب ۔ فتاویٰ حمادیہ میں بھی یہی عبارت عمیدی سے منقول ہے ۔

مگر معتبر متون و شروح میں سونے کا نصاب بیس مشقال بتلایا گیا ہے اور چاندی کا نصاب لیے دو سو درہم ہیں جن کے ہر دس سات مشقال کے برابر ہوں اور اسی کو وزن سبعہ کہا جاتا ہے ۔ مشقال بیس قیراط کا بیان کیا گیا ہے اور درہم چودہ قیراط کا ، قیراط پانچ متوسط جَو کا ہوتا ہے جن کا پوست نہ نکالا گیا جائے اوران کے کنارے دراز ہوں اور پوست چھیلا ہوا یا کٹے ہوئے نہ لئے جائیں بلکہ صحیح و سالم

ہوں ۔ شرح وقایہ کی کتاب الزکاۃ باب زکاۃ الاموال میں ہے : هو للذهب عشرون مثقالا و للفضة مائتا درهم كل عشرة منها سبعة مثاقيل اعلم ان هذا الوزن يسمى وزن سبعة و هو ان يكون الدرهم سبعة اجزاء من الاجزاء التي يكون المثقال عشرة منها اى يكون الدرهم نصف مثقال و خمس مثقال فيكون عشرة دراهم بوزن سبعة مثاقيل و المثقال عشرون قيراطا و الدرهم اربعة عشر قيراطا و القيراط خمس شعيرات ۔ در مختار کی کتاب الزکاۃ باب زکاۃ المال میں ہے : نصاب الذهب عشرون مثقالا و الفضة مائتا درهم كل عشرة دراهم وزن سبعة مثاقيل و الدينار عشرون قيراطا و الدرهم اربعة عشر قيراطا و القيراط خمس شعيرات فيكون الدرهم الشرعي سبعين شعيرة و المثقال مائة شعيرة فهو درهم و ثلاث اسباع درهم ۔ رد المحتار جلد ا صفحہ ۲۹ میں ہے : قوله و الدينار اى الذى هو المثقال ۔ صفحہ ۳۱ میں ہے : زاد فى النهر عن المعراج الا ان كون الدرهم اربعة عشر قيراطا عليه الجم الغفير و الجمهور الكثير و اطباق كتب المتقدمين و المتأخرين ۔ مجمع الانہر جلد ا باب زکاۃ الذہب و الفضۃ میں ہے : و القيراط خمس شعيرات متوسطة غير مقشورة مقطوعة ما امتد من طرفيها فالمثقال مائة شعيرة ۔

پس ان روایات سے ظاہر ہے کہ سونے اور چاندی دونوں نصابوں کی انتہاء قیراط پر ہے اور بالاتفاق قیراط پانچ جَو کا بتلایا گیا ہے اور جَو بھی متوسط پوست سمیت لینے کا حکم ہے ۔ ریاست دکن بلکہ تمام ہندستان میں چار جَو کی رتی یعنی گھنگچی اور آٹھ رتی کا ماشہ اور بارہ ماشہ کا تولہ مروج ہے جن میں تولہ کی انتہاء بھی چار جَو کی کی گئی ہے ۔ اس لئے تحقیق کی غرض سے متوسط چار جَو پوست سمیت جن کے دونوں بازو دراز تھے رتی یعنی گھنگچی کے مقابل کانٹے میں رکھکر تولے گئے اور بے کم و کاست وزن میں بالکل ایک گھنگچی کے برابر پائے گئے ۔ پس تحقیق سے ایک درہم جس کا وزن چودہ قیراط ہے ستر جو کا ہوا جس کے ساڑھے سترہ رتی یعنی دو ماشہ ڈیڑھ رتی ہیں ۔ اور دو سو درہم کے چھتیس تولے ساڑھے پانچ ماشے چاندی کی زکاۃ کا نصاب ہوا ۔

حیدرآباد کا روپیہ چونکہ گیارہ ماشہ کا ہے اس لئے انچالیس روپے بارہ آنے دو رتی روپیوں کے حساب سے زکاۃ کا نصاب ہوتا ہے جو تقریبا چالیس روپے ہیں ۔

سونے کا نصاب بیس مشقال ہے ۔ ایک مشقال بیس قیراط یعنی سو جَو کا ہوتا ہے اور سو جَو کے پچیس رتی یعنی تین ماشے ایک رتی ہیں ۔ اس حساب سے بیس مشقال کے پانچ تولے ڈھائی ماشے سونے کی زکاۃ کا نصاب ہے ۔

مقدار نصاب کا چالیسواں حصہ زکاۃ کی مقدار ہے ۔ جو دو سو درہم چاندی میں پانچ درہم ۔ اور بیس مشقال سونے میں آدھا مشقال ہوتا ہے ۔ تولوں اور روپیوں کے حساب سے چھتیس تولے ساڑھے پانچ ماشہ چاندی کی زکاۃ پانچ درہم یعنی دس ماشے ساڑھے سات رتی ۔ اور چالیس روپیوں کی زکاۃ ایک روپیہ ہے ۔ اور پانچ تولے ڈھائی ماشہ سونے کی زکاۃ آدھا مشقال یعنی ایک ماشہ ساڑھے چار رتی ہے ۔

اشرفی چونکہ ہمارے پاس چھوٹی بڑی ہے اس لئے اس کو سونے کے وزن سے حساب کرنا چاہئے ۔

مقدار نصاب کے بعد جس قدر زیادتی ہوتی جائے جب تک وہ نصاب کے پانچویں حصہ کو نہ پہنچے

معاف ہے ۔ اور جب پورا پانچواں حصہ زائد ہوجائے جب اصلِ نصاب کی زکاۃ کے علاوہ زائد پانچویں حصے کی زکاۃ مقدار زکاۃ کا پانچواں حصہ دیا جائے ۔ مثلاً چالیس روپیہ نصاب پر اگر دو تین چار پانچ سات روپے زائد ہوجائیں تو اس کی زکاۃ معاف ہے ۔ اس میں محض چالیس کا ایک ہی روپیہ دینا ہوگا ۔ اور اگر آٹھ روپے زائد ہوجائیں جو چالیس کا پانچواں حصہ ہے جب چالیس کا تو ایک روپیہ دیا جائے ۔ اور آٹھ روپے کی زکاۃ ایک روپیہ کا پانچواں حصہ یعنی تین آنہ ایک پیسہ اور ایک پیسہ کا پانچواں حصہ دیا جائے ۔ پھر اسی طرح چالیس روپے پر سولہ روپے زائد ہونے تک ایک روپیہ تین آنے ایک پیسہ اور ایک پیسہ کا پانچواں حصہ دیتے رہیں ۔ اور جب چالیس پر سولہ روپے زائد ہوجائیں تو ایک روپیہ چھ آنے دو پیسے اور دو پیسوں کا پانچواں حصہ دینا چاہیے ۔ اسی طرح چاندی کے نصاب یعنی چھتیس تولے ساڑھے پانچ ماشہ پر جبکہ پانچواں حصہ سات تولے تین ماشے چار رتی زائد ہوجائیں تو مقدار زکاۃ یعنی دس ماشے ساڑھے سات رتی کا پانچواں حصہ دو ماشے ایک رتی دو جُز زائد دیا جائے ۔ اور سونے کے نصاب یعنی پانچ تولہ ڈھائی ماشہ پر جبکہ اس کا پانچواں حصہ یعنی ایک تولہ چار رتی زائد ہوجائے تو اس کی زکاۃ ایک ماشہ ساڑھے چار رتی کا پانچواں حصہ دو رتی دو جُز زائد دیا جائے ۔ ایسا ہی ہر پانچویں حصہ کی زیادتی کی مقدار زکاۃ کا پانچواں حصہ دینا چاہیے اور جو زیادتی نصاب کے پورے پانچویں حصہ کو نہ پہنچے اس کی زکاۃ معاف ہے ۔

عمدۃ الرعایہ میں مولانا عبد الحی رحمہ اللہ نے بھی زکاۃ کے نصاب کی یہی تحقیق کی ہے ۔ اور کنز الحسنات فی ایتاء الزکاۃ میں بھی ملا مبین رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے ، جس کو مولانا عبد الحی نے معتبر مانا ہے ۔ عمدۃ الرعایہ مطبوعہ بر حاشیہ شرح وقایہ مطبوعہ انوار محمدی جلد ۱ صفحہ ۲۸۵ باب زکاۃ الاموال میں ہے : فاعلم ان الوزن المعروف فی بلادنا ماشجة و تولجة هو الذی یقال له "تولہ اثنتا عشرۃ ماشجۃ" و هو الذی یقال له ماشہ ، و الماشجة یکون له ثمانیة اجزاء منها یسمی بالفارسیة سرخ و یقال له بالهندیة رتی بفتح الراء المهملة و کسر التاء المثناۃ الفوقیة المشددۃ و اسمه المشهور گھنگچی بضم الکاف الفارسیة بعدها هاء ثم نون ثم کاف فارسیة ساکنة ثم جیم فارسیة مکسورۃ و لنسمه بالاحمر و هذا الجزء یکون بقدر اربعة شعیرات فیکون المثقال الذی هو مائة شعیرۃ خمسة و عشرین جزء احمر و هو ثلاث ماشجة و احمر واحد فیکون نصاب الذهب و هو عشرون مثقالا مقدار خمس تولجة و اثنتین ماشجة کما یعلم من ضرب ثلاث ماشجة و احمر فی عشرین هذا فی الذهب . و اما الفضة فقد عرفت ان نصابه مائتا درهم و کل درهم اربعة عشر قیراطا یعنی سبعین شعیرۃ فتحصل فی درهم سبعة عشر و نصف احمر و هو ماشجتان و واحد و نصف من ذلک الاحمر فیکون مقدار مائتی درهم ستا و ثلاثین تولجة و نصف ماشجة . و من المعلوم ان السکة المضروبة المتداولة فی بلادنا بلاد حکومة النصاریٰ تکون بقدر احدی عشرۃ و نصف ماشجة فیعرف القدر منه بأدنیٰ تأمل ممن له ممارسة فی الحساب ۔ اور صفحہ ۲۸۴ میں ہے : و ان شئت تحقیق وزن المثقال و الدرهم و غیرهما بحسب ما تعارفه اهل بلادنا فارجع الی کنز الحسنات فی ایتاء الزکاۃ لملا محمد مبین اللکهنوی و فتاوی ابنه مولانا محمد معین ۔

کنز الحسنات فی احیاء الزکاۃ مطبوعہ علوی صفحہ ہ میں ہے: قال فی الھدایۃ المعتبر فی الدرھم وزن سبعۃ و ھو ان یکون العشرۃ منھا وزن سبعۃ مثاقیل بذلک جری التقدیر فی دیوان عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ۔ یعنی در ہدایہ گفتہ کہ معتبر در دراہم نصاب کہ دو صد درم است وزن سبعہ است کہ دہ درم ازاں بمقدار ہفت مشـقال باشد و ہمیں وزن در دفتر حساب امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقرر یافت و ثابت و قائم ماند۔ در شرح وقایہ گفتہ کہ یکدرم بایں وزن سبعہ نیم مشـقال و پنجم حصہ از مشـقال می شود۔ پس بریں تقدیر دہ درم بوزن ہفت مشـقال شد و مشـقال بست قیراط است و قیراط پنج جو است۔ پس یکدرم چہاردہ قیراط بوزن ہفتاد جو شد۔ و رتی ایں شہر کہ آنرا در فارسی سرخ و در ہندی گھنگچی نامند بقدر چہار جواست پس ہفتاد جو کہ ہفدہ و نیم رتی است بحساب فی ماشہ ہشت رتی بوزن دو ماشہ و یک و نیم رتی می شود۔ پس یک درم دو ماشہ و یک و نیم رتی می شود۔ و دہ درم شرعی بایں حساب بست و دو ماشہ رتی کم کہ بحساب فی روپیہ یازدہ ماشہ کہ رائج الوقت است دو روپیہ کسرے کم یعنی پاؤ آنہ چہارم کم کہ تقریباً میشود۔ ہرگاہ دانستی کہ دہ درم شرعی بقدر دو روپیہ سکہ حال است۔ پس بدانکہ دو صد درم کہ نصاب زکاۃ است بایں حساب سی و ششش تولہ و پنج و نیم ماشہ می شود۔ و در آں دادن زکاۃ دہ ماشہ و ہفت و نیم رتی واجب است۔ و بحساب روپیہ ہائے مروجہ چہل روپیہ تقریبا یعنی سی و نہ روپیہ دوازدہ آنہ و یک نیم پاؤ بالا کسرے کم خواہد شد در آں یک روپیہ کہ ربع عشر چہل است در زکاۃ بالفراد دادن واجب و لازم است۔ و اگر بقدر پنجم حصہ زیادہ شود یعنی بر چہل ہشت روپیہ مثلا زیادہ شود یک روپیہ و سہ آنہ کسرے زیادہ بدہد۔ و در زیادتی بر نصاب زکاۃ کہ کمتر از خمس باشد ہموں یک روپیہ کہ در نصاب زکاۃ است کافی است زیادہ دادن نمی رسد زیرا کہ نزد امام اعظم زکاۃ نیست تا کہ زیادتی بقدر خمس نرسد زکاۃ واجب نگردد۔ و ہر گاہ کہ زیادتی بہ ہشت رسد یکروپیہ و سہ آنہ کسرے زیادہ دہد۔ و در ہر زیادتی ہمیں قدر خمس معتبر است مثلا در چہل و شانزدہ روپیہ کہ زیادتی دو خمس است یک روپیہ و ششش و نیم آنہ تقریبا بدہد۔ و نصاب طلاء بست مشـقال است و مشـقال بست قیراط کہ بوزن بست و پنج رتی کہ مقدار سہ ماشہ و یکرتی است۔ پس یک مشـقال بمقدار سہ ماشہ و یک رتی شد۔ و بست مشـقال بمقدار شصت و دو نیم ماشہ می شود و آں بحساب تولہ پنج تولہ و دو نیم ماشہ شد۔ ہمیں نصاب طلاء است۔

پس صورت مسئولہ میں نصاب زکاۃ تولہ کے حساب سے چاندی میں چھتیس تولے ساڑھے پانچ ماشے۔ اور سونے میں پانچ تولے ڈھائی ماشے۔ اور روپیوں میں تقریبا چالیس روپیہ سکہ عثمانیہ ہے۔ جیسا کہ کتب معتبرہ فقہ سے ثابت ہے۔ ساڑھے باون تولہ کی روایت چونکہ حساب میں متون و شروح کے خلاف ہے لہذا قابل عمل نہیں۔

صدقۂ فطر کی مقدار تمام معتبرہ کتب فقہ میں نصف صاع بتلائی گئی ہے۔ اور ہمارے پاس یعنی مذہب حنفی میں عراقی صاع معتبر ہے۔ شرح وقایہ میں نصف صاع عراقی دو من کا بیان کیا گیا ہے۔ اور ایک من ایک سو اسی مشـقال کا ہے۔ اور در مختار میں ایک صاع ایک ہزار چالیس درہم کا بیان کیا گیا ہے جس کا نصف پانچ سو بیس درہم ہے۔ شرح وقایہ مطبوعہ انوار محمدی جلد ۱ صفحہ ۳۰۰ باب صدقہ فطر میں ہے: ثم

اعلم ان ھذا الصاع ھو الصاع العراقی و اما الحجازی فھو خمسة ارطال و ثلث رطل فالواجب عند الشافعی من الحنطة نصف صاع من الحجازی و عندنا نصف صاع من العراقی و ھو منوان علی ان المن اربعون استارا و الاستار اربعة مثاقیل و نصف مثقال فالمن مائة و ثمانون مثقالا ۔ در مختار میں ہے : و ھو ای الصاع المعتبر ما یسع الفا و اربعین درھما من ماش او عدس ۔ ہدایہ کے صدقہ فطر میں ہے : قال و الصاع عند ابی حنیفه و محمد ثمانیة ارطال بالعراقی ۔ وقایہ کے صدقہ فطر میں ہے : صاع مما یسع فیه ثمانیة ارطال من مج او عدس ۔ نصاب زکاۃ کی تحقیق میں یہ لکھدیا گیا ہے کہ ایک مثقال تین ماشہ ایک رتی کا ہوتا ہے ، اور ایک درہم دو ماشہ ڈیڑھ رتی کا ۔ پس اس حساب سے شرح وقایہ کے موافق نصف صاع کے دو من اور ہر من کے تین سو سات مثقال ہوتے ہیں جس کا وزن ترانوے تولہ نو ماشے ہے ۔ اور در مختار کے موافق نصف صاع پانچ سو پچیس درہم کا ہے جس کے چورانوے تولے نو ماشے چار رتی ہوتے ہیں ۔ در مختار کا وزن شرح وقایہ کے وزن سے ایک تولہ چار رتی زائد ہے ، چونکہ رد محتار کی جلد ۱ صفحہ ۸۰ میں ہے : فی مبسوط السرخسی من ان الاخذ بالاحتیاط فی باب العبادات واجب ۔ یعنی جس میں احتیاط ہے وہی قول عبادات میں واجب العمل ہے ۔ اس لئے در مختار کے قول پر عمل کرنے میں شرح وقایہ کے قول پر بھی عمل ہوجاتا ہے ۔ اس لئے صدقہ فطر میں نصف صاع گیہوں یعنی چورانوے تولے نو ماشہ چار رتی دینا واجب ہے ۔

حیدرآباد دکن میں چونکہ انگریزی سیر مروج ہے اور انگریزی سیر کو کلدار روپیہ کے ساتھ وزن کیا گیا تو ایک سیر وزن میں اسی روپئے کلدار کے برابر پایا گیا ۔ اور کلدار روپیہ کو تولا گیا تو ساڑھے گیارہ ماشہ کا ثابت ہوا ۔ اس حساب سے انگریزی سیر چھتر تولے آٹھ ماشے کا ہے ، اور نصف صاع کے چورانوے تولے نو ماشے چار رتی ۔ انگریزی سیر کے حساب سے ساڑھے بارہ ماشے کم سوا سیر ہوتے ہیں ۔ اگر بر بنائے احتیاط سوا سیر انگریزی دے دیا جائے تو صدقہ فطر اداء ہوجاتا ہے ۔ دیہات میں جہاں انگریزی سیر رائج نہیں ہے بارہ ماشہ کے تولہ سے چورانوے تولے نو ماشے چار رتی صدقہ فطر اداء کیا جائے ۔ شہر میں چونکہ بیوپاریوں کے سیر عموماً کم ہوتے ہیں اس لئے جو سیر بازار میں رائج ہے اسی سے پورے سوا سیر گیہوں دینا چاہئے جس سے بلا شبہ واجب اداء ہوجاتا ہے ۔ اگر کوئی اس سے زائد دے تو زائد اس کی طرف سے صدقہ ہوجاتا ہے ۔ ریاست دکن میں عموماً جو ڈھائی سیر گیہوں مقدار صدقہ فطر مشہور ہے از روئے تحقیق فقہ کی معتبر کتب یعنی شرح وقایہ ، ہدایہ ، و در مختار وغیرہ کے حساب سے دوگنا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ریاست حیدرآباد میں حزارعین جو سرکاری زمینات کا محصول د پن اداء کرتے ہیں کیا اس محصول کی ادائی کے بعد ان پر غلہ کا دسواں حصہ جس کو "عشر" کہتے ہیں فقراء کو دینا لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب

محصول سرکاری ادا کرنے کے بعد عشر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۵۰ کتاب الزکاۃ باب العشر میں ہے: لا عُشر علیٰ المزارعین فی بلادنا اذا کانت اراضیھم غیر مملوکة لھم لان ما یأخذہ منھم نائب السلطان و ھو المسمیٰ بالزعیم او التیماری ان کان عُشراً فلا شیء علیھم غیرہ و ان کان خراجاً فکذٰلک لأنہ لا یجتمع مع العشر و ان کان اجرةً فکذٰلک علی قول الامام من انہ لا عشر علی المستأجر۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو تجارت کیلئے روپیہ قرض دیا تھا، عمرو کو تجارت میں نقصان ہوا۔ زید چاہتا ہے کہ اس روپیہ کو اپنے ذمہ کی زکاۃ میں عمرو کو معاف کردے، کیا معافی قرضہ سے زکاۃ واجب ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟ کیا بنی ہاشم کو زکاۃ کا روپیہ دینا درست ہے؟ اور سونے چاندی کے زیور میں زکاۃ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس قدر؟ بینوا توجروا۔

الجواب

قرضدار اگر تنگدست ہے تو اس کو زکاۃ واجب کے معاوضہ میں اگر قرض معاف کردیا جائے تو زکاۃ ادا ہوجاتی ہے۔ در مختار کی کتاب الزکاۃ میں ہے: و لو أبرأ ربّ الدَّین المدیون بعد الحول فلا زکاة سواء کان الدَّین قویا او لا۔ خانیة۔ و قیدہ فی المحیط بالمعسر۔ رد المحتار میں ہے: و لو وھب الدَّین معن علیہ و ھو فقیر تسقط عنہ الزکاة۔

بنی ہاشم کو زکاۃ دینا درست نہیں ہے۔ در مختار کی کتاب الزکاۃ باب المصرف میں ہے: و لا الیٰ بنی ھاشم۔

چھتیس تولہ ساڑھے پانچ ماشے چاندی کا نصاب ہے، اس میں دس ماشے ساڑھے سات رتی زکاۃ دینا چاہئے، تمام چاندی کے زیورات کی اسی حساب سے زکاۃ دی جائے۔ اور پانچ تولہ ڈھائی ماشہ سونے کا نصاب ہے اس میں ایک ماشہ ساڑھے چار رتی زکاۃ دینا چاہئے، تمام سونے کے زیور کی اسی حساب سے زکاۃ دینا چاہئے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حقیقی بھائی کو زکاۃ کا روپیہ دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

بشرط محتاجی حقیقی بھائی کو زکاۃ کا روپیہ دینا درست اور بہتر ہے، کیونکہ ماں باپ اور اولاد کے سوا

باقی قرابت داروں کو زکاۃ دینے میں صلہ رحمی اور صدقہ دونوں باتیں پوری ہوتی ہیں۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب الزکاۃ باب المصرف میں ہے: و قید بالولاد لجوازہ لبقیۃ الأقارب کالإخوۃ و الأعمام و الأخوال و الفقراء بل ھم اولیٰ لأنہ صلۃ و صدقۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زکاۃ و فطرہ و چرم قربانی مدرسہ یا کسی انجمن کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کوئی ہندو جانماز تحفہ دے تو اس پر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

چونکہ طلبائے علوم دینیہ کو زکاۃ دینا درست ہے اس لئے رقم زکاۃ و فطرہ و چرم قربانی طلبائے علوم دینیہ کے حوائج میں صرف کرنے کیلئے کسی دینی مدرسہ کے متولی یا دینی انجمن کے سرپرست کو دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ سرپرست انجمن طلبائے علوم دینیہ کے مصارف میں خرچ کرے۔ در مختار کے کتاب الزکاۃ باب المصرف میں ہے: ان طالب العلم یجوز لہ اخذ الزکاۃ و لو غنیا اذا فرّغ نفسہ لإفادۃ العلم و استفادتہ بعجزہ عن الکسب و الحاجۃ داعیۃ الی ما لا بد منہ کذا ذکرہ المصنف۔ رد المحتار میں ہے: و فی المبسوط لا یجوز دفع الزکاۃ الی من یملک نصابا الا الی طالب العلم و الغازی و منقطع الحج لقولہ علیہ الصلاۃ و السلام: یجوز دفع الزکاۃ لطالب العلم و ان کان لہ نفقتہ اربعین سنۃ۔

ہندو اگر مسلمان کو جانماز تحفتاً دے تو اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ اہل ذمہ کا مسلمانوں کو ان کے مذہبی امور میں صرف کرنے کیلئے مال و جائداد کا دینا درست ہے بشرطیکہ کسی خاص شخص یا اشخاص کو دے۔ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۳۰۵ میں ہے: و اھل الذمۃ فی حکم الھبۃ بمنزلۃ المسلمین لأنھم التزموا احکام الاسلام فی ما یرجع الی المعاملات۔ الإسعاف فی احکام الاوقاف صفحہ ۱۱۹ میں ہے: و لو اوصیٰ الذمی ان تبنی دارہ مسجدا لقوم بأعیانھم او لأھل محلۃ بأعیانھم جاز استحسانا لکونہ وصیۃ لقوم بأعیانھم و کذلک یصح الإیصاء بمال لرجل بعینہ لیحج بہ لکونہ وصیۃ لمعیّن ثم ان شاء حج بذلک و ان شاء ترک۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

کتاب الصوم

الاستفتاء

اگر کوئی شخص قبل طلوع صبح جماع کرے یا احتلام والا ہو اور اسی حالت ناپاکی میں صبح ہوجائے ، تو کیا اس ناپاکی سے روزہ میں کوئی فساد لازم آتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اس ناپاکی سے روزہ میں کوئی فساد لازم نہیں آتا ۔ فتاویٰ سراجیہ فیما یفسد الصوم میں مذکور ہے : لو اَصبح جنباً لا یفسد الصوم ۔ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۲۰ میں ہے : و من اصبح جنباً او احتلم فی النہار لم یضرہ کذا فی محیط السرخسی ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

ہر کوئی شخص رمضان شریف میں اپنی عورت سے بعد مغرب کب تک جماع کرسکتا ہے ؟ اور بعد نماز صبح اپنی عورت سے جماع کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

رمضان شریف میں غروب آفتاب سے لیکر صبح صادق تک کھانے پینے اور جماع کرنے کی اجازت ہے ۔ بعد طلوع صبح صادق جبکہ نماز صبح کا وقت شروع ہو جاتا ہے کھانا پینا اور جماع کرنا روزہ دار کیلئے قطعا حرام ہے ۔ محیط سرخسی جلد اول صفحہ ۸۰ کتاب الصوم میں ہے : قولہ تعالیٰ " ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ " فان اللہ تعالیٰ اباح لکم الاکل و الشرب و الوقاع فی لیالی رمضان ثم اَمر بالکَفِّ فی النہار من وقت طلوع الفجر الیٰ دخول اللیل فیکون مقداراً بالیوم ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

بعد نماز صبح کوئی شخص آرام کرے اور بدخوابی ہو تو وہ صبح کو غسل کرسکتا ہے یا روزہ فاسد ہوجائیگا ؟ اور غسل کرے تو کون کونسی شرائط چھوڑنی پڑیں گی ؟

الجواب

روزہ کی حالت میں ناپاکی کا غسل کرنے سے کوئی فساد نہیں آتا ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ غسل زوال سے پہلے کرلیا جائے چونکہ زوال کے بعد سے روزہ کی قبولیت شروع ہوجاتی ہے ایسے وقت میں ناپاک رہنا مکروہ ہے ۔ غسل کھڑے ہوکر کر سکتے ہیں اور غوطہ لگاکر کرنا بھی جائز ہے، مگر غوطہ لگاتے وقت کان ، ناک ، منہ ، آنکھ ، مقعد ، ان سب کو اچھی طرح بند کرلینا چاہئے تاکہ پانی انکے ذریعہ سے اندر نہ جائے ۔ حتیٰ کہ غوطہ کی حالت میں پانی میں گوز لگانا بھی مکروہ ہے ۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے ۔ اور غرغرہ کرنے اور ناک میں پانی لیتے وقت بھی یہی احتیاط کیجائے تاکہ زیادتی نہ ہو جائے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۹۹ میں ہے : و تکرہ له المبالغة في الاستنجاء ۔ کذا في السراج الوهاج و کذا المبالغة في المضمضة و الاستنشاق ۔ قال شمس الائمة الحلوائي و تفسير ذلك ان يكثر امساك الماء في فمه و يملأ لا ان يغرغر كذا في المحيط ۔ و لو فسا الصائم او ضرط في الماء لا يفسد الصوم و يكره له ذلك هكذا في معراج الدراية ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

اگر کوئی بعد نماز ظہر آرام کرے اور بدخوابی ہو جائے ، تو اس کے متعلق شارع نے کیا حکم کیا ہے ؟

الجواب

جنابت سے روزہ میں کوئی نقصان و ضرر نہیں آتا ۔ محیط سرخسی جلد اول صفحہ ۸۳ میں ہے : و من اصبح جنبا او احتلم في النهار لم يضره ۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۱۰۹ میں ہے : (او اصبح جنبا) و ان بقي كل اليوم (لم يفطر) ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

اگر کسی کو روزہ کی حالت میں کھٹی ڈکار آئے تو کیا ہوتا ہے ؟

الجواب

زیادہ کھانے سے کھٹی ڈکاریں آتی ہیں ۔ اور سحر کے وقت ضرورت سے زیادہ کھانا مکروہ ہے اگرچیکہ روزہ ہوجاتا ہے ۔ جیسا کہ فتاوی شرنبلالی قلمی صفحہ ۵۹، باب السحور میں ہے : و ينبغي ان لا يكثر فيه بما لا يبقى معه احساس ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

روزہ میں عود یا اگربتی کا دھواں خود بخود حلق میں جائے ، یا کوئی عمداً لے تو کوئی فساد پیدا ہوتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

روزہ کی حالت میں دھواں خود بخود حلق میں جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی شخص عمداً دھواں حلق میں داخل کرے تو روزہ فاسد ہوجاتا ہے۔ اور اس پر اسی روزہ کی قضاء واجب ہے۔ بلکہ عود و عنبر کا دھواں عمداً لینے سے تو کفارہ بھی لازم آتا ہے۔ اسی طرح تمباکو کے دھویں کا حال ہے۔ رد المحتار شامی جلد ۲ صفحہ ۱۰۰ میں ہے: (او دخل حلقه غبار او ذباب او دخان) و لو ذاكرا استحسانا لعدم امكان التحرز عنه۔ و مفاده انه لو أدخل حلقه الدخان أفطر اى دخان كان و لو عودا او عنبرا لو ذاكرا لامكان التحرز عنه فليتنبه له۔ فتاوی شرنبلالیہ باب ما یفسد الصوم صفحہ ۵۲، میں ہے: او أدخل دخاناً بصنعه متعمداً الیٰ جوفه او دماغه لوجود المفطر و هذا فى دخان غير العنبر و العود و فيهما لا يبعد لزوم الكفارة ايضا للنفع و التداوى و كذا الدخان الحادث شربه و ابتدع بهذا الزمان كما قدمناه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

سحر کے وقت کی ابتداء کب سے ہوتی ہے؟ اور انتہاء کب تک ہے؟ مفصل بحوالۂ کتب تحریر فرمائیں۔

الجواب

سحر کا وقت رات کے سُدسِ اخیر میں یعنی رات کے اخیر والے چھٹے حصہ سے شروع ہوتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۲۰۰ جلد اول میں مسطور ہے: التسحر مستحب و وقته آخر الليل قال الفقيه ابو الليث و هو السدس الاخير هكذا فى السراج الوهاج۔ پس روزہ دار کو چاہیئے کہ طلوع آفتاب و غروب آفتاب کو ٹھیک طور پر دریافت کرلے کے بعد ما بین طلوع و غروب جس قدر وقت رہے اس کے چھ حصے کرلے، ابتدائے شب سے پانچ حصے چھوڑ دے، اب جو اخیر والا چھٹا حصہ رہ جائیگا اس کے شروع ہوتے ہی سحر کا مسنون ابتدائی وقت شروع ہوجاتا ہے۔ علم ہیئت کے قاعدہ سے یہ امر ثابت ہے کہ جب آفتاب افق سے اٹھارہ درجہ نیچے ہوتا ہے تب صبح کاذب طلوع ہوتی ہے، جو سحر کا انتہائی اور نماز صبح کا ابتدائی وقت ہے۔ پس حیدرآباد میں جس زمانہ میں کہ رات چھوٹی سے چھوٹی یعنی ۱۰ گھنٹہ ۵۴ منٹ کی ہوگی سحر مسنون کی ابتداء ۳ بجکر ۲۸ منٹ سے ہوگی اور انتہاء ۳ بجکر ۴۷ منٹ تک۔ اور جوں جوں رات بڑھتی جائیگی ان اوقات میں اختلاف ہوتا جائیگا، یہاں تک کہ جب رات اور دن مساوی ہوجائیں گے تو ابتداء وقت سحر مسنون ۴ بجے سے ہوگا اور انتہاء ۵ بجے تک۔ پھر بعد مساوات جس قدر رات کی زیادتی دن سے ہوتی جائیگی اوقات میں اختلاف ہوتا جائیگا، یہاں تک کہ جب رات ۱۳ گھنٹے ۳ منٹ کی ہوگی جسے "اطول اللیل" کہتے ہیں تو اس وقت سحر مسنون کی ابتداء ۳ بجکر ۲۸ منٹ سے ہوگی اور انتہاء ۵ بجکر ۳۲ منٹ تک۔

تنبیہ

یہ حساب بلدہ حیدرآباد کے ڈائیل اور دائرہ ہندسیہ سے قائم کیا گیا ہے۔ جس کی تصحیح ہر وقت اس

گھڑی سے ہو سکتی ہے جو یہاں کے ڈائل اور دائرہ ہندسیہ کے مطابق ہو۔

صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی سحر کرنا یعنی کھانا پینا وغیرہ حرام ہے ، کیونکہ یہاں سے روزہ شروع ہوجاتا ہے اور یہی روزہ کا وقت ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد اول صفحہ ۱۹۳ میں مذکور ہے : و وقته من حين يطلع الفجر الثاني و المستطير المنتشر في الأفق الى غروب الشمس ۔ صبح صادق میں بھی وہ صبح صادق معتبر ہے جو پہلے پہل نکلتی ہے اس کا خوب اچھی طرح پھیلنا اور ہر طرف اڑنا ضروری نہیں اور اسی میں احتیاط ہے اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد اول صفحہ ۱۹۳ میں ہے : و قد اختلف في ان العبرة لأول طلوع الفجر الثاني او لاستطارته و انتشاره فيه قال شمس الأئمة الحلوائي القول الاول احوط و الثاني اوسع هكذا في المحيط و اليه مال أكثر العلماء كذا في خزانة الفتاوىٰ في كتاب الصلاة ۔

سحر کا آخر وقت میں کرنا مستحب ہے ، مگر ایسے آخر وقت میں کہ جس میں شک پڑجائے مکروہ ہے ، اس لئے بالکل آخر وقت میں جب کہ طلوع فجر قریب ہو سحر کرنا بہتر نہیں ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ صفحہ ۲۰۰ جلد اول میں مذکور ہے : ثم تأخير السحور مستحب كذا في النهاية الخ و يكره تاخير السحور الى وقت يقع فيه الشك هكذا في السراج الوهاج ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ماہ رمضان شریف میں اگر چاند آخر ماہ میں سورج غروب ہونے کے قبل نظر آوے تو روزہ افطار کرسکتے ہیں ؟

الجواب

چاند کے قبل از غروب آفتاب دن میں نظر آنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے ، اس کے نظر آنے سے نہ تو اس روز افطار کرنے کی ضرورت ہے نہ اس کے بعد والے دن میں روزہ رکھنے کی حاجت ۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار شامی جلد ۲ صفحہ ۹۹ مطبوعہ مصری میں مذکور ہے : (نهارا) قبل الزوال و بعده (غير معتبر على) ظاهر (المذهب) و عليه أكثر المشايخ و عليه الفتوىٰ ، بحر عن الخلاصة ۔ اور فتاوی رد المحتار شامی میں ہے : و معنىٰ عدم اعتبارها انه لا يثبت بها حكم من وجوب صوم او فطر فلذا قال في الخانية فلا يصام و لا يفطر و اعاده و ان علم مما قبله ليفيد ان قوله لليلة الآتية لم يثبت بهذه الرؤية بل ثبت ضرورة أكمال العدة ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص ماہ رمضان شریف میں نماز کے وقت فرض میں شامل نہ ہو تو وہ وتر میں شامل ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

رمضان شریف میں جب کہ کوئی شخص امام کے ساتھ فرض عشاء میں شامل نہ ہو تو اس کا وتر میں امام کے ساتھ شامل ہونا درست نہیں ہے۔ فتاوی رد المحتار شامی جلد ۱ مطبوعہ مصری ۴۹۰ میں مذکور ہے، لکن فی التاتارخانیۃ عن التتمۃ انہ سئل علی بن احمد عمن صلی الفرض و التراویح وحدہ او التراویح فقط ہل یصلی الوتر مع الامام فقال لا۔ ثم رأیت القہستانی فی ذکر تصحیح ما ذکرہ المصنف ثم قال لکنّہ اذا لم یصلّ الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر۔ جامع الرموز کشوری کے صفحہ ۹۰ میں ہے، لکنّہ اذا لم یصلّ الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر کما فی المنیۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ تار (ٹیلیگرام وغیرہ) کے ذریعہ سے رؤیت ہلال کی خبر اگر اس طرح آئے کہ وہاں کا قاضی یا عہدہ دار گواہیاں لیکر بذریعہ تار اطلاع دے اور گواہوں کا نام بھی تار میں بیان کردے، تو کیا ایسا تار معتبر سمجھا جائیگا یا نہیں؟ معتبر بنانے کا کوئی طریقہ مثلاً اگر تار دینے والے سے دوبارہ تصدیق کرلی جائے یا دو تین عہدہ داروں کے نام سے تار دیا جائے اور وہ تصدیق کرلیں۔ اس طریقے سے تار کی خبر معتبر ہوسکتی یا نہیں؟

الجواب

بلادِ غیر کی رؤیتِ ہلال فقہاء کے پاس اس وقت قابل اعتبار ہے جبکہ اس شہر کے دو شخص آکر رؤیتِ ہلال کی گواہی دیں، یا دو شخص اس بات کی گواہی دیں کہ وہاں قاضی (حاکم) نے حکم دیدیا ہے، یا اس شہر میں وہاں کی رؤیت کی خبر مشہور ہوجائے یعنی مقام رؤیت سے لوگ اس کثرت کے ساتھ یہاں آکر بیان کریں کہ ان کا جھوٹ بولنا عقل کے پاس محال ہو۔ در مختار کی کتاب الصوم میں ہے: (فیلزم اہل المشرق برؤیۃ اہل المغرب) اذا ثبت عندہم رؤیۃ اولئک بطریق موجب کما مرّ۔ رد المحتار میں ہے: (قولہ بطریق موجب) کأن یتحمل اثنان الشہادۃ او یشہدا علی حکم القاضی او یستفیض الخبر بخلاف ما اذا أخبرا ان اہل بلدۃ کذا رأوہ لأنہ حکایۃ۔ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ تنبیہ الغافل و الوسنان فی احکام ہلال رمضان میں لکھا ہے: ان المراد بالاستفاضۃ تواتر الخبر من الواردین من تلک البلدۃ الی البلدۃ الأخری لا مجرد الاستفاضۃ لأنہا قد تکون مبنیۃ علیٰ راخبار رجل واحد فیشیع الخبر عنہ و لا شک ان ہذا لا یکفی۔

اور فقہاء نے یہ بھی تصریح کردی ہے کہ روزہ چونکہ امر دینی ہے اور خیر محض ہے اس لئے غبار و ابر کی حالت میں اس کا ثبوت ایک مرد عادل کے بیان سے بھی ہوسکتا ہے۔ اور افطار میں چونکہ دنیوی نفع ہے اس لئے یہ حقوق العباد کے مشابہ ہے جس کے ثبوت میں دیگر حقوق کی طرح شرعی شہادت پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ در مختار کی کتاب الصوم میں ہے: (و قبل بلا دعوی و) بلا (لفظ اشہد) و

بلا حکم و مجلس قضاء لأنه خبر لا شهادة (للصوم مع علة كغيم) و غبار (خبر عادل) او مستور على ما صححه في البزازية على خلاف ظاهر الرواية (و لو قنا او انثى او محدوداً في قذف تاب و شرط للفطر) مع العلة و العدالة (نصاب الشهادة و لفظ اشهد) و عدم الحد في قذف لتعلق نفع العباد ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله لتعلق نفع العباد) علة لاشتراط ما ذكر في الشهادة على هلال الفطر بخلاف هلال الصوم لأن الصوم أمر ديني فلم يشترط فيه ذلك اما الفطر فهو نفع دنيوي للعباد فأشبه سائر حقوقهم فيشترط فيه ما يشترط فيها ۔ چنانچہ اہل قریہ کو رمضان شریف کا روزہ رکھنے کیلئے شہر سے توپوں کا سر ہونا یا شہر کے میناروں پر قندیلوں کا روشن ہونا وغیرہ علامات مفید ظن ہونے کے سبب سے کافی سمجھی گئی ہیں ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۹۳ کتاب الصوم میں ہے : قلت الظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او رؤية القناديل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن و غلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به و احتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك الا لثبوت رمضان ۔

بناء بریں صورت مسئولہ میں خبر تار تحقیق و توثیق کے بعد بھی چونکہ مذکور الصدر شہادۃ شرعی نہیں ہے ۔ اور اگر اس کو مخطوط کے قائم مقام سمجھا جائے تو الخط یشبہ الخط کا شبہ تار دینے والوں کے ساتھ بھی قائم ہے ۔ اس لئے توپوں اور قندیلوں کی طرح اس کی خبر بھی مفید غلبۂ ظن ہوسکتی ہے ۔ لہذا ہلال رمضان کے ثبوت کا حکم ایسے موثق تار کی خبر پر دینا جائز ہے ۔ مگر ہلال عید کے ثبوت کا حکم دینا درست نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر اورنگ آباد میں ۲۹ ویں کو چاند نظر آئے اور حیدرآباد میں نظر نہ آئے تو وہاں کی رؤیت کے لحاظ سے حیدرآباد میں تاریخ بدلنے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ یہ بات علم ہیئت سے واضح ہے کہ چاند بہ نسبت آفتاب کے سریع السیر ہے ۔ کسی مقام میں مثلاً کلکتہ میں جو مشرقی شہر ہے ۲۹ تاریخ شفق میں چھپا رہے اور دوسرے مقام مثلاً بمبئی میں جو مغربی شہر ہے اپنی سیر کی وجہ سے شفق سے نکل آئے اور دیکھنے لگے تو بمبئی والوں کو رؤیت کی گواہی دینا درست ہوگا ۔ بخلاف کلکتہ والوں کے کہ ان کے حق میں ۲۹ بمنزلہ ۲۸ کے ہوگی جس میں چاند چھپا رہتا ہے ۔ یعنی ان کے پاس چاند ۲۸ کو ہلال نہ تھا کیونکہ چاند پر ہلال کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جبکہ شفق سے خارج ہو کر ایسی وضع خاص پر آجائے کہ آفتاب کی منعکسہ روشنی کا ایک چھوٹا حصہ نظر آنے لگے ۔ اسی طرح ۲۹ کو بھی ان کے حق میں چاند ہلال نہوا کیونکہ اس روز بھی اس وضع خاص پر نہ آیا جس سے اس پر ہلال کا اطلاق ہو ۔ پس جبکہ اہل کلکتہ کے حق میں چاند ہلال ہوا ہی نہ تھا تو بمبئی والوں کا ہلال ان کے حق میں کیونکر ہلال سمجھا جائے ۔

خبر پہنچنے کا اگر یہ طریقہ ہو کہ تار کے ذریعہ سے بطور سرکاری پہنچے کیا یہ قابل اعتبار ہے یا نہیں ؟ اسی طرح اگر ٹپہ کے ذریعہ سے تحصیلدار یا دوسرے عہدہ دار اطلاع دیں تو یہ خبر قابل اعتبار ہوگی یا نہیں

جس پر رمضان میں روزہ رکھنے یا افطار کرنے کا حکم دیا جائے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مطالع کا مختلف ہونا جیسا کہ سائل کا بیان ہے یعنی مشرقی شہروں میں چاند کی رؤیت نہو اور مغربی شہروں میں ہو ، اس میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار (شامی) مصری جلد ۲ صفحہ ۹۹ میں ہے :
اعلم ان نفس اختلاف المطالع لا نزاع فیہ بمعنی انہ قد یکون بین البلدتین بعد بحیث یطلع الھلال لیلۃ کذا فی احدی البلدتین دون الاُخری و کذا مطالع الشمس لاَن انفصال الھلال عن شعاع الشمس یختلف باختلاف الاُقطار ۔ البتہ فقہاء کا اس کے اعتبار کرنے میں اختلاف ہے ۔ یعنی جبکہ کسی مغربی شہر میں چاند نظر آئے اور مشرقی شہر میں نظر نہ آئے تو آیا از روئے شرع مشرقی شہر کے رہنے والوں پر بھی اسی رؤیت کے لحاظ سے روزہ رکھنے یا عید منانے کا حکم دیا جائیگا یا نہیں ؟

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مذہب صحیح یہ ہے کہ مغرب والوں کے چاند کا مشرق والوں کو لحاظ و اعتبار کی ضرورت نہیں ، بلکہ ہر ایک اپنی رؤیت پر عمل کرے ۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا حنفی و مالکی و حنبلی ان تینوں مذاہب میں یہ حکم ہے کہ اہل مشرق کو بھی اہل مغرب کی رؤیت کا اعتبار کرنا چاہئے ۔ یعنی جس دن اہل مغرب کے پاس انکی رؤیت کے لحاظ سے روزہ یا افطار ہے اہل مشرق پر بھی روزہ رکھنا یا افطار کرنا لازم ہے ، چونکہ حدیث صحیح صُوموا لرُؤیتہٖ و اَفطِروا لرُؤیتہٖ عام ہے ، اس لئے اختلاف مطالع کا کوئی اعتبار نہیں ۔ فتاویٰ رد المحتار کے اسی صفحہ میں ہے : و انما الخلاف فی اعتبار اختلاف المطالع بمعنی انہ ھل یجب علیٰ کل قوم اعتبار مطلعھم و لا یلزم احداً العمل بمطلع غیرہ ام لا یعتبر اختلافھا بل یجب العمل بلا سبق رؤیۃ حتی لو رُئی فی المشرق لیلۃ الجمعۃ و فی المغرب لیلۃ السبت وجب علی اھل المغرب العمل بما رواہ اھل المشرق ، فقیل بالاول و اعتمدہ الزیلعی و صاحب الفیض و ھو الصحیح عند الشافعیۃ لان کل قوم مخاطبون بما عندھم کما فی اوقات الصلاۃ و ایدہ فی الدر بما مر من عدم وجوب العشاء و الوتر علی فاقد وقتھما ، و ظاھر الروایۃ الثانی و ھو المعتمد عندنا و عند المالکیۃ و الحنابلۃ لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرُؤیۃ فی حدیث " صوموا لرؤیتہ " بخلاف اوقات الصلاۃ ۔ اسی صفحہ در مختار میں ہے : (اختلاف المطالع) رؤیتہ نھارا قبل الزوال و بعدہ (غیر معتبر علی) ظاھر (المذھب) و علیہ اکثر المشایخ و علیہ الفتویٰ بحر عن الخلاصۃ (فیلزم اھل المشرق برؤیۃ اھل المغرب) اذا ثبت عندھم رؤیۃ اُولٰئک بطریق موجب کما مرّ ۔ بناء بریں حنفیوں کا یہ مفتی بہ قول ہے کہ جب مغربی کسی شہر میں چاند ہو جائے تو تمام مغرب و مشرق کے رہنے والوں پر خبر وثوق سے پہنچنے کے بعد اس کا اعتبار کرنا لازم ہے ۔

رمضان شریف کے چاند کی گواہی امر دینی ہونے کی وجہ سے شرعاً گواہی نہیں ہے بلکہ اِخبار یعنی خبر دینا ہے ، اس لئے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں اگر ایک عادل یعنی متقی شخص ، یا وہ شخص جس کا تقویٰ و فسق و فجور کسی کو معلوم نہیں ہے چاہے وہ غلام ہو یا عورت یا محدود فی القذف جو تائب ہے جبکہ

چاند دیکھکر کہدے تو شرعا اس ایک کی گواہی بھی معتبر ہے ۔ اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں جماعت عظیم کے کہنے کی ضرورت ہے ۔ اگر بڑی جماعت نہ دیکھے تو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے دو شخصوں کا دیکھکر کہہ دینا کافی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۲ صفحہ ۹۳ میں ہے : (و قبل بلا دعوی و) بلا (لفظ اشهد) و بلا حکم و مجلس قضاء لانه خبر لا شهادة (للصوم مع علة غيم) و غبار (خبر عدل) او مستور على ما صححه البزازي على خلاف ظاهر الرواية لا فاسق اتفاقا (و لو) كان العدل (قنا او انثى او محدودا في قذف تاب) ۔ اور صفحہ ۹۵ پر ہے : (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم) الشرعي و هو غلبة الظن (بخبرهم و هو المفوض الى رأى الامام من غير تقدير بعدد) على المذهب و عن الامام انه يكتفي بشاهدين و اختاره في البحر ۔ اور رد المحتار میں ہے : (قوله و اختاره في البحر) حيث قال: و ينبغي العمل على هذه الرواية في زماننا لان الناس تكاسلوا عن ترائي الاهلة فانتفى قولهم مع توجههم طالبين لما توجه هو اليه فكان التفرج غير ظاهر في الغلط ثم ايد ذلك بان ظاهر الولوالجية و الظهيرية يدل على ان ظاهر الرواية هو اشتراط العدد لا الجمع العظيم و العدد يصدق باثنين ۔ اور عید الفطر کے چاند کے لئے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں دو متقی مرد یا ایک متقی مرد اور دو عورتوں کی ضرورت ہے جو لفظ " اشهد " کے ساتھ گواہی دیں اور " محدود فی القذف " بھی نہ ہوں ۔ در مختار کے صفحہ ۹۴ میں ہے : (و شرط للفطر) مع العلة و العدالة (نصاب الشهادة و لفظ اشهد) و عدم الحد في قذف لتعلق نفع العبد ۔ مطلع صاف ہونے کی صورت میں رمضان کے چاند کی طرح اس کا بھی حکم ہے ۔ یعنی جماعت عظیم گواہی دے ۔ اگر جماعت عظیم نہ ہو تو دو شخصوں کی گواہی بھی کافی ہے ۔ رد المحتار کے صفحہ ۹۵ میں ہے : (قوله بلا علة) اى ان شرط القبول عند عدم العلة في السماء لهلال الصوم او الفطر او غيرهما اخبار جمع عظيم الخ ۔

پس صورت مسئولہ میں جبکہ اضلاع اور تعلقات کے قاضی یا عہدہ دار سرکاری جو اس کام پر منجانب سرکار مقرر ہیں حسب تحقیق و شروط بالا رؤیت ہلال کا اطمینان و یقین کرلینے کے بعد شہر کے قاضی یا اس حاکم کو جو منجانب سرکار اس کام پر مقرر ہے باضابطہ تحریر سے اطلاع دیں تو ان کی یہ تحریر معتبر ہے کیونکہ شریعت میں ایک قاضی کی تحریر دوسرے قاضی کے پاس ہر ایک حق میں جائز رکھی گئی ہے ۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۳۶۵ میں ہے : (القاضي يكتب الى القاضي في كل حق) به يفتي استحسانا ۔

تار کی خبر بھی مثل تحریری خبر کے ہے کیونکہ کاغذ پر جو لفظ لکھ دیا جاتا ہے وہ بجنسہٖ مکتوب الیہ تک پہنچتا ہے ۔ اسی طرح تار میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بھی بجنسہٖ مخاطب کو سنائی دیتی ہے اس میں کسی قسم سے فرق نہیں آتا ۔ قدیم زمانے میں دور کی کیفیت معلوم کرنے کیلئے خط جس طرح آلہ بنایا گیا تھا موجودہ زمانے میں خبر و کیفیت پہنچانے کیلئے تار ایک نیا آلہ ایجاد کیا گیا ہے لہذا اس کی خبر پر رمضان کے چاند کا حکم دیا جاسکتا ہے ۔ مگر اس قدر احتیاط ضروری ہے کہ مقامی عہدہ دار جن کو رؤیت ہلال کی حسب تصریح

سابق تحقیق ہوگئی ہے وہ خود یہ کسی معتبر شخص کو تار گھر پر تار کرنے کیلئے روانہ کریں اور تار ماسٹر کو اس امر کی تاکید کی جائے کہ رؤیت ھلال کے متعلق کسی جگہ تار بلا حکم و اطلاع سرکاری عام رعایا سے کسی شخص کے کہنے پر ہرگز نہ دیا جائے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ستہ شوال کے روزے رکھے ، پہلے روزے میں قضاء کی نیت تھی اور بعد اس کے پانچ روزوں میں نفل کی نیت ۔ اب یہ کہتا ہے کہ قضاء کا روزہ بھی ہو گیا اور ستہ شوال بھی پورے ہوئے ۔ کیا زید کا یہ قول صحیح ہے ؟ بینوا بالکتاب و توجروا یوم الحساب ۔

الجواب

اگر کوئی شخص قضاء رمضان و نفل دونوں کی نیت سے ایک روزہ رکھے تو شرعاً وہ روزہ قضاء کا ہوگا نفل کا نہیں ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری کی جلد ۱ صفحہ ۱۹۷ میں ہے : و اذا نویٰ قضاء بعض رمضان و التطوع یقع عن رمضان فی قول ابی یوسف رحمہ اللّٰہ تعالیٰ و ھو روایۃ عن ابی حنیفۃ رحمہ اللّٰہ کذا فی الذخیرۃ ۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے جو روزہ کہ قضاءِ رمضان و نفلِ شوال کی نیت سے رکھا ہے وہ محض قضاء کا ہے اس کو نفل کا دوسرا روزہ رکھنا چاہیئے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان شریف کے روزے اگر لڑکا یا لڑکی کو رکھائے جائیں تو کس سن تک ماں باپ کو اس کا ثواب حاصل ہوسکتا ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

احکام شرعیہ کی فرضیت و وجوب مُکلّف پر ہے ، اور مُکلّف شریعت میں ، مسلمان عاقل و بالغ کو کہا جاتا ہے ۔ رد محتار جلد ۱ صفحہ ۲۲۵ کتاب الصلاۃ میں ہے : المکلف ھو المسلم البالغ العاقل و لو انثیٰ او عبدا ۔ بالغ ہونے سے پہلے انسان مکلف نہیں ہے ، اس لئے احکام شرعی اس پر فرض نہیں ۔ البتہ والدین کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نابالغ بچوں کو نماز و روزہ رکھنے کیلئے سات برس کی عمر کے بعد زبان سے کہیں ، اور دس سال کی عمر کے بعد ہاتھ سے ماریں ۔ اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بچے اچھے کاموں کے عادی ہو جائیں اور برے کاموں سے بچنے لگیں ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار میں ہے : ھی فرض علیٰ کل مکلف و ان وجب ضرب ابن عشر علیہا بید لا بخشبۃ ، لحدیث " مُرُوا أولادکم بالصلاۃ و ھُم أبناء سبع و اضرِبُوھم علیہا و ھم أبناء عَشر " قلت و الصوم کالصلاۃ علی الصحیح کما فی صوم القھستانی معزیاً للزاھد و فی الحظر الاختیار انہ یؤمر بالصوم و الصلاۃ و ینھیٰ عن شرب الخمر لیألف

الخير و يترك الشر ۔ رد المحتار میں تحت قول لحديث تحریر ہے : و الظاهر ان الوجوب بعد استكمال السبع و العشر بان يكون فى اول ثامنة و الحادية عشر كما قالوا فى مدة الحضانة ۔

نابالغ بچوں کی عبادت کا ثواب انہیں کو ملتا ہے ، البتہ والدین کو تعلیم و تربیت کا اجر دیا جاتا ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۵۲۹ کتاب الحج میں ہے : حسنات الصبى له ، و لابويه اجر التعليم و نحوه ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ۲۹ شعبان کو مطلع ابر آلود تھا ، شہادت انسانی سے ہلال رمضان کی رؤیت ثابت ہوئی ، اور شب کے نو بجے محکمۂ شرعیہ سے بذریعۂ آوازِ توپ اعلان کیا گیا کہ دوشنبہ کو غرۂ رمضان قرار پایا ۔ پس اس حساب سے جبکہ رمضان کی تیس تاریخ یعنی سہ شنبہ کو اگر مطلع بالکل صاف و پاک رہے اور بجزابا مخلوق کو رؤیت ہلال نہ ہو اور شہادت آسمانی بھی مدد نہ دے یعنی ہلال دکھائی نہ دے تو اب عید کون سے دن قرار پائیگی ؟ کیا چہارشنبہ کو باعتبار شہادت انسانی ماہ شعبان ؟ یا پنجشنبہ کو باعتبار انکار شہادت آسمانی ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں جبکہ ۲۹ ویں شعبان کو مطلع ابرآلود ہونے کی وجہ سے ہلال رمضان کی رؤیت شہادت شرعی سے ثابت ہوئی ہے اور محکمہ قضاء سے اس کا اعلان بھی کیا گیا ، پس رمضان کے تیس دن ختم ہو جانے کے بعد باوجود مطلع صاف ہونے کے اگر ہلال شوال کی رؤیت نہ بھی ہو تو اکتیسویں دن افطار کرکے عید الفطر منانا چاہئے ۔ عالمگیریہ جلد اول کتاب الصوم باب رؤیۃ الہلال میں ہے : و اذا شهد عن هلال رمضان شاهدان و السماء متغيمة و قبل القاضى شهادتهما و صاموا ثلاثين يوما فلم يروا هلال الشوال ان كانت السماء متغيمة يفطرون من الغد بالاتفاق و ان كانت مصحية يفطرون ايضا على الصحيح كذا فى المحيط ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ کتاب الصوم بحث رؤیۃ الہلال میں ہے : (و بعد الصوم ثلاثين بقول عدلين حل الفطر) الباء متعلقة " بصوم " و "بعد" متعلقة " بحل " لوجود نصاب الشهادة ۔ رد المحتار میں ہے : قوله حل الفطر اى اتفاقا ان كانت ليلة الحادى و الثلاثين متغيمة و كذا مصحية على ما صححه فى الدراية و الخلاصة و البزازية و صحح عدمه فى مجموع النوازل و السيد الإمام الأجل ناصر الدين كما فى الإمداد ۔ و نقل العلامة نوح رحمه الله الاتفاق على حل الفطر فى الثانية ايضا عن البدائع و السراج و الجوهرة قال و المراد اتفاق ائمتنا الثلاثة و ما حكى فيها من الخلاف انما هو بعض المشايخ ۔ قلت و فى الفيض الفتوى على حل الفطر ۔ والله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بلدہ میں عید بروز سہ شنبہ ہوئی۔ ہم لوگ قصبہ میں اطلاع نہ ہونے کے سبب اس دن روزہ تھے۔ تین بجے دن کے ہم کو خبر ملی کہ ۲۹ تاریخ ماہ رمضان بلدہ میں رؤیت ہلال ہوئی ہے اور آج عید الفطر ہے! پس ہم لوگوں کو روزہ توڑنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب

جس شہر میں کہ رؤیت ہلال نہیں ہوئی ہے اگر وہاں کے قاضی کے پاس دو شخص اس امر کی گواہی دیں کہ دوسرے شہر میں فلاں رات دو شخصوں نے چاند دیکھا ہے اور وہاں کے قاضی نے ان کی گواہی پر عید کا حکم دیا ہے تو ایسی حالت میں اس شہر کے قاضی کیلئے جائز ہے کہ اپنے شہر میں بھی عید الفطر کا حکم دے۔ فتاویٰ حمادیہ کے کتاب الصوم مبحث رؤیت ہلال میں ہے: و اذا شهد شاهدان عند قاضی اهل بلدة علیٰ ان قاضی بلد کذا شهد عنده شاهدان برؤیة الهلال فی لیلة کذا و قضی القاضی بشهادتهما جاز لهذا القاضی ان یقضی بشهادتهما لأن قضاء القاضی حجة۔ فتاویٰ خلاصہ کی کتاب الصوم مبحث رؤیت ہلال میں ہے: اذا شهد شاهدان عند قاضی لم یر اهل بلده علی ان قاضی بلد کذا شهد عنده شاهدان برؤیة الهلال فی لیلة کذا و قضی القاضی بشهادتهما فان لهذا القاضی ان یقضی بشهادتهما۔ پس صورت مسئولہ میں مقامی قاضی کے پاس اگر دو شخصوں نے اس بات کی حلفاً گواہی دی ہے کہ بلدہ میں دو شخصوں نے قاضی کے پاس رؤیت ہلال شوال کی گواہی دی ہے اور قاضی نے ان کی گواہی پر بلدہ میں عید کا حکم دیا ہے، تو ایسی حالت میں مقامی قاضی کو بھی اس روز عید و افطار کرنے کیلئے مسلمانوں کو حکم دینا جائز ہے، اور مقامی مسلمانوں کو قاضی کے حکم کے بعد روزہ توڑنا چاہیے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

کِتَابُ الحَجّ

الاستفتاء

عورت کا حج بدل مرد اداء کرے تو جائز ہے ؟ یا اس کے لئے عورت ہی کی ضرورت ہے ؟ اور افضلیت کس میں ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مرد ، عورت کی جانب سے حج بدل اداء کرسکتا ہے ۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک شخص نے اپنی والدہ کی جانب سے جو مر گئی تھی حج کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم سے اجازت چاہی تھی اور آپ علیہ السلام نے اس کو اجازت دی ۔ چنانچہ محیط سرخسی صفحہ ۳۹ میں ہے : و لو أحجّ الوارث عنه رجلاً او حجّ عن نفسه سقط عن الميت حجة الاسلام ان شاء الله لما روى ان النبي صلى الله عليه و سلم سأله رجل و قال ان امي ماتت و لم تحج أ فأحج عنها فقال عليه السلام نعم ۔ بلکہ مرد ہی حج بدل اداء کرے تو اولیٰ و افضل ہے ۔ عورت کا حج بدل اداء کرنا مکروہ ہے ۔ اور بہتر یہ ہے کہ حج بدل اداء کرنے والا حج کیا ہوا ہو ، اگر نہیں کیا ہے جب بھی دوسرے کی جانب سے حج بدل اداء کرسکتا ہے ۔ اور افضل یہ ہے کہ یہ شخص عاقل ، بالغ ، حر ، اور حج کے طریقوں و ارکان سے واقف ہو۔ جیسا کہ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ میں ہے : و الأفضل للانسان اذا اراد ان يُحِجّ رجلا عن نفسه قد حَجّ عن نفسه و مع هذا لو أحج رجلا لم يحج عن نفسه حَجة الإسلام يجوز عندنا و سقط الحج عن الآمر كذا في المحيط السرخسي و في الكرماني الافضل ان يكون عالما بطريق الحج و افعاله و يكون حرا عاقلا بالغا كذا في غاية السروجي شرح الهداية و لو أحج عنه امرأة او عبدا او امة باذن السيد جاز و يكره هكذا في محيط السرخسي ۔ رد المحتار شامی صفحہ ۲۳۰ جلد ۲ میں ہے : و علل في الفتح الكراهة في المرأة بما في المبسوط من ان حجها انقص اذ لا رمل عليها و لا سعي في بطن الوادي و لا رفع الصوت بالتلبية و لا حلق ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے حج و عمرہ کی ایک ہی نیت کی ، اور

میقات یلملم سے احرام باندھا، پھر اسی احرام سے داخل مکہ معظمہ ہوکر حسب قاعدہ سات طواف کئے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کے بعد بھی احرام باقی رکھکر عرفات کو گیا۔ شب کو مزدلفہ میں رہ کر صبح کو بعد رمی جمرہ حلق کراکر احرام کھول دیا۔ ایسی حالت میں سب احکام حج و عمرہ کے اداء ہوتے یا نہیں؟ حاجی کو شبہ ہوا کہ میرا عمرہ باقی ہے۔ بعد حج کے پھر نیت عمرہ کی باندھکر مسجد عمرہ کو گیا ہے، احرام بھی نیت کے ساتھ دوسرا باندھا اور عمرہ بھی اداء کیا، مگر یہ بعد حج اور ایام تشریق ہوا۔ پس بیان فرماویں کہ عمرہ و حج جو اول اداء ہوا صحیح ہے یا نہیں؟ کیا دوسری نیت سے احرام باندھنا ضروری تھا؟ اور ان دونوں صورتوں میں حج اس کا پورا ہوا یا کسی طرح کا نقص رہا؟ کیا دم لازم آیا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

سب سے پہلے قافلہ مکہ معظمہ پہنچتے ہی جو طواف اداء کیا جاتا ہے اس کو شرعاً "طواف قدوم" کہتے ہیں۔ اور دسویں تاریخ کو منیٰ سے خانہ کعبہ آکر جو طواف اداء کیا جاتا ہے اس کو "طواف رکن" اور "طواف زیارت" کہتے ہیں۔ اس طواف کے بعد حجاج پھر منیٰ میں رمی جمار کیلئے واپس چلے جاتے ہیں، منیٰ میں رمی جمار سے فارغ ہونے کے بعد جب حجاج اپنے مکان کو واپس ہوتے ہیں تو بوقت واپسی و رخصت ان پر پھر کعبہ کا طواف واجب ہے جس کو "طواف صدر" کہتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں یلملم سے جو ایک ساتھ حج و عمرہ کی نیت ہے شرعا اس کو "حج قران" کہا جاتا ہے اور ایسے حاجی کو "قارن" کہتے ہیں۔ اور قارن پر واجب ہے کہ اولاً عمرہ کیلئے طواف و سعی کرے اور اس کے بعد مناسک حج کو شروع کرے۔ اگر کوئی قارن حج کے لئے پہلے طواف و سعی کرلے اور عمرہ کیلئے بعد کرے تو پہلے جو طواف و سعی کرے گا وہ عمرہ کیلئے ہوجائیگا اور دوسرا حج کیلئے، اور اس نے جو نیت کی تھی کہ پہلا طواف و سعی حج کیلئے ہے اور دوسرا عمرہ کے لئے ہے تو اس کی یہ نیت لغو اور بے کار ہوگی۔ جیسا کہ البحر الرائق جلد دوم مطبوعہ مصر باب القران صفحہ ۳۸۶ میں ہے: یعنی یأتی بأفعال العمرة اولاً من الطواف و السعی بین الصفا و المروة و الرمل فی الاشواط الثلاثة و السعی بین المیلین الاخضرین و صلاة رکعتی الطواف ثم یأتی بأفعال الحج کلها ثانیاً فیبدأ بطواف القدوم و یسعی بعدہ ان شاء و ھذا الترتیب اعنی تقدیم العمرة فی افعال الحج واجب لقوله تعالیٰ " فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ " جعل الحج غایة و هو شامل للقران و التمتع کما قدمناہ فأفاد انه لو طاف اولاً لحجته و سعیٰ لها ثم طاف لعمرته و سعیٰ لها فطوافه الأول و سعیه یکون للعمرة و نیته لغو۔

صورت مسئولہ میں اگرچہ سائل نے طواف قدوم و سعی وغیرہ حج کی نیت سے اداء کیا ہے، مگر بحکم شرع وہ سب عمرہ کیلئے ہوجائیگا۔ پس اگر سائل نے طواف زیارت میں رمل کرلیا ہے اور طواف زیارت کے ساتھ سعی صفا و مروہ بھی اداء کی ہے تو اس کا عمرہ اور حج دونوں اداء ہوگئے۔ فتح القدیر شرح ہدایہ جلد

دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۲۲۱ میں ہے: و ان لم یطف لعمرتہ فیما قدم مکۃ بل طاف و سعی ینوی عن حجتہ ثم وقف بعرفۃ لم یکن رافضا لعمرتہ و کان طوافہ و سعیہ لہا و ہو رجل لم یطف للحج فیرمل فی طواف الزیارۃ و یسعی بعدہ ۔ طواف قدوم شرعا سنت ہے چنانچہ سیدھے عرفات کو چلے جانے کی صورت میں ساقط ہوجاتا ہے ۔ بناء بریں جب طواف زیارت ادا کرلیا جائے تو طواف قدوم کے فوت ہونے سے کوئی حرج نہیں ہے ۔ چنانچہ کنز کی کتاب الحج صفحہ ۴۰ میں ہے: من لم یدخل مکۃ و وقف بعرفۃ سقط عنہ طواف القدوم ۔ اور اسی کے بین السطور عینی شرح کنز میں منقول ہے: و لا شیء علیہ لان طواف الزیارۃ یغنی عنہ کالفرض یغنی عن تحیۃ المسجد ۔ اور البحر الرائق جلد ۲ صفحہ ۳۶۹ میں ہے: و لا شیء علیہ بترکہ لأنہ سنۃ و لأن طواف الزیارۃ اغنی عنہ ۔ اگر سائل نے طواف زیارت کرلیا ہے تو اس سے طواف قدوم ساقط ہوگیا ۔ اور طواف زیارت کے بعد سعی صفا و مروہ نہیں کی ہے تو ایسی صورت میں البتہ اس کی سعی ترک ہوگئی اور ترک سعی کی صورت میں دم لازم آتا ہے ۔ مگر حج میں نقصان نہیں آتا ۔ جیسا کہ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الحج مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۷ میں ہے: و من ترک السعی بین الصفا و المروۃ فعلیہ دم و حجہ تام کذا فی القدوری ۔

پس صورت مسئولہ میں سائل کا حج و عمرہ دونوں بربنائے روایات سابقہ کامل ہوگئے ۔ البتہ اس کے ذمہ ترک سعی کی جنایت (دم) یعنی ایک بکری لازم آتی ہے ۔ پس سائل کو چاہئے کہ اس وقت جنایت میں ایک بکری اداء کردے ۔ جنایت کفارہ ہے اور جس قدر کفارات ہیں اگرچہ ان کی ادائی تاخیر کے ساتھ ہو سکتی ہے مگر آخر عمر میں جبکہ اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ اگر اس کفارہ کو اس وقت اداء نہ کیاجائے تو اس کے ذمہ واجب رہ جائیگا ۔ پس ایسی حالت میں اس کا اداء کرنا واجب و لازم ہے ۔ اگر بدون اداء کئے مر جائے تو شرعاً گنہگار ہوگا ۔ اس وقت اس پر واجب ہے کہ اپنے ورثاء کو وصیت کردے ۔ اگر بدون وصیت کئے مرجائے تو ورثاء پر اس کا اداء کرنا واجب نہیں ۔ اگر وہ اپنی جانب سے تبرعاً اداء کریں تو جائز ہوجائیگا ۔ جیسا کہ رد المحتار شامی جلد دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۲۰۵ باب الجنایات میں ہے: (تنبیہ) فی شرح النقایۃ للقاری ثم الکفارات کلہا واجبۃ علی التراخی و یکون مؤدیاً فی ای وقت و انما یتضیق علیہ الوجوب فی آخر عمرہ فی وقت یغلب علی ظنہ انہ لو لم یؤدہ لفات فان لم یؤد فیہ حتی مات اثم و علیہ الوصیۃ بہ و لو لم یوص لم یجب علی الورثۃ و لو تبرعوا عنہ جاز الا الصوم ۔ پس بہتر یہ ہے کہ سائل خود بعجلت عجیلہ اس دم کو خود ہی اداء کرکے ذمہ سے سبکدوش ہوجائے ۔ سائل نے دوبارہ جو عمرہ کیا ہے وہ تبرع ہے اس کی ضرورت نہیں تھی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورت ، مرد کی جانب سے حج بدل اداء کرسکتی ہے یا

نہیں ؟ اور حج بدل کیلئے کیا حج ادا کیا ہوا شخص درکار ہے یا حج نہیں کیا ہوا بھی حج بدل کرسکتا ہے ؟

الجواب

حج بدل ادا کرنے کیلئے شرعاً مرد یا عورت حج کئے ہوئے شخص کی خصوصیت نہیں ہے ۔ بلکہ عورت اور حج نہیں کیا ہوا شخص بھی حج بدل کرسکتا ہے ۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۴۰ باب الحج عن الغیر میں ہے : (فجاز حج الضرورة) بمهلة من لم يحج (و المرأة) و لو أمة (و العبد و غيره) كالمراهق ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ حج بدل کیلئے مرد اور حج کیا ہوا حر یعنی آزاد اور مسائل حج سے واقف شخص مقرر کیا جائے ۔ اسی مقام پر در مختار میں ہے : و غيرهم اولىٰ لعدم الخلاف ۔ اور رد محتار میں ہے : و قال في الفتح ايضا و الأفضل ان يكون قد حج عن نفسه حجة الاسلام خروجا عن الخلاف ثم قال و الأفضل إحجاج الحر العالِم بالمناسك الذي حجّ عن نفسه ۔

بلکہ فتاوی فتح میں یہ صراحت کی ہے کہ جس شخص پر ایک دفعہ صحت اور سواری اور خرچ راہ و خرچ اہل و عیال اداۓ کے لئے حاصل ہوگیا تھا اور پھر اس نے حج ادا نہیں کیا ہے تو ایسے شخص کا غیر کیلئے حج بدل کرنا مکروہ تحریمی ہے ۔ چنانچہ اسی جگہ رد المحتار میں ہے : ثم قال في الفتح بعد ما اطال في الاستدلال و الذي يقتضيه النظر ان حج الضرورة غيره ان كان بعد تحقق الوجوب عليه بملك الزاد و الراحلة و الصحة فهو مكروه كراهة تحريم ۔ اور صفحہ ۲۴۸ میں ہے : قال في البحر و الحق انها تنزيهية على الآمر لقولهم و الافضل الخ تحريمية على الضرورة المأمور الذي اجتمعت فيه شروط الحج و لم يحج عن نفسه لأنه أثم بالتأخير ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

کتاب النکاح

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمرو کی بیوی حبیبہ بقید حیات عمرو کے نکاح میں موجود ہے۔ اس وقت اگر عزیزہ کے ساتھ جو حبیبہ کی حقیقی بہن کی لڑکی ہے عمرو نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی شرعاً اپنی زوجہ کے عین حیات زوجہ کی حقیقی بہن کی لڑکی سے نکاح کرنا حرام ہے ۔ شرح وقایہ جلد دوم صفحہ ۱۲ مطبوعہ مجتبائی میں ہے : و حرم الجمع بین الاُختین نکاحاً و عدۃ و لو من بائن و وطئاً بملک یمین و بین امرأتین ایّتھما فُرِضَتْ ذکرا لم تحل له الاُخری ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چچا زاد بہن کی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

شرعاً چچا ، خالہ ، ماموں اور پھوپی کی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے ۔ اور اس کے جواز پر یہ دلیل ہے کہ آیت تحریم میں محرمات ذکر کئے جانے کے بعد " وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ " وارد ہے جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ چچا زاد ، خالہ زاد ، ماموں زاد اور پھوپی زاد بہنیں محرمات کے ما وراء ہونے کی وجہ سے حلال ہیں ۔ جیسا کہ فتاوی شامی جلد ۲ صفحہ ۲۸۵ کے حاشیہ پر رد المحتار میں ہے : و اما عمۃ عمۃ امہ و خالۃ خالۃ ابیہ حلال کبنت عمہ و عمتہ و خالہ و خالتہ لقولہ تعالی " وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ " ۔
پس جبکہ شرعاً چچا زاد بہنوں سے بہ بنائے آیت کریمہ " و احل لکم ما وراء ذلکم " نکاح کرنا جائز ہے تو ان کی لڑکیوں سے بھی آیت کریمہ کی بنیاد پر بدرجہ اولیٰ نکاح جائز ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایسے وقت میں کہ ہند اس کے نکاح میں موجود ہے ۔ ہند کی علاتی بہن سلمیٰ کے ساتھ نکاح کیا ۔ اب دونوں میں سے کس کا نکاح باقی اور کس کا باطل ہے ؟

اگر زید ہند کو طلاق دیدے ، آیا قبلِ اختتامِ عدت اس کی علاتی بہن مسماۃ سُلمیٰ سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورتِ صداقتِ مستفتی چونکہ زید ہند کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی علاتی بہن سُلمیٰ کو بھی اپنے نکاح میں لایا ہے اس لئے سلمیٰ کا نکاح شرعاً فاسد و باطل ہے ۔ پس زید پر واجب ہے کہ سُلمیٰ سے علیحدہ ہوجائے ، اور اگر قاضی کو اس کا علم ہے تو قاضی پر واجب ہے کہ ان دونوں کو علیحدہ کردے ۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ جلد اول صفحہ ۲۷۷ میں ہے : و ان تزوّجهما فی عقدتين فنكاح الأخيرة فاسد و يجب عليه ان يفارقها و لو علم القاضی بذلک يفرق بينهما ۔ اگر زید نے سلمیٰ سے نکاح کرکے وطی بھی کرلی ہے تو ایسی حالت میں سلمیٰ کو مدتِ طلاق تین حیض کامل اور در صورت حمل ، وضع حمل تک بیٹھنا ہوگا ۔ اور اس عدت کے ختم تک زید کا ہند سے بھی وطی کرنا حرام ہوگا ، اور بعدِ عدت جائز ۔ اگر زید نے سُلمیٰ سے محض نکاح کیا ہے اور وطی نہیں کی ہے تو ایسی حالت میں ہند سے وطی کرنا جائز ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۹۳ میں ہے : فلو علم فهو الصحيح و الثانی باطل و له وطی الأولی الا ان يطأ الثانية فتحرم الأولیٰ الیٰ انقضاء عدة الثانية ۔

چونکہ ہند بعد طلاق بحالتِ عدت زید کے نکاح میں من وجہٍ باقی رہتی ہے اس لئے قبلِ اختتامِ عدتِ ہند ، زید کے لئے علاتی بہن سُلمیٰ سے نکاح کرنا حرام ہے ۔ چنانچہ البحر الرائق جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ میں ہے : (و حرم تزوج اخت معتدية) و شمل الأُخت نسبا و رضاعا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

مسلمانانِ دیہات نے عام طور پر آجکل یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ کچھ معتد بہ رقم لیکر لڑکی کا نکاح کردینے پر راضی ہوتے ہیں ۔ اس معاہدے کے بعد دار القضاء مقامی سے اجازت نامہ حاصل کیا جاتا ہے ۔ اور اجازت نامہ میں مقدار مہر ، وکیل اور گواہوں کے ناموں کی صراحت درج ہوتی ہے ۔ پس یہ معاملہ جس میں عوض بالمعاوضہ ہوتا ہے اور ایک قسم کی تجارت ہے شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

لڑکی والے لڑکے سے یا اس کے اولیاء سے نکاح کرادینے کیلئے پہلے جو رقم لیتے ہیں یہ رقم لڑکی والوں کیلئے شرعاً حرام اور رشوت ہے ، جو قبضہ کے بعد بھی اُن کی ملک میں داخل نہیں ہوتی ۔ لڑکے کو یا اس کے اولیاء کو بعد نکاح بھی یہ حق حاصل ہے کہ یہ رقم ان سے واپس لے لیں ۔ رد المحتار کی کتاب الحظر و الإباحة فصل البيع میں ہے : و من السحت ما يُأخذ الصهر من الختن بسبب بنته بطيب نفسه حتى لو كان يطلبه يرجع الختن به ۔ در مختار کی کتاب النکاح مبحث جہاز میں ہے : اخذ اهل المرأة

شیئا عند التسلیم فللزوج ان یسترده لانہ رشوۃ انتھی ۔ قال رد المحتار قولہ (عند التسلیم) ای بان ابیٰ ان یسلمھا اخوھا او نحوہ حتیٰ یاخذ شیئا و کذا لو ابیٰ ان یزوجھا فللزوج الاسترداد قائما و ھالکا لانہ رشوۃ ۔ عالمگیریہ کی جلد ۴ کتاب الھبہ باب متفرقات میں ہے : خطب امرأۃ فی بیت اخیھا فابیٰ ان یدفعھا حتیٰ یدفع الیہ دراھم فدفع و تزوجھا یرجع بما دفع لانھا رشوۃ کذا فی القنیۃ ۔ رد المحتار کی کتاب الحظر و الاباحۃ فصل البیع میں ہے : الرشوۃ لا تملک بالقبض ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید غوری پٹھان حنفی المذہب نے ہندہ سید زادی عاقلہ و بالغہ سے عقد کیا ۔ ہندہ اور اس کے اولیاء اس عقد سے راضی ہیں ۔ کیا ایسا عقد شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

سید زادی چونکہ ہاشمیہ عریق النسب ہے ۔ اس لئے غوری پٹھان عجمی تا وقتیکہ اپنا نسب قریشی ثابت نہ کرے شرعا اس کا کفو یعنی مثل نہیں ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں عقد کے قبل ہندہ اور اس کے اولیاء کو اس سے باز رہنے کا حق تھا ، مگر چونکہ ہندہ اور اس کے اولیاء کی رضامندی سے یہ عقد ہوا ہے اس لئے شرعا جائز و درست ہے ۔ اب ہندہ اور اس کے اولیاء کو اس کے فسخ کرانے کا حق نہیں ۔ البحر الرائق جلد ۳ باب الکفاءۃ میں ہے : قال فی المبسوط افضل الناس نسبا بنو ھاشم ثم قریش ثم العرب ، لما روی عن محمد بن علی : قال النبی علیہ السلام ان اللہ اختار من الناس العرب و من العرب قریشا و اختار منھم بنی ھاشم ۔ و اختارنی من بنی ھاشم اھ ؛ و لم یذکر المصنف الموالی لان المراد بالموالی ھنا ما لیس بعربی و ان یمسہ رق لان العجم لما ضلوا انسابھم کان التفاخر بینھم فی الدین کما فی الفتح او لان بلادھم فتحت عنوۃ بایدی العرب فکان للعرب استرقاقھم فاذا ترکوھم احرارا اعتقوھم و الموالی ھم المعتقون کما فی التبیین ۔ رد المحتار جلد ۲ باب الکفاءۃ میں ہے : (قولہ و اما العجم) المراد بھم من لم ینتسب الیٰ احدیٰ قبائل العرب و یسمون الموالی و العتقاء کما مر وعامۃ اھل الامصار و القریٰ فی زماننا منھم سواء تکلموا بالعربیۃ او غیرھا الا من کان لہ منھم نسب معروف کالمنتسبین الیٰ احد الخلفاء الاربعۃ او الیٰ الانصار و نحوھم ۔ عالمگیریہ جلد اول باب الاکفاء میں ہے : و الموالی و ھم غیر العرب لا یکونون اکفاء للعرب و الموالی بعضھم اکفاء لبعض کذا فی العتابیۃ ۔ در مختار کے باب الکفاءۃ میں ہے : فقریش بعضھم اکفاء بعض ۔ رد المحتار میں ہے : اشار بہ الیٰ انہ لا تفاضل فیما بینھم من الھاشمی و النوفلی و التیمی و العدوی و غیرھم ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب الاکفاء میں ہے : و اذا زوجت نفسھا من غیر کفء و رضی بہ احد الاولیاء لم یکن لھذا الولی و لا لمن مثلہ او دونہ فی الولایۃ حق الفسخ و یکون ذلک لمن فوقہ

کذا فی فتاویٰ قاضی خان ۔ و کذا اذا زوّجها احد الأولیاء برضاها کذا فی المحیط ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خلوت صحیحہ کے بغیر مہر واجب ہوتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

بہ وقت نکاح جس قدر مہر کا تقرر ہوا ہے زوج پر عقد نکاح سے وہ واجب تو ہوجاتا ہے ۔ مگر پورے مہر کی ادائی اسی وقت زوج پر واجب ہے جبکہ زوجہ کے ساتھ وطی یا خلوۃ صحیحہ کرے ۔ یا زوج و زوجہ سے کوئی ایک فوت ہوجائے ۔ اور اگر زوج خلوت صحیحہ یا وطی سے پہلے زوجہ کو طلاق دیدے تو اس وقت زوج پر نصف مہر کی ادائی واجب ہے ۔ اور زوجہ کے مرتدہ ہوجانے یا اپنے خاوند کی دوسری زوجہ کے نوجوان لڑکے کا شہوت سے بوسہ لینے یا اس سے ناجائز تعلق پیدا کرنے سے پورا مہر زوج کے ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے ۔ در مختار کے باب المہر میں ہے ، و یتأکد (عند وطئٍ او خلوۃ صحت) من الزوج (او موت احدهما و) یجب (نصفه بطلاق قبل الوطئ او خلوة) ۔ رد المحتار میں تحت قول " و یتأکد " مکتوب ہے ؛ و افاد ان المهر وجب بنفس العقد لکن مع احتمال سقوطه بردتها او تقبیلها ابنه او تنصفه بطلاقها قبل الدخول و انما یتأکد لزوم تمامه بالوطئ و نحوه ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رد المحتار کی کتاب الحظر و الإباحة کی عبارت و من السحت ما یاخذه الصهر من الختن بسبب بنته بطیب نفسه حتی لو کان بطلبه یرجع الختن به اور در مختار کے کتاب النکاح مبحث جہاز کی عبارت ہے ، اخذ اهل المرأة شیئا عند التسلیم فللزوج ان یسترده لأنه رشوة انتهی ۔ ان دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ لڑکی والے نکاح کرادینے کیلئے جو روپیہ لیتے ہیں شرعا حرام و رشوت ہے ۔ اس صورت میں کیا دُلہا والوں کی طرف سے جو لڑکی کو چڑھاوا آتا ہے حرام ہوگا ؟ اور ناداری کی وجہ سے لڑکی والے کچھ رقم تبرعاً شادی کرنے کیلئے لیں تو کیا وہ بھی حرام ہے ؟

الجواب

دُلہا لڑکی کیلئے جو سامان چڑھاوا بھیجتا ہے وہ ہدیہ یا مہر معجل یا عاریتاً ہوا کرتا ہے ۔ اور یہ سامان محض لڑکی کیلئے آتا ہے ۔ دلہا اگر ہدیہ یا مہر معجل کی نیت سے اس سامان کو روانہ کرے تو یہ لڑکی کی ملک ہوگا ۔ اس سے لڑکی کے عزیز و اقارب کو کوئی تعلق نہیں ۔ اور دولہے کا اس طریقے سے سامان بھیجنا شرعا درست ہے ۔ چنانچہ در مختار کے کتاب النکاح باب المہر میں ہے ؛ و لو بعث الیٰ امرأته شیئا و یذکر جهة عند

ہے۔ اسی جگہ عالمگیریہ میں ہے: و اما شرط ادائها فنية مقارنة للاداء او لعزل ما وجب هكذا في الكنز۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق جلد ۱ صفحہ ۲۵۹ کتاب الزکاۃ میں ہے: و الحاصل فيه الاقتران بالأداء كسائر العبادات الا ان الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفى لوجودها حالة العزل دفعا للحرج۔

بناء بریں صورت مسئولہ میں بدفعات ادائی زکاۃ اس وقت درست ہے جبکہ ہمیشہ فقیر کو دینے کے وقت ادائے زکاۃ کی نیت کی جائے۔ چونکہ سال ختم ہوتے ہی فوراً زکاۃ اداء کرنا لازمی ہے، اس لئے چاہئے کہ رقم نصاب سے فوراً مقدار زکاۃ علیحدہ کرکے فقراء و مساکین پر تقسیم کردی جائے۔ اگر نصاب میں سونے چاندی کے زیورات یا ٹکڑے ہیں جن کا فروخت کرنا مقصود نہیں اور نہ اس کو شکست کرکے فقراء پر تقسیم کر سکتے ہیں تو ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زکاۃ کی مقدار رقم قرض لےکر فقراء پر فوراً تقسیم کردی جائے اور اپنی آمدنی سے اس کی ادائی کرلی جائے تاکہ تاخیر کے گناہ سے نجات ملے اور فوری وجوب اداء ذمہ سے ساقط ہوجائے۔ بر وقت ضرورت قرض لےکر رقم زکاۃ اداء کرنا۔ اور قرض کی ادائی کرنا شرعاً درست ہے۔ عالمگیریہ کتاب الزکاۃ صفحہ ۱۸۲ مسائل شتیٰ میں ہے: و لو اخر زكاة المال حتى مرض يؤدي سرا من الورثة و ان لم يكن عنده مال و اراد ان يستقرض لأداء الزكاة فان كان في اكبر رأيه انه اذا استقرض و ادى الزكاة و اجتهد لقضاء دينه يقدر على ذلك كان الافضل له ان يستقرض۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو وغیرہ مال زکاۃ فریضہ بغرض امداد مجروحین و ایتام و ارامل ترک کو روانہ کرنا چاہیں تو آیا ان کی زکاۃ اداء ہوگی یا نہیں؟

اور چرم قربانی اگر بہ نیت زکاۃ دیں تو ان کی زکاۃ اداء ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرح میں زکاۃ کا مصرف فقراء و مساکین و غازی بےسامان وغیرہ بتلائے گئے ہیں۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۹۰ باب مصرف زکاۃ میں ہے: هو فقير و هو من له ادنى شيء، و مسكين من لا شيء له، و عامل فيعطي بقدر عمله، و مكاتب، و مديون لا يملك نصابا فاضلا عن دينه، و في سبيل الله و هو منقطع الغزاة۔ اور رد مختار تحت قول و هو منقطع الغزاة مکتوب ہے: اى الذين عجزوا عن اللحوق بجيش الاسلام لفقرهم بهلاك النفقة و الدابة و غيرهما فتحل لهم الصدقات و ان كانوا كاسبين اذ الكسب يقعدهم عن الجهاد۔ قهستاني۔ بناء بریں مجاہدین ترک کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں جو کہ اپنے سرپرستوں کے شہید ہوجانے سے فقیر و مسکین ہوگئے ہیں، اور مجروح غازی جو بوجہ ناداری اپنے علاج سے عاجز ہیں، اور وہ غازی جو بے سرو سامانی کے سبب جہاد سے قاصر ہیں، یہ تمام از روئے شرع زکاۃ کے مستحق ہیں۔

شادی کا سامان کرنے کیلئے بلا کسی شرط تبرعاً کچھ روپیہ دینا یہ بر و احسان ہے جو کسی طرح حرام و ناجائز نہیں ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ باپ کی مدخولہ بالنکاح یا بالزنا کی حقیقی بہن ، بیٹے کیلئے حلال ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

باپ کی مدخولہ بالنکاح یا بالزنا کی اصل و فرع یعنی حقیقی ماں یا لڑکی بیٹے کیلئے جائز ہے ۔ جیسا کہ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۷ بحث محرمات صہریہ میں ہے ، لا بأس بأن یتزوج الرجل امرأۃ و یتزوج ابنہ بنتها او امها کذا فی محیط السرخسی ۔ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۲۸۰ فصل محرمات میں ہے : و یحل لاصول الزانی و فروعه اصول المزنی بها و فروعها ۔ اور صفحہ ۲۸۹ میں ہے : و لا تحرم بنت زوج الأم و لا امه و لا ام زوجة الاب و لا بنتها و لا ام زوجة الابن و لا بنتها و لا زوجة الربیب و لا زوجة الراب ۔ پس جبکہ مدخولۂ اَب کی حقیقی ماں یا اس کی لڑکی یعنی اصول و فروع دونوں بیٹے کیلئے شرعاً جائز ہیں تو مدخولۂ اَب کی حقیقی بہن بدرجۂ اولیٰ جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ سیدانی عمر ۱۳ سالہ نابالغہ ہے جس کا باپ و دادا فوت ہوگئے ہیں ، ہندہ کا حقیقی پھوپی زاد بھائی جو امراء عرب قوم بنی سلیم عدنانی سے ہے ہندہ کے ساتھ مہر مثل پر عقد کرنا چاہتا ہے ۔ ہندہ کا عمزاد بھائی اور اس کی والدہ و ماموں اس پر راضی ہیں ، اور ان کے سوا لڑکی کا کوئی وارث شرعی نہیں ہے ، پس از روئے مذہب حنفی یہ نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

عرب میں چونکہ کفاءۃ نسب کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہے ، اس لئے سیدانی ہاشمی النسب (جو نضر بن کنانہ کی اولاد ہے) کا عدنانی کفوء نہیں ۔ در مختار کتاب النکاح میں باب الکفاءۃ میں ہے : (و تعتبر) الکفاءۃ نسبا (فقریش) بعضهم (أکفاء) بعض (و) بقیة (العرب) بعضهم (أکفاء) بعض ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله فقریش الخ) القرشیان من جمعهما اب هو النضر بن کنانة فمن دونه و من لم ینتسب الا لأب فوقه فهو عربی غیر قرشی ۔ باپ دادا کے سوا دوسرا کوئی ولی اگر صغیرہ کا نکاح غیر کفوء سے کرادے تو شرعاً صحیح نہیں ہے ۔ در مختار کتاب النکاح باب الولی میں ہے : (و ان کان المزوّج غیرهما) ای غیر الأب و ابیه و لو الأم او القاضی علی ترتیب الإرث لا یصح النکاح من غیر

کفو او بغبن فاحش ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ لڑکی کا باپ و دادا فوت ہوگئے ہوں تو اب کسی ولی کا عدناً غیر کفو کے ساتھ اس کا نکاح کروانا صحیح نہیں ہے ۔ پھوپی کی اولاد جبکہ نسب سے علیحدہ ہو کفوء نسبی نہیں ۔ کیونکہ نسب شرع میں باپ سے دیکھا جاتا ہے ، جیسا کہ رد محتار کی کتاب الطلاق فصل ثبوت النسب میں ہے ، النسب ھو مصدر نسبہ الی ابیہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ ، خاوند کی وفات کے بعد اپنے سوتیلے لڑکے خالد کی ذاتی جائداد و آمدنی سے اپنا زر مہر طلب کرسکتی ہے یا نہیں ؟ اور خالد کو ہندہ کی ذاتی جائداد و آمدنی پر کسی قسم کا حق ہے یا نہیں ؟

الجواب

ہندہ کے خاوند کے انتقال کے بعد ہندہ کو اپنے سوتیلے لڑکے خالد کی ذاتی جائداد و آمدنی سے مہر طلب کرنے کا حق نہیں ہے ۔ اور نہ خالد ہندہ کی ذاتی جائداد و آمدنی سے کسی قسم کا حصہ پانے کا مستحق ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مجنون کا حقیقی بھائی ولی قریب موجود ہے ۔ بھائی کے بلا اطلاع مجنون کی حقیقی ماں نے مسماۃ ہندہ کے ساتھ مجنون کا نکاح بہ تقرر ۵۰۰ روپے زر مہر پر کرادیا ، کیا یہ نکاح جائز ہے ؟ اگر جائز ہے تو اب بھائی کو فسخ کروانے کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب

ولی قریب عاقل و بالغ کے ہوتے ہوئے بلا اطلاع اس کے ولی بعید کا نکاح کروادینا شرعاً ولی قریب کی اجازت پر موقوف ہے ۔ ولی قریب بمجرد اطلاع کے اس نکاح کی اجازت نہ دے تو نکاح ناجائز و غیر نافذ ہوگا ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب الولی میں ہے : فلو زوّج الأبعد حال قیام الأقرب توقف علیٰ إجازته ۔ رد المحتار میں ہے : قوله حال قیام الأقرب ای حضوره و ھو من اھل الولایة اَما لو کان صغیرا او مجنونا جاز نکاح الأبعد ، ذخیرة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے قوم ہنود کی ایک ثیبہ عورت کو مسلمان کرکے اس کے ساتھ نکاح کیا ، اس کے بعد باکرہ مسلمان عورت سے شادی کی ۔ ان ہر دو کے حقوق و مراتب مساوی ہیں

یا کم و بیش ؟

الجواب

مساوی ہیں ۔ در مختار کتاب النکاح باب القسم میں ہے : و یجب ان یعدل فیہ و فی الملبوس و الماکول ، و البکر و الثیب و الجدیدۃ و القدیمۃ و المسلمۃ و الکتابیۃ سواء ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ ثانیہ کا انتقال ہوگیا اور اس کی اولاد کمسن زید کے زیر پرورش ہے ، اور زوجۂ اولیٰ زندہ ہے مگر اس کی تمام اولاد کی شادیاں ہو گئی ہیں ۔ زید کی آمدنی اس وقت بارہ سو روپے ماہانہ ہے ، زید زوجۂ اولیٰ کو ماہانہ سو روپیہ نفقہ دیا کرتا تھا جس کو اب موقوف کردیا ہے ، اور مکان سے بھی علیحدہ کرنا چاہتا ہے ۔ پس از روئے شرع زید کی موجودہ آمدنی کے لحاظ سے کس قدر نفقہ زوجہ اولیٰ کا زید پر واجب ہے ؟ خصوصاً جبکہ زوجہ اولیٰ ایک خاندانی امیرزادی اور ذی ثروت گھرانے کی لڑکی ہے ؟

الجواب

زوجہ کے نفقہ کے لئے شرعاً زوج و زوجہ دونوں کی حالت کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔ اگر دونوں مالدار ہیں تو مالداروں کا نفقہ زوج پر واجب ہوتا ہے ، اور اگر دونوں تنگدست ہیں تو محتاجوں کا نفقہ لازم ہوا کرتا ہے ، اور اگر دونوں میں سے ایک مالدار اور ایک تنگدست ہے تو اس وقت متوسط نفقہ واجب الاداء ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۴۳ باب النفقۃ میں ہے : قال فی البحر و اتفقوا علیٰ وجوب نفقۃ الموسرین اذا کانا موسرین و علیٰ نفقۃ المعسرین اذا کانا معسرین و انما الاختلاف فیما اذا کان احدھما موسراً و الآخر معسراً فعلیٰ ظاھر الروایۃ الاعتبار بحال الرجل فان کان موسرا و ھی معسرۃ فعلیہ نفقۃ الموسرین و فی عکسہ نفقۃ المعسرین و اما علیٰ المفتیٰ بہ فتجب نفقۃ الوسط فی المسئلتین و فوق نفقۃ المعسرۃ و دون نفقۃ الموسرۃ ۔ اور زوجہ جب شریف اور معزز خاندان سے ہو تو اس کے نان و نفقہ کے علاوہ دو خادموں کا نفقہ بھی زوج کے ذمہ واجب ہے ۔ اور اگر وہ شادی کے وقت اپنے ساتھ متعدد خادموں کو زوج کے گھر لائی ہے تو ان تمام خادموں کا نفقہ زوج پر واجب ہے ۔ در مختار کے اسی باب میں ہے : زفت الیہ بخدم کثیر استحقت نفقۃ الجمیع ذکرہ المصنف قال و فی البحر عن الغایۃ و بہ ناخذ قال و فی السراجیۃ و یفرض علیہ نفقۃ خادمھا و ان کانت من الأشراف فرض نفقۃ خادمین و علیہ الفتوی ۔ رد المحتار میں ہے : قولہ ثم قال و فی البحر الخ ، عبارۃ البحر ھکذا قال الطحاوی و روی صاحب الإملاء عن ابی یوسف رحمہ اللہ ان المرأۃ اذا کانت ممن یجل مقدارھا عن خدمۃ خادم واحد انفق علی من لا بدّ لھا منہ من الخدم ممن ھو اکثر من الخادم

الواحد او الاثنین او اکثر من ذلک قال و بہ نأخذ کذا فی غایۃ البیان ۔ پس صورت مسئولہ میں زوج و زوجہ دونوں چونکہ مالدار ہیں ۔ اور زوجہ شریف و ذی ثروت خاندان سے ہے اس لئے زوجہ اپنے اور اپنے خادموں کے نفقہ میں خاوند کی آمدنی کے لحاظ سے ماہانہ سو روپیہ پانے کی مستحق ہے ۔ اور زوج پر کھانے اور کپڑے و خادم کے خرچ کے علاوہ مکان مسکونہ کی فراہمی بھی زوجہ کیلئے واجب ہے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : ھی لغۃ ما ینفقہ الانسان علی عیالہ و شرعاً ھی الطعام و الکسوۃ و السکنیٰ فتجب للزوجۃ علی زوجھا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ علاتی ماں کی حقیقی بہن یعنی علاتی خالہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

چونکہ علاتی ماں کی ماں یعنی علاتی نانی ہے ۔ اور علاتی ماں کی لڑکی ہے جو کہ اپنے باپ کے بطن سے نہیں ہے ۔ شرعا نکاح جائز ہے ۔ اس لئے علاتی ماں کی حقیقی بہن یعنی علاتی خالہ سے بھی نکاح جائز ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۰ کتاب النکاح باب المحرمات بالصھریۃ میں ہے : و لا بأس بأن یتزوج الرجل امرأۃ و یتزوج ابنہ ابنتھا او امھا کذا فی محیط السرخسی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ علاتی بھائی کی لڑکی سے نکاح جائز ہے یا نہیں ؟
نانا کے بھائی کی لڑکی یعنی ماں کے چچا کی لڑکی سے نکاح درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

علاتی بھائی کی لڑکی سے نکاح حرام ہے ۔ نزھۃ الأرواح فیما یتعلق بالنکاح میں ہے : السادسۃ بنات الأخ و ان سفلت سواء کان الأخ شقیقاً او لأب او لأم ۔
نانا کے بھائی کی لڑکی چونکہ محرمات سے نہیں ہے اس لئے آیت کریمہ " وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ " سے اس کا حلال ہونا ثابت ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مجنون ہے ۔ اور اس کا بھائی بکر ہے ۔ زید کا نکاح

حمیدہ کے ساتھ ہوا ، ایجاب و قبول مجنون سے کرایا گیا ، یہ نکاح میں کسی کی ولایت درج نہیں ہے ۔ عورت کا بیان ہے کہ نکاح کے بعد خلوۃ صحیحہ بھی ہوئی اور نکاح کی زوج کے بھائی کو اطلاع تھی ۔ کیا یہ نکاح جائز و نافذ ہے ؟ اگر نافذ ہے تو مجنون اور اس کی زوجہ میں تفریق کس طرح ہوسکتی ہے ؟ کیا بولایت ولی خلع کروایا جائے یا طلاق دی جاسکتی ہے ؟

الجواب

مجنون نے ایجاب و قبول اگر بصحت ہوش و حواس افاقہ کامل کے وقت کیا ہے تو اس کا یہ تصرف شرعاً درست و نافذ اور نکاح صحیح ہے ، اجازت ولی پر موقوف نہیں ۔ رد المحتار کے جلد ۵ صفحہ ۹۳ کتاب الحجر میں ہے : و جعله الزيلعي في حال إفاقته كالعاقل و المتبادر انه كالعاقل البالغ و به اعترض الشرنبلالي فلا تتوقف تصرفاته ۔ اسی صفحہ میں ہے : فيحترز به أن يفيق أحياناً اى يزول عنه ما به بالكلية و هذا كالعاقل البالغ في تلك الحالة ۔ مجنون اگر افاقہ کامل کی حالت میں طلاق دیدے تو طلاق واقع ہوگی ، اور خلوۃ صحیحہ کی وجہ سے کامل مہر واجب الادا ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے دماغ پر چوٹ لگنے کے باعث زید اس درجہ مختل الحواس و مجنون ہے کہ کسی وقت بھی اس کے حواس برجا نہیں رہتے ۔ اسکی حقیقی ماں ہندہ اور حقیقی بھائی بکر موجود ہیں ۔ زید کا نکاح سعیدہ کے ساتھ پانچ سو روپیہ زر مہر پر بہ ایجاب و قبول مجنون سے کرایا گیا ۔ سیاہۂ نکاح میں کسی کی ولایت درج نہیں ہوئی ۔ عورت کا بیان ہے نکاح کے بعد خلوۃ صحیحہ بھی ہو چکی ہے ۔ نکاح برضامندی ماں کے ہوا ہے اور بھائی کو اس کی اطلاع تھی ۔ کیا یہ نکاح جائز و نافذ ہے ؟ اگر نافذ ہے تو اس وقت ضرورت یہ ہے کہ مجنون اور سعیدہ میں تفریق کرائی جائے ۔ تو کیا بولایت مادر و برادر خلع ہوسکتا ہے یا طلاق دی جاسکتی ہے ؟ اور کیا ولی کے سکوت سے نکاح نافذ ہوسکتا ہے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں جبکہ زید اس درجہ دیوانہ ہے کہ کسی وقت اس کے حواس برجا نہیں رہتے ، اور بہ وقت نکاح اگر اس نے ایجاب و قبول سمجھ بوجھ کر نہیں کیا ہے تو چونکہ اس کو ان الفاظ کی تمیز نہیں اور نہ اس معاملہ کو سمجھکر الفاظ زبان سے نکالے ہیں اس لئے اس کا یہ فعل بالکل لغو اور مجنونانہ حرکت ہے ۔ اس ایجاب و قبول سے نکاح جائز و نافذ نہیں ۔ ایسی حالت میں اگر اس کا ولی عقد نکاح کی اجازت بھی دیتا ہے تو مجنون کے اس طرح ایجاب و قبول سے نکاح درست نہیں تا وقتیکہ ولی خود یا وکالۃً اس کا نکاح نہ کرائے ۔ اور اگر بحالت افاقہ کامل سمجھ بوجھکر ایجاب و قبول کیا ہے تو اس وقت چونکہ وہ عاقل کا

حکم رکھتا ہے لہذا نکاح درست اور صحیح ہے ۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق جلد ۵ کتاب الحجر میں ہے : (و لا تصرف المجنون المغلوب بحال) یعنی لا یجوز تصرفه اصلا و لو اجازه الولی لان صحة العبارة بالمتمیز و هو لا تمیز له فصار کبیع الطوطی ۔ و ان کان یجن تارة و یفیق اخری فهو فی حال افاقته کالعاقل ۔ مجمع الانهر شرح ملتقی الابحر جلد ۲ صفحہ ۴۳۸ کتاب الحجر میں ہے : (و لا تصرف المجنون المغلوب بحال) من الاحوال و ان اجازه الولی لعدم اهلیته اصلا ۔ شرح میں ہے : و لو اجازه الولی لعدم عقله قید بالمغلوب ای المستغرق لانه ان کان یجن و یفیق فهو فی حال افاقته کالعاقل ۔

صورت اُولیٰ میں چونکہ نکاح فاسد و باطل ہے لہذا وطی ہوجانے کی حالت میں زوجہ کو مہر مثل جو مہر مسمی سے زائد نہ ہو دینا لازم ہے ۔ اور صورت ثانیہ میں کامل مہر مسمیٰ واجب الاداء ہے ۔ در مختار کے باب نکاح فاسد میں ہے : و یجب المهر المثل فی نکاح فاسد بالوطیٔ لا بغیره و لم یزد علیٰ المسمیٰ ۔ پہلی صورت میں چونکہ نکاح درست نہیں ہے اس لئے زوجین کو علیحدہ کردینا کافی ہے ۔ دوسری صورت میں اگر زوج بحالت افاقہ کامل طلاق دیدے تو درست ہے ۔ اگر کسی حالت میں افاقہ نہیں ہوتا تو زوجہ فسخ کی درخواست قاضی (حاکم) کے پاس پیش کرے ، کیونکہ فسخ کا اختیار شرعا صرف قاضی ہی کو ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ باپ کی مزنیہ کے ساتھ نکاح کرنا کس مذہب میں جائز ہے اور کس میں نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

باپ کی مزنیہ ، بیٹے کے لئے مذہب حنفی و مالکی و حنبلی میں حرام ہے اور مذہب شافعی میں جائز ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب محرمات بالصهریة میں ہے : فمن زنی بامراة حرمت علیه امها و ان علت و ابنتها و ان سفلت و کذا تحرم المزنی بها علی آباء الزانی و اجداده و ان علوا و ابنائه و ان سفلوا کذا فی فتح القدیر ۔ بلغة السالک فقہ امام مالک جلد ۱ صفحہ ۲۴۰ میں ہے : (قوله فیحرم علیک زوجة ابیک) ای و لو من زنا ۔ الروض المربع بشرح زاد المستقنع فقہ امام احمد بن حنبل مطبوعہ بر حاشیہ نیل المآرب جلد ۲ صفحہ ۱۳۳ میں ہے : و من وطأ امرأة بشبهة او زنیٰ حرم علیه امها و بنتها و حرمت علیٰ ابنه ۔ شرح علامہ جلال الدین محلی علی منہاج الطالبین فقہ شافعی جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ میں ہے : لا تحرم علی الزانی امها و بنتها و لا تحرم هی علی ابیه و ابنه کما لا یثبت الزنا النسب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو طلاق دی ۔ اور عدتاً ختم ہونے کے قبل عمرو نے اس کے ساتھ نکاح کیا ۔ کیا زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ درست ہے ؟ فی الحال کسی وجہ سے عمرو نے ہندہ کو بغیر طلاق کے اپنے گھر سے نکالدیا ہے ۔ کیا اس وقت ہندہ کسی شخص سے نکاح کرسکتی ہے ؟

الجواب

اندرون عدت عمرو نے جو ہندہ سے نکاح کیا ہے شرعاً درست نہیں ۔ لہذا اس وقت (یعنی انقضائے عدت کے بعد) کسی بھی شخص سے زید کے علاوہ نکاح کرسکتی ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۲۳ باب العدۃ میں البحر الرائق سے منقول ہے : اما نکاح منکوحۃ الغیر و معتدتہ فالدخول فیہ لا یوجب العدۃ ان علم انہا للغیر لأنہ لم یقل احد بجوازہ فلم ینعقد اصلا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ عاقلہ و بالغہ کا بیان ہے کہ : میرے برادر حقیقی میرا نکاح زید سے کروانا چاہتے تھے جس سے مجھے انکار تھا ۔ آخر کار مجھکو فریب سے محلہ ترپ بازار میں لے گئے ۔ وہاں میں ایک روز صبح کی نماز پڑھکر اتفاقاً ایسا سو گئی کہ گویا مجھے کسی نے معجون پیسکر استعمال کرادیا ہو ایسی حالت میں مجھ سے اجازت لئے بغیر سوتے میں میرا نکاح زید سے کروادیا گیا ۔ جب مجھے ہوش آیا اور بیدار ہوئی تو سنتے ہی میں نے فوراً ناراضی ظاہر کی ۔ جو بھائی کہ وکیل نکاح تھے وہ حلفاً مظہر ہیں کہ : میں تنہا ہندہ کے پاس پہنچا ایک دو عورتیں ہندہ کے پاس تھیں ۔ میں نے اپنا وکیل ہونا سنادیا مگر ہندہ کے اقبال کو یا سننے کا مجھے علم نہیں ہوا ۔ سنی ہوئی سمجھکر میں نے نکاح بندھوادیا ۔ گواہ اول جو میرے حقیقی ماموں ہیں حلفاً مظہر ہیں کہ : میں اور ہندہ کا بھائی گواہ ثانی باہر ہی تھے ہندہ کے اقبال کا بھی ہم کو علم نہیں ہوا ۔ پس جبکہ میں اس سے ناراض تھی اور جعلی نکاح سے بے خبر اور خداوند عالم نے اس تاریخ جعلساز کے پنجہ سے بھی مجھے تا حال محفوظ رکھا ہے ۔ تو کیا ایسی حالت میں سائلہ کسی سے عقد کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

عاقلہ بالغہ صحیحۃ العقل کا نکاح بدون اس کی رضامندی کے جائز نہیں ۔ اگر ولی بلا اجازت اس کے نکاح کروا بھی دے تو یہ نکاح اس کی اجازت پر موقوف ہوگا ۔ اگر وہ اجازت دے تو جائز ہوگا اور اگر رد کردے تو باطل ہوجائے گا ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۸۰ کتاب النکاح باب الاولیاء میں ہے : لا یجوز نکاح احد علیٰ بالغۃ صحیحۃ العقل من اب او سلطان بغیر اذنہا بکراً کانت او ثیباً فان فعل ذلک فالنکاح موقوف علیٰ اجازتہا فان اجازت جاز و ان ردتہ بطل کذا فی السراج الوھاج ۔ پس

صورت مسئولہ میں ہندہ نے بعد نکاح مجرد خبر پانے کے جب اس سے اپنی ناراضی ظاہر کردی تو یہ نکاح شرعاً باطل ہوگیا ۔ اب ہندہ کو حق ہے کہ جس کسی سے چاہے نکاح کرلے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ اولیٰ مسماۃ ہندہ کا انتقال ہوا جس کے بطن سے ایک لڑکی زینب ہے ۔ اس کے بعد زید نے سلمیٰ کے ساتھ نکاح کیا ۔ اب زید، ہندہ کی لڑکی زینب کا نکاح سلمیٰ کے برادر بکر سے کروانا چاہتا ہے ۔ کیا شرعاً درست ہے ؟ بکر کو زید کی زوجہ اولیٰ ہندہ سے کسی قسم کی قرابت نہیں تھی ۔

الجواب

صورت مسئولہ میں بکر کا نکاح زینب سے شرعاً درست ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دو برادر حقیقی عمرو احمد ہیں ۔ عمر کی لڑکی مسماۃ زینب کی پوتی فاطمہ کا نکاح احمد کے فرزند فضل کے ساتھ جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

زینب کی پوتی فاطمہ چونکہ فضل کی چچازاد بہن کی پوتی ہے اس لئے فاطمہ کا نکاح فضل کے ساتھ جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی عمر اس وقت تخمیناً چالیس سال ہے اور تا حال اس نے نکاح نہیں کیا ۔ زید متشرع و پابند احکام شرعی ہے ۔ اس کو نکاح سے انکار نہیں مگر طبعی نفرت ہے ۔ کیا ایسے شخص سے میل جول رکھنا درست ہے ؟ اور جو مقولہ ہے کہ " ایسے شخص کی صورت دیکھنے سے خنزیر کا دیکھنا بہتر ہے " کہاں تک درست ہے ؟

الجواب

جس شخص کو شہوت کا غلبہ اور نکاح کی شدید خواہش ہے ایسے شخص کیلئے نکاح واجب ہے ۔ اور جب

اس کو یہ یقین ہوجائے کہ اگر میں نکاح نہ کروں تو ضرور زنا میں مبتلا ہوجاؤں گا تو ایسی حالت میں نکاح فرض ہے ۔ اگر اس کو شہوت کا غلبہ نہیں ہے اور وہ اعتدال کی حالت میں ہے تو ایسے شخص کیلئے نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے ۔ مگر یہ بھی شرط ہے کہ اس میں جماع کرلے کی بھی قدرت ہو یعنی عنین و نامرد نہ ہو ، اور مہر و نفقہ ادا کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہو ۔ اور اگر اس کو یہ خوف ہے کہ ، نکاح کرنے میں مجھ سے احکام الٰہی کی پابندی نہیں ہوگی اور میں گنہ میں مبتلا ہوجاؤنگا ۔ تو ایسی حالت میں نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے ۔ در مختار کی کتاب النکاح میں ہے : (و یکون واجبا عند التوقان) فان تیقن الزنا الا به فرض ، نهاية ۔ و هذا ان ملك المهر و النفقة و الا فلا اثم بتركه بدائع (و) يكون (سنة) مؤكدة في الأصح فيأثم بتركه و يثاب ان نوىٰ تحصيناً و ولدا (حال الاعتدال) اى القدرة على وطيٍ و مهر و نفقة ، و صح في النهر وجوبه للمواظبة عليه و الانكار على من رغب عنه (مكروها لخوف الجور) فان تيقن حرم ۔ رد المحتار میں ہے : و في البحر و المراد حالة القدرة على الوطءِ و المهر و النفقة مع عدم الخوف من الزنا و الجور و ترك الفرائض و السنن ، فلو لم يقدر على واحد من الثلاث او خاف واحدا من الثلاثة اى الاخيرة فليس معتدلا فلا يكون سنة في حقه كما افاده في البدائع ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کو نکاح سے طبعی نفرت اگر اس وجہ سے ہے کہ وہ جماع کی طاقت نہیں رکھتا ، یا اس کو خوف ہے کہ نکاح کے بعد اس سے احکام شرعیہ کی تعمیل و پابندی نہ ہوسکے گی ، یا اس میں زوجہ کا مہر و نفقہ ادا کرلے کی طاقت نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی قرض حسنہ دیتا ہے تو ایسی حالت میں اس کا نکاح نہ کرنا بہتر ہے ۔ اور اگر ان وجوہ بالا سے کوئی وجہ نہیں ہے تو پھر اس کا نکاح کو ترک کرنا گناہ ہے ۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ " ایسے گنہگار کو دیکھنا خنزیر کے دیکھنے سے بدتر ہے" اس قول کا کسی معتبر کتاب میں ثبوت نہیں ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے نکاح ثابت کرنے کی غرض سے کئی گواہ پیش کئے ۔ ان تمام گواہوں کا بیان ہے کہ اس عقد کا علم ہم کو زید ہی سے ہوا ہے اور زید نے ہم سے یہ بیان کیا تھا کہ ہندہ سے میرا نکاح ہوا ہے ۔ اور ان گواہوں سے ایک بھی شریک محفل عقد نہیں تھا ۔ اور نہ کسی گواہ کو تاریخ النکاح و شہور و عقد و مہر وغیرہ کا علم ہے ۔کیا ایسی حالت میں ایسی گواہی سے زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ شرعاً ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

گواہوں کا ناکح و منکوحہ کے ایجاب و قبول کو سننا ضروری ہے ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ کسی بھی گواہ نے ایجاب و قبول نہیں سنا ہے اس لئے اس گواہی سے زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ شرعاً ثابت نہیں ۔

عالمگیریہ جلد ا صفحہ ۲۹۰ کتاب النکاح میں ہے : (و منها) سماع الشاهدین کلامهما هکذا فی فتح القدیر ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زر مہر اور سامان جہیز جو ہندہ اپنے میکے سے لے گئی اور اشیاء چڑھاوا و پارچہ جو کہ شوہر بوقت شادی ہندہ کے لئے لایا اور ہندہ کو چڑھایا گیا یہ سب ہندہ کی ملک ہے یا نہیں ؟ ہندہ کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کے ورثاء حسب ذیل ہیں : پدر ، مادر ، برادر ، شوہر ، خواہر ۔ ان ورثاء میں کون اور کس قدر حصہ پانے کا مستحق ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی زر مہر چونکہ زوجہ کی " ملک بضعہ " یعنی حق وطی کا معاوضہ ہے اس لے یہ زوجہ کی ملک ہے ۔ سامان جہیز جو ماں باپ یا کسی ولی جائز کی جانب سے دیاجاتا ہے اس کے متعلق شرعاً عرفِ بلد یعنی رواجِ ملک کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔ حیدرآباد میں عموماً جہیز لڑکی کی ملک کردیا جاتا ہے اس لئے یہ بھی لڑکی کی ملک ہے ، جس میں وراثت جاری ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۵ میں ہے : جهز ابنته بجهاز و سلمها ذلک لیس له الاسترداد منها و لا لورثته بعد ان سلمها ذلک فی صحة بل تختص به و به یفتی ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله لیس له الاسترداد) هذا اذا کان العرف مستمرا ان الأب یدفع مثله جهازاً لا عاریة ۔ زوج نے جو زیورات و لباس کہ زوجہ کیلئے شادی کے قبل بطور چڑھاوے کے روانہ کیا ہے اگر زوجہ کو یہ زیورات و لباس بطور ہبہ کے دیا ہے ، ان زیورات کو زوجہ کے مہر میں دیا ہے تو ایسے وقت میں وہ زوجہ کی ملک ہے اس میں وراثت جاری ہوتی ہے ، ورنہ عاریتاً ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۸ میں ہے : و اذا بعث الزوج الی اهل زوجته اشیاء عند زفافها منها دیباج فلما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذا بعث الیها علی جهة التملیک کذا فی الفصول العمادیة ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : و لو بعث الی امرأته شیئا و لم یذکر جهة عند الدفع غیر المهر فقالت هو هدیة و قال هو من المهر فالقول له فی غیر المهیا للاکل و لها فی المهیأ له ۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵ کتاب البیوع میں ہے : و هذا یوجد کثیرا بین الزوجین یبعث الیها متاعا و تبعث له ایضا و هو فی الحقیقة هبة حتی لو ادعی الزوج العاریة رجع و لها ایضا الرجوع لأنها قصدت التعویض عن هبة فلما لم توجد الهبة بدعوی العاریة لم یوجد التعویض منها فلها الرجوع ۔ پس صورت مسئولہ میں زر مہر اور سامان جہیز جو ماں باپ نے دیا ہے اور سامان چڑھاوا جو خاوند کی جانب سے بطور ہبہ یا معاوضہ مہر کے ملا ہے یہ سب زوجہ کی ملک ہے ۔ خاوند کے حین حیات اگر ہندہ کا انتقال ہوا ہے تو مصارفِ تجہیز و تکفین خاوند کے ذمہ ہیں ۔ ورنہ اس کے جملہ مال سے بعد وضع مصارف تجہیز و تکفین و ادائی دیون و اجراء وصیت

جملہ مال کے ۶ حصے کرکے باپ کو دو ، ماں کو ایک ، شوہر کو تین حصے دیے جائیں ۔ بھائی اور بہن محروم ہونگے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ ثیبہ سنی المذہب اپنی رضامندی و خوشی سے زید رافضی سے نکاح کرنا چاہتی ہے ۔ کیا از روئے شریعت ہندہ کے ولی کو اس نکاح سے ہندہ کو باز رکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟ بدون رضامندی ولی کے ہندہ اگر نکاح کرلے تو ایسی حالت میں ولی کا اس پر کوئی حق و جبر ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جو رافضی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کے منکر ہیں ، یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کرتے ہیں ، اور فرقہ زیدیہ جو عجم سے ایک ایسے نبی کے آنے کا انتظار رکھتے ہیں جو ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم کے دین کو منسوخ کرے گا ، اسی طرح وہ رافضی جو دنیا میں اموات کے رجوع ہونے اور تناسخ کے قائل ہیں ، اور وہ رافضی جو ائمہ میں روح الٰہی کے منتقل ہونے کے قائل ہیں ، اور وہ جو امام باطنی کے نکلنے کے قائل ہیں اور اس کے نکلنے تک تمام اوامر و نواہی کو بےکار جانتے ہیں ، اسی طرح وہ رافضی جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی طرف وحی لانے میں غلطی ہوئی اصل وحی علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر آنے والی تھی ، یہ تمام رافضی حنفیوں کے پاس کافر اور مذہب اسلام سے خارج ہیں ۔ ان کے احکام ہمارے پاس مرتدوں کے احکام ہیں ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ باب کلمات الکفر میں ہے : من انکر امامۃ ابی بکر الصدیق رضی اللّٰہ عنہ فھو کافر و علیٰ قول بعضھم ھو مبتدع و لیس بکافر و الصحیح انہ کافر ۔ و کذلک من انکر خلافۃ عمر رضی اللّٰہ عنہ فی اصح الأقوال کذا فی الظھیریۃ ۔ و یجب إکفار الزیدیۃ کلھم فی قولھم بانتظار نبی من العجم ینسخ دین نبینا محمد صلیٰ اللّٰہ علیہ و سلم کذا فی الوجیز للکردری ۔ و یجب اکفار الروافض فی قولھم برجعۃ الأموات الی الدنیا و بتناسخ الأرواح و بانتقال روح الإلٰہ الیٰ الأئمۃ و بقولھم فی خروج امام باطن و بتعطیلھم الأمر و النھی الیٰ ان یخرج الإمام الباطن و بقولھم ان جبرئیل علیہ السلام غلط فی الوحی الیٰ محمد صلیٰ اللّٰہ علیہ و سلم دون علیؓ ابن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ و ھٰؤلاء القوم خارجون عن ملۃ الاسلام و احکامھم احکام المرتدین کذا فی الظھیریۃ ۔ اور رد المحتار مصری جلد ۳ صفحہ ۳۲۰ میں ہے : نعم لا شک فی تکفیر من قذف السیدۃ عائشۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا او انکر

صحبة الصديق او اعتقد الالوهية في على رضى الله عنه او ان جبرئيل غلط في الوحي او نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقرآن ۔

اور جو رافضی کہ صحابۂ کرام کو گالیاں دیتے ہیں اور ان سے بغض رکھتے ہیں، ان کے گمراہ و بدکار ہونے پر تمام اماموں کا اتفاق ہے ۔ بلکہ بعض فقہاء نے ان کو بھی کافر لکھا ہے ۔ اور جو علی کی شیخین رضی اللہ عنہم پر فضیلت کے قائل ہیں وہ بدعتی ہیں ۔ رد المحتار مصری کے جلد ۳ صفحہ ۲۰۲ میں ہے : في الاختيار اتفق الائمة على تضليل اهل البدع اجمع و تخطئتهم و سب احد من الصحابة و بغضه لا يكون كافرا لكن يضلل ۔ اور عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ میں ہے : الرافضي اذا كان يسب الشيخين و يلعنهما و العياذ بالله فهو كافر و ان كان يفضل عليا كرم الله وجهه على ابي بكر رضي الله عنه لا يكون كافرا الا انه مبتدع ۔

روایات سابقہ سے جبکہ رافضیوں کا کافر و بدکار و گمراہ ہونا ثابت ہے تو از روئے شریعت رافضی سے سنی عورت کا نکاح ناجائز ہے ۔ کیونکہ نکاح میں شرعا زوج و زوجہ کے ما بین کفوء کا لحاظ کیا گیا ہے اور ہمسری مرد کی عورت کے ساتھ اسلام و دینداری و تقوی میں بھی رکھی گئی ہے ۔ یعنی کافر یا غیر متقی و بدکار مرد ہرگز مؤمنہ عصمہ و صالحہ کا ہمسر نہیں ہوسکتا ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۱۰ میں ہے : (و منها الديانة) اى تعتبر الكفاءة في الديانة و هذا قول ابي حنيفة و ابي يوسف رحمهما الله و هو الصحيح كذا في الهداية فلا يكون الفاسق كفوا للصالحة كذا في المجمع سواء كان معلنا الفسق او لم يكن كذا في المحيط ۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۳۶ باب الکفاءۃ میں ہے : (و) اما في العجم فتعتبر (حرية و اسلاما) و (ابوان فيهما كالآباء (و) تعتبر في العرب و العجم (ديانة) اى تقوى فليس فاسق كفوء الصالحة او فاسقة بنت صالح معلنا كان او على الظاهر ۔ نهر ۔

شرعاً کفاءۃ ولی کا حق ہے ۔ یعنی اگر لڑکی ثیبہ ہو یا باکرہ جبکہ غیر کفوء سے نکاح کرنا چاہے اور ولی ناراض ہو تو اس کا نکاح ہی منعقد نہیں ہوتا ۔ اور اگر ولی کو نکاح کے بعد معلوم ہو اور وہ فسخ کرانا چاہے تو قبل حاملہ ہونے کے یا بچے والی ہونے کے قاضی کے پاس پیش کرکے فسخ کراسکتا ہے ۔ مگر یہ حق ولی کو اس وقت دیا گیا ہے جبکہ وہ عصبہ ہو یعنی ولی باپ ہو یا حقیقی بھائی یا چچازاد بھائی یا دادا وغیرہ ۔ اور جو ولی کہ ذوی الارحام سے ہیں یا ماں اور قاضی اگر ولی ہے تو ایسے اولیاء کو لڑکی کے خود بخود غیر کفوء سے نکاح کرلینے کی صورت میں اعتراض و فسخ کا حق نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ باب الکفاءۃ میں ہے : (و) الكفاءة (هي حق الولي لا حقها) فلو نكحت رجلا و لم تعلم حاله فاذا هو عبد لا خيار لها بل للاولياء ۔ اور صفحہ ۳۴۳ رد المحتار میں ہے : (قوله الكفاءة معتبرة) قالوا معناه معتبرة في اللزوم على الاولياء حتى عند عدمها جاز للولي الفسخ اهـ فتح ۔ و هذا بناء على ظاهر الرواية من ان العقد صحيح و للولي الاعتراض اما على رواية الحسن المختارة للفتوى

من انه لا يصح فالمعنى معتبرة في الصحة ۔ اور عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۱۰ میں ہے: ثم المرأة اذا زوجت نفسها من غير كفء صح النكاح في ظاهر الرواية عن ابي حنيفة رحمة الله عليه و هو قول ابي يوسف رحمه الله آخرا و قول محمد رحمه الله آخرا ايضا حتى ان قبل التفريق يثبت فيه حكم الطلاق و الظهار و الايلاء و التوارث و غير ذلك ولكن للاولياء حق الاعتراض ۔ و روى الحسن عن ابي حنيفة رحمه الله ان النكاح لا ينعقد و به اخذ كثير من مشايخنا رحمهم الله كذا في المحيط و المختار في زماننا للفتوى رواية الحسن و قال الشيخ الإمام شمس الائمة السرخسي رواية الحسن اقرب الى الاحتياط ۔ كذا في فتاوى قاضيخان في فصل شرائط النكاح ۔ و في البزازية ذكر برهان الأئمة ان الفتوىٰ في جواز النكاح بكراً كانت او ثيباً على قول الامام الأعظم ۔ و هذا اذا كان لها وليٌّ فان لم يكن صح النكاح اتفاقا كذا في النهر الفائق ۔ و لا يكون التفريق بذلك الا عند القاضي ۔ اور در مختار میں اسی جلد کے صفحہ ۳۲۲ باب الولی میں ہے: و يفتى في غير الكفء بعدم جوازه و هو المختار للفتوى لفساد الزمان ۔ اور در مختار میں ہے: قوله بعدم جوازه اصلا هذه رواية الحسن عن ابي حنيفة و هذا اذا كان لها وليٌّ و لم يرض به قبل العقد فلا يفيد الرضا بعده ۔ بحر ۔ و اما اذا لم يكن لها وليٌّ فهو صحيح نافذ مطلقا اتفاقا كما يأتي لأن وجه عدم الصحة على هذه الرواية دفع الضرر عن الأولياء اما هي فقد رضيت باسقاط حقها ۔ فتح ۔ و قول البحر لم يرض به ليشمل ما اذا لم يعلم اصلا فلا يلزم التصريح بعدم الرضا بل السكوت منه لا يكون رضا كما ذكرنا فلا بد حينئذ بصحة العقد من رضاه صريحا و عليه فلو سكت قبله ثم رضي بعده لا يفيد ۔ اور صفحہ ۳۲۱ میں ہے: (و له)اي للولي اذا كان عصبة (الاعتراض) في غير الكفء فيفسخه القاضي و يتجدد الاعتراض يتجدد النكاح (ما لم) يسكت حتى (تلد منه) لئلا يضيع الولد و ينبغي إلحاق الحبل الظاهر به ۔

پس صورت مسئولہ میں ہندہ سنیہ کا نکاح زید رافضی سے شرعاً صحیح و جائز نہیں ہے ۔ اور ولی کو قبل نکاح روکنے کا حق حاصل ہے ۔ مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی فتاویٰ عزیزیہ مجتبائی کے صفحہ ۱۱ میں عدم جواز نکاح تحریر فرمایا ہے اور اس نکاح سے مذہب میں فتور آنے کا اندیشہ ظاہر کیا ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میت کی جائداد سے خواہ کسوبہ ہو یا موروثی یا عطیہ سلطانی ، دین مہر کی ادائی ضروری ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مہر چونکہ دوسرے قرضوں کی طرح ایک قرض ہے ۔ جیسا کہ فتاویٰ مہدیہ مصری کی جلد ۱ صفحہ ۱۳۲ میں

ہے: و هو دين في ذمة الزوج ۔ اور خزانة الرواية قلمی کے صفحہ ۱۰۳ میں ہے: ان المهر دين ۔ اس لئے میت کے تمام قرضوں کی ادائی جس طرح کہ اس کی ہر قسم کی جائداد سے کی جاتی ہے ۔ اسی طرح مہر کی ادائی بھی واجب ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی مزنیہ کی لڑکی سے جس کا اس کے صلب سے نہ ہونا یقینی ہے خود نکاح کرسکتا یا اپنے اُس لڑکے کے ساتھ جو مزنیہ مذکورہ کے بطن سے نہیں ہے نکاح کرواسکتا ہے یا نہیں؟ مزنیہ کی اعلیٰ و اسفل عورتوں کے ساتھ یعنی ماں و نانی و دادی یا پوتی و نواسی سے خود یا اپنے لڑکے کا عقد کرسکے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

نکاح والی عورت کی ماں، نانی، دادی، بیٹی، پوتی وغیرہ جس طرح کہ ناکح پر حرام ہے ۔ اسی طرح مزنیہ کی ماں، نانی، دادی، بیٹی، پوتی وغیرہ بھی زانی پر حرام ہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۱ میں ہے: و تثبت بالوطئ حلا كان او عن شبهة او زنا كذا في فتاوى قاضيخان فمن زنىٰ بامرأة حرمت عليه امها و ان علت و ابنتها و ان سفلت ۔ البتہ مزنیہ کے پہلے خاوند کی لڑکی کا زانی کی دوسری عورت کے لڑکے سے نکاح جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عابدہ، عاصمہ کی ماں ہے اور خالد، عمرو کا باپ ہے ۔ کیا خالد کا عابدہ سے، اور عمرو کا عاصمہ سے ایک وقت میں نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

ایک ہی محفل میں ان دونوں کا نکاح کرنا جائز ہے ۔ فتح القدیر مصری کے جلد ۳ صفحہ ۱۲۰ میں ہے: جاز التزوج بأم زوجة الابن و بنتها و جاز للابن التزوج بأم زوجة الأب و بنتها ۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۷۷ میں ہے: و لا بأس بأن يتزوج الرجل امرأة و يتزوج ابنه ابنتها او امها كذا في محيط السرخسي ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

اس مسئلہ شرعی میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں کہ زید کی دو بیویاں تھیں، ایک کے ساتھ بعد ادائے رسومِ شادی و سہرا و کنگن و ناچ و رنگ وغیرہ نکاح کیا، دوسری بیوی کے ساتھ بلا ادائے رسوم

مندرجہ بالا صرف حسب سنت نبوی نکاح کیا۔ ان ہر دو بیویوں سے اولاد موجود ہیں۔ کیا ان ہر دو زوجگان کی اولاد کے حقوق توریث حسب شرع شریف مساوی ہیں یا کم و بیش؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرعاً نکاح دو گواہوں کے روبرو ایجاب و قبول کرلنے سے منعقد ہوجاتا ہے۔ اور رسومات یعنی کنگن و ناچ و رنگ وغیرہ نکاح کیلئے شرط نہیں ہیں۔ بلکہ یہ شرعاً ممنوع ہیں۔ اس لئے دونوں بیویوں کی اولاد شرعاً برابر حصہ پانے کی مستحق ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے جو بالغ و عاقلہ ہے متعدد مرتبہ یک ہی جلسے کے متعدد اشخاص کے روبرو جب کبھی موقع ملا یہ کہا اور اب بھی کہتی ہے کہ مجھے زید کی زوجہ ہونا منظور ہے۔ اور زید بھی یہ کہتا ہے کہ ہندہ کو اپنی زوجیت میں لینا مجھے ہر طرح منظور ہے۔ لیکن ہندہ کے والدین ہندہ کو مقید رکھکر دوسرے شخص سے نکاح کردینا چاہتے ہیں۔ کیا ہندہ اور زید کا یہ ایجاب و قبول دونوں کو زوج و زوجہ ثابت کرسکتا ہے جو دوسرے شخص سے ہندہ کے نکاح کا مانع ہو؟ بینوا توجروا۔

الجواب

شرع میں نکاح کی شروط سے یہ بھی ایک شرط ہے کہ ایک ہی مجلس میں دونوں کا ایجاب و قبول ہو، یہاں تک کہ اگر ایک مجلس میں دونوں حاضر ہوں اور ایک کی جانب سے ایجاب ہو اور دوسرا بدون قبول کرلنے مجلس سے کھڑا ہوجائے یا اس کے ایجاب کو سن کر بغیر قبول کرلنے کے کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجائے جس سے مجلس بدل جاتی ہے تو شرعاً یہ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر عورت دو گواہوں کے روبرو مرد کے غائبانہ یہ کہے کہ "میں نے فلاں سے نکاح کرلیا" پھر اس کی خبر مرد کو پہنچے اور مرد اس کو قبول کرلے، یا مرد عورت کے غائبانہ دو گواہوں کے روبرو یہ کہے کہ "میں فلاں عورت کو نکاح میں لایا" پھر یہ خبر عورت کو ملی اور عورت نے اس کو قبول کرلیا، اس صورت میں اگرچہ ایجاب و قبول انہیں دو گواہوں کے روبرو ہوا مگر چونکہ عورت یا مرد اصالتاً و وکالتاً مجلس نکاح سے غائب ہیں اس لئے شرعاً یہ نکاح منعقد و معتبر نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیریہ مصری کے جلد ۱ صفحہ ۲۶۹ میں ہے: (و منها)

ان یکون الایجاب و القبول فی مجلس واحد حتی لو اختلف المجلس بان کانا حاضرین فاوجب احدهما فقام الآخر عن المجلس قبل القبول او اشتغل بعمل یوجب اختلاف المجلس لا ینعقد۔ و کذا اذا کان احدهما غائبا لم ینعقد حتی لو قالت امراۃ بحضرۃ شاهدین "زوّجتُ نفسی من فلان" و هو غائب فبلغه الخبر فقال "قبلتُ" او قال رجل بحضرۃ شاهدین "تزوجتُ فلانة"

و هی غائبة فبلغها الخبر فقالت " زوجت نفسی منه " لم یجز و ان کان القبول بحضرة ذینک الشاهدین و هذا قول ابی حنیفة و محمد رحمهما الله ۔

پس صورت مسئولہ میں ہندہ جس جلسے میں ایجاب کررہی ہے اسی جلسے میں زید کا قبول کرنا ثابت نہیں ہے ۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زید اس جلسے میں نہیں تھا بلکہ لوگوں کے ذریعہ سے اس کو اسکی خبر ملی جب اس نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی ۔ علاوہ بریں انعقاد نکاح کیلئے شرعاً یہ بھی ضروری ہے کہ ایجاب و قبول کے لفظ دونوں ماضی کے صیغے ہوں یا ایک ماضی کا ہو اور دوسرا مضارع کا یعنی یہ کہا جائے کہ " میں نے فلاں کو نکاح کیا " یا " فلاں کو نکاح میں قبول کیا " ۔ صورت مسئولہ میں ہندہ کا یہ قول کہ " مجھکو زید کی زوج ہونا منظور ہے " ماضی کا صیغہ نہیں ۔ اور نہ زید کا یہ قول " مجھکو ہندہ کا اپنی زوجیت میں لینا ہر طرح منظور ہے " ماضی کا صیغہ ہے ۔ نظر بریں وجوہ اس وقت ہندہ شرعاً زید کی زوجہ نہیں ہے اور نہ زید ہندہ کا شوہر ہے ۔ اگر ہندہ اس وقت زید کے سوا اپنے ہم مثل کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ ہندہ عاقلہ بالغہ کا عقد زید سے جو اس کا ہم کفوء ہے قرار پایا ہے ۔ لیکن خالد جو ہندہ کا چچا اور ولی ہے اس عقد سے ناراض ہے ۔ کیا خالد کی ناراضی سے نکاح ناجائز ہوگا ؟ کیا ہندہ بوجہ عقل و بلوغ اپنی رضامندی سے بغیر استمزاج ولی کے نکاح کرسکتی ہے ؟

الجواب

شرعاً عرب کے سوا عجم کیلئے کفائت اس طرح ہے کہ زوج و زوجہ دونوں حر یعنی آزاد ہوں ، کسی کے غلام نہ ہوں ، اور زوج مذہب اور تقویٰ و پرہیزگاری اور مال اور پیشہ میں زوجہ کے مساوی ہو ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۲۷ باب الکفاءۃ میں ہے : (و) اما فی العجم فتعتبر (حریة و اسلاما) ۔ اور صفحہ ۳۲۸ میں ہے : (و) تعتبر فی العرب و العجم (دیانة) ای تقوی (و مالا و حرفة) ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زید حسب تفصیل سابق تمام باتوں میں ہندہ کا کفوء اور مثل ہے تو ہندہ زید سے بلا رضامندی ولی کے بھی عقد کرسکتی ہے اور ولی کو اعتراض کا حق نہیں ہے ۔ اور اگر زید ان تمام باتوں میں ہندہ کا کفوء اور مثل نہیں ہے تو ولی کو روکنے اور اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۲۵ باب الکفاءۃ میں ہے : حاصله ان المرأة اذا زوجت نفسها من کفء لزم علی الأولیاء و ان زوجت نفسها من غیر کفء لا یلزم او لا یصح ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوج اپنی زوجہ کو بغیر دخول یا خلوت صحیحہ کے طلاق

دیدے تو زوجہ ایام عدت گذارے بغیر دوسرے کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

عدت کے واجب ہونے کا سبب دخول یا خلوتِ صحیح یا موت ہے ۔ بدون دخول یا خلوتِ صحیحہ کے اگر طلاق دی جائے تو شرعاً عدت واجب نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۷۱۵ باب العدۃ میں ہے : (و سبب وجوبها) عقد (النكاح المتاكد بالتسليم و ما جرىٰ مجراه) من موت او خلوة صحيحة ۔ اور در مختار میں ہے : (قوله بالتسليم) اى بالوطء ۔ کفایہ کے باب العدۃ میں ہے : ان عدة الطلاق لا تجب الا بعد الدخول او الخلوة ۔ پس صورت مسئولہ میں اس عورت کا طلاق کے بعد عدت گذارے بغیر دوسرے شخص سے نکاح جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے جو کہ عاقلہ بالغہ ہے اور جس کی عمر چودہ سال ہے اپنے باپ کی بلا رضامندی اپنی مرضی سے زید سے جو ہم کفوء شرعی ہے بہ تکمیل احکام شرعی اپنا نکاح کرلیا ، اس نکاح سے ہندہ کی ماں نانی سب راضی ہیں ۔ کیا چودہ سال میں شرعاً بلوغ ممکن ہے یا نہیں ؟ اور ہندہ صحت و جواز عقد میں ولی کی اجازت کی محتاج ہے یا نہیں ؟ اگر محتاج نہیں ہے تو ہندہ کا یہ فعل شرعی سمجھا جائیگا یا کیا ؟ اور کیا ایسا نکاح لائق فسخ ہوگا ؟ بدلائل بیان فرمایئے ۔

الجواب

لڑکی احتلام اور حیض اور حمل سے بالغہ سمجھی جاتی ہے ۔ اگر ان تینوں سے کوئی بھی چیز نہ پائی جائے تو اس کے لئے پندرہ سال عمر رکھی گئی ہے ، اس عمر تک پہنچنے کے بعد بدون احتلام و حمل و حیض کے بھی بالغہ سمجھی جاتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۵ صفحہ ۱۰۰ کتاب الحجر میں ہے : (بلوغ الغلام بالاحتلام و الاحبال و الإنزال) و الأصل هو الانزال (و الجارية بالاحتلام و الحيض و الحبل) فان لم يوجد فيهما شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة) به يفتى لقصر أعمار اهل زماننا ۔ (و ادنىٰ مدته له اثنتا عشرة سنة و لها تسع سنين) هو المختار كما في احكام الصغار ۔ اور قدوری مجتبائی کے صفحہ ۸۲ کتاب الحجر میں ہے : و بلوغ الجارية بالحيض و الاحتلام و الحبل فان لم يوجد ذلك فحتى يتم لها سبع عشرة سنة و قالا اذا تم للغلام و الجارية خمس عشرة سنة فقد بلغا و عليه الفتوىٰ ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر ہندہ کو ۱۴ سال ہی کی عمر میں حیض آنے لگا ہے یا احتلام ہوتا ہے تو ہندہ شرعاً عاقلہ و بالغہ ہے اور اس کا نکاح اپنے ہم کفوء زید سے بلا رضامندی و اجازت ولی کے درست ہے اور ولی کو فسخ کا حق نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۵ باب الکفاءۃ میں ہے :

ان المرأة اذا زوجت نفسها من كفء لزم على الأولياء و ان زوجت نفسها من غير كفء لا يلزم

او لا یصح ۔ اور ہدایہ اولین مجتبائی کے صفحہ ۲۹۳ باب الاولیاء میں ہے : و ینعقد نکاح الحرۃ العاقلۃ البالغۃ برضائھا و ان لم یعقد علیھا ولی بکرا کانت او ثیبا عند ابی حنیفۃ و ابی یوسف رحمھما اللّٰہ تعالٰی فی ظاھر الروایۃ ۔ اور صفحہ ۲۹۴ میں ہے : ثم فی ظاھر الروایۃ لا فرق بین الکفوء و غیر الکفوء لکن للولی الاعتراض فی غیر الکفوء ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کو پہلے شوہر سے ایک دختر مسماۃ مریم تھی ۔ پھر اس نے زید سے نکاح کیا اور اس سے ایک دختر فاطمہ پیدا ہوئی ۔ اس کے بعد مریم ایک دختر مسماۃ زینب چھوڑکر فوت ہوگئی ۔ اگر فاطمہ کا شوہر زینب سے بموجودگی فاطمہ نکاح کرے تو درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

نکاح میں ایسی دو عورتوں کا جمع کرنا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری سے اس کا نکاح حرام ہوتا ہو ۔ شرعاً ناجائز ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۷ باب المحرمات میں ہے : و الاصل ان کل امرأتین لو صورنا إحداھما من أی جانب ذکراً لم یجز النکاح بینھم برضاع او نسب لم یجز الجمع بینھما ۔ ھکذا فی المحیط ۔ بناء بریں خالہ بھانجی کا نکاح میں جمع کرنا شرعاً ناجائز ہے ۔ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : فلا یجوز الجمع بین امرأۃ و عمتھا نسبا او رضاعا و خالتھا کذلک ۔ اور شرعاً اخیافی خالہ و بھانجی حرمت میں حقیقی خالہ و بھانجی کی برابر ہیں جیسا کہ عالمگیریہ کی جلد ۱ صفحہ ۲۷۳ باب المحرمات کی عبارت : و اما الأخوات فالأخت لأب و أم ، و الأخت لأب ، و الأخت لأم ، و کذا بنات الأخ و الأخت و ان سفلن و الخالات فخالتہ لأب و أم ، و خالتہ لأب ، و خالتہ لأم میں لفظ و کذا بنات الأخ و الأخت اور خالتہ لأم سے ثابت ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا فاطمہ یعنی اخیافی خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے زینب یعنی اخیافی بھانجی کے ساتھ نکاح کرنا ناجائز ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو زوجہ اولیٰ حمیدہ کے بطن سے ایک فرزند مسمی بکر موجود ہے ۔ اب زید بکر کا نکاح اپنی زوجہ ثانیہ کی بہن سے کرنا چاہتا ہے ۔ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

شرعاً علاتی ماں کی ماں سے اور اس کے پہلے خاوند کی بیٹی سے نکاح جائز ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۷ میں ہے : لا بأس بأن یتزوج الرجل امرأۃ ویتزوج ابنہ ابنتھا او امھا کذا فی محیط السرخسی ۔ پس جبکہ علاتی ماں کی ماں یعنی علاتی نانی اور علاتی ماں کی بیٹی سے نکاح جائز ہے ۔ تو علاتی ماں کی بہن یعنی علاتی خالہ سے بھی جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی حقیقی بھانجی سے نکاح کیا اور مفقود ہو گیا ۔ کیا اس کی تفریق کیلئے قاضی کو چاہیے کہ زوج کا انتظار کرکے بعد حضوری تفریق کروائے یا بغیر تفریق کے اس کے ساتھ دوسرا شخص نکاح کرسکتا ہے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

محرمات سے نکاح شرعاً باطل ہے ۔ " باطل " و " فاسد " میں محض عدت کا فرق ہے ۔ چنانچہ رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ میں ہے : و الحاصل انه لا فرق بينهما في غير العدة اما فيها فالفرق ثابت ۔ اور بعض فقہاء نے یہاں " فاسد " کو " باطل " کے معنیٰ میں لیا ہے ۔ چنانچہ اسی جگہ ہے : و فسر القهستاني ههنا الفاسد بالباطل و مثله بنكاح المحارم ۔ اور اس قسم کے نکاح میں شرعاً زوج و زوجہ ہر ایک کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ بدون حاضری دوسرے کے اس کو فسخ کرلے اور علیحدہ ہوجائے ۔ کیونکہ گناہ سے بچنا ہر ایک پر لازم ہے ۔ مابین ہر دو کے وطی ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے ۔ بلکہ یہ حکم ہر حالت میں ہے ۔ اور خود علیحدہ نہ ہونے کی صورت میں قاضی پر انکی تفریق واجب ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ کتاب النکاح میں ہے : (و) يثبت (لكل واحد منهما فسخه و لو بغير محضر عن صاحبه دخل بها او لا) في الاصح خروجا عن المعصية فلا ينافي الوجوب بل يجب على القاضي التفريق بينهما ۔ رد المحتار میں تحت قول (بل يجب على القاضي) مکتوب ہے : اي ان لم يتفرقا ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ شرعاً ہر ایک کو دوسرے کے غائبانہ میں فسخ کرلنے کا حق دیا گیا ہے اور فسخ نہ کرنے کی صورت میں منجانب شرع قاضی تفریق پر مامور ہے تو قاضی کو ہر ایک کے غائبانہ میں بھی فسخ و تفریق کا حق حاصل ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ عربیۃُ النسب کا نکاح عجمیُ النسب مرد سے جائز ہے یا نہیں ؟ حالانکہ اس وقت ہندہ کے ہم کفو اشخاص بھی اس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں ۔ اور ہندہ کا ایک حقیقی بھائی صغیر السن اور چچازاد بھائی عاقل و بالغ موجود ہے ۔ ان بھائیوں میں سے حق ولایتِ نکاح کس کو ہے ؟ اور ہندہ کو غیر کفوء عجمی النسب کے نکاح سے روکنے کا ولی کو حق ہے یا نہیں ؟ بمذہب شافعیہ و حنفیہ اس کا جواب عطاء ہو ۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب میں عربیہ عورت اگرچیکہ اس کا باپ ہی صرف عربی ہو اور ماں عجمیہ ہو ۔ عجمی مرد کیلئے جس کا باپ عجمی ہو اگرچیکہ اس کی ماں عربیہ ہو کفو

نہیں ہے ۔ تحفہ شرح منہاج الطالبین مطبوعہ مصری کی جلد ۶ صفحہ ۲۰۹ کتاب النکاح میں ہے : (فالعجمی) ابا و ان كانت امه عربية (ليس كفوء عربية) و ان كانت امها عجمية ۔ عورت جبکہ غیر کفوء سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے ولی کو اس نکاح سے روکنے اور منع کرنے کا حق حاصل ہے ۔ فتاویٰ ابن زیاد صفحہ ۲۲۳ میں ہے : الكفاءة حق للمراة و الولي واحد كان او جماعة مستوين في درجة فلا بد من رضاها و رضاهم مطلقا و لا يكفي الحضور و السكوت ۔

نکاح کی ولایت باپ کو ہے ، اس کے بعد دادا کو ، پھر پڑ دادا کو ، پھر حقیقی بھائی کو ، پھر علاتی بھائی کو ، پھر بھائی کے بیٹے کو ، پھر بھائی کے پوتے کو ، پھر بھائی کے پڑ پوتے کو اگرچہ وہ کتنے ہی چھوٹے درجہ کا ہو ۔ ان کے نہ ہونے کی صورت میں چچا کو ، پھر چچا کے بیٹے کو ، پھر پوتے اور پڑ پوتے کو چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے درجہ کا ہو ۔ اس کے بعد تمام عصبہ کو ہے ۔ منہاج الطالبین مصری کے صفحہ ۹۰ میں ہے : و أحق الأولياء بالتزويج اب ثم جد ثم ابوه ثم الأخ لأبوين ثم لاب ثم ابنه و ان سفل ثم عم ثم ابنه و ان سفل ثم سائر العصبة كالارث ۔ قریب درجہ والا ولی اگر غلام یا بچہ یا دیوانہ یا مختل الرائے وغیرہ ہو تو اس وقت دور والے شخص کی طرف جس میں یہ عیوب نہوں ولایت منتقل ہوجاتی ہے ۔ منہاج الطالبین کے صفحہ ۹۰ کتاب النکاح میں ہے : لا ولاية لرقيق و صبي و مجنون و مختل النظر بهرم او خبل و كذا محجور عليه بسفه على المذهب و متى كان الأقرب ببعض هذه الصفات فالولاية للأبعد ۔ پس صورت مسئولہ میں حسب مذہب شافعیہ حقیقی بھائی چونکہ کمسن ہے اور اس کے بعد والا کوئی ولی بجز چچازاد بھائی کے نہیں ہے اس لئے چچازاد بھائی کو یہ حق حاصل ہے کہ ہندہ کو عجمی النسب سے نکاح کرنے کیلئے منع کرے ، اور بدون رضامندی اس کے نکاح درست نہیں ۔

حنفیہ کے پاس بھی عجمی مرد عربیہ عورت کا کفوء نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۳۱ باب الکفاءۃ میں ہے : (العجمي لا يكون كفوا للعربية و لو) كان العجمي (عالما) او سلطانا (و هو الأصح) ۔ عورت جبکہ غیر کفوء سے نکاح کرنا چاہے اور اس کا ولی اس سے راضی نہ ہو تو یہ نکاح ناجائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۵ باب الولی میں ہے : (و يفتى) في غير الكفوء (بعدم جوازه اصلا) و هو المختار للفتوى (لفساد الزمان) ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله بعدم جوازه اصلا) هذه رواية الحسن عن ابي حنيفة و هذا اذا كان لها ولي لم يرض به قبل العقد فلا يفيد الرضا بعده ۔

ولی نکاح سب سے پہلے بیٹا ہے پھر پوتا پھر پڑ پوتا ہے اگرچہ چھوٹے درجہ کا ہو ، اس کے بعد باپ پھر دادا اگرچہ اوپر کے درجہ کا ہو ، پھر حقیقی بھائی ، پھر علاتی بھائی ، پھر حقیقی بھائی کی اولاد ، پھر علاتی بھائی کی اولاد ، پھر حقیقی چچا ، پھر علاتی چچا ، اس کے بعد حقیقی چچا کی اولاد ، پھر علاتی چچا کی اولاد ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۸۳ باب الاولیاء میں ہے : و اقرب الأولياء الى المرأة الابن ثم ابن الابن و ان سفل ثم الجد ابو الأب و ان علا كذا في المحيط ثم الأخ لأب و ام ثم الأخ لأب ثم ابن الأخ لأب و أم ثم ابن الأخ لأب و ان سفلوا ثم العم لأب و أم ثم العم لأب ثم ابن العم لأب و أم

ثم ابن العم لاب و ان سفلوا الخ ۔ ولی قریب کمسن ہونے کی صورت میں ولی بعید کو حق ولایت حاصل ہوتا ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۳ میں ہے : اما لو کان صغیرا او مجنونا جاز نکاح الابعد ، ذخیرۃ ۔ پس صورت مسئولہ میں مذہب حنفیہ کے موافق بھی ہندہ کا غیر کفوء بھی سے بدون اجازت چچازاد بھائی کے نکاح کرنا ناجائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کی دو زوجہ ہیں ۔ ایک ہندہ دوسری زبیدہ ۔ ہندہ کے بطن سے سکینہ ہے اور زبیدہ کے بطن سے بکر ۔ اب سکینہ کی بیٹی حمیدہ کے ساتھ بکر کا نکاح جائز ہے یا نہیں ؟ مخفی نہ رہے کہ حمیدہ کا باپ بکر کا حقیقی ماموں ہے ۔

الجواب

سکینہ بکر کی علاتی بہن ہے اور علاتی بہن کی بیٹی بھی شرعا حرام ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۳ باب المحرمات میں ہے : و کذا بنات الاخ و الاخت و ان سفلن ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۸۳ باب المحرمات میں ہے : حرام اصلہ و فرعہ و بنت اخیہ و اختہ و بنتها ۔ پس صورت مسئولہ میں بکر کا اپنی علاتی بہن سکینہ کی لڑکی حمیدہ سے نکاح کرنا حرام ہے ۔

ماموں کی لڑکی شرعا جائز ہے ۔ مگر چونکہ اس صورت میں ماں یعنی سکینہ بکر کی علاتی بہن ہے اس لئے اس کی لڑکی حمیدہ حرام ہوئی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو باکرہ جانکر عقد کیا ۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ہندہ کو سات ماہ کا حمل ہے ۔ عام اس سے کہ وہ جائز ہے ناجائز آیا یہ نکاح صحیح ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

جس عورت کو زنا سے حمل ہے ایسی عورت کا بحالت حمل نکاح کرنا صحیح و جائز ہے ۔ مگر وضع حمل تک اس سے وطی یعنی صحبت کرنا حرام ہے ۔ اور جس عورت کا حمل زنا سے نہیں بلکہ جائز طریقہ سے ہے بحالت حمل اس سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے ۔ ملا مسکین مطبوعہ بر حاشیہ فتح المعین جلد ۲ صفحہ ۲۲ کتاب النکاح میں ہے : (و) حل تزوج (حبلیٰ من زنا) و لکن لا یطؤھا حتی تضع حملها عندهما (لا من غیرہ) ای لا یحل تزوج حبلیٰ من غیر زنا ۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ میں ہے : (و) صح نکاح (حبلی من زنا لا) حبلی (من غیرہ) ای الزنا لثبوت نسبه و لو من حربی و سیدها المقر بہ (و ان حرم وطؤھا) و دواعیہ (حتی تضع) ۔

البتہ وہ شخص جس نے اس عورت کے ساتھ زنا کیا ہے اور اس کے زنا سے وہ حاملہ ہوئی ہے اگر اس سے نکاح کرلے تو اس کو بحالت حمل صحبت کرلے کی اجازت ہے ۔ اسی جگہ فتح المعین میں ہے : و لا خلاف فی جوازہ للزانی ۔ اور در مختار میں ہے ، و لو نکحھا الزانی حل لہ وطؤھا اتفاقا و الولد لہ و لزمہ النفقۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حقیقی بہن ہندہ کا اپنے پھوپھی زاد بھائی بکر کے ساتھ اس کی زوجہ رضیہ کے فوت ہونے کے بعد عقد کردیا ۔ ہندہ بھی دو لڑکے چھوڑکر فوت ہوئی ۔ زید بکر کی لڑکی کو جو رضیہ متوفیہ کے بطن سے ہے اپنے عقد میں لانا چاہتا ہے ، یہ عقد صحیح ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

زید کا اپنے پھوپی زاد بھائی بکر کی لڑکی کے ساتھ جو رضیہ کے بطن سے ہے نکاح کرنا شرعا درست ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ " جمع بین الاختین " نکاح از روئے مذہب حنفیہ باطل ہے یا فاسد ؟ اور بحالت جمع اولاد کا نسب ثابت ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

نکاح میں احکام کے لحاظ سے فاسد و باطل دونوں ایک ہی ہیں ۔ یعنی عدت و ثبوت نسب جس طرح " نکاح فاسد " میں ہے بر بنائے مذہب صواب " نکاح باطل " میں بھی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۷۲۳ باب العدۃ میں ہے : (و عدۃ المنکوحۃ نکاحا فاسدا) فلا عدۃ فی باطل و کذا موقوف قبل الاجازۃ ، اختیار ۔ لکن الصواب ثبوت العدۃ و النسب ۔ بحر ۔ رد مختار میں ہے : (قولہ فلا عدۃ فی باطل) فیہ انہ لا فرق بین الفاسد و الباطل فی النکاح بخلاف البیع کما فی نکاح الفتح و المنظومۃ المحبیۃ ۔ اور صفحہ ۲۷۰ میں ہے : و فسر القھستانی ھھنا الفاسد بباطل و مثلہ بنکاح المحارم ۔

پس صورت مسئولہ میں اگر ناکح نے ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے نکاح کیا تو دوسری بہن کا نکاح شرعا فاسد و باطل ہے ۔ ناکح کو چاہیے کہ اس سے خود علیحدہ ہوجائے ۔ اور قاضی پر بھی لازم ہے کہ معلوم ہوتے ہی دونوں کو علیحدہ کردے ۔ اگر بدون وطی کے علیحدگی ہوئی ہے تو کوئی شرعی مہر و عدت وغیرہ ثابت نہیں ہوتے ، اور اگر وطی کے بعد علیحدگی ہوئی ہے تو زوج کو مہر مقرر اور مہر مثل ان دونوں میں سے جو کم ہو دینا ہوگا ۔ اور عورت کو بعد تفریق عدت شرعی گذارنا لازم ہے ۔ اور اس وطی

سے اگر حمل ہو گیا تو نکاح کا نسب بھی ثابت ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ نکاح پر لازم ہے کہ بعد تفریق عدت ختم ہونے تک اپنی پہلی زوجہ سے جو دوسری زوجہ کی حقیقی بہن ہے بالکل علیحدہ رہے۔ البتہ ختم عدت کے بعد اس سے مل سکتا ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۰ جمع بین المحرمات میں ہے: و ان تزوجهما في عقدتين فنكاح الأخيرة فاسد و يجب عليه ان يفارقها و لو علم القاضي بذلك يفرق بينهما فان فارقها قبل الدخول لا يثبت شيء من الأحكام و ان فارقها بعد الدخول فلها المهر و يجب الأقل من المسمى و من المهر المثل و عليها العدة و يثبت النسب و يعتزل عن امراته حتى تنقضي عدة اختها كذا في محيط السرخسي۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ باکرہ و بالغہ اگر بلا رضامندی باپ کے، مرد سے جو ہم کفوہ ہے نکاح کرلے تو یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ باکرہ عاقلہ و بالغہ کا نکاح امام شافعی و امام احمد بن حنبل و امام مالک رحمهم الله کے پاس بغیر اجازت ولی کے جائز نہیں۔ کیا یہ جواب صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمهما اللہ کے پاس عورت چاہے باکرہ ہو یا ثیبہ، صغیرہ ہو یا کبیرہ، بغیر اجازتِ ولی نرینہ اگر نکاح کرے تو صحیح نہیں ہوگا۔ رحمت الامۃ فی اختلاف الائمۃ مصری صفحہ ۱۰۳ میں ہے: و لا يصح النكاح عند الشافعي و احمد الا بولي فان عقدت المرأة النكاح لم يصح۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے پاس عورت اگر حسب و نسب اور خوبصورتی میں ایسی ہے کہ لوگ اس کی رغبت کرتے ہیں تو ایسی عورت کا نکاح بغیر اجازت ولی کے صحیح نہیں، اور اگر ایسی نہیں ہے تو عورت کو اختیار ہے کہ اپنی رضامندی سے کسی بھی اجنبی شخص کو نکاح کیلئے اپنا ولی بنالے۔ رحمت الامۃ میں اسی جگہ ہے: و قال مالك ان كانت ذات شرف و جمال يرغب في مثلها لم يصح نكاحها الا بولي و ان كانت بخلاف ذلك جاز ان يتولى نكاحها اجنبي برضاها۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے والد عمرو نے زید کے غائبانہ میں اس کی زوجہ ہندہ سے جبکہ وہ دو مہینے کی حاملہ تھی زنا بالجبر کیا۔ اس واقعہ کے بعد تا حال زید اپنی زوجہ سے علیحدہ ہے۔ کیا از روئے شرع شریف ہندہ زید پر حرام ہوگئی ہے اور زید کے نکاح سے خارج ہوگئی ہے یا نہیں؟ اور حمل زید ہی کا سمجھا جائیگا یا نہیں؟

الجواب

شرع میں حرام وطی سے بھی محرمیت ثابت ہوتی ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۰ باب المحرمات میں ہے : المحرمیة تثبت بالوطئ الحرام و بما تثبت به حرمة المصاهرة کذا فی فتاوٰی قاضیخان ۔ بناء بریں باپ ، بیٹے کی زوجہ کے ساتھ اگر جبر سے بھی زنا کرلے اور بیٹا اس کی تصدیق کرے تو ایسی حالت میں بیٹے کی زوجہ بیٹے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے ۔ بیٹے کو چاہئے کہ زوجہ کو مہر دیکر علیحدہ کردے ، اور باپ پر شرعا حد زنا لازم ہے ۔ عالمگیریہ کے جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ باب المحرمات میں ہے : رجل قبّل امرأة ابیه بشهوة او قبّل الأب امرأة ابنه بشهوة و هی مکرهة و انکر الزوج ان یکون بشهوة فالقول قول الزوج و ان صدقه الزوج وقعت الفرقة و یجب المهر علی الزوج و یرجع بذلک علی الذی فعله ان تعمد الفاعل الفساد و ان لم یعتمد لا یرجع و فی الوطی لا یرجع و ان تعمد بالوطئ الفساد لأنه وجب الحد و المال مع الحد لا یجتمع ۔ اسی صفحہ میں ہے ، رجل تزوج امرأة علی انها عذراء فلما اراد وقاعها وجدها قد افتضت فقال لها من افتضک فقالت ابوک ان صدقها الزوج بانت منه و لا مهر لها و ان کذبها فهی امرأته کذا فی الظهیریة ۔ پس صورت مسئولہ میں زید پر اس کی زوجہ حرام ہے ، چاہئے کہ مہر اداء کرکے علیحدہ ہوجائے ۔ اور آئندہ بھی اس کے ساتھ زید کا نکاح حرام ہے ۔

زید کی عورت جو بوقت زنا زید سے دو مہینہ کی حاملہ تھی یہ بچہ زید ہی کا ہے ، کیونکہ شرع میں زنا کی وجہ سے زانی کا نسب ثابت نہیں ہوتا ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ کتاب النکاح میں ہے : ان الشرع قطع نسبه منه ۔

علیحدگی کے بعد کمسن بچوں کی پرورش ماں کے ذمہ رہنا چاہئے ، کیونکہ شرع میں پرورش کا حق ماں کو ہے ۔ اور خاوند کو چاہئے کہ بچوں کا خرچ اور نگرانی و پرورش کی اجرت فرقت کے بعد بھی بچوں کی ماں کو دیتا رہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۶۵۰ باب الحضانت میں ہے : (هی تثبت للأم) و لو بعد الفرقة ۔ اور صفحہ ۶۵۳ میں ہے : (و تستحق) الحاضنة (اجرة الحضانة) اذا لم تکن منکوحة و لا معتدة لأبیه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک ثیبہ عورت فعل زنا کی مرتکب ہو کر حاملہ ہو گئی ، اور دو تین ماہ کے عرصہ میں اس کا حمل یقینی طور پر ثابت ہوگیا ۔ عورت کے باپ نے بدنامی کے اندیشے سے عورت کا نکاح اسی شخص سے کرادیا جس کے ساتھ وہ بدنام تھی ۔ زمانہ حمل ہی میں نکاح ہوا اور نکاح سے پندرہ دن بعد زچگی ہوئی ۔ کیا از روئے شرع شریف ایسی عورت کا نکاح اس شخص سے ایام حمل میں جائز ہے یا نہیں ۔ عورت چونکہ بدچلن تھی اس لئے یہ حمل شخص ناکح کا ہونے یا نہ ہونے میں بھی احتمال ہے ۔ ایسی حالت میں بچہ کس کا سمجھا جائیگا ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

جس عورت کو زنا سے حمل ہوا ہے ایسی عورت کا نکاح بحالت حمل شرعاً صحیح و جائز ہے۔ مگر وضع حمل تک اس سے وطی یعنی صحبت کرنا حرام ہے۔ اور جس عورت کا حمل زنا سے نہیں بلکہ جائز طریقہ سے ہے ایسی عورت کا بحالت حمل نکاح حلال نہیں ہے۔ فتح المعین جلد ۲ صفحہ ۴۲ کتاب النکاح میں ہے:
(و) حل تزوج [حبلیٰ من زنا] و لکن لا یطؤها حتی تضع حملها عندهما [لا من غیره) ای لا یحل تزوج حبلیٰ من غیر زنا۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ میں ہے: (و) صح نکاح (حبلی من زنا لا) حبلی (من غیره) ای الزنا لثبوت نسبه و لو من حربی و سیدها المقر به (و ان حرم وطؤها) و دواعیه (حتی تضع)۔

البتہ وہ شخص جس نے اس کے ساتھ زنا کیا ہے اور اسی کے زنا سے وہ حاملہ ہوئی ہے اگر اس سے نکاح کرلے تو اس شخص کو بحالت حمل اس عورت سے صحبت کرنے کی بھی اجازت ہے۔ بعد نکاح جب بچہ پیدا ہوگا، اگر وہ بچہ نکاح سے چھ مہینے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا نسب شخص ناکح سے ثابت ہوگا اور وہ اس کی میراث کا بھی مستحق ہوگا۔ اور اگر چھ مہینے کے اندر بچہ پیدا ہوا ہو تو اس کا نسب شخص ناکح سے ثابت نہوگا، مگر اس وقت جبکہ وہ شخص ناکح اس بات کا اقرار کرے کہ یہ بچہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ یہ زنا کا نہیں ہے۔ اگر اس کے زنا سے پیدا ہونے کا اقرار کرکے پھر اپنا ہونا بیان کرے تو اس کا نسب اس سے شرعاً ثابت نہیں ہے اور نہ وہ اس کی میراث کا مستحق ہے، بلکہ از روئے دینداری ناکح کو چاہئے کہ چھ مہینے سے کم مدت میں پیدا ہونے والے بچہ کو اپنا ہونا بیان نہ کرے کیونکہ شریعت میں اولادِ زنا کا نسب زانی سے ثابت نہیں رکھا گیا، پس ایسے اقرار سے احتیاط کرنا چاہئے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ کتاب النکاح میں ہے: لو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقا و الولد له و لزمه النفقة۔
رد مختار میں ہے: (قوله و الولد له) ای ان جاءت بعد النكاح لستة اشهر۔ مختارات النوازل فلو لأقل من ستة اشهر من وقت النكاح لا يثبت النسب و لا يرث منه الا ان يقول هذا الولد منى و لا يقول من الزنا۔ خانية و الظاهر ان هذا من حيث القضاء اما من حيث الديانة فلا يجوز له ان يدعيه لان الشرع قطع نسبه منه فلا يحل له استلحاقه به و لذا لو صرح بانه من الزنا لا يثبت قضاء ايضا و انما يثبت لو لم يصرح لاحتمال كونه بعقد سابق او بشبهة حملا لحال المسلم على الصلاح و كذا ثبوته مطلقا اذا جاءت به لستة اشهر من النكاح لاحتمال علوقه بعد العقد و ان ما قبل العقد كان انتفاخا لا حملا و يحتاط فى اثبات النسب ما امكن۔ پس صورت مسئولہ میں حسب تفصیل سابق عمل کیا جائے۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا ایک عورت سے جو ذات کی دھوبن ہے، سات آٹھ سال سے ناجائز تعلق ہے۔ زید کا خیال ہے کہ اس کو مسلمان کرکے نکاح کرلے، مگر بعض اشخاص کا

بیان ہے کہ دھوبن کے نکاح سے نحوست دامنگیر ہوتی ہے اور انسان کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ یہ قول کہاں تک صحیح ہے ؟

الجواب

اس قسم کے اقوال کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ ہندستان میں ہنود کے اختلاط سے مسلمانوں میں ایسے توہمات پیدا ہو گئے ہیں۔ زید کو چاہیے کہ نکاح کرلے اور اپنے کو زنا سے بچالے۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے لڑکے عمرو کی زوجہ سے جبراً زنا کیا، عمرو کی زوجہ ہرگز اس فعل سے راضی نہ تھی۔ بلکہ رات کے وقت زید نے عمرو کی زوجہ کو تنہا پایا اور ہتھیار نکالکر مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہوئے نہایت جبر و تعدی سے زنا کیا۔ کیا اس جبری زنا سے بھی عمرو کی زوجہ عمرو پر حرام ہوجائیگی۔ حالانکہ اس میں زوجہ کا کوئی قصور نہیں ؟

الجواب

جبری زنا سے بھی شرعاً حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۸۹ فصل المحرمات میں ہے : (و لا فرق) فیما ذکر (بین اللمس و النظر بشھوۃ و بین عمد و نسیان) و خطأً و إکراہ فلو ایقظ زوجتہ او ایقظتہ لجماعھا فمست یدہ بنتھا المشتھاۃ او یدھا ابنہ حرمت الأم ابدا فتح ۔ رد محتار میں ہے : (قولہ و لا فرق فی ما ذکر) ای من التحریم (و قولہ بین اللمس و النظر) صوابہ فی اللمس و النظر و عبارۃ الفتح و لا فرق فی ثبوت الحرمۃ باللمس بین کونہ عامدا او ناسیا او مکرھا او مخطئا الخ افادہ ح ۔ قال الرحمتی و انا علم ذلک فی المس و النظر علم فی الجماع بالاولی ۔

پس صورت مسئولہ میں زید نے اپنے بیٹے عمرو کی زوجہ سے جو جبراً زنا کیا ہے اس جبری زنا سے بھی عمرو کی زوجہ عمرو پر حرام ہوگئی۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر ایک غیر تبرائی شیعی، سنیہ عورت سے نکاح کرے تو شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

شیعی غیر تبرائی اگرچہ سبِ شیخین نہیں کرتے مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی خلیفۂ اول

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تفضیلت کے ضرور قائل ہیں۔ اور علمائے اہل سنت کے پاس ایسی تفضیلت کا قائل جدع یعنی بدعتی ہے۔ عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ میں ہے: و ان کان یفضل علیاً کرم اللہ تعالیٰ وجھہ علیٰ ابی بکر رضی اللہ عنہ لا یکون کافراً الا انہ مبتدع۔ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ باب المرتد میں بزازیہ سے منقول ہے: و ان کان یفضل علیاً علیھما فھو مبتدع۔ اور علمائے اہل سنت کے پاس بدعتی مثل فاسق کے ہے، جس سے اعراض کرنے اور بغض و عداوت رکھنے کا حکم ہے۔ بلکہ اس کی توہین اور اس پر لعن طعن کرنا جائز ہے۔ شرح مقاصد کے صفحہ ۱۹۸ میں ہے: و المبتدع ھو من خالف فی العقیدۃ طریقۃ اھل الحق و ھو کالفاسق۔ شرح میں ہے: و حکم المبتدع البغض و العداوۃ و الإعراض عنہ و الإھانۃ و الطعن و اللعن و کراھیۃ الصلاۃ خلفہ۔ چونکہ حسب روایت در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۸ (فلیس فاسق کفوء الصالحۃ) فاسق مرد صالحہ عورت کا کفوء نہیں یعنی مثل نہیں ہے۔ اور حسب روایت سابقہ بدعتی کے ساتھ ارتباط و اختلاط ممنوع بتلایا گیا ہے۔ اس لئے صورت مسئولہ میں سنیہ عورت کا نکاح شیعی غیر تبرائی سے ٹھیک نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے بغیر نکاح کے وطی کیا جس سے ہندہ حاملہ ہوگئی۔ زید نے اس حمل کی حالت میں ہندہ سے نکاح کرلیا۔ اب جو بچہ ہندہ کو پیدا ہوگا وہ ولد الحلال سمجھا جائیگا یا ولد الحرام؟ بینوا توجروا۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر نکاح سے کامل چھ مہینہ کے بعد بچہ تولد ہو تو اس بچہ کا نسب مرد ناکح سے ثابت ہوگا اور وہ بچہ ولد الحلال سمجھا جائیگا۔ کیونکہ شرع شریف میں حمل کی اقل مدت چھ مہینہ ہے۔ ممکن ہے کہ قرار حمل نکاح کے بعد ہو اور قبل نکاح جو حمل زنا کا دکھائی دیتا تھا وہ محض ہوائی ہو۔ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ کتاب النکاح میں ہے: و کذا ثبوتہ مطلقا اذا جاءت بہ لستۃ اشھر من النکاح لاحتمال علوقہ بعد النکاح و ان ما قبل العقد کان انتفاخا لا حملا و یحتاط فی النسب ما امکن۔ اور اگر نکاح کے بعد چھ مہینہ سے کم میں بچہ پیدا ہو اور مرد ناکح اس کے زنا سے پیدا ہونے کا اقرار کرے تو اس کا نسب ناکح سے ثابت نہوگا اور یقینا وہ ولد الحرام کہلائےگا۔ کیونکہ شریعت میں زانی کا نسب ولد الزنا سے منقطع کیا گیا ہے۔ اور اگر مرد ناکح اس کو اپنا بچہ ہونا بیان کرے اور اس کا نسب اپنے ساتھ ثابت رکھے تو پھر وہ اس کی اولاد ہوگی اور ولد الحرام نہیں سمجھی جائیگی۔ اس سے اس کا نسب ثابت ہوگا اور وہ اس کی میراث کا بھی مستحق ہوگا۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے: فلو لاقل من ستۃ اشھر من وقت النکاح لا یثبت النسب و لا یرث منہ الا ان یقول ھذا الولد منی و لا یقول من الزنا۔ خانیۃ۔ و الظاھر ان ھذا من حیث القضاء و اما من حیث الدیانۃ فلا یجوز لہ ان یدعیہ لأن الشرع قطع

نسبہ منہ فلا یحل لہ استلحاقہ بہ و لذا لو صرح بأنہ من الزنا لا یثبت قضاء ایضا و انما یثبت لو لم یصرح لاحتمال کونہ بعقد سابق او بشبھۃ حملا لحال المسلم علی الصلاح ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کے بطن سے زید کو دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔ اس کے بعد زید کی زندگی ہی میں ہندہ زید کے حقیقی بھانجے عمرو کے ساتھ فرار ہوگئی اور اس نے عمرو کے صلب سے ایک لڑکا جنا ۔ اور اس لڑکے کے بعد ایک لڑکی مسماۃ اصغری بھی ہندہ کو عمرو کے صلب سے پیدا ہوئی ۔ زید کو دوسری زوجہ سعیدہ کے بطن سے ایک لڑکا مسمی بکر موجود ہے جو عمرو کا ماموں زاد بھائی ہے ۔ پس بکر کا نکاح اصغری سے جو بکر کی علاتی ماں کی لڑکی بکر کے پھوپی زاد بھائی عمرو کے صلب سے ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

علاتی ماں کی لڑکی جو دوسرے خاوند سے ہو علاتی بیٹے کیلئے جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ باب المحرمات میں ہے ۔ و اما بنت زوجۃ ابیہ او ابنہ فحلال ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں ہندہ کی لڑکی اصغری اگر یقیناً عمرو کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے تو بکر سے اس کا نکاح جائز ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا نکاح زید سے رواج ملک کے موافق مہر مؤجل پر کیا گیا ۔ بدون طلاق و موت کے ہندہ مدعیہ ہے کہ زید اس کا مہر اداء کرے ۔ کیا زید پر فی الحال ہندہ کا مہر اداء کرنا شرعاً واجب ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اہل ہند چونکہ عموماً مہر مؤجل پر نکاح کرتے ہیں ۔ اور ادائی مہر کی کوئی مدت سوائے طلاق و موت کے نہیں ہوتی ۔ اس لئے بہ بنائے عرف بلد زوجہ بعد تفریق یا موت مہر دلائے جانے کی مستحق ہے ۔ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۶۸ باب المہر میں ہے ۔ و فی الصیرفیۃ الفتویٰ علیٰ اعتبار عرف بلدھما من غیر اعتبار الثلث او النصف و فی الخانیۃ یعتبر التعارف لأن الثابت عرفاً کالثابت شرطاً ۔ اسی صفحہ میں در مختار کے ہے ۔ و الا اذا جھل الأجل جھالۃ فیجب حالا ۔ غایۃ ۔ الا التأجیل الطلاق او موت فیصح للعرف ۔ بزازیۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا انتقال ہوا اور اس کا زر مہر زید کے ذمہ واجب الاداء ہے ۔ ورثاء میں زوج ، ابن ، ام ، ہیں ۔ کیا زر مہر متروکہ ہے اور ورثاء پر تقسیم ہوگا ؟ اگر تقسیم ہوگا تو ہر ایک کو کس قدر حصہ ملیگا ؟ اور ورثاء کو زوج سے زر مہر طلب کرنے کا کس مدت تک حق حاصل ہے ؟

الجواب

زر مہر متروکہ ہے جس کی تقسیم ورثاء پر حسب فرائض کی جاتی ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ میں ہے : یتأکد المهر بموت احد الزوجین فیکون ترکة یقسم بین ورثتها بالفریضة الشرعیة کجمیع ما یتحقق انه مملوک لها ۔ پس زر مہر کے ۱۲ حصے کرکے زوج کو ۳ اور اُم کو ۲ اور ابن کو ۷ حصے دیئے جائیں ۔

متروکہ کے دعویٰ کے لئے شریعت میں کوئی میعاد مقرر نہیں ہے ، ہر وقت ورثاء کو دعویٰ کا حق حاصل ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ مصری کی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ کتاب الوقف میں ہے ؛ لا تسمع الدعوی بعد مضی خمس عشرة سنة الا فی الإرث و الوقف و وجود عذر شرعی ۔ اسی صفحہ میں ہے ؛ و لم یقید دعویٰ الإرث و الوقف بمدة ۔ پس زوج کے سوا دیگر ورثاء کو زر مہر کے متعلق اپنے حصہ کے موافق زوج پر دعویٰ کرنے کا ہر وقت حق حاصل ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اگر خاوند کے انتقال کے بعد نکاح ثانی کرلے تو کیا مرحوم خاوند کی چڑھاتی ہوئی اشیاء اور اپنے ماں باپ کی دی ہوئی اشیائے جہیز سے محروم ہوجاتی ہے ؟ اور کیا مرحوم خاوند کے بھائیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ بالزام عقد ثانی زوجہ کو ان اشیاء سے محروم کردیں اور اشیاء روک لیں ؟

الجواب

ہر جہیز بلحاظ عرف حیدرآباد زوجہ کی ملک ہے ، اس میں کسی کا حق نہیں ہے ، اور اشیاء چڑھاوا چونکہ حقیقتاً بطور ہبہ دی گئی ہیں اس لئے یہ بھی زوجہ کی ملک ہیں ۔ البتہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ خاوند نے ان اشیاء کو عاریتاً دیا تھا تو اس وقت یہ خاوند کا متروکہ ہے ۔ خاوند کے جملہ متروکہ سے مصارف تجہیز و تکفین و مہر و دیگر دین و وصیت ادا کئے جانے کے بعد زوجہ اگر صاحب اولاد ہے تو اولاد کے ساتھ آٹھواں حصہ ، اور لا ولد ہے تو چوتھا حصہ پانے کی مستحق ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۰۵ میں ہے ؛ جهز

ابنته بجهاز و سلمها ذلک لیس له الاسترداد منها و لا لورثته بعده ان سلمها ذلک فی صحة بل تختص به و به یفتی ۔ رد محتار میں ہے: (قوله لیس له الاسترداد) هذا اذا کان العرف مستمرا ان الاب یدفع مثله جهازاً لا عاریة ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۷ میں ہے: و اذا بعث الزوج الیٰ اهل زوجته اشیاء عند زفافها منها دیباج فلما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذا بعث الیها علی جهة التملیک کذا فی الفصول العمادیة ۔ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۰ کتاب البیوع میں ہے: و هذا یوجد کثیرا بین الزوجین یبعث الیها متاعا و تبعث له ایضا و هو فی الحقیقة هبة حتی لو ادعی الزوج العاریة رجع الخ ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید باشندہ ملک غیر علاقۂ گورنمنٹ انگریزی ہے ۔ اس نے حمیدہ باشندۂ بلدہ حیدرآباد کے ساتھ بلدہ ہی میں عقد کیا ۔ تین چار بار حمیدہ اپنے شوہر کے مستقر کو جو اس کا وطن نہیں ہے اور بلدہ سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے برضامندی گئی ۔ اس آمد و رفت سے زوجین میں اس قدر رنجش پیدا ہوگئی ہے کہ اب حمیدہ اپنے وطن یعنی حیدرآباد سے بخیالِ خوفِ جان باہر جانا نہیں چاہتی ۔ زید کے صلب سے حمیدہ کو تین اولاد ہیں جو حمیدہ کی حضانت میں ہیں ۔ پس بموجب شرع شریف اور مذہب حنفی کیا اس انکار سے حمیدہ ناشزہ ہوگئی اور نفقہ و سکنیٰ مع دیگر لوازمات کے زید سے حاصل کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

جبکہ زوجہ کو باہر جانے میں جان کا خوف ہے تو ایسی حالت میں زوجہ انکار سے ناشزہ نہیں ہے ، نفقہ و سکنیٰ کی مستحق ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ میں ہے: سئل فی رجل تزوج امرأة من المصر و یرید نقلها من المصر الی قریة من قری الریف و الزوجة ممتنعة من السفر معه فهل لا یجبر المرا علی السفر معه شرعا ، و لو کانت المسافة اقل من مسافة القصر حسب کان الزوج غیر مأمون علیها ؟ و اذا قلتم بذلک یجبر الزوج المذکور علی الإنفاق و ما یلزمه للزوجة من کسوة و مسکن و خادم و غیر ذلک مما یلزم لها شرعا ام کیف الحال ؟ أفیدوا!

الجواب ، اجاب: للزوج نقل زوجته دون مسافة السفر اذا اوفاها الصداق و کان مأمونا علیها فاذا تحقق عدم الأمن علیها لا یکون له نقلها من الإضرار عنها و اذا امتنعت بعد ذلک لا تعد ناشزة فلها النفقة علیه و السکنی فی مسکن شرعی ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ماں باپ پر اولاد کے کیا فرائض ہیں ؟ اور کس سن تک ؟

الجواب

بچے کے حقوق باپ پر یہ ہیں کہ اس کا نام اچھا رکھے ۔ اگر ہوسکے تو ساتویں دن عقیقہ کرے ۔ اور جب چھ سال کی عمر کو پہنچے تو اس کا بچھونا علیحدہ کردے ۔ اور جہاں تک ہو سکے اس کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرے ۔ اور علم دین سکھائے ۔ اور تیرنے اور تیر مارنے کی بھی تعلیم دے (ضروری دماغ کے گر سکھلائے) ۔ اس کے مال کی حفاظت کرے ۔ اور مالدار نہ ہونے کی صورت میں جوان ہونے تک مال حلال سے اس کی حوائج ضروریہ کی تکمیل کرے ۔ اور جب وہ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو اس کی شادی کرادے اور ہاتھ پکڑ کر یہ کہے کہ : میں نے تیری تعلیم و تربیت کردی ہے اور نکاح بھی کرادیا ہے اب میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ مجھے دنیا میں تیرے فتنہ سے بچائے ۔ اور آخرت میں تیرے عذاب سے نجات دے ۔

اور والدہ پر یہ حق ہے کہ اس کی حالت درست رکھے ۔ اور باپ کے کم استطاعت ہونے یا انا نہ ملنے یا بچہ ماں کے سوا انا کا دودھ نہ پیتا ہو تو اس حالت میں اس کو دودھ پلائے ۔ چنانچہ احیاء العلوم کے باب حق الوالدین میں ہے : قال صلی اللہ علیہ و سلم " من حق الولد علی الوالد ان یحسن ادبہ و یحسن اسمہ " اور احکام الشریعۃ فی الاحوال الشخصیۃ کے باب ثانی فیما یجب للولد علی الوالدین میں ہے : یطلب من الوالد ان یعتنی بتأدیب ولدہ و تربیتہ و تعلیمہ و ما ھو میسر لہ من علم و حرفۃ و حفظ مالہ و القیام بنفقتہ ان لم یکن لہ مال حتی یصل الذکر الی حد الاکتساب و تتزوج الأنثیٰ ۔ و یطلب من الوالدۃ الاعتناء بشأن ولدھا و ارضاعہ فی الأحوال التی یتعین علیھا ذلک ۔ احیاء العلوم کے باب حق الوالدین میں ہے : قال النبی صلی اللہ علیہ و سلم " الغلام یعق عنہ یوم السابع و یسمیٰ و یماط عنہ الأذیٰ و اذا بلغ ست سنین عزل فراشہ و اذا بلغ ثلاث عشرۃ سنۃ ضرب علی الصلاۃ و اذا بلغ ست عشرۃ سنۃ زوّجہ ابوہ ثم اخذ بعدہ بیدہ و قال : ادبتک و علمتک و انکحتک اعوذ باللہ من فتنتک فی الدنیا و عذابک فی الآخرۃ " ۔ اور اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین کی جلد ۶ صفحہ ۳۱۸ میں ہے : و فی الباب عن ابی ھریرۃ و ابی رافع ، اما حدیث ابی رافع فلفظہ " حق الولد علی والدہ ان یعلمہ الکتابۃ و السباحۃ و الرمایۃ و ان لا یرزقہ الا طیبًا ۔ و فی روایۃ : و ان لا یورثہ برزقہ الا طیبا " رواہ الحکیم و ابو الشیخ فی الثواب و رواہ ابن السنی بلفظ : ان یعلمہ کتاب اللہ ۔

الاستفتاء

استفتاء میکند و فتوی می طلبد اضعف العباد از علماء دین حنین و فضلاء شرع مبین دریں باب کہ مسمی زید ، مسماۃ ہندہ زوجۂ خود را بحالت زنا مرتکب مشاہدہ نمودہ طلاق بائن داد ۔ اکنوں مسماۃ ہندہ مستدعی مہر است و می خواہد کہ اگر بطور خانگی ادائے مہر نہ شود از عدالت مہر خود حاصل کند ۔ پس دریں امر ہر چہ احکام شرع شریف باشند ازاں ایماء شود تا بموجب آں بطور خانگی تصفیہ کردہ شود ؟

الجواب

در شریعت مہر زوجہ از ارتداد یا از بوسہ دادنِ وے فرزندِ زوج را باطل می شود ۔ در صورت مسئول اگر زوج با وے ہم صحبت شدہ است پس بر وے مہر کامل واجب است زیراکہ از زنا یا نافرمانی زوجہ مہر باطل نمی شود ۔ صاحب رد المحتار در باب المہر می آرد ، افاد ان المهر وجب بنفس العقد لكن مع احتمال سقوطه بردتها او تقبيلها ابنه و تنصفه بطلاقها قبل الدخول و انما يتأكد لزوم تمامه بالوطئ و نحوه ۔ قال في البدائع و اذا تأكد المهر بما ذكر لا يسقط بعد ذلك و ان كانت الفرقة من قبلها لأن البدل بعد تأكده لا يحتمل السقوط الا بالإبراء كالثمن اذا تأكد بقبض المبيع ۰

الاستفتاء

ما قول علماء السادة الحنفية اطال الله بقاءهم و حفظ بهم الدين عن اهل الجهل و الزائغين ، في رجل تزوج بنتا دون البلوغ ثم بعد العقد اراد السفر فمنعه ولي البنت عن السفر و كتب على نفسه اقرارا في مجلس العقد انه في باطن سنتين يحضر و التزم انه يسلم مائتين و ستين روبية لزفاف البنت و قال ان لم احضر في المدة المذكورة و لم اسلم ما التزمت به فاعفوني عن المهر و النفقة و جميع حقوق الزوجية فزوجتي فلانة في عقدي طالقة ثلاثا و الحال ان المدة التي التزم ان يحضر فيها قد انقضت و لم يحضر ۔ و الى الآن البنت لم تبلغ فهل يصح ابراؤها مع كونها زاكية الفعل ام لا ، و هل يصح ابراء الولي عن مولاة اذا اجازته و هي مميزة ام لا ، افتونا مأجورين ۔

الجواب

قال في عالمكيرية في تعليق الطلاق بكلمة "ان" و "اذا" و غيرها و اذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط اتفاقا ۔ قال في رد المحتار في باب المهر مطلب في حط المهر و الابراء منه : لأن حط ابيها غير صحيح لو صغيرة و لو كبيرة توقف على اجازتها و لا بد من رضاها و قال في التفسير الكبير تحت آية " فَإِذَا طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ " الآية : فليس للولي ان يهب مهر مولاة صغيرة كانت او كبيرة ۔ قال في الدر المختار في كتاب الماذون مبحث تصرف الصبي : (و تصرف الصبي و المعتوه) الذي لا يعقل البيع و الشراء (ان كان نافعا) محضا (كالاسلام و الاتهاب صح بلا اذن و ان ضاراً كالطلاق و العتاق) و الصدقة و القرض (لا و ان اذن به وليهما و ما تردد) من العقود (بين نفع و ضرر كالبيع و الشراء توقف على الإذن) حتى لو بلغ فأجازه نفذ ۔ و قال في رد المحتار في شرح قوله (الذي يعقل البيع و الشراء) صفة لكل من الصبي و المعتوه و في شرح قوله (محضا) اي من كل الوجوه و في شرح قوله (و ان ضاراً) اي من كل وجه اي

ضررا دنیویا و ان کان فیه نفع اخروی کالصدقة و القرض و قال فی شرح قوله (کالطلاق و العتاق) و کذا الهبة و الصدقة و غیرهما ۔ ففی الصورة المسئولة لما علّق الزوج طلاق الزوجة بشروط عدیدة لا بدّ ان یقع الطلاق عقیب تلک الشروط ۔ فالحال و ان تمت المدة و ما وعد لکن شرط ابراء الاولیاء عن المهر و النفقة و جمیع حقوق الزوجیة موقوف علیٰ اجازة البنت بعد بلوغها لأن هذا حق لها و لیس للولی ابراء الزوج عن حقوق مولاتها حال کونها صغیرة ۔ و ان اجازت للولی توقفت اجازتها الی البلوغ فبعدم وقوع هذا الشرط لا یقع الطلاق فی الصورة المسئولة و یقع بعد اجازتها حال کونها بالغة ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ مسماۃ ہندہ کے انتقال کے ۲۹ سال بعد زید کا انتقال ہوا ۔ ہندہ نے اپنے انتقال کے وقت ایک لڑکی مسماۃ سعیدہ و زوج مسمی زید چھوڑا ۔ اور زید نے اپنے انتقال کے وقت ایک زوجہ مسماۃ زینب اور زینب کے بطن سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اور ہندہ کے بطن کی ایک لڑکی مسماۃ سعیدہ چھوڑی ۔ ہر دو زوجگان مسماتان ہندہ و زینب کا زر مہر زید کے ذمہ واجب الاداء ہے ۔ کیا سعیدہ اس وقت اپنی ماں ہندہ کے زر مہر سے حصہ پاسکتی ہے ؟ حالانکہ اس کی ماں کو انتقال کئے ہوئے اس وقت ۲۹ سال گذر چکے ہیں ؟ اگر پاسکتی ہے تو اس کو کیا ملیگا ؟ اور باقی ورثہ کو کیا ؟ اور اگر زینب بھی اپنے مہر کے پانے کی مستحق ہے تو یہ زر مہر کل زینب کو ہی دیا جائے یا شوہر و دیگر ورثہ پر بھی تقسیم ہوگا ؟

الجواب

زر مہر زوجہ کا متروکہ ہے ۔ اور دَین واجب الاَداء ہونے کے سبب سے خاوند پر اس کی ادائی واجب ہے ۔ اگر بدون اداء کئے ہوئے خاوند کا انتقال ہوجائے تو اس کے متروکہ سے اس کی ادائی کی جائے ۔ زوجہ اگر زندہ ہے تو وہ خود لےگی اور در صورت فوت ہونے کے زوجہ کے ورثہ پر حسب فرائض تقسیم کیا جائےگا ۔ اور چاہے کتنی ہی مدت گذرے ورثۂ زوجہ اس زوج سے یا اس کے متروکہ سے حاصل کرسکتے ہیں ۔ متروکہ و میراث ہونے کی وجہ سے شریعت میں اس کے لئے کوئی میعاد نہیں ہے ۔ ہر وقت ورثہ کو دعویٰ کا حق حاصل ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ باب المہر میں ہے : یتأکد المهر بموت احد الزوجین فیکون ترکة یقسم بین ورثتها بالفریضة الشرعیة کجمیع ما یتحقق انه مملوک لها ۔ خزانة الروایة قلمی کے صفحہ ۱۰۳ میں ہے : المهر دَین ۔ فتاویٰ ہندیہ کی جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ کتاب الوقف میں ہے : و لم یقیدوا دعوی الإرث و الوقف بمدة ۔

پس صورت مسئولہ میں ہندہ کے مہر کے چار حصہ کرکے تین حصے سعیدہ کو دیئے جائیں ۔ اور ایک حصہ زید کے متروکہ کے ساتھ اس کے تمام ورثہ پر حسب فرائض تقسیم کیا جائے ۔ اور سعیدہ اس چوتھے حصے

میں بھی باپ کے دیگر ورثہ کے ساتھ شریک رہےگی۔ زینب اپنا پورا مہر پائےگی اس کے حین حیات کسی پر تقسیم نہ ہوگا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے نکاح کیا۔ بعد چند روز کے ہندہ بیمار ہوکر میکے چلی گئی۔ زید نے بغیر اطلاع و بلا رضامندی زوجہ کے دوسرا نکاح کیا۔ ہندہ صحت و تندرستی کے بعد زوج کے مکان میں آگئی۔ اب زوج چاہتا ہے کہ دونوں بیویوں کو ایک ہی مکان میں رکھے اور ہندہ چاہتی ہے کہ شوہر اس کو کسی دوسرے مکان میں رکھے تاکہ دونوں میں جھگڑا نہ ہو۔ مگر زوج اس کے خلاف ہے اور نان نفقہ بھی نہیں دیتا۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب

زید جس مکان میں ہندہ کو اس کی سوتن کے ساتھ رکھنا چاہتا ہے اگر اس مکان میں کئی حجرے ہیں اور زید ہندہ کو ایک مستقل حجرہ اس کے رہنے اور اس کے اسباب کی حفاظت کیلئے مع قفل کنجی دیتا ہے، تو ایسی حالت میں ہندہ کو اپنی سوتن کے ساتھ ایسے مکان میں رہنے سے انکار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر اس مکان میں کوئی ایسا حجرہ نہیں ہے اور زوج ایک ہی کمرہ میں ہندہ کو سوکن کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے تو ایسی حالت میں ہندہ کو یہ حق حاصل ہے کہ زوج سے ایسا حجرہ طلب کرے۔ اور در صورت نہ دینے کے زوجہ کو یہ حق حاصل ہے کہ مسکن شرعی و نان نفقہ کے متعلق حاکم مجاز کے پاس نالش کرے۔ عالمگیری جلد ۱ باب النفقات فی السکنیٰ میں ہے: امرأۃ ابت ان تسکن مع ضرتہا او مع احمائہا کامہ و غیرہا فان کان فی الدار بیوت و فرغ لہا بیتا و و جعل لبیتہا غلقا علیحدۃ لیس لہا ان تطلب من الزوج بیتا آخر فان لم یکن فیہا الا بیت واحد فلہا ذلک و ان قالت لا اسکن مع امتک لیس لہا ذلک و کذلک لو قالت لا اسکن مع ام ولدک۔ کذا فی الظہیریۃ و بہ افتیٰ برہان الائمۃ کذا فی الوجیز للکردری۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کا نکاح شرعی ایک شخص سے دو سو پچاس روپے مہر پر ہوا تھا جس کو پچیس تیس برس کا زمانہ ہوگیا، عورت کا بیان ہے کہ یہ مہرِ مؤجل تھا کیونکہ عقد کے بعد جب تک موافقتِ باہمی رہی مہر طلب نہیں کیا گیا۔ پانچ چھ برس ہوتے ہیں کہ شوہر نے دوسرا عقد کرلیا ہے۔ اور مساوات کا عامل نہ ہوکر پہلی زوجہ کے نان و نفقہ سے بالکل دست بردار ہے، زوجہ شوہر سے مہر کی طالب ہے اور شوہر مہر دینے سے منکر ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ مہرِ مؤجل بلا

موت احد المتعاقدین یا طلاق کے واجب الاداء نہیں ۔ کیا از روئے شرع شریف حقیقتاً زوجہ محروم المہر ہے ؟ اور جبکہ شوہر مطلقاً غیر ملتفت ہو تو کیا عورت مہر بھی نہ پائے ؟

الجواب

شریعت میں مہر مؤجل کی میعاد عرفِ بلد پر رکھی گئی ہے ۔ چونکہ ریاست دکن بلکہ ہندوستان میں عموماً مہرِ مؤجل موت یا طلاق کے بعد ہی اداء کیا جاتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں مہر کے متعلق زوج کا قول درست ہے ۔ رد المحتار کی جلد ۲ صفحہ ۳۶۸ باب المہر میں ہے : و فی الصیرفیۃ الفتویٰ علیٰ اعتبار عرف بلدھما من غیر اعتبار الثلث او النصف و فی الخانیۃ یعتبر التعارف لأن الثابت عرفاً کالثابت شرطاً ۔ اسی صفحہ میں ہے : الا اذا جھل الأجل جھالۃ فیجب حالا غایۃ ۔ الا التأجیل لطلاق او موت فیصح للعرف ۔ بزازیۃ ۔ زوج چونکہ زوجہ کا نفقہ شرعی نہیں اداء کرتا ہے اس لئے زوجہ کو چاہئے کہ قاضی یعنی حاکم مجاز کے پاس فریاد کرکے نفقہ حاصل کرے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مجنون کی زوجہ ہندہ نے بوجہ جنون قاضی کے پاس اپنے نکاح کے فسخ کی درخواست پیش کی ۔ اور قاضی نے نکاح فسخ کردیا ۔ بعد ختم عدت دوسرے گاؤں کے قاضی نے ہندہ کا عقد خالد سے کردیا ۔ کیا فسخ نکاح اول و عقد ثانی صحیح و نافذ ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوج اگر نکاح کے بعد مجنون ہوجائے تو قاضی کو چاہئے کہ بر بنائے درخواست زوجہ ۔ زوج کو ایک سال کی مہلت دے ۔ اگر اس مہلت میں تندرست ہوجائے تو فسخ کی ضرورت نہیں ۔ ورنہ زوجہ کو اختیار حاصل ہے کہ فسخ کروائے یا اسی نکاح میں رہے ۔ اور اگر زید ہمیشہ مجنون ہے تو زوجہ کو اختیار ہے کہ قاضی کے پاس درخواست پیش کرے اور قاضی کو یہ حق ہے کہ بغیر مدت دیئے کے تفریق کروادے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب العنین میں ہے : قال محمد علیہ الرحمۃ ان کان الجنون حادثا یؤجلہ سنۃ کالعنۃ ثم یخیر المرأۃ بعد الحول اذا لم یبرأ و ان کان مطبقا فھو کالجب و بہ نأخذ ۔ کذا فی الحاوی القدسی ۔ اسی باب میں ہے : و لو وجدت المرأۃ زوجھا مجنونا خیّرھا القاضی للحال و لا یؤجل کذا فی فتاوی قاضیخان ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر حسب تفصیل سابق نکاح اول کا فسخ اور نکاح ثانی کا انعقاد ہوا ہے تو فسخ درست ہے اور نکاح ثانی نافذ ہے ۔ ورنہ نہ فسخ درست ہے نہ نکاح جائز ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شیعہ عورت جس کا عقیدہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی لانے میں غلطی ہوئی۔ فی الحقیقت وحی علی رضی اللہ عنہ پر بھیجی گئی تھی۔ اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر زنا کی تہمت لگاتی ہے۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کی منکر ہے۔ کیا ایسی عورت سے سنی مرد کا نکاح شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

اہل سنت و جماعت کے پاس ایسے عقیدے والی عورت کا حکم کافرہ و مرتدہ کا ہے۔ اس لئے سنی مرد کا نکاح اس عورت کے ساتھ درست نہیں۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ باب کلمات الکفر میں ہے: من انکر إمامة الصدیق رضی اللہ عنہ فھو کافر و علیٰ قول بعضھم ھو مبتدع و لیس بکافر و الصحیح انہ کافر و کذلک من انکر خلافة عمر رضی اللہ عنہ فی اصح الأقوال کذا فی الظھیریة۔ و یجب إکفار الزیدیة فی قولھم بانتظار نبی من العجم ینسخ دین نبینا و سیدنا محمد صلیٰ اللہ علیہ و سلم کذا فی الوجیز للکردری۔ و یجب إکفار الروافض فی قولھم برجعة الأموات الی الدنیا و بتناسخ الأرواح و بانتقال روح الإلٰہ الی الأئمة و بقولھم فی خروج امام باطن و بتعطیلھم الامر و النھی الی ان یخرج الامام الباطن و بقولھم ان جبرئیل علیہ السلام غلط فی الوحی الیٰ محمد صلی اللہ علیہ و سلم دون علیّ ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ و ھٰؤلاء القوم خارجون عن ملة الإسلام و احکامھم احکام المرتدین کذا فی الظھیریة۔ اور الدر المختار مصری کی جلد ۳ صفحہ ۳۲۰ میں ہے: نعم لا شک فی تکفیر من قذف السیدة عائشة رضی اللہ عنھا او انکر صحبة الصدیق او اعتقد الألوھیة فی علیّ رضی اللہ عنہ او ان جبرئیل غلط فی الوحی او نحو ذلک من الکفر الصریح المخالف للقرآن۔

فتاویٰ عزیزیہ کے صفحہ ۱۲ میں ہے: نکاح کردن درمیان مرد سنی و زن شیعہ مبنی بر تکفیر و عدم تکفیر این فرقہ است۔ در مذہب حنفی موافقِ روایاتِ مفتیٰ بہ حکم فرقہ شیعہ حکم مرتدان است۔ چنانچہ در فتاویٰ عالمگیریہ مرقوم است، پس نکاح کردن از زن کہ دریں فرقہ باشد درست نیست۔ و در مذہب شافعی دو اقوال است بر یک قول کافر اند و در قول آخر فاسق۔ چنانچہ در صواعق محرقہ مسطور است۔ لیکن قطع نظر از آن انعقاد مناکحت بایں فرقہ موجب مفاسدہائے بسیار می گردد مثل بد مذہب شدن اہل خانہ و عدم موافقت صحبت و غیر ذلک۔ پس احتراز از آں واجب است۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید جس کا مع اپنے متعلقین کے قادیانی ہونا عام لوگوں

میں مشہور تھا، خالد سنی حنفی المذہب کی لڑکی ہندہ سے نکاح کیلئے اپنے لڑکے عمرو کا پیام بھیجا۔ خالد نے زید کے قادیانی مشہور ہونے کی وجہ سے اس کے لڑکے کو اپنی لڑکی دینے سے انکار کیا۔ زید نے معتبر دس اشخاص کے روبرو اپنے اور اپنے تمام متعلقین کے قادیانی ہونے سے انکار کیا اور قسم کھائی کہ میں سنی حنفی المذہب ہوں۔ جب خالد نے اس انکار کے بعد انہیں معتبر اشخاص کے روبرو زید سے یہ اقرار لیا کہ تمہارے لڑکے سے میری لڑکی ہندہ کا نکاح ہوجانے کے بعد اگر تمہارے لڑکے کا قادیانی ہونا ظاہر ہوجائے تو پھر میں لڑکی کا نکاح فسخ کروادونگا۔ زید نے اس کو قبول کیا، اور عمرو کا ہندہ کے ساتھ نکاح ہوگیا۔ نکاح کے چار مہینے کے بعد خالد کو معلوم ہوا کہ عمرو اور اس کا والد زید وغیرہ قادیانی ہیں اور عمرو اپنی زوجہ ہندہ کو بھی قادیانی ہونے پر مجبور کررہا ہے۔ اس بناء پر خالد نے ہندہ سے دریافت کیا اور بعد تصدیق ہونے کے ہندہ کو اپنے گھر میں لا لیا۔ تا حال ہندہ اپنے باپ کے گھر میں مقیم ہے اور عمرو اس کا طالب ہے۔ ہندہ اور خالد ہر دو فسخ نکاح چاہتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں شرعا ہندہ و عمرو کا نکاح قابل فسخ ہے یا نہیں؟ اور کیا ہندہ عمرو کے گھر جاسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مرزا غلام احمد بانی فرقہ قادیانی کے بعض اقوال ایسے ہیں کہ اہل سنت و جماعت کے پاس کفر ہے۔ چنانچہ اخبار الحکم مورخہ ۲۳ / فبروری ۱۹۰۵ء میں توضیح مرام سے مرزا قادیانی کا قول منقول ہے کہ "میں اللہ کا نبی اور رسول ہوں"۔ اس کے متعلق البحر الرائق مصری جلد ۵ صفحہ ۱۳۰ باب المرتد میں ہے: و یکفر بقولہ انا رسول اللہ۔ عالمگیریہ مطبوعہ مصری جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ موجبات کفر میں ہے: و کذلک لو قال انا رسول اللہ او قال بالفارسیۃ من پیغمبرم یرید بہ من پیغام میبرم یکفر۔ یعنی اہل سنت و جماعت حنفیہ کی معتبر کتب فقہ البحر الرائق و عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اللہ کا رسول اور پیغمبر ہوں خدا کا کلام لے جاتا ہوں تو ایسا کہنے والا کافر ہے۔

رسالہ عقائد مرزا میں توضیح المرام وغیرہ رسائل سے منقول ہے کہ مرزا غلام احمد کہتا ہے کہ "میں اللہ کا نبی ہوں، رسول ہوں، میرا منکر کافر و مردود ہے، مردودوں کے پیچھے نماز درست نہیں ہے بلکہ ان پر سلام نہ کرنا چاہئے"۔ مرزا کے اس قول کے بموجب گویا تمام اہل سنت و جماعت جو اس کے منکر ہیں کافر ہیں جن کے پیچھے نماز درست نہیں اور ان پر سلام بھی نہ کرنا چاہئے۔

شرح مواقف مصری جلد ۳ صفحہ ۲۵۸ اور شرح مقاصد مصری کے صفحہ ۱۹۰ میں ہے: و قال الاستاذ ابو اسحاق کل مخالف یکفرنا فنحن نکفرہ و الا فلا۔ اہل سنت و جماعت کی معتبر کتب عقائد شرح مواقف و شرح مقاصد میں ہے کہ جو کوئی مخالف ہم کو یعنی اہل سنت و جماعت کو کافر کہتا ہے ہم بھی اس کو کافر کہیں گے۔

ازالۃ الاوہام کے صفحہ ۶۲۸ میں قادیانی کی تحریر ہے کہ: "خدائے تعالیٰ نے اس عاجز کو آدم صفی اللہ کا

مثیل قرار دیا ، پھر نوح کا ، پھر یوسف کا ، پھر داود کا ، پھر موسیٰ کا ، پھر مثیل ابراہیم کا قرار دیا اور بار بار احمد کے خطاب سے مخاطب کرکے ظلی طور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم قرار دیا " ۔ اور صفحہ ۶۷۳ میں ہے کہ " مثیل آیت کریمہ مُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ سے میں مراد ہوں میرے ہی آنے کی بشارت دی گئی تھی " ۔

رسالہ عقائد مرزا میں اشتہار معیار الاخیار سے مرزا قادیانی کا قول نقل کیا ہے : میں مہدی ہوں اور بعض نبیوں سے افضل ہوں ۔ رسالہ عقائد مرزا میں توضیح المرام وغیرہ رسائل سے منقول ہے کہ : میرے معجزات و نشانیاں انبیاء کے معجزات سے بڑھکر ہیں ، میری پیشگوئیاں نبیوں کی پیشگوئیوں سے زیادہ ہیں ، میرے معجزات اور نشانیوں کے انکار سے سب نبیوں کے معجزات کا انکار کرنا پڑے گا ۔ اسی اشتہار میں دافع البلاء سے مرزا کا قول نقل کیا ہے کہ : میں امام حسین علیہ السلام سے افضل ہوں ، ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے ، میں اللہ کی اولاد کا رتبہ والا ہوں ، میرا الہام ہے کہ انت منی بمنزلة اولادی یعنی اللہ فرماتا ہے کہ اے غلام احمد تو میرے پاس میری اولاد کے مرتبہ میں ہے ۔ ضرورة الامام کے صفحہ ۱۲ میں ہے کہ : خدائے تعالیٰ مجھ سے بہت قریب ہوجاتا ہے اور کسی قدر چہرہ سے پردہ سے اتار دیتا ہے اور نہایت صفائی سے مکالمہ کرتا ہے اور دیر تک سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں ۔ رسالہ عقائد مرزا میں توضیح المرام وغیرہ رسائل سے منقول ہے کہ " خدا بے پردہ ہوکر مجھ سے ٹھٹھے کرتا ہے " ۔ نعوذ باللہ منھا ۔

مرزا قادیانی کے یہ تمام اقوال جن سے خداوند کریم کی عزت و جلال میں فرق آتا ہے ، اور انبیاء کرام کی عظمت و شان کے بالکل خلاف ہیں ، اور جن سے مذہب اسلام کی علانیہ توہین ہوتی ہے ، اہل سنت و جماعت کے پاس گناہ کبیرہ ہے ، چنانچہ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۲۵۰ کتاب الشھادة میں گناہ کبیرہ کی اس طرح تفصیل ہے : و اختلفوا فی تفسیر الکبائر و اصح ما قیل فیه ما نقل عن الشیخ الامام شمس الائمة الحلوانی رحمه اللّٰه تعالیٰ انه قال ما کان شنیعا بین المسلمین و فیه ھتک حرمة اللّٰه تعالیٰ و الدین فھو من جملة الکبائر و کذٰلک ما فیه نبذ المروة و الکرم فھو من جملة الکبائر و کذٰلک الاعانة علی المعاصی و الفجور و الحث علیھا من جملة الکبائر و ما عداھا فمن الصغائر ۔ کذا فی المحیط ؛ اور مرتکب گناہ کبیرہ شرعاً فاسق ہے ۔

شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی کے صفحہ ۱۸۵ میں ہے : مرتکب الکبیرة فاسق ۔ مرزا قادیانی سے سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم کو جسمانی معراج ہونے کے انکار کا بھی صدور ہوا ہے جو سراسر اہل سنت و جماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے ۔ چنانچہ ازالۃ الاوھام کے صفحہ ۴۷ میں مرزا کا قول ہے کہ : " یہ معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کا کشف تھا ، اس کشف بیداری سے یہ حالت زیادہ اصفیٰ و اجلیٰ ہوتی ہے اور اس قسم کے کشفوں میں مؤلف خود صاحب تجربہ ہے " ۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی کے صفحہ ۲۱۸ میں ہے : و المعراج لرسول اللہ صلی اللّٰه علیه و سلم فی الیقظة بشخصه الی السماء ثم الی ما شاء اللّٰه تعالیٰ من العلیٰ حق ای ثابت بالخبر المشھور حتی ان منکرہ یکون مبتدعا ۔ یعنی

اہل سنت و جماعت کے عقائد کی معتبر کتاب شرح عقائد نسفی میں ہے کہ آں سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم کو بیداری میں معراج ہوئی اور آپ اپنے جسم پاک سمیت آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ اس کا جو شخص انکار کرے وہ بدعتی یعنی بد مذہب ہے۔ شرح مقاصد کے صفحہ ۱۹۸ میں ہے: و المبتدع ھو من خالف فی العقیدۃ طریقۃ اھل الحق و ھو کالفاسق۔

قادیانی فرقہ کے لوگ جو کہ مرزا غلام احمد کے پیرو اور معتقد ہیں اور اس کے تمام اقوال پر اعتقاد رکھتے اور احکام کی تعمیل کو فرض جانتے ہیں۔ اہل سنت و جماعت کے پاس ان عقائد کی رو سے قادیانی فاسق و بدعتی یقیناً ہیں۔ فاسق کیلئے شریعت میں یہ حکم ہے کہ اس پر حد و تعزیر لگائی جائے اور توبہ کا حکم دیا جائے۔ اس کی شہادت نا مقبول ہے۔ اور ولایت یعنی حکومت سے معزول کیا جائے۔ اور بدعتی کی لئے یہ حکم ہے کہ اس کے ساتھ بغض و عداوت رکھی جائے اور ہر وقت اس سے کنارہ کشی کی جائے۔ ہمیشہ اس کی توہین ہو اور اس پر لعن طعن کیا جائے۔ شرح مقاصد کے صفحہ ۱۹۸ میں ہے: و حکم الفاسق الحد فیما یجب فیہ الحد و التعزیر فی غیرہ و الامر بالتوبۃ و رد الشھادۃ و سلب الولایۃ علی اختلاف فی ذٰلک بین الفقہاء و حکم المبتدع البغض و العداوۃ و الاعراض عنہ و الاھانۃ و الطعن و اللعن و کراھیۃ الصلاۃ خلفہ۔

پس صورت مسئولہ میں زید کا لڑکا عمرو قادیانی مذہب ہونے کی وجہ سے اہل سنت و جماعت کے پاس فاسق و بدعتی ہے، اور مذہب حنفی میں فاسق و بدعتی اور بد عقیدہ شخص نکاح میں صالحہ صحیح العقیدہ لڑکی کا کفو و مثل نہیں ہے۔ در مختار جلد ۲ صفحہ ۳۲۸ باب الکفاءۃ میں ہے: (و) تعتبر فی العرب و العجم (دیانۃ) ای تقوی فلیس فاسق کفوء الصالحۃ۔

نکاح کے قبل ہندہ کے والد نے چونکہ عمرو کے والد سے سنی حنفی المذہب ہونے کا اقرار کیا ہے اور یہ شرط لگائی ہے کہ بعد نکاح اگر خلاف ظاہر ہوجائے تو ہندہ کا نکاح فسخ کروادے گا۔ اس لئے نکاح سے چار مہینہ بعد چونکہ عمرو کا قادیانی ہونا ثابت ہوگیا ہے، اور عمرو نے ہندہ کو قادیانی ہونے پر مجبور بھی کیا، اس لئے اب خالد کو از روئے شرع شریف یہ حق ہے کہ اپنی لڑکی ہندہ کا نکاح عمرو سے فسخ کرادے۔ چنانچہ در مختار میں اسی جگہ صفحہ ۳۲۶ میں ہے: (و) الکفاءۃ (ھی حق الولی لا حقھا) فلو نکحت رجلا و لم تعلم حالہ فاذا ھو عبد لا خیار لھا بل للاولیاء و لو زوجوھا و لم یعلموا بعدم الکفاءۃ ثم علموا لا خیار لاحد الا اذا شرطوا الکفاءۃ او اخبرھم بھا وقت العقد فزوجوھا علی ذٰلک ثم ظھر انہ غیر کفء کان لھم الخیار۔ والوالجیۃ۔ فلیحفظ۔ پس صورت مسئولہ میں قاضی یعنی حاکم عدالت کو چاہئے کہ بعد ثبوت خالد کی درخواست کے بموجب ہندہ اور عمرو کا نکاح فسخ کرادے اور تا فسخ ہندہ اپنے والد ہی کے گھر میں رہے عمرو کے پاس بھیجی نہ جائے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ، مذکورہ بالا اقوال و عقائد کے حامل ہونے، نیز دیگر صریح کفریات کی بناء پر حال ہی میں تمام مسلمانوں نے قادیانی کو قطعاً کافر اور خارج عن الاسلام اور مخلد فی النار قرار دیا ہے، اور اس عدو اللہ و رسولہ کے

تبعین بھی سارے عالم اسلام میں قطعی کافر قرار دے گئے ہیں ۔ جو اگر موت سے قبل توبہ کرکے مسلمان نہ ہوں تو مخلد فی النار ہوں گے اور موت کے اسلامی احکام ان پر جاری نہیں ہوں گے ۔ اسی طرح کسی مسلم خاتون کا نکاح قادیانی کافر سے منعقد نہ ہوگا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ و سلمیٰ دونوں حقیقی بہنیں ہیں ۔ زید نے پہلے ہندہ سے عقد کیا جو صاحب اولاد ہے ۔ اس کے بعد سلمیٰ سے بھی عقد کیا ۔ کیا یہ نکاح ثانی شرعاً درست ہے ؟ اور کیا اس سے نسب ثابت ہوگا اور زید کا متروکہ پائے گی ؟

الجواب

ایک عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی حقیقی بہن سے عقد کیا جائے تو یہ نکاح شرعاً فاسد ہے، مگر نسب ثابت ہے۔ اور نکاح فاسدہ والی عورت میراث کی مستحق نہیں ہے۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب النکاح باب الجمع بین المحرمات میں ہے : و ان تزوجها فی عقدتین فنکاح الأخیرة فاسد و یجب علیه ان یفارقها و لو علم القاضی بذلک یفرق بینهما فان فارقها قبل الدخول لا یثبت شیء من الأحکام و ان فارقها بعد الدخول فلها المهر و یجب الأقل من المسمیٰ و من المهر المثل و علیها العدة و یثبت النسب و یعتزل عن امرأته حتی تنقضی عدة اختها کذا فی محیط السرخسی ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ باب المهر میں ہے : (قوله و یثبت النسب) اما الإرث فلا یثبت فیه و کذا النکاح الموقوف ۔ ط عن ابی السعود ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ والدین کتنے دن کے بعد لڑکی سے ملاقات کیلئے اس کے شوہر کے مکان کو جاسکتے ہیں ؟ اور لڑکی شوہر کے مکان سے والدین کی ملاقات کیلئے آسکتی ہے تو کتنے دن رہ سکتی ہے ؟ بحوالہ کتب فقہ جواب فرمایا جائے ۔

الجواب

اگر والدین لڑکی کے پاس جانے کی طاقت نہیں رکھتے تو لڑکی کو ہر جمعہ میں (ہفتہ میں ایکبار) ان سے ملنے کیلئے جانے کی اجازت ہے ۔ اور اگر وہ خود لڑکی کے پاس آسکتے ہیں تو ان کو ہر جمعہ میں آنے کی اجازت ہے ۔ مگر اس وقت لڑکی کا ان کے گھر جانا مناسب نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ کتاب النکاح باب النفقہ میں ہے : و لا یمنعها من الخروج الیٰ الوالدین فی کل جمعة ان لم

یقدرا علی اتیانها علی ما اختاره فی الاختیار و لا یمنعهما من الدخول علیها فی کل جمعة۔
رد المحتار میں ہے : و عن ابی یوسف علیه الرحمة فی النوادر تقیید خروجها بأن لا یقدرا علی اتیانها فان قدرا لا تذهب و هو حسن۔

لڑکی کو والدین کے گھر جانے کی اسی وقت اجازت ہے جبکہ اس کے وہاں جانے سے کوئی فتنہ و فساد پیدا نہ ہو، ورنہ زوج کو یہ حق ہے کہ حسب ضرورت اجازت دے، اور ایسی حالت میں والدین ہی کا جبکہ وہ آنے کی طاقت رکھتے ہیں لڑکی سے ملنے کیلئے اس کے شوہر کے گھر آنا بہتر ہے۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے : و الحق الأخذ بقول ابی یوسف رحمه الله اذا کان الأبوان بالصفة التی ذکرت و الا ینبغی ان یأذن لها فی زیارتهما فی الحین بعد الحین علیٰ قدر متعارف اما فی کل جمعة فهو بعید فان فی کثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصاً اذا کانت شابة و الزوج من ذوی الهیئات بخلاف خروج الأبوین فانه أیسر۔

والدین جب لڑکی کے پاس جائیں تو ان کو ٹھہرنے کی اجازت دینا زوج کا اختیار ہے، اگر زوج مناسب جانے تو ٹھہرا سکتا ہے، ورنہ اس کو یہ حق ہے کہ بعد ملاقات واپس کردے۔ در مختار میں اسی جگہ ہے : (و یمنعهم من الکینونة) و فی نسخة من البیتوتة لکن عبارة مسلا مسکین من القرار (عندها) به یفتی خانیة۔

اور اگر لڑکی کے والدین سے ملکر بات کرنے میں زوج کو کوئی فساد و فتنہ کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں زوج کو یہ حق ہے کہ والدین کو لڑکی کی ملاقات سے منع کردے۔ اسی جگہ رد محتار میں ہے : و لا یمنعهم من النظر الیها و الکلام معها خارج المنزل الا ان یخاف علیها الفساد فله منعهم من ذلک ایضا۔ لڑکی کو والدین کے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دینا زوج کا اختیاری ہے جیسا کہ رد المحتار کی روایت سابقہ سے مستفاد ہے۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کے شوہر کا انتقال ہوا۔ جب جنازہ غسل و کفن کے بعد تیار کیا گیا تو حاضرین میں سے بعض اشخاص نے ہندہ سے مہر معاف کرنے کی درخواست کی اور ہندہ نے اس رنج و غم میں بلا ارادہ کہدیا کہ "میں نے مہر معاف کردیا"۔ کیا ایسی معافی شرعاً معتبر ہے؟ اور یہ جو عام رواج ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد لوگ تقاضہ کرکے زوجہ سے مہر معاف کراتے ہیں اور بغیر معاف کئے جنازہ نہیں اٹھاتے کیا اس قسم کی معافی سے مہر معاف ہوجاتا ہے؟

الجواب

زوجہ خاوند کی وفات کے بعد اگر زر مہر معاف کردے تو یہ معافی شرعاً معتبر ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ فصل فی ھبۃ المہر میں ہے : امرأة المیت اذا وهبت المهر من المیت جاز و لو وهبت من ورثته یجوز۔

مہر کے ہبہ و معاف کرنے کیلئے زوجہ کی رضامندی ضروری ہے ۔ اگر جان و مال کی ہلاکی کا خوف دلاکر مہر معاف کرایا جائے تو یہ معافی شرعا معتبر نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ فصل فی الزیادۃ فی المہر و الحط عنہ میں ہے : و لا بدّ فی صحۃ حطہا من الرضا حتی لو کانت مُکرَھۃ لم یصح ۔ معافی و ہبہ بلا ارادہ کے محض مذاق و تفریح طبع کے طور پر بھی کیا جائے تو یہ شرعا معتبر ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب الھبہ کے حاشیہ پر در مختار میں ہے : و تصح بایجاب کوھبت و نحلت و اطعمتک ھذا الطعام و لو ذلک علی وجہ المزاح ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر ہندہ نے بلا خوف جان و مال محض حاضرین کی فہمائش و اصرار پر مہر معاف کیا ہے تو یہ معافی شرعا معتبر ہے ۔ ہندہ کو اب اس کے خاوند کے مترو کہ سے مہر لینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر کے انتقال کے ساتھ ہی زوجہ نکاح سے خارج ہوجاتی ہے اور شوہر کے مترو کہ کی مستحق رہتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

شوہر کی وفات کے بعد موت کی عدت چار مہینے دس روز گذرنے تک زوجہ نکاح میں رہتی ہے ۔ اگر شوہر اپنی زندگی میں زوجہ کو طلاق نہیں دی ہے اور عین حیات دونوں میں علیحدگی نہیں ہوئی ہے تو زوجہ زوج کے انتقال کے بعد اس کے مترو کہ کی حقدار ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ باب الجنائز میں ہے : و النکاح بعد الموت باقٍ الیٰ ان تنقضی العدۃ بخلاف ما اذا ماتت فلا یغسلہا لانتہاء مِلک النکاح لعدم المحل فصار اجنبیاً و ھذا اذا لم یثبت البینونۃ بینہما فی حال حیاۃ الزوج فان تبینت بأن طلقہا بائناً او ثلاثۃ ثم مات لا تغسلہ لارتفاع المِلک بالإبانۃ ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الفرائض میں ہے : و یستحق الإرث برحم و نکاح صحیح فلا توارث بفاسد و لا باطل اجماعا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کریمہ و رحیمہ خالد کی دو زوجہ ہیں ۔ کریمہ کے بطن سے خالد کو ایک لڑکی ہے جس کا نکاح رحیمہ کے حقیقی بھائی کے ساتھ قرار پایا ہے ۔ کیا یہ نکاح شرعا درست ہے؟

الجواب

یہ نکاح درست ہے جیسا کہ مسئلہ نکاح شغار سے مستفاد ہے ۔ در مختار مطبوعہ جلد ۲ کتاب النکاح میں ہے : و وجب مہر المثل فی الشغار ھو ان یزوجہ بنتہ علیٰ ان یزوجہ الآخر بنتہ او اختہ مثلا

معارضة بالعقدين و هو منهي عنه لخلوه عن المهر فأوجبنا فيه مهر المثل فلم يبق شغارا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی زوجہ ہندہ کو اپنے مکان میں چھوڑکر ایک سال دس مہینے تک غائب رہا ۔ ہندہ نے قاضی کے پاس رجوع ہوکر زوج کے غائب ہونے اور نفقہ کی سخت تکلیف ہونے کی کیفیت بیان کی ۔ نائب قاضی نے ہندہ کے مجرد بیان پر باوجود شوہر کے زندہ ہونے کے جس کا کہ نکاح ہندہ سے اسی نائب قاضی نے پڑھا تھا یہ حکم دے دیا کہ ہندہ کا ایسی حالت میں بر بنائے قول شافعی خود طلاق لے سکتی ہے ، چنانچہ اس حکم کی بناء پر ہندہ نے طلاق لی اور اسی نائب نے تاریخ طلاق سے ایک ماہ کے اندر اس کا نکاح خالد سے پڑھادیا ۔ فریقین اور نائب قاضی حنفی المذہب ہیں ۔ کیا شرعا ایسا نکاح و طلاق صحیح ہے ؟

الجواب

زوج اگر غائب ہوجائے اور زوجہ قاضی (حاکم) کے پاس نفقہ کی شکایت پیش کرے تو ایسے وقت میں قاضی کو یہ حکم ہے کہ اگر وہ اس کے زوجہ ہونے سے واقف نہیں ہے تو زوجہ سے زوجیت کا ثبوت لے ، اس کے بعد اگر زوج کا مال ہے تو حسب ضرورت اس کو خرچ کرنے کی اجازت دے ، اور اگر مال نہیں ہے تو اس کو اجازت دے کہ کسی سے قرض لے کر کام چلائے اور زوج کی واپسی کے بعد وہ رقم اس سے قاضی (حاکم) کے حکم سے وصول کی جائے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : و لو غاب و له زوجة و صغار تقبل بينتها على النكاح ان لم يكن عالما به ثم يفرض لهم ثم يأمرها بالإنفاق او الاستدانة لترجع ۔ قاضی حنفی اگر اپنے مذہب کے خلاف کسی دوسرے امام یعنی شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے مذہب کے موافق حکم دے تو یہ حکم باطل ہے ۔ در مختار کی کتاب القضاء میں ہے : قضى في مجتهد فيه بخلاف رأيه اي مذهبه مجمع و ابن كمال لا ينفذ مطلقا ناسيا او عامدا عندهما و الأئمة الثلاثة و به يفتي ۔ اسی صفحہ میں ہے : قضى من ليس مجتهدا كحنفية زماننا بخلاف مذهبه عامدا لا ينفذ اتفاقا ۔ رد المحتار میں ہے : قوله اي مذهبه كالحنفي اذا حكم على مذهب الشافعي او نحوه او بالعكس ۔ پس صورت مسئولہ میں نائب قاضی نے جو حکم دیا ہے وہ مذہب حنفی کے بالکل خلاف ہے اس لئے ہندہ کا نکاح خالد کے ساتھ فاسد و باطل ہے ۔ ہندہ زید کے نکاح سے خارج نہیں ہوئی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر اگر زوجہ کو زیور محض استعمال کی غرض سے بنادے اور اس کو ہبہ نہ کرے تو کیا یہ زوجہ کی ملک ہوگی ؟ یا زوج کی وفات کے بعد یہ اس کا متروکہ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

جو زیور بطور عاریت کے محض استعمال کی غرض سے دیا جاتا ہے وہ زوج کی ملک ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کا متروکہ ہے ۔ زوجہ کو اس میں کوئی حق نہیں ہے اور نہ وہ اس کی ملک ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۲ کتاب العاریۃ میں ہے ، اذا اعترفت الزوجة بأصل الملك في المصاغ المذكور لزوجها و لم تثبت انتقاله لها بناقل شرعي يكون تركة عن الزوج و لا يكون استمتاعها به حال حياته و رضاه بذلك دليل على انه ملكها كما تفهمه النساء العوام ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مندرجہ ذیل رشتہ کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

۱ ۔ سوتیلے باپ یعنی ماں کے خاوند کی زوجہ ۔
۲ ۔ انا کے خاوند کی زوجہ یا داشتہ ۔
۳ ۔ سوتیلے باپ کی بہن ۔
۴ ۔ سوتیلی ماں کی بہن ۔
۵ ۔ انا کی سوتیلی بہن ۔
۶ ۔ زوجہ کی سوتیلی ماں کی سوتیلی بہن ۔
۷ ۔ سوتیلے باپ کی بیٹی ۔
۸ ۔ انا کے مرد کی بیٹی ۔
۹ ۔ سوتیلے بھائی کی زوجہ کی بیٹی ۔
۱۰ ۔ رضاعی بھائی کی زوجہ کی بیٹی ۔
۱۱ ۔ سوتیلی بہن کے خاوند کی بیٹی ۔
۱۲ ۔ رضاعی بہن کے خاوند کی بیٹی ۔
۱۳ ۔ زوجہ یا داشتہ کے بیٹے کی زوجہ ۔
۱۴ ۔ زوجہ کی موجودگی میں اس کی سوتیلی بہن یا اس کی خالہ یا پھوپی یا بھانجی یا بھتیجی ۔
۱۵ ۔ زوجہ کے انتقال یا طلاق کے بعد اس کی حقیقی خالہ یا پھوپی یا بھتیجی یا بھانجی یا اس کی سوتیلی ماں ؟ ؟

الجواب

صورت ہائے مسئولہ میں انا کے خاوند کی زوجہ یا داشتہ سے نکاح حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الرضاع میں ہے ، و تثبت حرمة المصاهرة في الرضاع حتىٰ لن امرأة الرجل حرام على الرضيع و امرأة الرضيع حرام على الرجل و على هذا القياس ۔

انا کی سوتیلی بہن بھی حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ قسم رابع محرمات بالجمع میں ہے ، کل من تحرم

بالقرابة و الصهرية تحرم بالرضاع - شرح وقایہ میں ہے :

از جانب شیردہ ہمہ خویش شوند ☆ و از جانب شیر خوار زوجان و فروع

انّا کے مرد کی بیٹی حرام ہے - عالمگیریہ جلد ا کتاب الرضاع میں ہے : او ولد لهٰذا الرجل من غير هذه المرأة قبل هذا الارضاع او بعده او ارضعت امرأة من لبنه رضيعا فالكل اخوة الرضيع و اخواته -
زوجہ کی موجودگی میں اس کی سوتیلی بہن یا خالہ یا پھوپی یا بھانجی حرام ہے - عالمگیریہ جلد ا قسم رابع محرمات بالجمع میں ہے : و الأصل ان كل امرأتين لو صوّرنا إحداهما من اى جانب ذكرًا لم يجز النكاح بينهما برضاع او نسب لم يجز الجمع بينهما هكذا في المحيط -
مندرجہ بالا صورتوں کے سوا باقی تمام صورتوں میں بمحواے آیت کریمہ " وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكَ " شرعا نکاح درست ہے - و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نابالغ لڑکی کا اس کے نانا نے غیر کفوء سے نکاح کردیا ۔ لڑکی نے بالغ ہوتے ہی نکاح سے انکار کردیا اور اس قدر ناراض ہے کہ اگر اس کو جبراً خاوند کے پاس روانہ کیا جائے تو وہ خود کشی کرلے گی ۔ کیا ایسی لڑکی کا نکاح دوسرے شخص سے کیا جاسکتا ہے ؟ اور کیا موجودہ خاوند کو یہ حق ہے کہ اس کو جبراً اپنے گھر لے جائے ؟

الجواب

باپ دادا کے سوا کوئی رشتہ دار اگر لڑکی کا کمسنی میں عقد کردے تو جوان ہوتے ہی اس کو اختیار ہے کہ اس نکاح کو فسخ کردے ۔ مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی اپنے انکار کو قاضی (حاکم) کے پاس پیش کرے اور قاضی فسخ کا حکم دے - عالمگیریہ جلد ا باب الاولیاء میں ہے : فان زوّجهما الأب و الجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما و ان زوجهما غير الأب و الجد فلكل واحد منهما الخيار اذا بلغ ان شاء اقام على النكاح و ان شاء فسخ و هذا عند ابى حنيفة و محمد رحمهما اللّٰه تعالىٰ و يشترط فيه القضاء بخلاف خيار العتق كذا فى الهداية - در مختار کے باب الاولیاء میں ہے : و ان كان المزوّج غيرهما اى غير الأب و ابيه لا يصح النكاح من غير كفوء او بغبن فاحش اصلا و ان كان من كفوء و بمهر المثل صح و لكن لهما خيار الفسخ بالبلوغ او العلم بالنكاح بعده بشرط القضاء للفسخ - پس صورت مسئولہ میں لڑکی کو چاہئے کہ اپنے انکار کو " عدالت دار القضاء " میں پیش کرے اور جب وہاں سے فسخ کا حکم ہوجائے تب دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے - و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اپنے والدین کے مکان میں رہکر خاوند سے نفقہ طلب

کرسکتی ہے یا نہیں ؟ اور اگر والدین کے پاس بیمار ہوجائے تو طبیب کی اجرت اور دواء کے مصارف والدین کے ذمہ ہونگے یا خاوند کے ؟

الجواب

شوہر اگر زوجہ کو نفقہ دینے کے وعدے سے اس کے ماں باپ کے گھر میں چھوڑے تو ایسی حالت میں شوہر پر اس کا نفقہ واجب ہے ۔ اور اگر زوجہ بلا وجہِ شرعی خاوند کی مرضی کے خلاف ماں باپ کے گھر میں بیٹھی ہے تو شوہر پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہے ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب النفقہ میں ہے : و لو هي في بيت ابيها اذا لم يطالبها الزوج بالنقلة به يفتي ۔ اسی باب میں ہے : و خارجة من بيته بغير حق و هي الناشزة حتي تعود۔ زوجہ کی دواء کا خرچ اور طبیب کی اجرت خاوند پر لازم نہیں ہے ۔ در مختار کے اسی باب میں ہے ، كما لا يلزمه مداواتها بدواء المرض و لا اجرة الطبيب و لا الفصد و لا الحجامة ، هندية عن السراج ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ زوجہ بکر نے بکر کے نکاح میں رہکر زید کے ساتھ نکاح کرلیا ، اور زید نے قبل از وطی یہ معلوم کرکے کہ یہ بکر کی منکوحہ ہے اس کو طلاق دے دی ، تو کیا زید کے ذمہ مہر واجب ہے ؟ اگر وطی کے بعد طلاق دیتا تو کیا اس کو مہر دینا لازم ہوتا ؟

الجواب

غیر کی منکوحہ کا نکاح شرعا فاسد ہے ، رد المحتار جلد ۲ کتاب الطلاق باب العدۃ میں ہے : (قوله نكاحا فاسدا) هي المنكوحة بغير شهود و نكاح امرأة الغير بلا علم بأنها متزوجة ۔ نکاح فاسد میں وطی نہ کرنے سے مہر لازم نہیں ہوتا ۔ اسی جلد کے باب المہر در مختار میں ہے : (و يجب مهر المثل في نكاح فاسد بالوطئ لا بغيره) كالخلوة لحرمة وطئها و لم يزد مهر المثل علي المسمیٰ ۔ منکوحۂ غیر کے ساتھ نکاح کے بعد جان بوجھکر وطی کرنا زنا ہے ، ایسے شخص پر شرعا حد زنا واجب ہے ، مہر نہیں ہے ، اور اگر لاعلمی سے وطی کرلے تو اس پر مہر مثل لازم ہے جوکہ مہر مسمیٰ یعنی مہر مقرر بہ وقت نکاح سے زائد نہ ہو ۔

در مختار باب العدۃ میں ہے : و كذا لا عدة لو تزوج امرأة الغير و وطئها عالما بذلك و دخل بها و لا بدّ منه و به يفتي و لهذا يعد مع العلم بالحرمة لأنه زنا ۔ البحر الرائق جلد ۵ کتاب الحدود میں ہے : لأن الوطءة في دار الإسلام لا يخلو عن الحد او المهر ۔ بہجت المشتاق صفحہ ۱۳۵ کے حاشیہ پر زہت الارواح میں ہے ، قال في الأشباه الوطء في دار الإسلام لا يخلو عن حد او مهر

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے لاعلمی سے دو ۲ بہنوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے نکاح کیا ۔ اب وہ چاہتا ہے کہ زوجہ اولیٰ کو طلاق دیکر زوجہ ثانیہ کو اپنے نکاح میں رکھے ۔ کیا زوجۂ ثانیہ کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ہوگا یا موجودہ نکاح کافی ہے ؟

الجواب

زوجۂ ثانیہ کا نکاح فاسد ہے ۔ مذکور شخص کو چاہئے کہ فوراً اس سے علیحدہ ہوجائے ۔ اگر اس کے ساتھ صحبت کی ہے تو زوجہ پر عدت لازم ہے ، اور شخص مذکور کو مہر بھی دینا ہوگا ، مگر مہر مقرر بہ وقت نکاح اور مہر مثل ان دونوں میں جو کم ہو وہی دینا پڑیگا ۔ اور چاہئے کہ زوجہ ثانیہ کی عدت ختم ہونے تک زوجۂ اُولیٰ سے بالکل علیحدہ رہے ۔ اگر زوجہ اُولیٰ کو طلاق دیدے اور اس کی عدت بھی ختم ہوجائے تب زوجۂ ثانیہ سے از سر نو نکاح کرسکتا ہے ۔ عالمگیریہ کتاب النکاح باب المحرمات بالجمع میں ہے : و ان تزوجهما فی عقدتین فنکاح الأخیرة فاسد و یجب علیه ان یفارقها و لو علم القاضی بذلک یفرق بینهما فان فارقها قبل الدخول لا یثبت شیء من الأحکام و ان فارقها بعد الدخول فلها المهر و یجب الأقل من المسمیٰ و من مهر المثل و علیها العدة و یثبت النسب و یعتزل عن امرأته حتیٰ تنقضی عدة اختها کذا فی محیط السرخسی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے چار ازواج رکھتے ہوئے مسماۃ ہندہ سے نکاح کیا ۔ کیا یہ پانچواں نکاح شرعاً درست ہے یا نہیں ؟ در صورت عدم جواز اس کے مہر کا تصفیہ کیا ہوگا ؟ اور کیا زید کی وفات کے بعد ہندہ اس کی میراث سے حصہ پائے گی ؟ اور ہندہ کے بطن سے اگر زید کو اولاد ہو تو کیا زید کے متروکہ سے اس کی دیگر اولاد کے ساتھ حصہ پانے کی مستحق ہوگی ؟ اگر زید ہندہ کیلئے قاضی کے روبرو باخفاء حال کچھ نفقہ اپنے پر لازم کرلے تو شرعاً کیا اس کی ادائی زید پر لازم ہوگی؟ اگر سلطان وقت ہندہ اور اس کی اولاد کیلئے کوئی گزارہ زید کے متروکہ سے مقرر کردے تو کیا یہ شرعاً واجب الایصال ہے یا نہیں ؟

الجواب

چار عورتوں کے نکاح میں ہوتے ہوئے پانچواں نکاح باطل ہے ، ایسی صورت میں پانچویں عورت کو مرد سے علیحدہ کردینا چاہئے ۔ اگر صحبت یعنی ہم بستری کے بعد علیحدگی ہو تو مہر مثل و مہر مقرر بہ وقت نکاح ان دونوں میں جو کم ہو وہ دینا لازم ہوگا ۔ عورت پر بعدِ تفریق عدت لازم ہوگی ، اور جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا ۔ اس عورت کو مرد کے متروکہ سے حصہ نہیں ملیگا ، اور عین

حیات مرد پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہوگا ۔ البتہ جو اولاد اس کے بطن سے ہوئی وہ ثبوت نسب کی وجہ سے باپ کے متروکہ سے حصہ پائےگی ۔ عورت چونکہ شرعی زوجہ نہیں ہے اس لئے شوہر کے انتقال کے بعد اگر سرکار اس کی پرورش کیلئے شوہر کے متروکہ سے گذارہ مقرر کرے تو درست نہیں ہے ۔ البتہ اس کی اولاد کیلئے بوجہ ثبوت نسب گذارہ لازم ہے ۔ زحمت الارواح فی احکام النکاح مصری کے صفحہ ۳۲ میں ہے : المحرمات بالجمع ست الاولی الخامسة للحر ۔ اسی صفحہ میں محیط سے منقول ہے : و یجب ان یفارقها و لو علم القاضی بذلک یفرق بینهما فان فارقها قبل الدخول لا یثبت شیء من الاحکام و ان فارقها بعد الدخول فلها المهر و یجب الأقل من المسمیٰ و من مهر المثل و علیها العدة و یثبت النسب ۔ آگے فتح القدیر سے منقول ہے : و کل هذه الاحکام المذکورة بین الاختین ثابت بین کل من لا یجوز جمعه من المحارم کذا فی فتح القدیر ۔ رد المحتار جلد ۲ باب المہر میں ہے : اما الإرث فلا یثبت فیه ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب محرمات بالجمع میں ہے : و اذا تزوج الحر خمسا علی التعاقب جاز نکاح الأربع و لا یجوز نکاح الخامسة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نابالغ کا نکاح اس کی والدہ نے ہندہ نابالغہ کے ساتھ کروادیا ، ہندہ کا ولی اس کا باپ تھا ، اور زید کی ولیہ اس کی والدہ تھی ۔ زید اب بالغ ہوگیا ہے اور ہندہ تا حال نابالغہ ہے ۔ کیا زید کو نکاح کے فسخ کا حق حاصل ہے ؟ اگر فسخ کردے تو ہندہ کے مہر کی ذمہ داری کیا اس کی والدہ پر ہوگی یا خود زید پر ؟

الجواب

زید کا نکاح چونکہ والدہ نے اپنی ولایت سے کرایا ہے ، اس لئے زید کو بالغ ہوجانے کی وجہ سے فسخ نکاح کا حق حاصل ہے ، مگر وہ بطور خود فسخ نہیں کرسکتا بلکہ اپنی ناراضی کی کیفیت " محکمۂ دار القضاء " میں پیش کرکے قاضی (حاکم) سے فسخ نکاح کی درخواست کرے ، کیونکہ فسخ نکاح کا حق شرعا قاضی کو حاصل ہے، زوج و زوجہ کو نہیں ہے ۔ زید نے اگر ہندہ سے صحبت کی ہے تو بعد فسخ اس پر ادائی مہر لازم ہے ، ولی پر اس کی ادائی واجب نہیں ہے کیونکہ زوجہ سے شوہر نے نفع حاصل کیا ہے ۔ البتہ اگر بہ وقت نکاح زوج کا ولی یا سرپرست ادائی مہر کا ضامن ہوا ہے تو زوج کے نادار و مفلس ہونے کی حالت میں ضامن سے زر مہر وصول کیا جاسکتا ، اور ضامن اس رقم کو زوج کے مالدار ہونے کے بعد اس سے وصول کرلے ۔ اگر زید نے ہندہ سے صحبت نہیں کی ہے تو بعد فسخ نکاح اس پر زر مہر لازم نہیں ہے بلا مہر فسخ ہوجائے گا ۔

عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب رابع میں ہے : فان زوّجهما الأب و الجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما ، و ان زوّجهما غیر الاب و الجد فلکل واحد منهما الخیار اذا بلغ ان شاء اقام علی

النکاح و ان شاء فسخ و ھذا عند ابی حنیفۃ و محمد رحمھما اللّٰہ تعالیٰ و یشترط فیہ القضاء بخلاف خیار العتق کذا فی الھدایۃ ۔ اور صفحہ ۲۸۰ میں ہے : و اذا وقعت الفرقۃ بخیار البلوغ ان لم یکن الزوج دخل بھا فلا مھر لھا وقعت الفرقۃ باختیار الزوج او باختیار المرأۃ و ان کان دخل بھا فلھا المھر کاملا وقعت الفرقۃ باختیار الزوج او باختیار المرأۃ ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مرد و عورت بہ تراضی طرفین باہم یہ معاہدہ کرلیں کہ وہ دونوں زوج و زوجہ کی طرح زندگی بسر کرینگے ، مگر اس ایجاب و قبول پر کوئی گواہ نہ ہو ، تو ظاہر شریعت میں تو یہ نکاح گواہ نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہوتا جس سے کہ زوجیت کے حقوق ایک دوسرے پر ثابت ہوں ، مگر خداوند عالم کے نزدیک کیا یہ دونوں مستحق عذاب سمجھے جائیں گے ؟ اور اس تراضی طرفین کا خدا کے پاس کوئی لحاظ نہیں ہوگا ؟ فقہ و حدیث سے جواب دیا جائے ۔

الجواب

فقہاء نے اس قسم کی تراضی کو معصیت اور فعل حرام لکھا ہے ، احادیث میں بھی اس کو باطل اور فعل بغی (بدکاری) بتلایا گیا ہے ۔ فتح القدیر جلد ۳ کتاب النکاح میں ہے : و بالمعقول ان حرام ھذا الفعل یکون سراً و ضدہ یکون جھراً لتنتفی التھمۃ ۔ اسی صفحہ میں ہے : و کلام المبسوط حیث قال و لأن الشرط لما کان الإظھار یعتبر فیہ ما ھو طریق الظھور شرعاً و ذلک بشھادۃ الشاھدین فانہ مع شھادتھما لا یبقی سرا ۔ در مختار مطبوعہ جلد ۲ کتاب النکاح میں ہے : و لکل واحد فسخہ و لو بغیر محضر صاحبہ دخل بھا او لا فی الأصح خروجاً عن المعصیۃ ۔ فتح القدیر کے صفحہ مذکورہ سابق میں ہے ، لکن ابن حبان رویٰ من حدیث عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا انہ صلیٰ اللّٰہ علیہ و سلم قال : لا نکاح الا بولی و شاھدی عدل و ما کان من نکاح علیٰ غیر ذلک فھو باطل ۔ البحر الرائق جلد ۳ کتاب النکاح میں ہے : فلم یصح بغیر شھود لحدیث الترمذی : البغایا اللاتی ینکحن انفسھن من غیر بینۃ ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے یہ اقرار لکھدیا کہ : " ہندہ بنت سعید عاقلہ و بالغہ ساکن دہلی حال وارد بمبئی سے بمعاوضۂ زرِ مہر پانچ سو میں نے عقد کرلیا ہے ۔ چونکہ چند موانع کی وجہ سے حسبِ قواعدِ جاریہ بحضوریِ قاضی و شہود اس کی تکمیل نہیں کرواسکتا اس لئے یہ تحریر بطورِ عقد نامہ کے ہندہ کو لکھدی گئی ہے تاکہ بہ وقت ضرورت کام آئے اور آئندہ بر وقت اس کا اظہار بھی کردیا جائےگا " ۔ اس نوشتہ پر ہندہ کی تحریر ہے کہ " مجھے منظور ہے " اور دو گواہوں نے بھی اس پر دستخط کی ہے ۔ کیا ان

تحریرات سے عقد ہوگیا یا زبانی ایجاب و قبول کی بھی ضرورت ہے ؟

الجواب

زبان سے کہے بغیر محض تحریر سے جو زوج و زوجہ نے ایجاب و قبول کرلیا ہے اس سے عقد نہیں ہوا ۔ زوج و زوجہ جبکہ حاضر ہیں تو چاہئے کہ دونوں دو گواہوں کے روبرو زبان سے ایجاب و قبول کریں ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب النکاح میں ہے : قوله و لا بکتابة حاضر فلو کتب تزوجتک فکتبت قبلت لم ینعقد ۔ بحر ، و الأظهر ان یقول فقالت قبلت الخ اذ الکتابة من الطرفین بلا قول لا تکفی و لو فی الغیبة ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح میں ہے : و لو کتب الإیجاب و القبول لا ینعقد کذا فی فتح القدیر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید برادر قاضی فاروقیؒ النسب ہے ، جس کی چھوٹی لڑکی ہندہ پانچ سال سے عاقلہ و بالغہ ہے ۔ مگر زید اپنی زوجہ کی ناموافقت کی وجہ سے لڑکی کی شادی کا کوئی انتظام نہیں کرتا ۔ لڑکی کا نانا چاہتا ہے کہ اس کا عقد اپنے پھوپی و ماموں زاد بھائی کے فرزند مسمی خالد فاروقیؒ النسب سے کردے ۔ کیا ایسی حالت میں زید کو نکاح کے روکنے اور منسوخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب

جب دونوں فاروقی النسب ہیں تو نسب کے لحاظ سے دونوں باہم کفوء ہیں ۔ مگر ہم کفوء ہونے کے سوا دینداری ، مال اور پیشہ کا بھی لحاظ ضروری ہے ۔ اگر خالد فاروقی النسب ہونے کے علاوہ دینداری اور مال و پیشہ میں بھی ہندہ اور اس کے باپ کے برابر ہے تو ایسی حالت میں ہندہ اپنی رضامندی سے باپ کی مرضی کے خلاف عقد کرلے سکتی ہے اور باپ کو اعتراض کا حق نہیں ہے ۔ لیکن اگر خالد امور بالا میں سے کسی ایک میں بھی لڑکی کے برابر نہیں ہے تو پھر باپ کو ضرور اعتراض کا حق ہے ۔ اور اس کی رضامندی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے ۔

در مختار کی کتاب النکاح باب الکفاءۃ میں ہے : و تعتبر (نسبا فقریش أکفاء و العرب أکفاء) و حریة و اسلاما و دیانة و مالا و حرفة ۔ اسی جگہ رد المحتار میں ہے : و الخلفاء الأربعة کلهم قریش ۔ رد محتار میں اسی جگہ صفحہ ۳۲۵ میں ہے : المراة اذا زوجت نفسها من کفوء لزم علی الأولیاء و ان زوجت من غیر کفوء لا یلزم او لا یصح ۔ صفحہ ۳۲۹ میں ہے : اذا زوجت نفسها بلا اذن الولی لم یبق لها حق فی الکفاءة لرضاها باسقاطها فبقی الحق للولی فقط فله الفسخ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو لوگ سیّد نہیں ہیں کیا وہ سیدانیوں سے نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

جو اشخاص کہ شیخ قریشی النسب ہیں وہ سیدانیوں کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں ۔ کیونکہ تمام قریش چاہے ہاشمی ہوں یا غیر ہاشمی آپس میں ایک دوسرے کے کفوء ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے نکاح کرنا درست ہے ۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنی رضامندی سے فاروقی شیخوں کے جد اعلیٰ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کرادیا تھا ۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو ایسے اخیار و بزرگان ملت سے کبھی صادر نہ ہوتا ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب النکاح باب الکفاءۃ میں ہے : (قولہ فقریش بعضھم أکفاء بعض) اشار بہ الی انہ لا تفاضل فیما بینھم من الھاشمی و النوفلی و التیمی و العدوی و غیرھم و لھذا زوّج علیٌّ رضی اللّٰہ عنہ و ھو ھاشمی ام کلثوم بنت فاطمۃ الزھراء رضی اللّٰہ عنھما لعمر رضی اللّٰہ عنہ و ھو عدوی ۔ قہستانی ۔ فلو تزوجت ھاشمیۃ قریشیا غیر ھاشمی لم یرد عقدھا ۔ اسی صفحہ میں ہے : و الخلفاء الأربعۃ کلھم من قریش ۔ پس جو اشخاص کہ خلفاء ثلاثہ سیدنا ابوبکر الصدیق و سیدنا عمر بن الخطاب و سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم کی اولاد ہیں یا ان کے سوا دوسرے قریشی نسب صحابہ کی اولاد ہیں وہ علویہ و غیر علویہ ہر قسم کی سیدانیوں کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے حقیقی بھائی کی نابالغ لڑکی کا نکاح اپنی ولایت سے لڑکی کے ہم کفوء ہاشمی النسب مسمی حامد کے ساتھ کردیا ۔ زید کا بڑا بھائی جو لڑکی اور اس کی والدہ کا مخالف ہے اور لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتا تھا دعویدار ہے کہ میری موجودگی میں زید کو اور لڑکی کی والدہ کو میری اجازت کے بغیر نکاح کردینے کا حق نہیں تھا کیونکہ زید فاسق و فاجر ہے ۔ ولی ہونے کے قابل نہیں ہے ۔ لہٰذا یہ نکاح فسخ کردیا جائے ۔ کیا شرعا اس دعوی سے نکاح فسخ ہوسکتا ہے ؟ اور بوجہ فسق و فجور زید کی دیانت ساقط الاعتبار ہے ؟

الجواب

ولی چاہے فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو نکاح کرادینے کا حق رکھتا ہے ۔ کیونکہ فسق و فجور سے حق ولایت زائل نہیں ہوتا ۔ مساوی درجہ کے دو ولیوں میں سے اگر ایک لڑکی کا عقد کرادے تو دوسرا اس کو فسخ نہیں کرواسکتا ۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے اگر لڑکی کا نکاح حامد ہاشمی سے مہر مثل پر کرادیا ہے

تو زید کا بڑا بھائی اس کو فسخ نہیں کرواسکتا ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب الولی میں ہے : هو البالغ العاقل الوارث و لو فاسقا ما لم یکن متهتكا ۔ رد محتار جلد ۲ باب الولی میں ہے : و به ظهر ان الفاسق المتهتك هو بمعنیٰ سیئ الاختيار لا تسقط ولايته مطلقا لانه لو زوّج من كفوء بمهر المثل صح ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب الکفاءۃ میں ہے : و اذا اجتمع للصغير و الصغيرة وليان مستويان كالأخوين و العمّين فأيّهما زوّج جاز عندنا كذا في فتاوىٰ قاضيخان سواء اجاز الآخر او فسخ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمرو کا انتقال ہوا ۔ اس نے ایک لڑکی نابالغہ مسماۃ ہندہ چھوڑی ۔ عمرو کا حقیقی بھائی زید ہندہ کا عقد اپنے نابالغ لڑکے بکر سے کردینا چاہتا ہے ۔ مگر لڑکی اپنے ماموں کے پاس ہے ۔ اور وہ اس عقد سے ناراض ہے ۔ کیا زید کو یہ حق حاصل ہے کہ ماموں کے ناراضی کے باوجود ہندہ کا نکاح بکر سے کردے ؟ اور کیا یہ شرعاً جائز ہے ؟

الجواب

ہندہ کا ولی چونکہ اس کا چچا زید ہے ۔ اس لئے زید کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لڑکے بکر سے ہندہ کا نکاح کردے ۔ مگر شرط یہ ہے کہ نکاح مہر مثل پر کروائے اور بکر دینداری اور مال و پیشہ میں بھی ہندہ کے برابر ہو ۔ ماموں چونکہ ولی نہیں ہے ۔ اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے ۔ اور اس کی ناراضی سے زید کے کرواتے ہوئے نکاح پر اثر نہیں پڑتا ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب النکاح باب الولی میں ہے : ثم يقدّم الأب ثم ابوه ثم الأخ الشقيق ثم لأب ثم ابن الأخ الشقيق ثم لأب ثم العم الشقيق ثم لأب ۔ صفحہ ۳۱۱ در مختار میں ہے : و للولی إنكاح الصغير و الصغيرة (جبراً) و لو ثيبا و لزم النكاح و لو بغبن فاحش او بغير كفوء ان كان الولي اباً او جداً لم يعرف منهما سوء الاختيار و ان عرف لا ۔ و ان كان المزوّج غيرهما لا يصح من غير كفء او بغبن فاحش اصلا و ان كان من كفء و بمهر المثل صح ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بالغہ لڑکی جس کی عمر بائیس سال کی ہے اپنی ماں کی رضامندی کے بغیر چچا کی ولایت سے عقد کرلے سکتی ہے یا نہیں ؟ کیا ماں کے مقابل چچا کی ولایت کو ترجیح ہے ؟

الجواب

بالغہ لڑکی اولیاء کی ولایت سے خارج ہے ۔ اس کو کوئی ولی نکاح کے لئے جبر نہیں کرسکتا ۔ وہ خود اپنی

رضامندی سے جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہم کفو مرد سے مہر مثل پر نکاح کرے اگر اس کے خلاف ہو تو ولی کو حق ہے کہ اس کا نکاح فسخ کرادے۔ بلکہ بلا اجازت ولی کے غیر کفوء سے نکاح کرنا ولی کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے اگر وہ اجازت دے تو صحیح ہوگا ورنہ نہیں۔

چچا چونکہ عصبہ ہے اس لئے صورت مسئولہ میں لڑکی کا ولی یہی ہے، اس کے مقابل ماں کو کوئی حق نہیں ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ کتاب النکاح باب الولی میں ہے، و لا تجبیر البالغة البکر علی النکاح لانقطاع الولایة بالبلوغ۔ صفحہ ۳۱۹ میں ہے: الولی فی النکاح العصبة بنفسه۔ صفحہ ۳۲۰ میں ہے: فان لم یکن عصبة فالولایة للام۔ صفحہ ۳۳۳ باب الکفاءة میں ہے: و لو نکحت باقل من مهرها فللولی العصبة الاعتراض حتی یتم مهر مثلها۔ رد محتار میں اسی جگہ ہے: و لو تزوجت غیر کفوء فالمختار للفتویٰ روایة الحسن انه لا یصح العقد۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی بہن عمرو کے نکاح میں ہے، پھر زید اپنی لڑکی کو بھی عمرو کے نکاح میں دینا چاہتا ہے، کیا شرعاً پھوپی اور بھتیجی ایک شخص کے نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں؟

الجواب

پھوپی اور بھتیجی کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ محرمات بالجمع میں ہے، و فلا یجوز الجمع بین امرأة و عمتها نسبا او رضاعا و خالتها کذلک و نحوها۔ ہدایہ اولین مصطفائی صفحہ ۲۸۸ میں ہے، و لا یجمع بین المرأة و عمتها او خالتها۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

علمائے دین مندرجہ مسائل خلافیہ بین الاحناف و الشوافع کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ ہر مذہب کے مفتیٰ بہٖ اقوال ہیں یا نہیں؟

۱۔ الولی رکن عند الشافعی، و عند الإمام الأعظم لیس هو رکن و لا یشترط۔

۲۔ عند الإمام الشافعی یشترط فی الشهود تسعة شروط، و عند الإمام الأعظم لا یشترط الإسلام فی نکاح المسلمة لا الذمیة۔

۳۔ عند الإمام الشافعی لا ولایة للمرأة علی نفسها و لا غیرها، و عند الإمام الأعظم تلی المرأة نفسها و غیرها۔

۴۔ عند الإمام الشافعی لا ولایة للأم، و عند الإمام الأعظم تلی الأم قبل البلوغ۔

۵۔ عند الإمام الشافعی اذا غاب الولی الأقرب مسافة القصر زوّج الأبعد و ان لم ینقطع خبره و

عند الإمام الأعظم اذا كانت الغيبة منقطعة انتقلت للأبعد و الانقطاع اذا كان بمحل لا تصل اليه القافلة الا في السنة مرة ۔

۲ ۔ عند الإمام الشافعي لا يصح نكاح المحرم بحال ، و عند الحنفي يصح نكاح المحرم و ان كانت الزوجة محرمة ۔

۴ ۔ عند الشافعي للأب و الجد تزويج البكر صغيرة و كبيرة بغير رضاها و عند الحنفي ليس للأب و الجد ان يزوج البالغة الا برضاها ۔

۵ ۔ عند الشافعي لا يجوز لغير الأب و الجد ان يزوّج الصغيرة حتى تبلغ و عند الحنفي يجوز لسائر العصبات ان يزوّج الصغيرة بغير رضاها ؟ بينوا توجروا ۔

الجواب

مسائل مندرجۂ بالا ، کتب شوافع میں دیکھے گئے ۔ مسئلہ نمبر ۵ کے سوا باقی سب درست ہیں ۔ نمبر ۵ جس طرح لکھا گیا ہے مُفتیٰ بِہٖ نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں مُفتیٰ بِہٖ اور اصح قول یہ ہے : اذا غاب الولي الأقرب مسافة القصر انتقلت الولاية الى الحاكم لا الى الأبعد في الأصح ۔ كذا في بغية المسترشدين صفحه ۲۰۸ ۔

مسائل مندرجۂ بالا ، کتب احناف میں دیکھے گئے ، مسئلہ نمبر ۲ کے سوا باقی تمام مسائل جس طرح لکھے گئے ہیں مُفتیٰ بِہٖ اور اصح نہیں ہیں ، اس لئے ہر ایک مسئلہ کے متعلق مُفتیٰ بِہٖ و اصح قول مع حوالہ درج ذیل ہے :

۱ ۔ عند الإمام الأعظم الولي شرط لصحة نكاح صغيرة و مجنون و رقيق لا مكلفة ۔ قال في الدر المختار المطبوع على حاشية رد المحتار الجزو الثاني باب الولي : و هو اي الولي شرط صحة نكاح صغيرة و مجنون و رقيق لا مكلفة فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا الولي ۔

۲ ۔ عند الإمام الأعظم يشترط إسلام الشهود في نكاح المسلمة لا الذمية ۔ في الدر المختار كتاب النكاح ، و شرط حضور الشاهدين حرين مكلفين سامعين قولهما معا فاهمين انه نكاح مسلمين لنكاح مسلمة ۔ في رد المحتار قيد بقوله مسلمين احترازا عن نكاح الذمية فانه لو تزوجها عند ذميين صح ۔

۳ ۔ عند الإمام الأعظم تلي الحرة المكلفة نفسها لا المجنونة و الصغيرة و الأمة ۔ في الدر المختار باب الولي ، و الأصل ان كل من تصرف في ماله تصرف في نفسه و ما لا فلا ۔

۴ ۔ عند الإمام الأعظم تلي الأم اذا لم يكن عصبة ۔ في الدر المختار باب الولي ، فان لم يكن عصبة فالولاية للأم ۔

۵ ۔ صرّح في الهداية ان الغيبة المنقطعة ان يكون الولي في بلد لا تصل اليه القوافل في

السنة الا مرة و قال هو اختيار القدوري لكن مختار اكثر المشايخ و اصح الأقاويل انه اذا كان الأقرب في موضع لو انتظر حضوره او استطلاع رأيه فات الكفوء الذي حضر فهذه غيبة منقطعة و يجوز للأبعد التزويج عندها قال في الدر المختار في باب الولي : (و للولي الأبعد التزويج بغيبة الأقرب مسافة القصر) ۔ و اختار في الملتقى ما لم ينتظر الكفوء الخاطب جوابه و اعتمده الباقاني و نقل ابن الكمال ان عليه الفتوى ۔ في رد المحتار و قال في الذخيرة الأصح انه اذا كان في موضع لو انتظر حضوره او استطلاع رايه فات الكفوء الذي حضر فالغيبة منقطعة و اليه اشار في الكتاب اه ۔ و في البحر عن المجتبیٰ و المبسوط انه الأصح ۔ و في النهاية و اختاره اكثر المشايخ و صححه ابن الفضل ۔ و في الهداية انه اقرب الى الفقه ۔ و في فتح القدير انه الأشبه بالفقه و انه لا تعارض بين اكثر المتأخرين و اكثر المشايخ اى لأن المراد من المشايخ المتقدمون ۔ و في شرح الملتقیٰ عن الحقائق انه اصح الأقاويل و عليه الفتویٰ و عليه مشیٰ في الاختيار و النقاية و يشير كلام النهر الى اختياره و في البحر الأحسن الافتاء بما عليه اكثر المشايخ ۔

۶ ۔ عند الحنفي ليس للولي عصبة كان او غيره ان يزوج البالغة الا برضاها ۔ في الدر المختار في باب الولي : و لا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ ۔

۷ ۔ عند الحنفي يجوز لغير الأب و الجد انكاح الصغير و الصغيرة جبرا اذا كان النكاح من الكفوء و بغير غبن فاحش و الا لا يصح اصلا ۔ و قال في باب الولي صفحه ۳۳۳ و ان كان المزوِّج غيرهما اى غير الأب و ابيه و لو الأم او القاضي او وكيل الأب لا يصح النكاح من غير كفوءٍ او بغبنٍ فاحشٍ ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نکاح فاسد سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی یا نہیں ؟

الجواب

نکاح فاسد کے بعد اگر منکوحہ سے وطی یعنی ہم بستری کی جائے تو حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے ۔ یعنی موطوءہ کی ماں وغیرہ وطی کرنے والے پر حرام ہوجاتی ہے ۔ بغیر وطی کے محض نکاح فاسد سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ۔ رد المحتار باب المحرمات میں ہے : و كذا تثبت حرمة المصاهرة لواطئِ المنكوحة فاسدا ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب محرمات صہریہ میں ہے : و تثبت حرمة المصاهرة بالنكاح الصحيح دون الفاسد كذا في محيط السرخسي فلو تزوجها نكاحا فاسدا لا تحرم عليه امها بمجرد العقد بل بالوطئِ هكذا في البحر الرائق و تثبت بالوطئ حلالا كان او عن شبهة او زنا كذا في فتاویٰ قاضيخان ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و ہندہ دونوں امامیہ مذہب رکھتے ہیں ۔ ان دونوں کا نکاح حسب رواج بلدہ ، سرکاری نائب قاضی کے ذریعہ سے مذہب حنفی کے موافق منعقد ہوا ۔ اس کے بعد مذہب امامیہ کے مجتہد کے ذریعہ دوبارہ نکاح کرنے سے زید کو انکار ہے ۔ کیا نائب قاضی سرکاری حنفی کا منعقد کیا ہوا نکاح از روئے مذہب امامیہ کافی سمجھا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب

شیعہ امامیہ کے مذہب میں انعقاد نکاح کیلئے ایجاب و قبول کے وہی الفاظ ہیں ، جو مذہب حنفی میں ہیں ۔ اور جس طرح عاقلہ و بالغہ کیلئے حنفیوں کے پاس ولایت شرط نہیں ہے ، ایسا ہی مذہبِ امامیہ میں بھی شرط نہیں ہے ۔ زوج و زوجہ کا انعقاد نکاح کیلئے دوسرے شخص کو اپنا وکیل مقرر کرنا جیسا کہ مذہب حنفی میں جائز ہے ، ویسا ہی مذہب امامیہ میں بھی جائز ہے ۔ زوج و زوجہ کا اشارہ یا نام یا اوصافِ خاصّہ سے معیّن ہونا جس سے اشتباہ رفع ہو اور اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ فلاں ناکح ہے اور فلاں منکوحہ ، یہ شرط بھی مذہب امامیہ میں مذہب حنفی کے موافق ہے ۔ اگرچہ مذہب امامیہ میں اس شخص کیلئے جو عربی الفاظ کہہ سکتا ہے ایجاب و قبول کے الفاظ عربی زبان میں کہنا شرط ہے ، مگر بعض فقہاء امامیہ نے اس کو بھی مستحب بتا کر بغرض سہولت یہ اجازت دیدی ہے کہ ناکح و منکوحہ اپنی زبان میں ایجاب و قبول کرسکتے ہیں ، اور یہی حنفیوں کا مذہب ہے ۔ الروضۃ البہیّۃ شرح اللمعۃ الدمشقیۃ فقہ شیعہ امامیہ کی جلد ۱ صفحہ ۲۹۸ فصل ثانی فی العقد میں ہے : و یعتبر اشتماله علی الإیجاب و القبول اللفظین کغیره من العقود اللازمة فالإیجاب زوّجتُکَ و اَنکحتُکَ و متّعتُکَ لا غیر و القبول قبلتُ التزویج او النکاح او تزوجت او قبلت مقتصرا علیه من غیر ان یذکر المفعول کلاهما بلفظ الماضی ۔ و لا یشترط تقدیم الإیجاب علیٰ القبول لأن العقد هو الإیجاب و القبول و الترتیب کیف اتفق غیر مخل بالمقصود ۔ اور صفحہ ۲۹۹ میں ہے : و یجوز تولی المرأۃ العقد عنها و عن غیرها ایجابا و قبولا و لا یشترط الشاهدان فی النکاح الدائم و لا الولی فی النکاح الرشیدۃ و ان کان افضل علیٰ الأشهر ۔ اس صفحہ کے بعد مسائل متفرقہ میں ہے : و یصح توکیل کل من الزوجین فی النکاح لأنه مما یقبل النیابة و لا یختص غرض الشارع بایقاعه من مباشر معین ۔ صفحہ ۲۹۹ میں ہے : و یشترط تعیین الزوج و الزوجة بالإشارة او بالاسم او الوصف الرافعین للاشتراک ۔ صفحہ ۲۹۸ میں ہے : و لا یجوز العقد ایجابا و قبولا بغیر العربیة مع القدرة علیها لأن ذلک هو المعهود من صاحب الشرع کغیره من العقود اللازمة بل اولیٰ و قیل ان ذلک مستحب لا واجب لأن غیر العربیة من اللغات من قبیل المترادف یصح ان یقام مقامه و لأن الغرض ایصال المعانی المقصودة الیٰ فهم المتعاقدین فیتأدی بأی لفظٍ اتفق ۔

پس جبکہ روایات سابقہ کے لحاظ سے انعقاد نکاح کی شروط میں امامیہ و حنفیہ کے پاس فرق نہیں ہے تو صورت مسئولہ میں سرکاری نائب قاضی کے ذریعہ سے جو نکاح کہ مذہب حنفی کے طریقہ پر ہوا ہے وہ مذہب امامیہ کے موافق ہے ، اس کے بعد دوسرے نکاح کی ضرورت نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ماں کے حقیقی چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب

درست ہے ، جیسا کہ آیتِ کریمہ " وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ " سے ثابت ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر اگر اپنی نابالغہ زوجہ کے ساتھ جس کی عمر دس سال کی ہے صحبت کرے تو کیا یہ فعل شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

کمسن نابالغ لڑکی سے صحبت کرنے کیلئے شرع میں لڑکی کی طاقت و قوت کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اگر لڑکی صحبت کی طاقت رکھتی ہے تو درست ہے ، ورنہ نہیں ۔ طاقت کا اندازہ لڑکی کی جسامت پر ہے ، اگر لڑکی جسامت میں بھاری اور جماع کی متحمل ہے تو شوہر اس سے صحبت کرسکتا ہے ۔ البحر الرائق جلد ۳ باب المہر میں ہے : و لیس لہ ان یدخل بھا قبل ان تطیقہ و قدّر بالبلوغ و قیل بالتسع و الاَولیٰ عدم التقدیر ۔ رد المحتار جلد ۲ بابِ المہر میں ہے : قدرت الإطاقۃ بالبلوغ و قیل بالتسع و الاَولیٰ عدم التقدیر ۔ رد المحتار جلد ۲ باب النفقہ میں ہے : و اشار الیہ ما فی الزیلعی من تصحیح عدم تقدیرہ بالسنّ فان السمینۃ الضخیمۃ تحتمل الجماع و لو صغیرۃ السن ۔ پس صورت مسئولہ میں لڑکی عورتوں کو دکھائی جائے ، اگر وہ اس کے جسم و قویٰ کے لحاظ سے یہ کہہ دیں کہ اس میں جماع کی طاقت ہے تو شوہر کا فعل درست ہے ، ورنہ نہیں ۔ رد المحتار جلد ۲ باب المہر میں ہے : و لو قال الزوج تطیقہ و اراد الدخول و انکر الأب فالقاضی یُرِیھا النساء و لم یعتبر السن کذا فی الخلاصۃ ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی کمسن لڑکی کی پرورش جو اس کی زوجہ مرحومہ کے بطن سے ہے اپنی زندگی تک دوسری زوجہ فاطمہ کے پاس کروائی ، اور بوقتِ انتقال یہ وصیت کی کہ فاطمہ اور اس کا باپ بلوغ تک اس کی پرورش کرکے بعد بلوغ بکر کے فرزند سے اس کا عقد کردیں ۔ لڑکی تا حال

دونوں وصیوں کے پاس ہے۔ مگر لڑکی کے حقیقی نانا نے بطور خود وصیوں کی اطلاع کے بغیر قبل از بلوغ اپنی ولایت سے اس کا نکاح ایک اجنبی شخص سے کردیا۔ کیا یہ نکاح صحیح ہے؟ اور کیا نانا کو شرعاً ایسا حق حاصل ہے؟

الجواب

وصی کو وصی ہونے کی حیثیت سے نابالغ لڑکی کا نکاح کردینے کو حق نہیں ہے۔ در مختار کی کتاب النکاح باب اول میں ہے: و لیس للوصی من حیث ھو وصی ان یزوج الیتیم مطلقاً و ان اوصیٰ الیہ الأب بذلک علیٰ المذھب، نعم لو کان قریبا او حاکماً بملکہ بالولایۃ کما لا یخفی۔ عصبات اور ماں وغیرہ نہ ہونے کی صورت میں نانا ولی ہے۔ صفحہ ۳۲۰ میں ہے: فان لم یکن عصبۃ فالولایۃ للام ثم لأم الأب و فی القنیۃ عکسہ ثم للبنت ثم لبنت الابن ثم لبنت البنت ثم لبنت ابن الابن ثم لبنت بنت البنت و ھکذا ثم للجد الفاسد۔ باپ دادا کے سوا دوسرا ولی اگر نابالغ لڑکی کا نکاح غیر کفوء سے یا کم مہر مثل کے ساتھ کرادے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے۔ در مختار کے باب الولی میں ہے: و ان کان المزوّج غیرھما ای غیر الأب و الجد و لو الأم او القاضی او وکیل الأب لا یصح النکاح من غیر کفوء او بغبن فاحش اصلا و ان کان من کفوء و بمھر المثل صح۔ اور اگر کفوء کے ساتھ مہر مثل پر کرادے تو نکاح صحیح ہوگا، مگر بعد بلوغ لڑکی کو اس کے فسخ کروانے کا اختیار رہےگا۔ در مختار میں اسی جگہ ہے: (و لکن لھما) ای لصغیر و صغیرۃ و ملحق بھما (خیار الفسخ) و لو بعد الدخول (بالبلوغ او العلم بالنکاح بعدہ)۔ پس صورت مسئولہ میں نانا نے جو نکاح کرایا ہے اگر کفوء کے ساتھ مہر مثل پر کروایا ہے تو یہ نکاح صحیح ہے، مگر لڑکی کو بعد بلوغ فسخ کا اختیار ہے اور اگر غیر کفوء کے ساتھ یا مہر مثل سے کم مہر پر نکاح کروایا ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے۔ وصی کو چونکہ نکاح کی ولایت کا حق نہیں ہے اس لئے اس کی رضامندی کوئی چیز نہیں ہے اگرچیکہ باپ نے اس کو وصی بنایا ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ہندہ سے اگر اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ ہندہ کو ہمیشہ اس کے والدین کے گھر میں رکھےگا، تو کیا بعد نکاح زید اس کی پابندی سے انحراف کرسکتا ہے؟ اور در صورت انحراف کیا نکاح میں کوئی فساد لازم آتےگا؟

اور اگر یہ اقرار نامہ لکھدے کہ اگر میں اس شرط سے پلٹ جاؤں تو زوجہ مطلقہ ہوجائےگی تو کیا پلٹ جانے پر طلاق ہوگی؟

الجواب

ایسی شروط کی پابندی شرعاً واجب نہیں ہے، البتہ بلحاظ تقویٰ و پرہیزگاری وعدہ کو پورا کرنا چاہیے۔ اگر

کوئی وعدہ خلافی کرکے شرط کی پابندی نہ کرے تو اس سے نکاح فاسد نہیں ہوتا۔ البتہ پابندی شرط کو طلاق سے معلق کرنے کی صورت میں عدم بجا آوری شرط سے طلاق ضرور واقع ہوگی۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ میں ہے : و لکن لا یبطل النکاح بالشروط الفاسدۃ و انما یبطل الشروط دونہ یعنی لو عقد مع شرط فاسد لم یبطل النکاح بل الشروط ۔ عینی شرح بخاری جلد ۹ صفحہ ۳ میں ہے : و اختلف العلماء فی الرجل یتزوج المرأۃ و تشترط ان یخرجھا من دارھا و لا یتزوج علیھا و نحو ذلک من الشروط المباحۃ علی قولین الثانی ان یؤمر الزوج بتقویٰ اللہ و الوفاء بالشرط و لا یحکم علیہ بذلک حکما و ان ابیٰ الخروج لھا کان احق الناس بأھلہ ۔ در مختار جلد ۲ کتاب الطلاق میں ہے : و تنحل الیمین بعد وجود الشرط مطلقا لکن ان وجد فی الملک طلقت ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو باکرہ سمجھکر اس کے ساتھ نکاح کیا۔ نکاح و صحبت کے چار ماہ بعد ہندہ کی زچگی ہوئی اور لڑکی صحیح و سالم پیدا ہوئی، جس سے یقین ہے کہ ہندہ نکاح کے قبل حاملہ تھی۔ ایسی حالت میں زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ درست ہوا یا نہیں ؟ اور کیا زید پر مہر واجب الاداء ہے ؟ اور نکاح صحیح نہ ہونے کی صورت میں زید ہندہ سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ہندہ کو قبل از نکاح زنا سے حمل تھا تو زید کا نکاح اس کے ساتھ درست ہے، مگر زید نے بعد نکاح جو اس سے صحبت کی ہے وہ حرام تھی۔ در مختار کے کتاب النکاح میں ہے : و صح نکاح حُبلیٰ من زنا لا حبلیٰ من غیرہ ای الزنا لثبوت نسبہ و ان حرم وطؤھا و دواعیہ ۔ اگر ہندہ کا زنا سے حاملہ ہونا ثابت نہ ہو تو زید کا نکاح اس کے ساتھ درست نہیں ہوا۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ میں ہے : ھذا ما لم تلد لأقل من ستۃ اشھر من وقت العقد فلو ولدتہ لأقل لم یصح العقد کما صرحوا بہ ای لاحتمال علوقہ من غیر الزنا بأن یکون بشبھۃ فلا یرد صحۃ تزوج الحبلیٰ من زنا ۔ ہندہ کا حمل اگر زنا سے ثابت ہوجائے تو ایسی حالت میں چونکہ زید کا اس سے نکاح صحیح ہے اس لئے ہندہ تا حال زید کی زوجہ ہے، جدید نکاح کی حاجت نہیں ہے۔ زید اگر آئندہ ہندہ کو طلاق دے گا تو صحبت کی وجہ سے پورا مہر دینا ہوگا، کیونکہ بعد نکاح باکرہ نہ پائے جانے سے مہر میں کوئی کمی نہیں آتی۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب النکاح باب العدۃ میں ہے : اذا دخل الرجل بالمرأۃ علی وجہ شبھۃ او نکاح فاسد فعلیہ المھر و لھا العدۃ ۔

رد المحتار کتاب النکاح باب العدۃ میں ہے : و لو شرط البکارۃ فوجدھا ثیبا لزمہ الکل ۔ درر، وضحہ فی البزازیۃ ۔ عالمگیریہ جلد ا باب المہر میں ہے : رجل تزوج امرأۃ علیٰ انھا بکر فدخل بھا فوجدھا غیر بکر فالمھر واجب بکمالہ کذا فی التجنیس ۔ اگر ہندہ کا حمل زنا سے ثابت نہ ہو تو زید کا

نکاح اس سے چونکہ صحیح نہیں ہوا ، اس لئے چاہئے کہ فوراً اس سے علیحدہ ہوجائے ۔ اور صحبت کرنے کی وجہ سے اس کو مہر مثل یعنی ہندہ کے باپ کے خاندان کی عورتوں کا مہر دینا پڑیگا ۔ بشرطیکہ مہر مثل اور مہر مسمیٰ یعنی مہر مقرر بر وقت نکاح سے کم یا اس کے برابر ہو ، اگر زائد ہو تو پھر مہرِ مسمی ہی دینا پڑیگا ۔ ایسی حالت میں زید ہندہ سے دوبارہ عقد کرسکتا ہے ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب المہر میں ہے : (و یجب مہر المثل فی نکاح فاسد بالوطیٔ لا بغیرہ) کالخلوۃ لحرمۃ وطئہا (و لم یزد) مہر المثل (علی المسمی) لرضاہا بالحط و لو کان دون المسمیٰ لزم مہر المثل لفساد التسمیۃ بفساد العقد ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی زوجہ کے انتقال کے بعد اپنی حقیقی سالی کی لڑکی سے عقد کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

کرسکتا ہے ، جیسا کہ آیتِ کریمہ " وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ " سے ثابت ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حدیث شریف " النکاح سنتی " " فمن رغب عن سنتی فلیس منی " کے متعلق زید کا بیان ہے کہ اس میں " فمن رغب " کی جگہ " فمن لم رغب " چاہئے ۔ لفظ " لم " کے نہ ہونے سے معنی غلط ہوتے ہیں ۔ کیا زید کا یہ بیان درست ہے ؟

الجواب

زید کا بیان درست نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ زید قواعدِ علمِ صرف سے قطعاً ناواقف ہے ۔ کیونکہ "رغب" ماضی کا صیغہ ہے جس پر "لم" حرفِ جازم نہیں آتا ۔ اور "رغب" کے بعد جب "عن" آتے تو اس کے معنی اعراض و روگردانی کے ہوتے ہیں ۔ فقہ و حدیث کی معتبر کتابوں میں یہ حدیث "عن" کے صلہ کے ساتھ آئی ہے ۔ بخاری شریف مجتبائی جلد ۲ صفحہ ۷۵۷ کتاب النکاح میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی طویل حدیث میں ہے : اما واللہ انی لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ و اَتقاکُمْ لَہٗ لکن اَصوم و اُفطِر و اُصلّی و ارقُد و اتزوّج النساءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنّتی فَلَیسَ مِنّی ۔ مبسوط سرخسی کی جلد ۳ صفحہ ۱۹۳ کتاب النکاح میں ہے : و قال صلی اللہ علیہ و سلم النکاح سنتی ۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی ۔ تبیین الحقائق جلد ۲ صفحہ ۹۵ کتاب النکاح میں ہے : و قال علیہ السلام النکاح سنتی ۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حقیقی ماموں ولیِ نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر لڑکی کے عصبات اور ماں ، بہن ، نانا ، اخیافی بھائی اور ان کی اولاد اور پھوپی نہیں ہے تو ماموں لڑکی کا ولی نکاح ہوسکتا ہے ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب الولی میں ہے : الولی فی النکاح العصبة بنفسه بلا واسطة انثی علی ترتیب الإرث و الحجب ۔ اس کے بعد صفحہ ۳۲۰ میں ہے : فان لم یکن عصبة فالولایة للأم ثم لأم الأب ۔ پھر آگے ہے : ثم للجد الفاسد ثم للأخت لأب و أم ثم للأخت لأب ثم لولد الأم الذكر و الأنثیٰ سواء ثم لأولادهم ثم لذوی الأرحام العمات ثم الأخوال ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لڑکی اپنی رضامندی سے کسی غیر کفوء والے مرد سے نکاح کرلے اور بعض ولی بھی اس پر راضی ہوں تو کیا دوسرے اولیاء کو اس پر اعتراض کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب

جو ولی کہ ناراض ہے اگر راضی ہونے ولیوں سے اوپر کے درجہ کے ہیں تو بےشک ان کو روکنے کا اور فسخ کرانے کا حق ہے ۔ اور جو کہ ان کے مساوی یا کم درجہ کے ہیں ان کو کوئی حق نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب الکفاءۃ میں ہے : و اذا زوجت نفسها من غیر کفوء و رضی به احد الأولیاء لم یکن لهذا الولی و لا لمن مثله او دونه فی الولایة حق الفسخ و یکون ذلک لمن فوقه كذا فی فتاویٰ قاضیخان و كذا اذا زوّجها احد الأولیاء برضاها كذا فی محیط السرخسی ۔ اسی صفحہ میں ہے : و ان كان الأولیاء الذین باشروا عقد النکاح برضاها و لم یعلموا انه كفوء او غیر كفوء فلا خیار لواحد منهما ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے کفر کی حالت میں ایک مسلمان عورت سے زنا کیا ۔ اب مسلمان ہوکر اس عورت کی لڑکی ہندہ سے جو اس کے شوہر کے صلب سے ہے نکاح کرنا چاہتا ہے ۔ کیا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

زانی چاہے کفر کی حالت میں زنا کرے یا اسلام کی، ہر حالت میں اس پر اس کی زنا کی ہوئی عورت کی لڑکی حرام ہے۔ عالمگیریہ کتاب النکاح باب المحرمات میں ہے: فمن زنا بامرأة حرمت علیه امها و ان علت و ابنتها و ان سفلت۔ فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۱۹ باب المحرمات میں ہے: و قد روی اصحابنا احادیث کثیرة منها قال رجل یا رسول اللّٰه انی زنیت بامرأة فی الجاهلیة أ فأنکح ابنتها؟ قال لا اری ذلک و لا یصلح ان تنکح امرأة تطلع من ابنتها علی ما تطلع علیه منها۔ و اللّٰه اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے حقیقی یا علاتی بھائی کی زوجہ سے یا حقیقی چچا یا ماموں کی زوجہ سے ان کے انتقال یا طلاق دینے کے بعد نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

کرسکتا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ "وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" سے ثابت ہے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی لڑکی کا نکاح اپنے حقیقی چچازاد بھائی کے ساتھ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

کرسکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنی صاحبزادی سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنھا کا نکاح اپنے حقیقی چچا زاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے فرمادیا تھا۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بہ وقت نکاح مہر میں جبکہ "معجل" یا "مؤجل" کی صراحت نہ کی جائے تو شرعاً کونسا مہر سمجھا جائے گا؟

الجواب

ایسے وقت میں عرفِ بلد یعنی شہر کے رواج کا اعتبار کیا گیا ہے۔ حیدرآباد میں چونکہ مہرِ مؤجل کا رواج ہے جس کی میعاد شرع میں طلاق یا موت ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی مہرِ مؤجل ہی سمجھا جائے گا۔

تبیین الحقائق جلد ۲ صفحہ ۱۵۵ باب المہر میں ہے : اعلم ان المھر المذکور ھٰھنا ما تعورف تعجیلہ حتیٰ لا یکون لھا ان تحبس نفسھا فیما تعورف تأجیلہ الیٰ المیسرۃ او الموت او الطلاق و لو کان حالا لأن المتعارف کالمشروط و ذٰلک تختلف باختلاف البلد و الأزمان و الأشخاص ھذا اذا لم ینصا علی التعجیل او التأجیل ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۶۸ باب المہر میں ہے : ان لم یبین تعجیلہ او تعجیل بعضہ فلھا المنع لأخذ ما یعجل لھا منہ عرفاً و فی الصیرفیۃ الفتویٰ علیٰ اعتبار عرف بلدھما من غیر اعتبار الثلث او النصف و فی الخانیۃ یعتبر التعارف لأن الثابت عرفاً کالثابت شرطاً ۔

فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۸ میں ہے : و ان لم یشترط تعجیل شیء بل سکتوا عن تعجیلہ او تأجیلہ فان کان عرف فی تعجیل بعضہ و تأخیر باقیہ الیٰ الموت و المیسرۃ او الطلاق فلیس لھا ان تحتبس الا الیٰ تسلیم ذٰلک القدر قال فی فتاویٰ قاضی خان فان لم یبینوا قدر المعجل ، ینظر الی المرأۃ و الیٰ المھر انہ کم یکون المعجل لمثل ھذہ المرأۃ و الیٰ المھر انہ کم یکون المعجل لمثل ھذہ المرأۃ من مثل ھذا المھر فیعجل ذٰلک و لا یتقدر بالربع و الخمس بل یعتبر المتعارف فان الثابت عرفا کالثابت شرطا ۔ اسی صفحہ میں ہے : بل المعتبر فی المسکوت العرف ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بدفعلی کی نیت سے اپنی ساس کا ہاتھ پکڑا پھر اس کے ساتھ زنا کیا، کیا ایسی صورت میں زید کی زوجہ اس پر حرام ہوجائے گی اور اس کے نکاح سے خارج ہوگی ؟

الجواب

ساس کے ساتھ بدفعلی کرنے سے زوجہ حرام ہوجاتی ہے ۔ چاہیئے کہ زید اپنی زوجہ کا مہر دیکر اس سے علیحدہ ہوجائے ، اور زوجہ عدت ختم ہونے کے بعد دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب المحرمات میں ہے : فمن زنیٰ بامرأۃ حرمت علیہ امھا و ان علت و ابنتھا و ان سفلت ۔ اس کے بعد ہے : و کما تثبت ھذہ الحرمۃ بالوطء تثبت بالمس و التقبیل و النظر الی الفرج بشھوۃ کذا فی الذخیرۃ ۔ اس کے صفحہ میں ہے : لو اقر بحرمۃ المصاھرۃ یؤاخذ بہ و یفرق بینھما ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حنفی مذہب مرد ، غیر مقلد لڑکی کے ساتھ عقد کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

اہلِ ہوا و بدمذہب اشخاص کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں فقہاء نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ

اگر ان کے اعتقادات کفر کی حد تک پہنچ گئے ہیں تو ان سے نکاح کرنا درست نہیں ، ورنہ جائز ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح میں ہے ، لا یجوز نکاح المجوسیات و لا الوثنیات الخ ۔ اس کے بعد ہے : و یدخل فی عبدۃ الأوثان عبدۃ الشمس و النجوم و الصور التی استحسنوھا و المعطلۃ و الزنادقۃ و الباطنیۃ و الاباحیۃ و کل مذھب یکفر بہ معتقدہ کذا فی فتح القدیر ۔ غیر مقلدین جو مطلق ائمہ اربعہ کی تقلید کے منکر ہیں چونکہ اہلِ سنت کے مخالف ہیں اس لئے ان کے ساتھ مناکحت کرنے سے احتراز مناسب ہے ، جیسا کہ مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ نے فتاویٰ عزیزیہ کے صفحہ ۱۲ میں لکھا ہے : انعقاد بایں فرقہ موجب مفاسدہائے بسیار میگردد ، مثل بد مذہب شدن اہلِ خانہ و اولاد و عدم موافقت صحبت و غیر ذلک پس احتراز از آں واجب است ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ شوہر کے مکان میں بیمار ہوکر علاج کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس گئی ، صحت کے بعد اب شوہر کے مکان میں آنے سے انکار کررہی ہے ۔ ہندہ کے ماں باپ وغیرہ کا بیان ہے کہ ہم ہندہ کو شوہر کے مکان میں اس وجہ سے نہیں بھیجتے کہ اس کے والدین ہندہ کو کھانے کپڑے وغیرہ کی تکلیف دیتے ہیں ، اگر شوہر خود ہمارے مکان میں ہندہ کے ساتھ رہے تو مناسب ہے ۔ شوہر چاہتا ہے کہ ہندہ کو اپنے والدین کے مکان میں ایک علیحدہ حجرہ دیکر اس کی تمام ضروری حوائج کا انتظام کرکے رکھے ۔ ایسی حالت میں کیا شوہر کی مرضی کے مطابق عمل کرنا لازم ہے یا ہندہ کے والدین کے منشاء پر عمل ہو؟

الجواب

شوہر جبکہ ہندہ کو علیحدہ حجرہ میں تمام حوائج ضروری کا انتظام کرکے رکھنا چاہتا ہے تو ایسی حالت میں ہندہ اور اس کے اقارب کو شوہر کے منشاء کے خلاف کسی مطالبہ کا حق نہیں ہے ۔ چاہئے کہ ہندہ علیحدہ حجرہ میں اپنا سامان منتقل کرکے تنہا رہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ فصل السکنیٰ میں ہے : امرأۃ ابت ان تسکن مع ضرتھا او مع أحمائھا کأمہ و غیرھا فان کان فی الدار بیوت و فرّغ لھا بیتا و جعل لبیتھا غلقاً علیحدۃ لیس لھا ان تطلب من الزوج بیتا آخر فان لم یکن فیھا الا بیت واحد فلھا ذلک ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک ہندو عورت جو رذیل قوم کی فاحشہ تھی ، اس نے مسلمان ہوکر ایک مسلمان مرد سے نکاح کرلیا ہے ۔ مرد کے قرابت دار بوجہ شرافتِ نسبی اس کو ذلیل جانتے ہیں ، اور اس کے ساتھ اختلاط اور ارتباط نہیں رکھتے ، اور اس کو اپنی محفلوں میں شریک نہیں کرتے ۔ کیا اہل قرابت کا یہ فعل شرعاً درست ہے ؟ اور کیا شرافتِ نسبی اسلامی شرافت سے بڑھکر ہے ؟

الجواب

مرد کے قرابت داروں کا فعل شرعاً درست نہیں ہے۔ کیونکہ جب کوئی کافر مسلمان ہوجاتے تو وہ شرافت اسلامی کی وجہ سے دیگر تمام مسلمانوں کا بھائی ہوجاتا ہے۔ ارشاد باری ہے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" پس ایک بھائی دوسرے بھائی کو کسی طرح کم درجہ اور ذلیل نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ غریب صحابہ جو کہ اسلام سے قبل غلام تھے، اسلام لانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم ان کو دوسرے تمام خاندانی شریف النسل صحابہ کے برابر مجلسوں میں جگہ دیتے تھے۔ بلکہ ان کے تقویٰ و پرہیزگاری کی وجہ سے مالدار ذی عزت اصحاب سے ان کو افضل و بہتر جانتے تھے۔ مشرکین عرب کے چند رؤساء نے آپ سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ کے پاس بلال و صہیب و عمار جیسے ذلیل لوگوں کا مجمع رہتا ہے اس لئے ہم کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے شرم آتی ہے۔ اگر یہ ہٹا دیے جائیں تو ہم حاضر ہونگے! جب آپ نے فرمایا کہ: مسلمانوں کو میں کبھی اپنے سے جدا نہیں کرسکتا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ آپ کم از کم اتنا کریں کہ ایک دن ان کی ملاقات کا رکھیں اور ایک دن ہماری ملاقات کا۔ اس پر آپ راضی ہوگئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا کہ ایسا معاہدہ ان کو لکھکر وثیقہ دے دیا جائے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی " وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" یعنی آپ ان لوگوں کو جو کہ اللہ پاک کو صبح و شام خالصاً لوجہ اللہ پکارتے ہیں اپنے پاس سے نہ بھگائیے۔ ان کا حساب آپ کے ذمہ نہیں ہے اور نہ آپ کا حساب ان پر ہے۔ اگر آپ ان کو چلادینگے تو ظالم ہوجائیں گے۔ پس اس آیت کریمہ کے نازل ہوتے ہی آپ نے اس کاغذ کو جو کہ ترتیب معاہدہ کے لئے لکھا گیا تھا پھینک دیا۔ اور بلال و صہیب و عمار وغیرہ جو کہ اس گفت و شنید سے متاثر ہوکر آپ سے دور علیحدہ گوشہ میں بیٹھ گئے تھے آپ فوراً ان کے پاس تشریف لائے اور گلے سے لگا کر ان کی دلجوئی فرمائی۔ تفسیر مدارک میں اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے: نزلت فی الفقراء بلال و صهیب و عمار و أحزابهم حین قال رؤساء المشرکین لو طردت هؤلاء السقاط لجالسناک فقال علیه السلام ما انا بطارد المؤمنین فقالوا اجعل لنا یوما و لهم یوما و طلبوا بذلک کتابا فدعا علیا رضی الله عنه لیکتب فقام الفقراء و جلسوا ناحیة فنزلت فرمیٰ علیه السلام بالصحیفة و اتیٰ الفقراء فعانقهم۔

اگرچہکہ شریعت میں کفو کیلئے انساب کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر یہ محض دنیاوی مصلحتوں کے لئے ہے نہ کہ اخروی۔ امام کردری صاحب فتاویٰ بزازیہ نے مناقب امام اعظم رضی اللہ عنہ کی جلد ۲ صفحہ ۲۴۰ میں لکھا ہے: بل امر اشتراط الکفاءة لتحقق المقاصد المطلوبة من النکاح من انتظام المصالح و المعاش فان الزوج یعلو علیها بحکم المالکیة و هی تتعاظم بحکم ما فیها من الشرف و الدعة فلا یلتئم کل التصرف فانه المقصد الأصلی و الحکم الموضوع فلا یعادله ← ＝

انسان کی شرافت چونکہ خدائے تعالی کی اطاعت و پرہیزگاری سے ہے نسب سے نہیں ۔ اس لئے انسان کا نسب پر فخر کرنا نا مناسب و نا زیبا ہے ۔ سورہ حجرات میں خدائے پاک فرماتا ہے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ" اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو مگر خدا کے پاس بزرگ و برتر وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار و اطاعت گذار ہے ۔ تفسیر روح المعانی میں "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کی تفسیر میں لکھا ہے: تعلیل للنھی عن التفاخر بالأنساب المستفاد من الکلام بطریق الاستیناف الحقیقی کأنہ قیل ان الأکرم عند اللہ و الأرفع منزلۃً لدیہ عز و جل فی الآخرۃ و الدنیا ھو الإتقاء فان فاخرتم ففاخروا بالتقویٰ الخ ۔

اس آیت کریمہ کے شان نزول میں متعدد اقوال ہیں ۔ ایک روایت یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن بلال رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی چھت پر چڑھکر اذان دی جس پر حارث بن ہشام و عتاب بن اسید نے بگڑ کر کہا: یہ کالا غلام کعبہ پر چڑھکر اذان دے رہا ہے! جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ۔ اس دوران ثابت بن قیس آئے ، انھوں نے ثابت کو جگہ نہیں دی تو ثابت نے کہا کہ وہ فلا نی کے بیٹے! اس پر حضور نے ثابت کو ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ: تم کسی پر بجز دینداری اور پرہیزگاری کے فضیلت حاصل نہیں کرسکتے ۔ اس کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ۔ ایک روایت یہ ہے کہ ابو ہند رسول اللہ علیہ السلام کے حجام غلام تھے ، حضور نے بنی بیاضہ سے فرمایا کہ تم اپنے خاندان کی لڑکی سے ابو ہند کا عقد کردو ۔ جب بنی بیاضہ نے کہا کہ یا رسول اللہ علیہ السلام: کیا ہم اپنی لڑکیاں غلاموں کو دیں؟ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ۔ روح المعانی میں اسی جگہ ہے: روی انہ لما کان فتح مکۃ اذن بلال رضی اللہ عنہ علی الکعبۃ فغضب الحارث بن ھشام و عتاب ابن اسید و قالا أ ھذا العبد الأسود یؤذن علیٰ ظھر الکعبۃ! فنزلت ۔ و عن ابن عباس رضی اللہ عنھما سبب نزولھا قول ثابت بن قیس لرجل لم یفسح لہ عند النبی صلی اللہ علیہ و سلم: یا ابن فلانۃ! فوبّخہ النبی صلیٰ اللہ علیہ و سلم و قال انک لا تفضل احدا الا فی الدّین و التقویٰ و نزلت ۔ و اخرج ابو داود فی مراسیلہ و ابن مردویہ و البیھقی فی سننہ عن الزھری قال امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بنی بیاضۃ ان یزوّجوا ابا ھند امرأۃ منھم فقالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم أ نُزوّج بناتنا موالینا فانزل اللہ تعالیٰ "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی" الآیۃ ۔ قال الزھری نزلت فی ابی ھند خاصۃ و کان حجام النبی صلی اللہ علیہ و سلم ۔ و فی روایۃ ابن مردویہ من طریق الزھری عن عروۃ عن عائشۃ انہ علیہ السلام قال انکحوا ابا ھند و انکحوا الیہ و نزلت "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" الآیۃ فی ذلک ۔

امام بیہقی اور ابن مردویہ نے جابر بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے وسط ایام تشریق میں خطبۃ الوداع میں فرمایا ہے کہ: " اے لوگو! آگاہ ہوجاؤ کہ تمہارا رب ایک ہے ۔ کسی عربی کو

عجمی پر اور عجمی کو عربی پر ، کالے کو سرخ و سفید رنگ والے پر اور سرخ و سفید رنگ والے کو کالے رنگ والے پر کوئی فضیلت نہیں ہے ۔ اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو تقویٰ و پرہیزگاری سے ہے ۔ اللہ کے پاس بزرگ وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے ۔ دیکھو میں نے تمہیں خدا کا حکم پہنچادیا ہے ، پس چاہئے کہ موجودہ لوگ غائب اشخاص کو بھی یہ مضمون سنا دیں " ۔

امام بزار نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ : " تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے ، خبردار کوئی قوم اپنے باپ دادا پر فخر نہ کرے ورنہ وہ خدا کے پاس گوبر کے کیڑے سے بڑھکر ذلیل و خوار سمجھے جائیں گے " ۔ طبرانی و ابن مردویہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ : خدائے پاک قیامت کے دن کہے گا : " اے لوگو میں نے ایک نسب مقرر کیا اور تم نے بھی ایک نسب مقرر کیا ۔ میں نے اپنے پاس بزرگ اسی کو ٹھہرایا جو کہ پرہیزگار ہو مگر تم میرے ٹھہرائے ہوئے نسب سے انکار کرکے کہتے ہو کہ فلاں فلاں کا بیٹا ، فلاں فلاں سے بزرگ و برتر ہے ! پس میں آج اپنے ٹھہرائے ہوئے نسب کو بلند و برتر کرتا ہوں اور تمہارے بنائے ہوئے نسب کو ذلیل کرتا ہوں ۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میرے دوست پرہیزگار لوگ ہیں " ۔

روح المعانی میں اسی مقام پر ہے : و اخرج البیھقی و ابن مردویہ عن جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ قال خطبنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی وسط ایام التشریق خطبۃ الوداع فقال : یا ایھا الناس الا ان ربکم واحدٌ لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علیٰ عربی و لا لأسود علی احمر و لا لأحمر علی اسود الا بالتقویٰ ، ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم ۔ الا ھل بلغت ؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللّٰہ (علیہ السلام) ! قال : فلیبلغ الشاھد الغائب ۔

اس جگہ چند سطر بعد ہے : و اخرج البزار عن حذیفۃ قال قال رسول اللّٰہ علیہ السلام : کلکم بنو آدم و آدم خلق من تراب ، لینتھین قوم یفخرون بآبائھم او لیکونن اھون علیٰ اللّٰہ من الجعلان ۔ و اخرج الطبرانی و ابن مردویہ عن ابی ھریرۃ عن النبی علیہ السلام قال یقول اللّٰہ تعالیٰ یوم القیامۃ : ایھا الناس انی جعلت نسباً و جعلتم نسباً فجعلت اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم فأبیتم الا ان تقولوا فلان بن فلان و فلان اکرم من فلان و انی الیوم ارفع نسبی و اضع نسبکم ۔ الا ان اولیائی المتقون ۔ و اخرج الخطیب عن علی کرم اللّٰہ وجھہ نحوہ مرفوعا ۔

آیت کریمہ " اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ " الآیۃ ۔ کے سوا متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ خداوندِ عالم کے پاس علم و فضل و دینداری و پرہیزگاری کی عزت ، نسبی شرافت سے بدرجہا فائق ہے ۔ اس کے مقابل خاندانی عزت کوئی چیز نہیں ۔ بلکہ حقیقی بات یہ ہے کہ دنیا میں آج تک جتنے خاندان شریف سمجھے گئے ہیں اور ان کی عزت ہوتی ہے وہ محض ان کے آباء و اجداد کی اعلیٰ قابلیت و دینداری و نیکوکاری کی بدولت ہے ۔ عوام الناس جن بزرگوں کے اخلاقِ حسنہ و شائستہ عادات و اطوار و اعلیٰ فضل و کمال سے متاثر ہوکر زندگی میں ان سے فائدہ مند ہوتے اور ان کی عزت کرتے ہیں ان کی وفات کے بعد بھی ان کی

اولاد کو اسی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور شریف جانتے ہیں ۔ ورنہ بمخوائے احادیث سابقہ سب اولاد آدم ہیں جو خلقت میں یکساں ہیں ۔ مگر ان کی محض اعلیٰ قابلیت و لیاقت ذاتی ہے جو ان کو اوروں سے ممتاز بناتی ہے ۔ لقمان حکیم باوجود اس کے کہ ایک حبشی غلام تھے مگر خدائے پاک نے ان کو حکمت عطاء فرمائی اور حکیم کے نام سے مشہور ہوئے ، اور ان کے بعد ان کی زوجہ سے ان کا تمام خاندان ذی عزت ہوگیا ۔ نوح علیہ السلام کے لڑکے نے باوجود نبی کے فرزند ہونے کے دینداری و فرماں برداری خدا سے روگردانی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تا حال دنیا میں رسوا و ذلیل ہے ۔ شعر :

پسر نوح با بداں بنشست خاندان نبوتش گم شد
چو کنعاں را طبیعت بے ہنر بود پیمبر زادگی قدرش نیفزود

پس واضح ہوا کہ انسان کی ذاتی کوشش و سعی اور اس کا جوہر ذاتی باعث فخر و ناز ہوسکتا ہے نہ کہ فخر خاندانی ۔ تفسیر روح المعانی کے اسی صفحہ میں ہے : و فی الآیۃ اشارۃ الیٰ وجہ رد التفاخر بالنسب حیث افادت ان شرف النسب غیر مکتسب ، و ان لیس للانسان الا ما سعیٰ ، و انہ لا فرق بین النسب و غیرہ من جھۃ المادۃ لاتحاد ما خلق منہ و لا من جھۃ الفاعل لانہ ھو اللّٰہ تعالیٰ الواحد فلیس للنسب شرف یعول علیہ و یکون مدارا للثواب عند اللّٰہ عز و جل و لا احد اکرم من احد عندہ سبحانہ الا بالتقویٰ و بھا تکمل النفس و تتفاضل الاشخاص ۔

امام کردری صاحب بزازیہ نے مناقب امام اعظم رضی اللہ عنہ کی جلد ۲ صفحہ ۱۰ میں لکھا ہے : و اعلم ان الاعتبار للتقویٰ لا للنسب المجرد ۔ و قال اللّٰہ تعالیٰ " اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ " نزلت فی بنی بیاضۃ حین امرھم النبی علیہ السلام ان یزوّجوا امراۃ منھم ابا ھند المولیٰ فقالوا کیف نزوج بناتنا من موالینا ؟ ۔ و قال اللّٰہ تعالیٰ لنوح علیہ السلام فی حق ابنہ " اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ " ۔ قیل لسعید بن جبیر : کان ابنہ ؟ فسبح اللّٰہ تعالیٰ طویلا ثم قال لا الٰہ الا اللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ یخبر انہ ولدہ و تنکرہ ! نعم کان ابنہ و کان مخالفا لہ فی الدّین و العمل ، فانظر الی لقمان الحکیم کان عبدا حبشیا غلیظ المشافر قال اللّٰہ تعالیٰ " وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ " و فقراء الصحابۃ و زھادھم کانوا متقدمین علیٰ کثیر من الاشراف باعتبار العمل و التقویٰ حتیٰ انہ علیہ السلام عوقب علی قصد المناوبۃ بینھم و بین الملأ حرصا فی ھدایتھم الی آخر ما تقید فی آخر سورۃ الانعام و الکھف ۔ یدل علی ان شرف العلم و التقویٰ فوق شرف النسب آیات منھا قولہ " ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا " و قولہ تعالیٰ " وَ تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ " و قولہ تعالیٰ " وَ لَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ " و قولہ تعالیٰ " اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ " و قولہ تعالیٰ " وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا " الی قولہ تعالیٰ " وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ " الیٰ آخر الآیۃ ۔ و قولہ تعالیٰ " وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی " و غیر ذلک من الآیات التی لا تعد و لا تحصیٰ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سوتیلی والدہ کی سوتیلی ماں کی لڑکی سے نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب

درست ہے ۔ جیسا کہ آیت کریمہ " وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ " سے ثابت ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر امراض خبیثہ جذام وغیرہ میں مبتلاء ہے ۔ زوجہ بھی اس کی وجہ سے ایک دفعہ مہلک مرض میں مبتلاء ہوگئی تھی ۔ اب زوجہ کو اندیشہ ہے کہ آئندہ بھی شوہر کی ساتھ داری سے وہ ضرور ہلاک ہوگی ۔ کیا ایسی حالت میں زوجہ شوہر سے علیحدہ ہوسکتی ہے ؟

الجواب

اس قسم کے عیوب سے زوجہ خاوند سے علیحدہ نہیں کرائی جاسکتی ۔ البتہ زوجہ شوہر کو راضی کرکے خلع کرواسکتی ہے ۔ در مختار کے باب العنین میں ہے : و لا یتخیر احد الزوجین بعیب الآخر فاحشا کجنون و جذام و برص و رتق و قرن ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے نابالغ لڑکے کا نکاح عمرو کی نابالغہ لڑکی سے کیا اور مہر کی ادائی اپنے ذمے لی ۔ اب لڑکی کا انتقال ہوگیا ہے ۔ اور اس کے ورثہ زید سے مہر کے طالب ہیں ۔ کیا زید پر ادائی مہر واجب ہے ؟

الجواب

کم سن لڑکا جبکہ نادار و مفلس ہو تو اس کی زوجہ کے مہر کا مطالبہ اس کے ولی سے نہیں کیا جاسکتا ۔ مگر جب کہ ولی بہ وقت نکاح مہر کی ذمہ داری اپنے پر لے تو اس وقت اس کو بر بناء ضمانت مہر دینا ہوگا ۔

در مختار جلد ۲ باب المہر میں ہے : و لا یُطالَبُ الأبُ بمهر ابنه الصغیر الفقیر اذا زوّجه امرأةً الا اذا ضمنه ۔ رد المحتار میں ہے : (و لا یطالب الأب الخ) لأن المهر مال یلزم ذمة الزوج و لا یلزم الأب بالعقد اذ لو لزمه لما افاد الضمان شیئاً ۔ بحر ۔ در مختار میں عبارت سابقہ کے قبل ہے : (و صح ضمان الولی مهرها و لو) المرأة (صغیرة) ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا عقد زید سے ہوا جس کو بارہ (۱۲) سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ تاحال زید نہ تو ہندہ کو اپنے پاس بلاتا ہے اور نہ نفقہ شرعی دیتا ہے حالانکہ زید مالدار و صاحب استطاعت ہے۔ کیا ایسی حالت میں ہندہ دوسرا عقد کرسکتی ہے ؟

الجواب

ہندہ کو چاہیے کہ عدالت میں نفقہ کا دعویٰ کرے، حاکم عدالت زید سے جبراً نفقہ دلوائیگا، شوہر کے نفقہ نہ دینے سے زوجہ نکاح سے خارج نہیں ہوتی۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : (و للزوج الإنفاق علیہا بنفسہ الا ان یظھر للقاضی عدم انفاقہ فیفرض) ای یقدر (لھا) بطلبھا مع حضرتہ و یأمرہ لیعطیھا ان شکت مطلہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر کی وفات کے بعد زوجہ سے اگر مہر جبراً معاف کروایا جائے تو کیا معاف ہوجائیگا یا نہیں ؟

الجواب

مہر جبراً معاف نہیں ہوتا، معافی کے لئے زوجہ کی رضامندی ضروری ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ فصل فی زیادۃ فی المہر و الحط عنہ میں ہے : و لا بدّ فی صحۃ حطھا من الرضاء حتیٰ لو کانت مُکرَھۃ لم تصح ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ کا زر مہر زوج سے زوجہ کی وفات کے بعد زوجہ کا باپ یا بھائی یا بیٹا یا کوئی اور وارث لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کی وفات کے بعد زر مہر اس کا متروکہ ہے جو حسب فرائض اس کے ورثہ میں تقسیم ہوگا، اور ورثہ کو زوج سے طلب کرنے کا حق ہے۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ باب المہر میں ہے : یتأکد المھر بموت احد الزوجین فیکون ترکۃ تقسم بین ورثتھا بالفریضۃ الشرعیۃ کجمیع ما یتحقق انہ مملوک لھا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ طلاقِ بائنہ کی وجہ سے علیحدہ ہوگئی ہے۔ اب زید اس کے ساتھ نکاح جدید کرنا چاہتا ہے، کیا یہ نکاح ثانی سابق مہر ہی پر منعقد ہوگا یا جدید مہر کی ضرورت ہوگی ؟

الجواب

سابق مہر زید کے ذمہ قرض واجب الاداء ہے، نکاح جدید کے لئے جدید مہر چاہیئے۔ فتاویٰ حمدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۱ میں ہے : و ھو دین فی ذمۃ الزوج ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتابُ الرّضاع

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زینب و فاطمہ یہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ زینب کو تین لڑکے ؛ زید، عمرو، بکر۔ اور فاطمہ کو ایک لڑکی ہے۔ زینب نے فاطمہ کی لڑکی کو مدتِ رضاعت میں بحالت بیماری دو وقت بکر کا دودھ بکر کے تولد ہونے کے تین سال بعد چچہ میں نکالکر منھ میں ڈالا، بوجہ بیماری وہ ہضم تک نہ ہونے پایا (بلکہ قے ہوگئی)۔ اب زینب اپنے فرزند مسمیٰ زید سے اس لڑکی کا نکاح کرنا چاہتی ہے، کیا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

در صورتِ صدقِ بیان مستفتی فاطمہ کی لڑکی سے جس نے زینب کا دودھ پیا ہے زینب کے کسی لڑکے کا نکاح درست نہیں ہے۔ کیونکہ زینب فاطمہ کی لڑکی کی انا ہے، اور شرعاً انا کی تمام اولاد دودھ پینے والے پر حرام ہے۔ چنانچہ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے: و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا۔ جامع الرموز کشوری کے صفحہ ۲۱۸ میں ہے: فیحرم علی الرضیع اولادھما و اولادھا و اولادہ المتقدمۃ و المتأخرۃ لأنھم اخوۃ و اخوات لہ من قِبَل الأُم و الأب او احدھما۔

دودھ چچہ وغیرہ میں نکالکر پلانے سے بھی حرمت ثابت ہوجاتی ہے، چنانچہ خلاصہ میں لکھا ہے کہ مردہ عورت کا دودھ اگر چچہ میں نکالکر پلایا جائے تو حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔ فتاوی خلاصہ صفحہ ۱۱۰ میں ہے: و لو حلب اللبن بعد موت المرأۃ فأَجروا صبیا یثبت حرمۃ الرضاع۔ دودھ پلانے کے بعد قے ہوجانے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پوری غذا معدہ سے نکل گئی ہے، بلکہ معدہ میں ضرور کچھ نہ کچھ غذا رہ جاتی ہے جیسا کہ اقوال اطباء سے ثابت ہے، بناء بریں تھوڑے سے دودھ کا رہ جانا بھی ثبوت حرمت کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ فتاوی خلاصہ میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ رضاعت میں کمی و زیادتی دودھ کی حرمت کے لئے دونوں مساوی ہیں، فتاوی خلاصہ صفحہ ۱۱۰ میں ہے: و القلیل و الکثیر فی الرضاع سواء۔

علاوہ بریں ثبوت حرمتِ رضاعت کیلئے دودھ کا محض معدہ میں پہنچ جانا کافی ہے، ہضم ہونے کی شرط نہیں ہے، چنانچہ محیط سرخسی جلد اول صفحہ ۲۸۰ میں ہے: و وصول شیء من اللبن الی المعدۃ یکفی

لاثبات الحرمة ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ لڑکی کے معدہ میں دودھ پہنچ گیا ہے اس لئے حرمتِ رضاعت ثابت ہے ، قے ہوجانے سے حرمت دفع نہیں ہوسکتی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

ام کلثوم نے اپنے خالہ زاد بھائی زید کے وقت کا دودھ زید کی والدہ زینب سے پیا ہے ۔ اب زید کے چھوٹے بھائی عمرو سے ام کلثوم کا نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائز نہیں ہے ، کیونکہ عمرو ام کلثوم کی مرضعہ کے فروع سے ہے ۔ عالمگیریہ جلد اول صفحہ ۳۴۳ میں ہے :

و یحرم علی الرضیع ابواه من الرضاع و اصولهما و فروعهما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ جامع الرموز کشوری صفحہ ۳۱۸ میں ہے : و یحرم علی الرضیع اولادهما و اولادها و اولاده المتقدمة و المتأخرة لأنهم اخوة و اخوات له من قبل الأم و الأب او احدهما ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کا دودھ بلا ضرورت اپنے استعمال میں لائے یعنی خود نوش کرے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے ؟ کسی ظرف میں نکالکر پینے سے کیا ہوتا ہے ؟ اور پستان کو منہ لگاکر پینے سے کیا ؟

الجواب

مرد اگر اپنی زوجہ کا دودھ بے ضرورت نوش کرے تو اس پر زوجہ حرام نہیں ہوتی ۔ فتاویٰ قاضی خان باب الرضاع صفحہ ۴۱۷ میں ہے : اذا مص الرجل ثدی امرأته و شرب لبنها لم تحرم علیه امرأته لما قلنا انه لا رضاع بعد الفصال ۔ مگر شیرخوار بچوں کے سوائے ہوش والے آدمی کو آدمی کا دودھ چاہے اپنی عورت کا ہو یا غیر کا ضرورتاً ہو یا بے ضرورت استعمال کرنا حرام ہے ، جیسا کہ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۱۳ مطبوعہ مصر میں ہے : و لو بعد الفطام محرم علیه الفتوی ، یعنی ایام شیرخواری کے بعد عورت کا دودھ پینا حرام ہے اور اسی پر فتویٰ ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دو حقیقی بہنیں ہندہ و ام کلثوم ، زید و بکر کی زوجہ ہیں ، یعنی ہندہ زید کی زوجہ ہے اور ام کلثوم بکر کی ۔ زید کو چار فرزند ہیں ، اور بکر کی لڑکی کے وقت کا ام کلثوم کا دودھ زید کا فرزند صغیر ایام رضاعت میں پیا ۔ ایسی صورت میں زید کا فرزند اول اس لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کے فرزند اول کا نکاح بکر کی لڑکی سے جائز ہے ۔ کیونکہ یہ لڑکی زید کے فرزند اول کے چھوٹے بھائی کی رضاعی بہن ہے لہٰذا فرزند اول سے اس کا شرعاً نکاح درست ہے ۔ فتاوی عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : و تحل اخت اخیہ رضاعا الخ ، کذا فی الکافی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے جس کی عمر پچاس سال ہے اپنے نواسے اور پوتی کے منہ میں انکی ماں کے مرنے کے بعد اپنے پستان دینا شروع کیا ۔ شان الٰہی سے اس میں دودھ اتر آیا اور یہ دونوں پینے لگے ۔ اس وقت ایک کی عمر دو سال تھی اور دوسرے کی دو سال دو مہینے ۔ پس ایسی صورت میں کیا رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں رضاعت ثابت ہے ۔ ان دونوں کا نکاح آپس میں حرام ہے ۔ کیونکہ شرعاً ضعیفہ عورت جس کی عمر سن ایاس کو پہنچ گئی ہو اس کے دودھ پلانے سے بھی رضاعت ثابت ہوجاتی ہے ۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۴۰۳ میں ہے : (الرضاع ھو) لغۃ بفتح و کسر مص الثدی و شرعاً (مص من ثدی آدمیۃ) ر لو بکرا او میتۃ او آئسۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے زنا کیا ۔ اس کے بعد ہندہ نے خالد سے نکاح کیا اور اس سے ایک لڑکا بھی ہوا جس کا دودھ ہندہ نے کریمہ کو پلایا ۔ اب زید زانی کا کریمہ سے نکاح درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

زید کا نکاح کریمہ سے درست ہے ۔ اگرچہ فتاوی خلاصہ میں بذریعہ عبارت و کذا من الزنا و ارضعت لا بلبن الزنا تحرم علیٰ الزانی یہ تصریح کی گئی ہے کہ زانیہ اگر زنا سے حاملہ نہ ہو اور نکاح کا دودھ کسی لڑکی کو پلائے تو وہ لڑکی زانی پر حرام ہے ۔ مگر صاحب فتح القدیر نے ان کے اس قول کی اس بناء پر تردید کی ہے کہ صاحب خلاصہ کا قول کتب مشہورہ کے ایک مسلمہ مسئلہ کے خلاف ہے ۔ کیونکہ کتب مشہورہ میں یہ بات ثابت ہے کہ غیر زوج کے دودھ سے دودھ پی ہوئی لڑکی مرضعہ کے موجودہ زوج پر حرام نہیں ہے ۔ جب ایک زوج کے دودھ سے دودھ پی ہوئی لڑکی مرضعہ کے دوسرے زوج کے لئے جائز ہے تو پھر

صاحب خلاصہ کا یہ کہنا کہ " غیر لبن زنا سے دودھ پی ہوئی لڑکی زانی کے لئے حرام ہے " مردود و غیر مقبول ہے ۔ کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ جب متن فتاویٰ کا کوئی قول مشہور شرح کے خلاف ہو تو اس شرح کے خلاف میں فتاوی کا قول قبول نہیں کیا جاتا بلکہ رد کیا جاتا ہے ، چنانچہ فتاویٰ شامی جلد ۲ مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۴ میں فتح القدیر سے منقول ہے ؛ و ان ما فی الخلاصة من انها لو ارضعت لا بلبن الزانی تحرم علی الزانی مردود لأن المسطور فی الکتب المشهورة ان الرضیعة بلبن غیر الزوج لا تحرم علیٰ الزوج کما تقدم فی قوله طلق ذات لبن الخ و کلام الخلاصة یقتضی تحریمها بالاولیٰ و ما فی الفتاویٰ اذا خالف ما فی المشاهیر من الشروح لا یقبل ۔ منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۔ جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ میں ہے : اقول ما قاله فی الخلاصة رده فی فتح القدیر بانه مخالف لما فی الکتب المشهورة لأنه یقتضی تحریم بنت المرضعة بلبن غیر الزوج علی الزوج بطریق اولی یعنی ان المنصوص علیه فی الکتب المشهورة انه لو کان اللبن بغیر الزوج لا تحرم الرضیعة علی الزوج و قول الخلاصة "لو ارضعت لا بلبن الزنا تحرم علی الزانی" یقتضی خلاف المسطور فی الکتب المشهورة فهو مردود ۔ پس صورت مسئولہ میں بر بنائے روایاتِ کتب مشہورہ زانی کا مزنیہ کی رضاعی لڑکی سے جس لے مزنیہ کے زوج کے دودھ سے دودھ پیا ہے نکاح کرنا جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کی لڑکی مریم کا دودھ زینب کی لڑکی فاطمہ اور ام کلثوم کا لڑکا عمرو دونوں نے پیا۔ اب عمرو کا بھائی زید زینب کی لڑکی یعنی مسماۃ فاطمہ کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو اس کا یہ عقد جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

چونکہ زینب کی لڑکی فاطمہ زید کے نسبی بھائی عمرو کی رضاعی بہن ہے ، بناء بریں فاطمہ کا نکاح زید کے ساتھ شرعاً جائز ہے ۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۱۸ میں ہے ؛ و تحل اخت اخیه رضاعا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی دو بیٹیاں ہیں حمیدہ اور محمودہ ۔ محمودہ نے حمیدہ کے نواسے حامد کو اور حمیدہ کی دوسری لڑکی کی نواسی مسماۃ علیمہ نے ان ہر دو کو دودھ پلایا ۔ اب حامد کا نکاح علیمہ کی دوسری بہن حلیمہ سے شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی زید حامد کا رضاعی باپ ہے ، اور رضاعی باپ کی جس قدر فروع نکلیں وہ رضاعی بیٹے پر حرام ہیں ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ حلیمہ زید کی فروع سے ہے اس لئے اس کے ساتھ حامد کا نکاح حرام ہے ، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : و یحرم علیٰ الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا حتی ان المرضعۃ لو ولدت من ھذا الرجل او غیرہ قبل ھذا الإرضاع او بعدہ او ارضعت رضیعا او ولد لھذا الرجل من غیر ھذہ المرأۃ قبل ھذا الإرضاع او بعدہ او ارضعت امرأۃ من لبنہ رضیعا فالکل اخوۃ الرضیع و اخواتہ و اولادھم اولاد اخوتہ و اخواتہ و اخو الرجل عمہ و اختہ عمتہ و اخو المرضعۃ خالہ و اختھا خالتہ و کذا فی الجد و الجدۃ ۔ انتھی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے چھ ماہ کی عمر میں ہندہ کا دودھ سعیدہ کے ساتھ نوش کیا اور اس وقت سعیدہ کی عمر ساڑھے تین سال کی تھی ۔ کیا ہندہ کی تیسری یا چوتھی یا پانچویں لڑکی سے زید کا نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

در صورتِ صداقتِ مستفتی ہندہ زید کی مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی ہے ، اور مرضعہ کی تمام اولاد شرعا رضیع یعنی دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ بناء بریں ہندہ کی تمام اولاد زید پر حرام ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے ؛ و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ زہراء بی مادر علاتی محمد مجد الدین صاحب نے مسماۃ عزت النساء بیگم بنت محمد مجد الدین صاحب کو ایام رضاعت میں دودھ پلایا ہے ، اور مسماۃ زہراء بی کو یہ دودھ محمد مجد الدین صاحب کے والد سے تھا ۔ اب محمد مجد الدین صاحب کی حقیقی بہن مسماۃ خورشید النساء چاہتی ہے کہ اپنے فرزند مسمی حسن الدین کا نکاح اپنی بھتیجی عزت النساء کے ساتھ کیا جائے ، اور حسن الدین نے زہراء بی کا دودھ نہیں پیا ہے ۔ پس از روئے شرع کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

دودھ پلانے والی کا خاوند جس سے اس کو دودھ ہے دودھ پینے والے کا رضاعی باپ ہے ۔ اور رضاعی باپ کی تمام اولاد نسبی و رضاعی دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد اول کتاب الرضاع میں ہے ۔ و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زہراہ بی کو مجد الدین کے والد کا دودھ تھا اس لئے عمدۃ النساء بیگم مجد الدین کے والد کی رضاعی بیٹی ہوئی جس پر والد مجد الدین کا نواسہ حسن الدین حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کی رضاعی لڑکی زینب کا لڑکا ہندہ کی سوتن رحیمہ کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے ۔ اور رحیمہ کو یہ لڑکی ہندہ کے خاوند سے ہے ۔ کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

نسب سے جس قدر رشتے ناطے حرام ہوتے ہیں ۔ رضاعت سے بھی وہ رشتے ناطے حرام ہیں ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ رحیمہ کی لڑکی زینب کے رضاعی باپ کی لڑکی ہونے کے سبب سے زینب کی رضاعی علاتی بہن ہے ۔ اور از روئے نسب ماں کی علاتی بہن خالہ ہونے کے سبب سے حرام ہوتی ہے ۔ لہذا زینب کے لڑکے کا نکاح رحیمہ کی لڑکی یعنی رضاعی علاتی خالہ سے حرام ہے ۔ رضاعی باپ کی دوسری زوجہ کی اولاد کا رضیع کی علاتی بہن ہونا فتح القدیر کی کتاب الرضاع کی عبارت سے ثابت ہے ۔ (و لبن الفحل یتعلق به و التحریم) یعنی اللبن الذی نزل من المراۃ بسبب ولادتها من زوج او سید یتعلق به التحریم بین من ارضعته و بین ذلک الرجل بان یکون ابا للرضیع فلا تحل له ان کانت صبیة لأنه ابوها و لا لإخوته لأنهم اعمامها و لا لآبائه لأنهم اجدادها و لا لأعمامه لأنهم اعمام الأب و لا لأولاده و ان کانوا من غیر المرضعة لأنهم اخوتها لأبیها ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے ام کلثوم کی لڑکی مسماۃ زینب کو اپنے چھوٹے لڑکے بکر کے ساتھ دودھ پلایا ۔ کیا ہندہ اس لڑکی کا اپنے بڑے لڑکے زید سے نکاح کر سکتی ہے ؟
سلمیٰ کی تین لڑکیاں زیتون ، خاتون ، بانو ہیں ۔ اور زینب کے تین لڑکے عمرو ، خالد ، ولید ۔ خالد نے سلمیٰ کا دودھ خاتون کے ساتھ پیا ہے ۔ کیا زیتون و بانو سے جو خاتون کی حقیقی بہنیں ہیں نکاح کر سکتا ہے؟

الجواب

دودھ پلانے والی کی تمام اولاد دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ بناء بریں پہلی صورت میں ہندہ اور

دوسری صورت میں سلمیٰ کی تمام اولاد زینب و خالد پر حرام ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ کتاب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولہما و فروعہما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو ایام رضاعت میں اپنی ممانی کا دودھ دواء کے طریقہ پر پلایا گیا ۔ اب اپنی ممانی کی دوسری لڑکی سے زید کا نکاح درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

دودھ پلانے والی کی تمام اولاد دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ عالمگیریہ کے باب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولہما و فروعہما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ دواء کے طریقہ پر دودھ ڈالنے سے بھی حرمت ثابت ہوتی ہے ۔ عالمگیریہ کے اسی باب میں ہے : و کما یحصل الرضاع بالمص من الثدی یحصل بالصب و السعوط و الوجور کذا فی فتاوی قاضیخان قلیل الرضاع و کثیرہ اذا حصل فی مدۃ الرضاع تعلق بہ التحریم قال فی الینابیع و القلیل مفسر بما یعلم انہ وصل الی الجوف کذا فی السراج الوہاج ۔ رد المحتار کے باب الرضاع میں تحت قول ، و الحق بالمص رلخ مکتوب ہے ، و فی المصباح الوجور بفتح الواو الدواء یصب فی الحلق و السعوط کرسول دواء یصب فی الأنف ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی رضاعی بہن کی حقیقی بہن سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر مرضعہ کی اولاد سے نہیں ہے تو کرسکتا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے چار پانچ برس کی عمر میں زید کی ماں نے ہندہ کی شیرخوارگی کے زمانہ میں ہندہ کو دودھ پلایا ۔ بعد سن شعور ہر دو زید و ہندہ کے درمیان نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی تمام اولاد دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ عالمگیریہ کی کتاب الرضاع میں

ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ و اصولھما و فروعھما جمیعا ۔ پس صورت مسئولہ میں ہندہ کا نکاح زید سے حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کے زید و ہندہ باہم خالہ زاد بھائی بہن ہیں ، مگر زید نے ڈیڑھ سال کی عمر میں اپنی نانی کا دودھ پیا ہے جو ہندہ کی بھی حقیقی نانی ہوتی ہے ۔ پس ایسی حالت میں زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں ہندہ چونکہ زید کو دودھ پلانے والی کی اولاد ہے ، اس لئے ہندہ کا نکاح زید کے ساتھ درست نہیں ۔ عالمگیریہ کی کتاب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مریم اور سلیمان خان نے مدت رضاعت میں روشن بی کا دودھ پیا ، اب مریم کا نکاح سلیمان خان سے درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

مریم چونکہ سلیمان خان کی رضاعی بہن اور روشن بی کی رضاعی لڑکی ہے اس لئے مریم کا نکاح سلیمان خان کے ساتھ درست نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ کنز الدقائق کی کتاب الرضاع میں ہے : و حرم بہ و ان قل فی ثلاثین شھرا ما حرم بالنسب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی خالہ کی لڑکی کے ساتھ عقد کرنا چاہتا ہے ، لڑکی نے زید کے چھوٹے بھائی خالد کے ساتھ اس کی ماں کا دودھ پیا ہے ، ایسی صورت میں عقد جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

زید کی خالہ کی لڑکی نے اگر ایام رضاعت میں زید کی والدہ کا دودھ پیا ہے تو شرعا زید کا نکاح اس

کے ساتھ حرام ہے ۔ کیونکہ ایسی صورت میں زید کی والدہ اس لڑکی کی مرضعہ ہے اور مرضعہ کی تمام اولاد شرعاً رضیع یعنی دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۳۴۴ میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نواب محمد قادر علی خاں و نواب محمد فاروق علی خاں دونوں حقیقی بھائی ہیں ۔ محمد قادر علی خاں اپنے لڑکے کی شادی اپنے بھائی فاروق علی خاں کی لڑکی زینب سے کرنا چاہتے ہیں ۔ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ قادر علیخاں کی لڑکی ہندہ نے فاروق علی خاں کی لڑکی زینب کو تین مہینے کی عمر میں دودھ پلایا تھا ۔ اب ہندہ کا حقیقی بھائی اس لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

قادر علی خاں کے لڑکے کا نکاح فاروق علی خاں کی لڑکی سے جائز نہیں ہے ۔ کیونکہ قادر علی خاں کا لڑکا اس کی حقیقی بہن کے دودھ پلانے کی وجہ سے فاروق علی خاں کی لڑکی کا ماموں ہے ۔ اور رضاعی ماموں سے شرعاً نکاح حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : و اخو المرضعة خاله و اختها خالته ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے ماموں کی بیٹی کے ہمراہ اپنی نانی یا دادی کا دودھ پیا ہے ۔ زید اب اس لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے ۔ کیا ایک ضعیفہ کا دودھ پینے سے ان ہر دو کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جس عورت کا حیض بند ہوجاتا ہے ایسی عورت کے دودھ سے بھی جبکہ مدت رضاعت کے اندر ہو پلایا جائے تو شرعاً حرمت ثابت ہوتی ہے ۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ باب الرضاع میں ہے : (هو) لغة بفتح و كسر مصّ الثدي و شرعا (مصّ من ثدي آدمية) و لو بكرا او ميتة او آئسة ۔ پس صورت مسئولہ میں ضعیفہ کا دودھ پینے کی وجہ سے دونوں کا نکاح حرام ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اور بکر دونوں آپس میں حقیقی بھائی ہیں ۔ زید کی زوجہ نے بکر کی زوجہ کے انتقال کے بعد بکر کی دختر کو دودھ پلانے کا شبہ ظاہر کیا ہے ۔ لیکن زید کی زوجہ کا بیان ہے کا دودھ پلانے کا حال بالکل یاد نہیں ہے ۔ کیونکہ اس واقعہ کو تخمیناً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے

اور میری عمر بھی قریب ساٹھ سال کی ہے ۔ اس زمانہ کی عورتوں سے چند عورتوں کا بیان ہے کہ دودھ پلانے کے لئے بہت اصرار کیا گیا تھا لیکن زید کی زوجہ نے دودھ نہیں پلایا ۔ اور بکر بھی اس بیان کی اپنی یاد سے تائید کرتا ہے ۔ چند عورتوں کا بیان ہے کہ انہوں نے دودھ پلاتے ہوئے دیکھا نہیں بلکہ سنا ہے ۔ اب ایسی صورت میں زید کے فرزند سے بکر کی دختر کا عقد کرنا شرعا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

رضاعت کے ثبوت کے لئے شرعا دو متقی مرد یا ایک متقی مرد اور دو پرہیزگار عورتوں کی گواہی ضروری ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۷ باب الرضاعۃ میں ہے : و لا یقبل فی الرضاع الا شھادۃ رجلین او رجل و امرأتین عدول کذا فی المحیط ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۴۲۴ میں ہے : و الرضاع حجتہ حجۃ المال و ھی شھادۃ عدلین او عدل و عدلتین ۔ محض عورتوں کی گواہی سے شرعا رضاعت ثابت نہیں ہوتی ۔ واقعات المفتین مصری کے صفحہ ۲۷ میں ہے : و انا نقول ھذہ شھادۃ قامت علیٰ زوال ملک النکاح فلا تثبت الحرمۃ کما لو قامت علی الطلاق فاشھد بذلک امرأتان او رجل عدل فکذلک و کذا لو شھد اربع نسوۃ و کما لا یفرق بینھما بعد النکاح و لا تثبت الحرمۃ بشھادتھن فکذلک قبل النکاح ۔ البحر الرائق جلد ۳ صفحہ ۲۲۹ میں ہے : و فی الخانیۃ من الرضاع و کما لا یفرق بینھما بعد النکاح و لا تثبت الحرمۃ بشھادتھن فکذلک قبل النکاح ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ گواہی دینے والی محض عورتیں ہیں اس لئے زید کے فرزند اور بکر کی دختر کے ما بین از روئے شرع رضاعت ثابت نہیں ہے اس لئے ہر دو کا نکاح جائز ہے ۔ لیکن اگر زوج کو اس گواہی سے رضاعت کا یقین ہوجائے تو بر بنائے احتیاط نکاح سے احتراز اولیٰ ہے ۔ بزازیہ میں ہے : لا یثبت بشھادۃ النساء وحدھن لکن ان وقع فی قلبہ صدق الخبر ترک قبل العقد او بعدہ ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کی چار لڑکیاں : زبیدہ ، مریم ، حمیدہ ، سلطانہ ہیں ۔ زبیدہ جب پیدا ہوئی اس وقت زید نے زبیدہ کے ساتھ ہندہ کا دودھ پیا ہے ۔ ایسی حالت میں کیا مریم ، حمیدہ ، سلطانہ ان تین بہنوں میں سے کسی ایک کے ساتھ زید کا عقد ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی تمام اولاد دودھ پینے والے پر حرام ہے اس لئے زید کا نکاح ان چار لڑکیوں سے کسی بھی لڑکی کے ساتھ صحیح نہیں ہے ۔ عالمگیریہ کے جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ کتاب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے زید کی لڑکی زبیدہ کو دودھ پلایا تھا۔ بعد میں بکر کے لڑکے عمرو کو بھی شیرخوارگی کے زمانہ میں دودھ پلایا۔ جس کا اقرار ہندہ نے زبیدہ اور عمرو کے والدین کے روبرو ایک موقعہ پر کیا۔ اس وقت ہر دو کے والدین ہی نہ تھے بلکہ اور لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے ہندہ کے اس بیان کو سنا۔ علاوہ اس کے عمرو کی والدہ نے بھی بعض لوگوں کے روبرو یہ بیان دیا کہ ہندہ نے عمرو کو دودھ پلانا جو ظاہر کیا ہے وہ صحیح ہوگا کیونکہ مجھ سے چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ لیکن چند روز سے ہندہ نے اپنے پچھلے بیان کے خلاف میں یہ بیان کرنا شروع کیا ہے کہ بکر کو دو لڑکے تھے ایک عمرو دوسرا قمر۔ ان دونوں میں سے میں نے کس کو دودھ پلایا ہے اس کا مجھے اچھی طرح خیال نہیں ہے۔ ہندہ کے اس مخالفت و مشتبہ بیان کی بناء پر زبیدہ کی عمرو سے نسبت ہوئی اور قریب میں شادی ہونے والی ہے۔ پس ایسی صورت میں زبیدہ کا عمرو سے نکاح شرعاً بنظر احتیاط صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب

رضاعت کے ثبوت کے لئے شرع شریف میں دو متقی مرد یا ایک متقی مرد اور دو پرہیزگار عورتوں کی گواہی شرط ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۷ میں ہے : لا یقبل فی الرضاع الا شھادۃ رجلین او رجل و امرأتین عدول کذا فی المحیط ۔ اور در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۴۴۳ باب الرضاع میں ہے : و حجتہ حجۃ المال و ھی شھادۃ عدلین او عدل و عدلتین ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ محض ایک عورت کا بیان ہے اور وہ بھی مذبذب اس لئے از روئے شرع شریف رضاعت ثابت نہیں ہے۔ اگر یہ عورت نیک بخت ہے اور اس کا قول قابل وثوق بھی ہے اور ناکح کو اس کے کہنے سے رضاعت کا یقین ہوگیا ہے تو پھر نکاح سے بچنا اولیٰ ہے۔ چنانچہ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : و ان کان المخبر واحدا وقع فی قلبہ انہ صادق فالاولی ان یتنزہ و یأخذ بالثقۃ وجد الاخبار قبل العقد او بعدہ و لا یجب علیہ ذلک کذا فی المحیط ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ ثانیہ نے زید کی زوجہ اولیٰ کے نواسہ حامد کو دودھ پلایا ۔ کیا حامد اپنی خالہ زاد بہن سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ زید ، حامد کی مرضعہ کا خاوند ہے اس لئے زید کی تمام اولاد حامد پر حرام ہے ۔ فتاوی عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما

من النسب و الرضاع جمیعا ۔ اور جامع الرموز کے صفحہ ۲۱۸ میں ہے : فیحرم علی الرضیع اولادھما و اولادھا و اولادہ المتقدمۃ و المتأخرۃ لأنھم اخوۃ و اخوات لہ من قِبَلِ الأم و الأب او احدھما ۔ بناء بریں حامد کا نکاح اپنے تمام حقیقی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ شرعا حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے اپنے نواسے زید اور پوتی زینب کو دودھ پلایا ہے، کیا زید کا نکاح زینب سے درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

زید و زینب چونکہ رضاعی بھائی بہن ہیں اس لئے دونوں کا نکاح حرام ہے ۔ شرح وقایہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ نور علی میں ہے : یحرم منہ ما یحرم من النسب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حقیقی نانی ہندہ کا دودھ پیا ہے ، کیا اس کا نکاح ہندہ کی پوتی آمنہ سے درست ہے ؟

الجواب

مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی تمام اولاد رضیع پر حرام ہے ۔ عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا نکاح آمنہ سے حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایام رضاعت میں ہندہ کا دودھ پیا ، کیا زید ہندہ کی نواسی سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی تمام اولاد رضیع یعنی دودھ پینے والے پر حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ کتاب الرضاع میں ہے : یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولھما و فروعھما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا نکاح ہندہ کی نواسے سے حرام ہے و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ ہندہ کی زچگی ہوکر تقریبا چھ سال چھ مہینے کا عرصہ ہوا تھا ۔ ہندہ نے اپنے پستان کا سر حلیمہ شیرخوارہ کے منہ میں قریب نصف منٹ یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک رکھدیا اور ہندہ کو اس وقت اس امر کا شبہ ہے کہ سر پستان حلیمہ کے منہ میں دیا گیا تھا یا حلیمہ کے بھائی بکر کے ۔ اور اس کا بھی یقین نہیں ہے کہ حلیمہ نے ایک گھونٹ یا دو گھونٹ دودھ پیا یا نہیں ۔ اور اس وقت ہندہ کو دودھ آتا تھا یا نہیں ۔ اور اگر آتا تھا تو نصف منٹ میں حلیمہ نے پیا یا نہیں ۔ کیونکہ زچگی کا زمانہ دراز ہونے کی وجہ سے اس وقت دودھ باقی رہنے کا یقین نہیں ہے اور اس واقعہ کا گواہ بھی بجز ہندہ کے اور کوئی نہیں ۔ اب ہندہ اپنے فرزند خالد کا عقد حلیمہ سے کرنا چاہتی ہے ۔ آیا بحالت صدر حرمت رضاعت ثابت ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اگر حرمت میں شک واقع ہوجائے تو شرعا حرمت ثابت نہیں ہوتی ۔ حموی شرح الاشباہ و النظائر مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۹۳ قاعدہ ثالثہ کے تحت ہے : فلو کان فی الحرمۃ شک لم یعتبر فلذا قالوا لو ادخلت المرأۃ ثدیہا فی فم رضیعۃ و وقع الشک فی وصول اللبن الی جوفہا لم تحرم لأن فی المانع شکا کما فی الولوالجیۃ و فی القنیۃ امرأۃ کانت تعطی ثدیہا صبیۃ و اشتہر ذلک فیما بینہم ثم تقول لم یکن فی ثدیی لبن حین ألقمتہا ثدیی و لا یعلم ذلک الا من جہتہا جاز لابنہا ان یتزوج بہذہ الصبیۃ ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ ہندہ کو حلیمہ کے منہ میں پستان دینے کے وقت دودھ ہونے اور نہ ہونے اور حلیمہ کے پیٹ میں دودھ جانے یا نہ جانے کے متعلق شک ہے اس لئے خالد کا نکاح حلیمہ سے جائز ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے جو زید کی خالہ زاد بہن ہے زید کی والدہ کا دودھ زید کے برادر حقیقی عمرو کے ساتھ پیا ہے ۔ ایسی حالت میں کیا زید کا نکاح ہندہ سے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

رضیع یعنی ایام رضاعت میں دودھ پینے والے پر مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی کی تمام اولاد حرام ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ کتاب الرضاع میں ہے : و یحرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع و اصولہما و فروعہما من النسب و الرضاع جمیعا ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا نکاح ہندہ سے حرام ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حرمت رضاعت پانچ گھونٹ دودھ پینے سے ثابت ہوگی یا

ایک قطرہ بھی ثبوتِ حرمت کیلئے کافی ہے ؟

الجواب

اگر یہ معلوم ہوجائے کہ دودھ منہ یا ناک کے ذریعہ سے پیٹ میں پہنچ گیا ہے تو مذہب حنفی میں تھوڑے سے دودھ سے بھی رضاعت ثابت ہوجاتی ہے ۔ ایک قطرہ یا ایک گھونٹ کی کوئی قید نہیں ہے ۔

در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۲ باب الرضاع میں ہے : (و یثبت به و ان قل) ان علم وصوله بجوفه من فمه او انفه لا غیر ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے زید کے لڑکے عمر کو ایام رضاعت میں دودھ پلایا ہے ۔ کیا زید ہندہ کی لڑکی کلثوم سے نکاح کرسکتا ہے یعنی رضیع کا باپ مُرضِعہ کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

رضیع کا باپ مُرضِعہ کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ باب الرضاع میں ہے :

یفارق النسب الارضاع فی صور * کام نافلة او جدة الولد

و ام اخت و اخت ابن و ام اخ * و ام خال و عمة ام اعتمد

رد المحتار میں ہے : (قوله و اخت ابن) ای کل منهما رضاعی او الاول رضاعی و الثانی نسبی و العکس ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر نکاح کے بعد یہ معلوم ہوجائے کہ منکوحہ نے ناکح کی نانی کا دودھ پیا ہے تو کیا یہ نکاح شرعا قابل فسخ ہے یا نہیں ؟ اور منکوحہ کا باپ اس کو فسخ کراسکتا ہے ؟

الجواب

اگر دو معتبر مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت سے منکوحہ کا ناکح کی نانی سے دودھ پینا ثابت ہوجائے تو ناکح کو چاہئے کہ فوراً منکوحہ سے علیحدہ ہوجائے اور دفتر دار القضاء میں تفریق کی درخواست پیش کرے ۔ قاضی (حاکم) کے سوا کسی اور کو تفریق کا حق نہیں ہے ۔ ایک آدمی کی گواہی کا تعین ہونے کی صورت میں علیحدگی بہتر ہے ۔ اور فسخ واجب نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الرضاع میں ہے : و لا یقبل فی الرضاع الا

شهادة رجلين او رجل و امرأتين عدول كذا في المحيط . و لا تقع الفرقة الا بتفريق القاضي كذا في النهر الفائق . و لو شهد رجلان عدلان او رجل و امرأتان بعد النكاح عندها لا يسعها المقام مع الزوج لأن هذه شهادة لو قامت عند القاضي يثبت الرضاع فكذا اذا قامت عندها كذا في فتاوى قاضي خان . و ان المخبر واحد و وقع في قلبه انه صادق فالأولىٰ ان يتنزه و يأخذ بالثقة وجد الإخبار قبل العقد او بعده و لا يجب عليه ذلك كذا في المحيط ـ و الله اعلم بالصواب .

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی علاتی والدہ نے ہندہ کو دودھ پلایا ہے اور یہ دودھ زید کے والد کا ہے ۔ کیا زید کا نکاح ہندہ سے درست ہے ؟ اور اگر نکاح اور وطی ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے ؟

الجواب

زید کا باپ چونکہ ہندہ کا رضاعی باپ ہے اس لئے زید پر ہندہ حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الرضاع میں ہے ، و يحرم على الرضيع ابواه من الرضاع و اصولهما و فروعهما من النسب و الرضاع جميعا ـ نکاح و وطی کے بعد اگر گواہان عادل سے رضاعت ثابت ہوجائے تو قاضی کو چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان تفریق کروادے ، اور مہر مثل و مہر مقرر بہ وقت نکاح ان دونوں میں جو کم ہو عورت کو دلایا جائے ۔ تنقیح حامدیہ جلد ا کتاب الرضاع میں ہے ، و اذا ثبت الرضاع بالشهود العدول اذا كانت الشهادة على الزوجين فرق بينهما و ان كان قبل الدخول فلا مهر لها و ان كان بعد الدخول فلها الأقل من المسمىٰ و من المهر المثل و ليس النفقة و السكنى ـ مجموعة قدري آفندي من المضمرات ـ اقول و في قوله فرق بينهما اشارة الى انه لا تقع الفرقة الا بتفريق القاضي كما عزاه في البحر في آخر كتاب الرضاع الى المحيط ـ و الله اعلم بالصواب .

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مدت رضاعت ختم ہونے کے بعد دودھ پینے سے کیا رضاعت ثابت ہوتی ہے ؟

الجواب

نہیں ثابت ہوتی ، عالمگیریہ جلد ا کتاب الرضاع میں ہے ، و اذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق به التحريم ـ و الله اعلم بالصواب .

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے فاطمہ کے لڑکے اور سلمیٰ کی لڑکی کو دودھ پلایا ہے ۔ کیا ان دونوں کا نکاح آپس میں جائز ہے ؟

الجواب

دو اجنبی عورتوں کے لڑکے اور لڑکی دونوں آپس میں رضاعی بھائی بہن ہوگئے ۔ جن کا نکاح ایک دوسرے کے ساتھ حرام ہے ۔ کنز الدقائق کی کتاب الرضاع میں ہے : و لا حلّ بین رضیعی ثدي ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی چچی کا دودھ پیا ہے ۔ کیا اس کے چچازاد بھائی کا نکاح زید کی حقیقی بہن سے درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

درست ہے ۔ رد محتار جلد ۲ باب الرضاع میں ہے : و تحل اخت اخیه رضاعا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شیرخوار کے مصارف ماں پر ہیں یا باپ پر ؟

الجواب

شیرخوار کے مصارف ڈھائی سال کی عمر تک باپ کے ذمہ ہیں ۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر بچہ کا مال ہے تو اس کے مال سے مصارف لئے جائیں گے ۔ ورنہ باپ ہی کے ذمہ رہیں گے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : و للرضیع النفقة و الکسوة ۔ رد المحتار میں ہے : فبذلک صار علی الأب ثلاث نفقات اجرة الرضاع و اجرة الحاضنة و نفقة الولد من صابون و دھن و فرش و غطاء ۔ و فی المجتبیٰ اذا کان للصبی مال فمؤنة الرضاع و نفقته بعد الفطام فی مال الصغیر ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیه المرجع و المآب ۔

کِتابُ الطَّلاق و العِدّۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ اپنے شوہر کے والدین سے نزاع و فساد کرکے زید کے غائبانہ اپنے والدین کے مکان کو چلی گئی ۔ جب یہ کیفیت شوہر کو معلوم ہوئی تب شوہر نے ہندہ کو مختار مجلس کے روبرو تین طلاق دی ۔کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوئی ؟ اور ادائی مہر زید پر واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب

طلاق کے لئے زوجہ کو خطاب کرنا یا اس کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے ، بہجت الشاق فی احکام الطلاق مصری کے صفحہ ۱۵ میں ہے : لا بدّ فی الطلاق من خطابها او الاضافة الیها کما فی البحر ۔ صورت مسئولہ میں جبکہ زید نے مختار مجلس کے روبرو ہندہ کا نام لیکر طلاق دی ہے اس لئے ہندہ پر طلاق واقع ہو گئی ۔ بہجت الشاق کے صفحہ ۱۵ میں البحر الرائق سے منقول ہے : اذا قال طالق فقیل له من عنیت فقال امراتی طلقت ۔ اور فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۹ کتاب الطلاق کے اس جزئیہ سے ثابت ہے : سئل فی امرأة بالغة رشیدة متزوجة برجل بالغ رشید دخل بها و مکث معها مدة ثم تشاجر الزوج مع ابیها فی غیبتها و أبرأ الزوج من صداقها بغیر اذنها و رضاها فطلقها بحضرة بینة شرعیة و تزوجت غیره بعد انقضاء العدة و الآن طلبت من زوجها المطلق الصداق فأنکر طلاقها فهل اذا کان الطلاق ثابتا بالبینة الشرعیة لا یجاب لذلک و لا عبرة بانکاره و یکون لها مطالبة بما لها عنده من الصداق و لا عبرة بابراء الاب له ، اجاب: لا عبرة لإنکار الزوج المذکور الطلاق حیث ثبت علیه الطلاق بالوجه الشرعی و للزوجة المطالبة بما لها من الصداق و حیث لم یکن ابوها وکیلا عنها فی الإبراء منه و لم تجزه ۔ پس زید نے ہندہ کو جو طلاق دی ہے یہ طلاق مغلظ ہے ۔ اگر زوج نے زوجہ سے صحبت یا خلوۃ صحیحہ کی ہے تو زوج پر پورا مہر واجب الاداء ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا ہندہ کو تین طلاق حسب ذیل الفاظ حاضرین مجلس کے روبرو دینا تین گواہ بیان کرتے ہیں ۔ مگر ہر سہ گواہ الفاظ طلاق میں مختلف ہیں ۔ اور حاضرین مجلس کو انکار ہے ۔ گواہ اول کہتا ہے کہ زید نے تین مرتبہ " طلاق دیا میں " کہا ۔ گواہ ثانی اولاً یہ کہتا تھا کہ زید نے صرف لفظ طلاق تین مرتبہ کہا اور ثانیاً کہتا ہے کہ زید نے " طلاق میں تجھکو دیا " تین مرتبہ کہا ۔ اور گواہ ثالث کہتا ہے کہ زید نے " میں تم کو طلاق دیا " تین مرتبہ کہا ۔ ایسی اختلافی صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں ؟ اگر ہوگی تو کونسی ؟

الجواب

طلاق شریعت میں دو گواہوں کے بیان سے جبکہ وہ " اَشْھَدُ بِاللہِ " کہکر گواہی دیں ثابت ہوجاتی ہے، در مختار کے کتاب الشہادۃ میں ہے ؛ (و) نصابھا (لغیرھا من الحقوق سواء کان) الحق (مالا او غیرہ کنکاح و طلاق و وکالۃ و وصیۃ و استھلال صبی) و لو (للارث رجلان او رجل و امرأتان) ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ گواہ ثانی کے دوسرے بیان اور گواہ ثالث کے بیان سے زوجہ کو خطاب کرکے تین طلاق دینا ثابت ہے ۔ تو ایسی حالت میں زوجہ پر طلاق مغلظہ واقع ہوئی ۔ دوبارہ نکاح کے لئے تحلیل کی ضرورت ہے ، گواہ ثانی کے دوسرے بیان میں پہلے بیان پر زیادتی ہے جو ثبوت طلاق کے منافی نہیں ، اور گواہوں کی علمی گواہی کے مقابلہ حضار مجلس کا محض انکار قابل لحاظ نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو بحالت غصہ " طلاق طلاق " دو دفعہ کہا اور پھر تین بار یہ کلمات کہے " تو ماں ہے تو بیٹی ہے تو بہن ہے " ۔ پس صرف دو طلاق کا ایک مجلس میں بحالت غصہ مخاطب سے بلا اشارہ (اگرچہ مخاطبہ عورت ہی تھی) کہنا کیا اس سے طلاق واقع ہوئی ؟ اور یہ طلاق رجعی ہے یا بائن ؟ اور الفاظ مذکور الصدر سے کیا ظہار ہوگا یا تیسری طلاق ؟

الجواب

دو طلاق صریح کے بعد اندرون عدۃ زوج کو رجوع کا حق ہے ، اور بعد ختم عدت زوجہ بائنہ ہوجاتی ہے جس کے بعد دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب ایقاع الطلاق میں ہے ؛ متیٰ کرّر لفظ الطلاق بحرف الواو او بغیر حرف الواو یتعدد الطلاق و ان عنی بالثانی الأوّل لم یصدّق فی القضاء ۔ اور باب الرجعۃ میں ہے ؛ و اذا طلّق الرجل امرأتہ تطلیقۃ رجعیۃ او تطلیقتین فلہ ان یراجعھا فی عدتھا رضیت بذٰلک او لم ترض کذا فی الھدایۃ ۔

تو ماں ہے یا بیٹی ہے یا بہن ہے کہنے سے ظہار نہیں ہوتا ، اور شہادت میں یہ الفاظ کنایہ نہیں ہیں ، اس لئے نیت کے بعد بھی ان سے طلاق نہیں ہوتی ، بلکہ یہ کلام لغو ہے اور ایسا کہنا مکروہ ہے ۔ در مختار کے باب الظہار میں ہے : (و ان نویٰ بأنتِ علیَّ مثل اُمّی) او کامی و کذا لو حذف علیَّ خانیۃ (براً او ظہاراً او طلاقاً صحت نیتہ) و وقع ما نواہ لأنہ کنایۃ (والا) ینو شیئاً او حذف الکاف (لغا) و تعین الأدنیٰ ای البر یعنی الکرامۃ و یکرہ قولہ انت امی و یا ابنتی و یا اختی و نحوہ ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ لأنہ کنایۃ) ای من کنایات الظہار و الطلاق ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بحالت غصہ اپنی زوجہ کو سات بار طلاق دی اور اپنی جگہ سے علیٰحدہ بھی کردیا ۔ زید نے چونکہ بچوں کو اپنے پاس رکھ لیا ہے اور بچے کمسنی کے سبب پریشان ہیں اس لئے اگر اس طلاق کا کوئی کفارہ ہوسکتا ہے تو بیان فرمایا جائے ۔

الجواب

تین طلاق کے بعد زوجہ ، زوج پر حرام ہوجاتی ہے ۔ دوبارہ نکاح کرنا اس صورت میں درست ہے جبکہ دوسرا شخص اس مطلقہ کے ساتھ نکاح صحیح کے بعد صحبت کرکے طلاق دے اور جب اس طلاق کی عدۃ ختم ہو جائے گی تب پہلا خاوند اس سے نکاح کرسکتا ہے ۔ کنز الدقائق میں ہے : و ینکح مبانتہ فی العدۃ و بعدھا لا المبانۃ بالثلاث لو حرۃ و بالثنتین لو أمۃ حتیٰ یطأھا غیرہ و لو مراھقا بنکاح صحیح و تمضی عدتہ لا بملک یمین ۔

لڑکے کو سات سال کی عمر تک اور لڑکی کو بلوغ ہونے تک پرورش کرنے کا حق ماں کو ہے ، اور باپ پر اس کا خرچ واجب ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ باب الحضانۃ میں ہے : (و الحاضنۃ) اما کانت او غیرھا (احق بہ) ای بالغلام حتی یستغنی عن النساء و قدر بسبع و بہ یفتی (و الأم و الجدۃ) لأم او لأب (احق بھا) بالصغیرۃ (حتی تحیض) ای تبلغ فی ظاھر الروایۃ ۔ اسی باب میں ہے : (و تستحق) الحاضنۃ (اجرۃ الحضانۃ اذا لم تکن منکوحۃ و لا معتدۃ لأبیہ) و ھی غیر اجرۃ إرضاعہ و نفقتہ کما فی البحر ۔ پس صورت مسئولہ میں زوج اگر اپنی مطلقہ ثلاثہ سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو چاہئے کہ حسب تفصیل سابق دوسرے شخص کی طلاق کی عدۃ ختم ہونے کے بعد نکاح کرے اور تا نکاح ثانی کمسن بچوں کو مدتِ مذکورہ تک خرچہ دیکر زوجہ کے پاس چھوڑے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خاوند جب زوجہ کو طلاق دیدے تو زوجہ کے لڑکے پر اس

کا نفقہ واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب

ماں اگر مالدار نہیں ہے تو اس کا نفقہ اس کی تمام اولاد ذی معاش و صاحب جائداد پر مساوی واجب ہے۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : (و) تجب (علی موسر) و لو صغیرا (یسار الفطرۃ النفقۃ لأصولہ الفقراء) و لو قادرین علی الکسب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو طلاق دی جس کو عرصہ ایک سال کا گذرا ، اور بوقتِ طلاق ایک شیرخوار لڑکی تھی جو تا حال ہندہ کے پاس ہے ، اب ہندہ چاہتی ہے کہ ایام رضاعت کی اجرت اور ایام عدت کا نفقہ و کسوہ زید سے حاصل کرے ۔ کیا شرعا زید پر اجرت رضاعت اور نفقہ عدت کی ادائی واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب

ایام عدت کا نفقہ زوج پر واجب الاداء ہے ، عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الطلاق باب النفقہ میں ہے : المعتدۃ عن الطلاق تستحق النفقۃ و السکنیٰ کان الطلاق رجعیا او بائنا او ثلاثا حاملا کانت المرأۃ او لم تکن کذا فی فتاویٰ قاضی خان ۔ باپ پر بچہ کی رضاعت یعنی دودھ پلانے کی اجرت اور حضانت یعنی پرورش کرنے کی اجرت اور بچہ کا خرچ یعنی لباس و دیگر حوائج کی تکمیل شرعا واجب ہے ، البحر الرائق کے باب النفقہ میں ہے : تجب علی الأب ثلاثۃ اجرۃ الرضاع و اجرۃ الحضانۃ و نفقۃ الولد ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر عورت بلا اجازت شوہر کے کہیں چلی جائے ، یا شوہر کے حکم سے انحراف کرے ، مثلا بغیر اجازتِ شوہر کے نقل مقامات کرے ، یا غیر اشخاص کے روبرو بےپردہ ہوجائے تو ان تمام صورتوں میں نفقہ پاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

جو عورت خاوند کی اطاعت نہ کرے یعنی بلا اجازت گھر سے چلی جائے ، یا مقام سے منتقل ہو ، یا اجنبی اشخاص کے روبرو بےپردہ ہو ، اگر یہ افعال بلا کسی حق شرعی و وجہ شرعی کے اس سے سرزد ہوئے ہوں تو تا وقتیکہ وہ ان سے باز نہ آئے اور خاوند کے گھر میں واپس آکر اس کی شرعی اطاعت میں مصروف نہ

ہو ، شرعاً " ناشزہ " و نافرمان سمجھی جاتی ہے جو نفقہ کی مستحق نہیں ۔ فتاویٰ مہدیہ مصری جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ میں ہے : لا نفقة للزوجة ما دامت ناشزة و خارجة عن طاعة الزوج بغير حق و تؤمر بطاعته و لا تقر علي النشوز لأنه معصية ۔ اور صفحہ ۴۹۳ میں ہے : سئل في امرأة خرجت من بيت زوجها و مكثت عند الناس الاجانب من غير اذنه و من غير رضاه و طلبت البقاء علي النشوز و الطلاق و هو لا يرضيٰ بذلك هل تسقط مؤنتها و نفقتها ما دامت كذلك ؟ اجاب : لا نفقة للناشزة و هي من خرجت من بيت زوجها بغير حق ما دامت كذلك ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بحالت نشہ و بے خودی اپنی زوجہ کو ایک بار لفظ " طلاق " کہا ، پھر پانچ منٹ کے بعد کہا " دو طلاق دیا " پھر باہر جاکر آیا اور کہا کہ " تیسری طلاق لیو " ۔ یہ واقعہ شب میں ہوا اور وہ شخص نشہ کی بےہوشی میں پڑگیا اور اس کی عورت اپنے برادری کے مکان کو چلی گئی ۔ جب صبح ہوئی تو مشار الیہ نے شب کی حرکات سے لاعلمی ظاہر کی ، مگر دوسری عورتوں نے جو اس وقت موجود تھیں طلاق کا حال بیان کیا ، پس از روئے شرع طلاق واقع ہوئی تو کونسی ؟

الجواب

نشہ والے کی طلاق واقع ہوجاتی ہے ، لہذا صورت مسئول میں تین طلاقیں واقع ہو گئیں ۔ اب زوجہ بغیر تحلیل کے یعنی ختم عدۃ کے بعد دوسرے شخص سے نکاح صحیح کے ساتھ وطی کرکے طلاق لیکر اس کی عدۃ ختم کئے بغیر پہلے خاوند کے لئے حرام ہے ۔ در مختار کی کتاب الطلاق میں ہے : (و يقع طلاق كل زوج بالغ عاقل) و لو تقديرا بدائع ، ليدخل السكران (و لو عبدا او مُكرَها او هازلا او سفيها او سكران) و لو بنبيذ او حشيش او افيون او بنج زجرا به يفتي تصحيح القدوري ۔ عالمگیریہ کتاب الطلاق فصل من يقع الطلاق میں ہے : و طلاق السكران واقع اذا سكر من الخمر او النبيذ و هو مذهب اصحابنا كذا في المحيط ۔ اسی جگہ ہے : و من سكر من البنج يقع طلاقه و يحد لفشو هذا الفعل بين الناس و عليه الفتويٰ في زماننا كذا في جواهر الاخلاطي ۔ کنز کی کتاب الطلاق باب الرجعۃ فصل فيما تحل به المطلقۃ میں ہے : و ينكح مبانته في العدة و بعدها لا المبانة بالثلاث لو حرة و بالثنتين لو امة حتي يطأها غيره و لو مراهقا بنكاح صحيح و تمضي عدته لا بملك يمين ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص کسی مکان میں چند اشخاص کے روبرو اپنی زوجہ کو طلاق دے اور اسی مکان کے کسی حصہ میں زوجہ بھی موجود ہو مگر گواہ صرف یہ بیان کریں کہ ہمارے

سامنے طلاق دی گئی، مگر اس امر کے گواہ موجود نہیں کہ زوجہ نے اس طلاق کو سنا یا نہیں۔ اب زوجین کا انتقال ہو گیا ہے کیا ایسے گواہ تصدیق طلاق کے لئے کافی ہیں؟ کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگی؟

الجواب

طلاق کے لئے زوجہ کو خطاب کرنا یا اس کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے، اور جبکہ طلاق زوجہ کے طرف منسوب کردی گئی تو اس کے وقوع کے لئے زوجہ کا روبرو رہنا یا لفظ طلاق کو زوج کی زبان سے سننا ضروری نہیں۔ بحث المشتاق فی احکام الطلاق مصری کے صفحہ ۱۵ میں ہے و لا بُدّ فی الطلاق من خطابها او الإضافة اليها۔ البحر الرائق کی جلد ۳ صفحہ ۲۷۳ باب الطلاق الصریح میں ہے: و ذکر اسمها او اضافتها اليه کمخاطبه کما بینا فلو قال طالق فقیل له من عنیتَ فقال امرأتی طلقت امرأته۔ پس صورت مسئولہ میں اگر گواہ حسب شروط شہادت گواہی دیں تو طلاق ثابت ہے۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی خوش دامن کی درخواست پر یہ لکھا کہ اگر زوجہ یعنی ہندہ تمام مطالبات شرعی و قانونی سے زید کو بری کرتی ہے اور شروط مذکورہ پر رضامند ہے تو زید خلع کرنے کو رضامند ہے۔ اس تحریر کے جواب میں ہندہ نے لکھا کہ وہ تمام مطالبات شرعی و قانونی سے زید کو بری کرنے کے لئے آمادہ و تیار ہے مگر بعض شروط کے تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ پس ان تحریرات سے کیا زید کی جانب سے خلع اور زوجہ کی جانب سے اقبال واقع ہوگیا ہے؟ یا یہ کہ اس تصفیہ کے بعد پھر زوج کی جانب سے ایجاب خلع اور زوجہ کی جانب سے اس کے قبول کی ضرورت ہے؟

الجواب

خلع شریعت میں ملک نکاح کو زائل کرنے کا نام ہے، جو عورت کے قبول کرنے پر موقوف ہے۔ در مختار باب الخلع میں ہے: هو ازالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع او فی معناه۔ خلع انہیں الفاظ اور صیغوں سے ہوا کرتی ہے جن سے صاف و ظاہر طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ زوج نے بالمعاوضہ ملک نکاح کو زائل کردیا ہے اور تمام حقوق زوجیت زوجہ سے ساقط کئے ہیں اور زوجہ نے اس کو تسلیم کرلیا ہے۔ در مختار کے اسی باب میں ہے: و يكون بلفظ البيع و الشراء و الطلاق و المبارأة كبعتُ نفسكِ او طلاقك او طلقتك على كذا او بارأتك ای فارقتك و قبلت المرأة۔ رد المحتار میں ہے: (قوله و الخلع يكون) فی الجوهرة ألفاظ الخلع خمسة: خالعتكِ، باينتكِ، بارأتكِ، فارقتكِ، طلّقي نفسك على الف اهـ و يزاد عليه ما ذكره المصنف من لفظ البيع و الشراء (قوله كبعت نفسك)

تقدم عن الصغریٰ تصحیح انه مسقط للحقوق - ...

پس صورت مسئولہ میں زوج و زوجہ کے الفاظ سے دونوں کا محض خلع اور قبول پر آمادہ ہونا ثابت ہے ۔ قطعی طور پر زوج کا خلع دے دینا اور زوجہ کا اس کو قبول کرلینا جس کو شرعاً ایجاب و قبول کہا جاتا ہے طرفین کی تحریر سے ثابت نہیں ۔ لہذا اس تصفیہ کے بعد جبکہ طرفین ایک دوسرے کی شروط پر راضی ہوجائیں تو وقوع خلع کے لئے زوج کا از سر نو الفاظ وقوع کے ساتھ خلع دینا اور زوجہ کا الفاظ قبول کے ساتھ اس کو قبول کرنا ضروری ہے ۔ چنانچہ بہجت المشتاق فی احکام الطلاق صفحہ ۱۰۳ کی عبارت سے ثابت ہے : مدخولۃ سألتْ طلاقھا فقال الزوج أبرئینی عن کل حقٍ لکِ علیَّ حتیٰ اطلقکِ فقالت أبرأتُکَ عن کل حق یکون للنساء علیٰ الرجال فقال الزوج فی فور ذٰلک طلقتک واحدۃ و کذا یقع واحدۃ بائنۃ لأنہ طلقھا عوضاً عن الإبراء ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر نے اپنی زوجہ ہندہ سے بارہا یہ کہا کہ : میں تجھے طلاق دیا میرے گھر سے چلی جا ؛ اور اس کے بعد متعدد اشخاص کے روبرو یہ بیان کیا کہ میں نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ دس مرتبہ کہہ دیا کہ ہندہ جہاں چاہے چلی جائے مجھ کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔ اس قول کے بعد جب تحریری طلاق کے لئے کہا گیا تو بیان کیا کہ تحریری کی ضرورت نہیں ۔ میں زبان سے ایک نہیں دس دفعہ طلاق کہدیا ہوں ۔ اس واقعہ کو تین چار سال کا عرصہ گذرا ۔ کیا ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی ؟ اور ہندہ عقد ثانی کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

طلاق واقع ہوگئی ، اور عدت بھی ختم ہوگئی ۔ ہندہ کو حق ہے کہ دوسرے سے عقد ثانی کرلے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مرزا بلاقی بیگ نے مندرجہ ذیل طلاق نامہ کے ذریعہ اپنی زوجہ کو طلاق بائن دی ، اور طلاق نامہ عدالت میں ارسال کرکے بذریعہ تحریر زوجہ کو بھی اس کی اطلاع دیدی ۔ ایسی حالت میں کیا شرعاً طلاق واقع ہوئی یا نہیں ؟

طلاق نامہ

میں بذریعہ اس تحریر کے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بتاریخ ۱۷ / خورداد ۱۳۲۲ فصلی وقت نو بجے بروز پنجشنبہ بمقابلۂ گواہان میر رحمت علی و غوث محمد خاں مسماۃ فاطمہ بیگم عرف جمال بی کو اس کی وفاداری پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق بائن دی

الجواب

وقوع طلاق کے لئے زوجہ کا نام لینا بھی کافی ہے ، زوجہ کا روبرو ہوکر زوج کی زبان سے طلاق سننا ضروری نہیں ہے ۔ بہجت المشتاق فی احکام الطلاق مصری صفحہ ۱۵ میں ہے ، لا بد فی الطلاق من خطابہا او الاضافۃ الیہا ۔ البحر الرائق جلد ۳ صفحہ ۲۷۳ باب الطلاق الصریح میں ہے ؛ و ذکر اسمہا او اضافتہا الیہ کخطابہ کما بینا ۔ پس صورت مسئولہ میں زوج نے اگر گواہوں کے روبرو زبانی طلاق دیکر اس کی اطلاع بذریعہ اس تحریر کے عدالت اور زوجہ کو دی ہے تو بمجرد زبان سے لفظ طلاق نکالنے کے طلاق واقع ہوگئی ۔ بشرطیکہ گواہ اس کی شہادت دیں ۔ اگر زبانی نہیں دیا بلکہ ابتداءً یہ تحریر بعنوان طلاق نامہ زوجہ کے پاس ارسال کیا ہے تو لفظ طلاق لکھنے کے وقت ہی طلاق واقع ہوگئی ۔ بشرطیکہ تحریر اس کی دستخطی ثابت ہوجائے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۷۸ فصل طلاق بالکنایہ میں ہے ؛ و ان کانت مرسومۃ یقع الطلاق نوی او لم ینو ثم المرسومۃ لا تخلو اما ان ارسل الطلاق بان کتب اما بعد فانت طالق فکما کتب هذا یقع الطلاق و تلزمہ العدۃ من وقت الکتابۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عطاء الرحمن نے اپنی زوجہ کبریٰ بی سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں تم کو طلاق دیتا ہوں ۔ اسی طرح تین مرتبہ کہا اور تین مرتبہ دروازہ کے باہر کہا ۔ اس وقت معزز اشخاص اہل محلہ موجود تھے جنہوں نے اس طلاق کو سنا ۔ کیا شرعاً طلاق واقع ہوئی؟ اگر واقع ہوئی تو کونسی ؟

الجواب

زوج طلاق کو بصیغہ مضارع اداء کرتے وقت اگر زمانہ حال کی صراحت کردے تو طلاق فی الحال واقع ہو جاتی ہے ۔ بہجت المشتاق فی احکام الطلاق کے صفحہ ۱۳ میں ہے ؛ قال فی الفتح و لا یقع باطلقک الا اذا غلب فی الحال اھ قال فی الخلاصۃ و فی المحیط لو قال بالعربیۃ اطلق لا یکون طلاقا الا اذا غلب استعمالہ فی الحال فیکون طلاقا ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زوج نے "تم کو طلاق دیتا ہوں" بصیغہ مضارع حال تین دفعہ بیان کیا ہے لہذا تین طلاق واقع ہوگئیں ۔ اب زوجہ بعد ختم عدۃ دوسرے شخص سے نکاح کرلے ۔ جب دوسرا خاوند اس سے صحبت کرکے طلاق دیدے اور اس کی عدۃ بھی ختم ہوجائے تب پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے ۔ کنز الدقائق کی کتاب الطلاق باب الرضاع میں ہے ؛ و ینکح مبانتہ فی العدۃ و بعدها لا المبانۃ بالثلاث لو حرۃ و بالثنتین لو امۃ حتیٰ یطأها غیرہ و لو مراهقا بنکاح صحیح و تمضی عدته لا بملک یمین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کی نا شائستہ و ناگوار گفتگو پر دو طلاق

دی ، کیا یہ طلاق بائن ہے یا رجعی ؟

الجواب

دو طلاق صریح رجعی ہیں ، زوج کو حق ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے رجعت کرلے ۔ یعنی دو گواہوں کے روبرو یہ کہے کہ میں اپنی زوجہ کو طلاق سے واپس کرلیا ۔ یا زوجہ سے کہے کہ میں تجھے واپس کرلیا ۔ کنز الدقائق کی کتاب الطلاق باب الرجعہ میں ہے :۔ ھی استدامة الملک القائم فی العدة و تصح فی العدة ان لم یطلق ثلاثا و لو لم ترض براجعتک و راجعت امرأتی و بما یوجب حرمة المصاھرة و الاشھاد مندوب علیھا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اگر بحالت جنون ہندہ کو طلاق دے تو یہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں ؟ اگر واقع ہوگی تو اس کی عدت کیا ہے ؟

الجواب

زید نے اگر جنون کی حالت میں طلاق دی ہے تو طلاق واقع نہیں ہوئی ۔ در مختار کی کتاب الطلاق میں ہے ، لا یقع طلاق المولیٰ علی امرأة عبدہ و المجنون الا اذا علق عاقلا ثم جن فوجد الشرط ۔ اگر جنون سے افاقہ کامل حاصل ہونے کی حالت میں طلاق دی ہے تو طلاق واقع ہے ، اور اس کی عدت حائضہ کے لئے تین حیض ہے اور غیر حائضہ کے لئے تین مہینے اور حاملہ کے لئے وضع حمل ۔ رد المحتار کی جلد ۵ صفحہ ۹۴ کتاب الحجر میں ہے ، و جعلہ الزیلعی فی حال افاقتہ کالعاقل و المتبادر انہ کالعاقل البالغ و بہ اعترض الشرنبلالی علی الدرر فلا تتوقف تصرفاتہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ غلام محمد دستگیر خاں نے فاطمہ بیگم کو ایک طلاق دی جس کو تخمیناً چار سال کا عرصہ گذرا ۔ تاریخ طلاق سے فاطمہ بیگم شوہر سے علیحدہ ہے ۔ کیا دوبارہ نکاح جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں غلام محمد دستگیر خاں کا نکاح اپنی سابقہ زوجہ فاطمہ بیگم سے دوبارہ درست ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے طلاق کی عدت میں اجنبی شخص سے نکاح کرلیا

اور اس کے ساتھ رہی۔ کیا یہ نکاح قابل فسخ ہے؟ اور در صورت فسخ تجدید نکاح کے لئے استبراء کی ضرورت ہے یا نہیں؟

الجواب

عدت والی عورت کا نکاح چونکہ شرعا غیر منعقد ہے اس لئے صورت مسئولہ میں ہندہ کا نکاح ثانی منعقد نہیں ہے۔ اگر اجنبی ناکح نے اس کو معتدۂ غیر جانکر نکاح کیا اور اس کے ساتھ قربت یا خلوت کی ہے تو اس پر عدت یعنی استبراء واجب نہیں۔ چاہئے کہ عدتِ طلاق ختم ہونے کے بعد تجدیدِ نکاح کرے، موجودہ نکاح ثانی باطل و لغو ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۲۲ باب العدۃ میں بحر سے منقول ہے: اما نکاح منکوحة الغير و معتدته فالدخول فيه لا يوجب العدة ان علم انها للغير لأنه لم يقل احد بجوازه فلم ينعقد اصلا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر بالغ و عاقل سے جبرًا اس کی زوجہ ام کلثوم کا طلاق نامہ لکھوایا گیا اور جبرًا دستخط لی گئی، کیا یہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اس کے بعد ام کلثوم کا عقد نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب

جبرًا طلاق نامہ لکھوانے سے طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لئے کلثوم کا عقد ثانی درست نہیں۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۲۲ کتاب الطلاق میں ہے: فلو اکره علی ان یکتب طلاق امراته فكتب لا تطلق لأن الكتابة اقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا كذا في الخانية۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ منکوحۂ خالد نے بعد وفاتِ خالد ایام عدت میں زید کے ساتھ نکاح کیا، کیا یہ نکاح صحیح ہے یا فاسد؟ اگر فاسد ہے تو بعد ختم عدت زید ہی سے نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ جو اندرون عدت ہوا ہے شرعا درست نہیں ہے، بعد ختم عدت ہندہ زید سے نکاح کرسکتی ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۲۲ باب العدۃ میں ہے: اما نکاح منکوحة الغير و معتدته

فالدخول فیہ لا یوجب العدۃ ان علم انہا للغیر لانہ لم یقل احد بجوازہ فلم ینعقد اصلا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ بیماری کی وجہ سے اپنے والدین کے گھر زید کی رضامندی سے بغرض علاج گئی تھی ۔ زید نے اپنی زوجہ کو ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا مگر زوجہ اور اس کے والدین اس غرض سے راضی نہیں ہوئے کہ زید کے گھر اچھی طرح علاج نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے گھر میں کوئی پرسان حال تھا ۔ مگر زید نے باصرار تمام اپنے گھر لے جانے کی ضد کی اور مختار مجلس کے روبرو یہ الفاظ کہے کہ " اگر آج میرے گھر ہمراہ نہ چلی تو طلاق ہے " پھر اس کے بعد اپنی زوجہ کے بالمشافہ حاضرین مجلس اور دو عورتوں کے روبرو یہ الفاظ کہا کہ " میرے کہنے کے موافق تم بکر و عمرو سے پردہ نہیں کیں اس لئے تم میرے نکاح سے باہر ہوگئیں " یہ الفاظ مکرر سہ کرر کہا لیکن بکر و عمرو کے سامنے زوجہ شادی سے اب تک برابر نکلتی تھی ان سے کسی قسم کا پردہ نہیں تھا اور بکر و عمرو رشتہ میں چچازاد بھائی ہوتے ہیں ۔ زوجہ اس روز والدین کے گھر سے نہیں گئی ۔ کیا زوجین میں تعلقات شرعی باقی ہیں یا نہیں ؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہے تو رجعی ہے یا بائن یا مغلظہ ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں زوج کا پہلا قول کہ " اگر میرے گھر ہمراہ نہ چلی تو طلاق ہے " یہ طلاق معلق ہے ۔ اس کے بعد اگر زوج اسی وقت یا اس دن کے ختم ہونے کے پہلے یہ کہا کہ " تم میرے کہنے کے موافق بکر و عمرو سے پردہ نہیں کیں اس واسطے تم میرے نکاح سے باہر ہوگئیں " یہ طلاق کنائی ہے ، اگر زوج نے یہ لفظ کہتے وقت طلاق کی نیت کی ہے تو اس سے فی الفور طلاق بائن واقع ہوگئی ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۳۰۵ کتاب الطلاق فصل کنایات میں ہے : و لو قال لہا لا نکاح بینی و بینک او قال لم یبق بینی و بینک نکاح یقع الطلاق اذا نوی ۔ اس قول کے بعد جب دن ختم ہوگیا اور زوجہ زوج کے ساتھ اس کے گھر نہیں گئی تو پہلے قول کے موافق طلاق صریح معلق واقع ہوگئی ۔ عالمگیریہ کے اسی باب میں ہے : الطلاق الصریح یلحق الطلاق الصریح بأن قال انتِ طالق وقعت طلقۃ ثم قال انتِ طالق تقع الاُخری و یلحق البائن ایضا بان قال لہا انتِ بائن او خالعہا علی مال ثم قال لہا انتِ طالق وقعت عندنا ۔ پس اس ترتیب سے چونکہ پہلے طلاق بائن اور بعد میں طلاق صریح معلق واقع ہوئی ہے اس لئے زوج بدون دوبارہ نکاح کے زوجہ کے ساتھ تعلق زوجیت قائم نہیں کرسکتا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید شہر سے تین منزل کی مسافت پر چلا گیا ۔ اور وہاں سے

ایک خط زوجہ کے باپ کے پاس بایں الفاظ روانہ کیا کہ: "میں تمہاری دختر مسماۃ عائشہ بی کو اپنی زوجیت سے خارج کردیا چاہتا ہوں اس لئے بذریعہ ہذا مطلع کئے دیتا ہوں کہ عورت مذکورہ مطلقہ خیال کی جائے یعنی عورت مذکورہ کو طلاق دیا میں وہ جس سے چاہے بعد عدت نکاح کرسکتی ہے مجھے کوئی عذر نہیں ہے وہ تاریخ وصولِ خط سے مطلقہ خیال کی جائے اور اسی وثیقہ کو بجائے طلاق نامہ کے تصور کیجئے اور عورت مجتنب کی جائے"۔ پس زوج کی اس تحریر سے کیا طلاق واقع ہوئی؟ اگر ہوئی تو بائن ہے یا رجعی یا مغلظہ؟ اور در صورت طلاق کیا زوجہ کا نفقہ عدت زوج پر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب

طلاق بالکتابت چونکہ شرعاً معتبر ہے اس لئے صورت مسئولہ میں زوجہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہوئی، ختم عدت کے بعد زوجہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے، اور ایام عدت کا نفقہ زوج پر واجب الاداء ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۲۹ کتاب الطلاق میں ہے: و ان کانت مرسومۃ یقع الطلاق نوی او لم ینو ثم المرسومۃ لا تخلو اما ان أرسل الطلاق بأن کتب اما بعد فأنت طالق فکما کتب ھذا یقع الطلاق و تلزمھا العدۃ من وقت الکتابۃ و ان علق طلاقھا بمجیء الکتاب بأن کتب اذا جاءک کتابی فأنت طالق فجاءھا الکتاب فقرأتہ او لم تقرأ یقع الطلاق کذا فی الخلاصۃ۔ در مختار جلد ۲ صفحہ ۷۸۸ باب النفقہ میں ہے: (و) تجب (لمطلقۃ الرجعی و البائن و الفرقۃ بلا معصیۃ کخیار عتق و بلوغ و تفریق بعدم کفاءۃ النفقۃ و السکنیٰ و الکسوۃ) ان طالت المدۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ حاملہ کو دو گواہوں کے روبرو بحالت غصہ تین طلاق دی، اس کے بعد دوسرے مکان میں جاکر اپنی دوسری زوجہ کو بھی تین طلاق دی مگر اس وقت گواہ نہیں تھے محض زوج و زوجہ کو اس کا اقبال ہے۔ ایسی صورت میں ان دونوں زوجگان پر کونسی طلاق ہوئی؟ اور اس کے کیا احکام ہیں؟ کیا زید کا ان میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں دونوں زوجہ پر طلاق مغلظہ واقع ہوگئی، اب بدون حلالہ کے یعنی دونوں کی عدت ختم ہونے کے بعد جب دوسرے اشخاص کے ساتھ نکاح و صحبت کریں پھر وہ ان کو طلاق دیں اور اس کی عدت ختم ہوجائے تب زید ان کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے۔ کنز الدقائق کے باب الرجعہ میں ہے: و ینکح مبانتہ فی العدۃ و بعدھا لا المبانۃ بالثلاث لو حرۃ و بالثنتین لو أمۃ حتی یطأھا غیرہ و لو مراھقا بنکاح صحیح و تمضی عدتہ لا بملک یمین۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دولت خاں نے اپنی زوجہ کو ایک طلاقِ بائن بذریعۂ تحریر دی، اب ما بین ان ہر دو کے تعلق زوجیت قائم کرنے کی کیا صورت ہے؟

الجواب

طلاق بالکنایہ شرعاً معتبر ہے لہذا صورت مسئولہ میں ہر دو کے ما بین تعلق زوجیت قائم کرنے کے لئے عقد ثانی کی ضرورت ہے، رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۲۹ کتاب الطلاق میں ہے: و ان کانت مرسومة یقع الطلاق نوی او لم ینو۔ کنز الدقائق کے باب الرجعہ میں ہے: و ینکح مبانته فی العدة و بعدها۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوج، زوجہ کو بلانے کی غرض سے اس کے والد کے مکان کو گیا تھا۔ زوجہ کے والد کے چند احباب کے مجمع میں زوج کو طلاق نامہ مغلظہ لکھدینے پر مجبور کیا گیا اور تخویف دلائی گئی، زوج نے ضرر جان کے خوف سے طلاقنامہ مغلظہ لکھدیا، بوقت تحریر طلاق زوجہ رضامند تھی لیکن بعد طلاق وہ بھی طلاق سے ناراض ہوگئی، پس ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب

اگر زوج کسی تخویف و جبر سے طلاق دیدے تو شرعاً طلاق واقع ہوتی ہے، مگر شرط یہ کہ طلاق اپنی زبان سے کہے۔ اگر جبر و تعدی سے کسی کاغذ پر قلم سے لکھدیا اور زبان سے کچھ بھی نہیں کہا تو ایسی صورت میں شرعاً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۳۳ میں ہے: (و یقع طلاق کل زوج بالغ عاقل و لو عبداً او مُکرَهاً) فان طلاقه صحیح لاقراره بالطلاق و قد نظم فی النهر ما یضم مع الاکراه فقال: طلاق و ایلاء و ظهار و رجعة۔ اور رد المحتار کے اسی صفحہ میں تحت قول لاقراره بالطلاق مکتوب ہے: و فی البحر ان المراد الاکراه علی التلفظ بالطلاق فلو اُکره علی ان یکتب طلاق امرأته فکتب لا تطلق لان الکتابة اُقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة و لا حاجة هنا کذا فی الخانیة۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زوج نے طلاق مغلظہ محض کاغذ پر لکھدیا ہے اور زبان سے کچھ بھی نہیں کہا تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ سے یہ کہکر سفر کیا کہ اگر میں مدت معینہ تک تیرا نفقہ روانہ نہ کروں تو تجھے طلاق ہے اس کے بعد عدت ختم کرکے کسی سے نکاح کرلینا۔ پس زید کو سفر

کئے ہوئے دو سال کا عرصہ ہوا ہے ، اب تک نہ تو نفقہ روانہ کیا اور نہ اس کی کوئی خبر ہے ، اور جو مدت کہ نفقہ روانہ کرنے کی بیان کی تھی وہ بھی ختم ہوگئی ہے ۔ ایسی صورت میں کیا ہندہ پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

جب طلاق کی اضافت کسی شرط کی طرف کی جاتی ہے تو اس شرط کے واقع ہونے کے بعد طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے ۔ عالمگیریہ مصری کی جلد ۱ صفحہ ۴۲۰ کتاب الطلاق میں ہے : و اذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زید نے مدت متعینہ تک نفقہ نہ بھیجنے کو طلاق کے لئے شرط گردانا ہے ، اب جبکہ مدتِ متعینہ گذر گئی اور زید نے نفقہ نہیں بھیجا اس لئے مدت کے ختم ہوتے ہی زوجہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہوئی ، اور طلاق ہونے کے ساتھ ہی عدت بھی شروع ہو گئی ۔ یعنی مدت متعینہ کے ختم ہونے کے بعد جب زوجہ کے تین حیض پورے ہوتے اسی وقت اس کو دوسرے سے نکاح کرنے کا شرعا اختیار حاصل ہوگیا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جس عورت کو طلاق ثلاثہ دی جائے کیا وہ عورت اپنے شوہر کی جائداد پر قابض ہوسکتی ؟ کیا وہ بحالت زندگی مورث جائداد کی وارث ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر زوج ، زوجہ کو بحالت صحت تین طلاق دیدے تو زوجہ شرعا زوج کی میراث سے محروم ہوجاتی ہے ۔ البحر الرائق مصری جلد ۴ صفحہ ۴۶ میں ہے : اذا طلق فی الصحة ثم مرض و مات و هی فی العدة لا ترث منه ۔ اور عنایہ کے باب طلاق مریض میں ہے : اذا طلقها بائنا فی صحته او فی مرضه ثم صح ثم مات لا ترث ۔ اور فتح القدیر میں ہے : و اجمعوا انه لو طلقها فی الصحة فی کل طهر واحدة ثم مات احدهما لا یرثه الآخر ۔ اور فتاویٰ ہندیہ کی جلد ۱ صفحہ ۱۴۲ کتاب الطلاق میں ہے : اذا اثبت وارث الزوج طلاق الزوجة ثلاثا حال صحة الزوج لا یکون لها میراث و لو مات فی عدتها ۔ پس صورت مسئولہ میں بعد طلاق اگر زوج کا انتقال ہوجاتا ہے تو شرعا زوجہ اس کی میراث پانے کی مستحق نہیں تھی ۔ اور اب جبکہ زوج زندہ ہے تو زوجہ کو اس کی جملہ جائداد سے مہر معین کے سوا کوئی اور حق نہیں ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کے ساتھ عقد کیا ، ہندہ تمتع نہ دیکر بلا اجازتِ شوہر کے مکان سے باہر ہوگئی ، ایسی حالت میں ہندہ کا عقد و نفقہ و مہر قائم ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کے خاوند کے گھر سے بدون حق شرعی باہر جانے کو "نشوز" کہتے ہیں اور "ناشزہ" نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ فتاویٰ انقرویہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۱ کے حاشیہ میں فتاویٰ ابن نجیم سے منقول ہے: سئل عن النشوز و إسقاط النفقة و الكسوة اجاب هو الخروج عن محل الزوج بلا إذنه بغير حق. من فتاوى ابن نجيم في النفقة۔ شرعاً ناشزہ عورت کا نہ نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ مہر سے محروم کی جاتی ہے۔ صفحہ ۱۱۳ میں ہے: و نشزت في حال قيام النكاح من كل وجه لم تكن لها النفقة و السكنى و كذا اذا نشزت في حال قيام النكاح من وجه من المحل المزبور۔

البتہ اگر عورت مرتد ہوجائے یا اپنے سوتیلے لڑکے کا شہوت سے بوسہ لے تو اس وقت مہر ساقط ہوتا ہے۔ اور اگر خاوند عورت کو بدون وطی یا خلوۃ صحیحہ کے طلاق دیدے تو نصف مہر خاوند پر واجب ہوتا ہے۔ فتاوی رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۹۳ میں ہے: و افاد ان المهر وجب بنفس العقد مع احتمال سقوطه بردتها او تقبيلها ابنه او تنصفه بطلاقها قبل الدخول۔

پس صورت مسئولہ میں اگر ہندہ بدون حق شرعی بلا اجازت خاوند کے گھر سے باہر گئی ہے تو تا واپسی خاوند پر اس کا نفقہ و کسوہ واجب نہیں ہے۔ اور اس نشوز سے شرعاً نہ نکاح باطل ہوتا ہے اور نہ مہر ساقط ہوتا ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے نکاح کیا۔ بعد از چند سال ہندہ زید سے خلاف کرکے فرار ہوگئی، زید نے اسے طلاق نہیں دی۔ اور معلوم نہیں کہ اس وقت ہندہ کس حالت میں ہے۔ مگر دریافت سے صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ زندہ ہے۔ اس صورت میں زید کا ہندہ کی بھانجی سے نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور عدم علم کی وجہ سے نکاح ہوجائے تو کیا باطل ہوگا یا اس پر کچھ کفارہ لازم آئے گا؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی ہندہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے اگرچہ وہ غائب ہو ہندہ کی بھانجی سے نکاح کرنا شرعاً حرام ہے۔ شرح وقایہ جلد ۲ صفحہ ۱۳ مطبوعہ مجتبائی میں ہے: و حرم الجمع بين الأختين نكاحاً و عدة و لو من بائن و وطياً بملك يمين و بين امرأتين أيتهما فرضت ذكراً لم تحل له الأخرى۔

البتہ زید کے ہندہ کو طلاق دینے کے بعد جبکہ عدت ختم ہوجائے تب ہندہ کی بھانجی سے نکاح کرسکتا ہے۔

خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے بھانجی کا نکاح فاسد و باطل ہے، رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۴۰ میں ہے: و فسر القهستاني ههنا الفاسد بالباطل و مثله بنكاح المحارم۔ اس قسم کے نکاح کیلئے شرع میں زوج و

زوجہ ہر ایک کو یہ حق دیا گیا ہے کہ بدون اجازت و حاضری دوسرے کے اس نکاح کو فسخ کرلے اور علیحدہ ہوجائے، کیونکہ گناہ سے بچنا ہر ایک پر لازم ہے، اور اس فسخ کیلئے بین ہر دو لے وطی کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ ہر حالت میں یہ حکم ہے، اور در صورت علیحدہ نہ ہونے کے قاضی پر ان کی تفریق واجب ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۳۹۰ میں ہے: (و) یثبت (لکل واحد منهما فسخه و لو بغير محضر عن صاحبه دخل بها او لا) في الأصح خروجاً عن المعصية فلا ينافي الوجوب بل يجب على القاضي التفريق بينهما۔ رد محتار میں تحت قول بل یجب علی القاضی مکتوب ہے: ای ان لم يتفرقا۔

جان بوجھکر اس قسم کے نکاح و وطی کرنے والے پر شرعاً اگرچہ حدِ زنا نہیں ہے، مگر قاضی کو چاہئے کہ کچھ نہ کچھ سزا ضرور دے تاکہ آئندہ کے لئے اس کو نصیحت ہو اور دوسروں کو تنبیہ ہوجائے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار مصری جلد ۳ صفحہ ۱۵۸ کتاب الحدود میں ہے: (و) لا حد ايضا (لشبهة العقد) اى عقد النكاح (عنده) اى الامام (كوطء محرم نكحها)۔ اور رد محتار میں تحت قول کوطء محرم نکحها مکتوب ہے: اى عقد عليها اطلق في المحرم فشمل المحرم نسبا و رضاعا و صهرية۔ اسی جگہ کافی حاکم سے منقول ہے: و كذا عبارة الكافي للحاكم تفيده حيث قال تزوج امرأة ممن لا يحل له نكاحها فدخل بها لا حد عليه و ان فعله على علم لم يحد ايضا و يوجع عقوبة في قول ابى حنيفة۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زید نے زوجہ کی بھانجی سے نکاح کرلیا ہے تو چاہئے کہ فوراً علیحدہ ہوجائے اور نکاح فسخ کردے تاکہ گناہ حرام سے نجات ملے۔ اور اگر لاعلمی میں یہ فعل اس سے سرزد ہوا ہے تو اس پر شرعاً کوئی حد نہیں ہے۔

نکاح فاسد و نکاح باطل میں بعض فقہاء کے پاس عدت کا فرق ہے، یعنی نکاح باطل میں وطی کرنے کے بعد بھی جبکہ مابین مرد و عورت کے تفریق ہوجائے عدت لازم نہیں ہے، رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۹۰ کتاب النکاح میں ہے: و الحاصل انه لا فرق بينهما في غير العدة و اما فيها فالفرق ثابت۔ اور بعض فقہاء دونوں کو ایک ہی لکھتے ہیں، اس لئے رائے صواب یہ بیان کرتے ہیں کہ نکاح باطل میں بھی عدت و نسب ثابت ہے، چنانچہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۹۲۳ باب العدۃ میں ہے: (قوله فلا عدة في باطل) فيه انه لا فرق بين الفاسد و الباطل في النكاح بخلاف البيع كما في النكاح۔ الفتح و المنظومة المحبيبية۔ در مختار میں ہے: لكن الصواب ثبوت العدة و النسب۔ بحر۔ عدت کے سوا دوسرے احکام یعنی ثبوت نسب و مہر، نکاح باطل میں نکاح فاسد کی طرح ہیں۔ اور نکاح فاسد کے یہ احکام ہیں کہ اگر نکاح کے بعد وطی کی جائے تو بعد تفریق مرد پر عورت کا مہر مثل واجب ہے اور اگر مہر مثل مہر مسمی یعنی نکاح کے وقت مقرر کئے ہوئے مہر سے زائد ہے تو پھر مہر مسمی دینا چاہئے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۵۹ میں ہے: (و يجب مهر المثل في نكاح فاسد بالوطء) في القُبل (لا بغيره) كالخلوة لحرمة وطئها (و لم يزد على المسمىٰ)۔ اور بعد وطی جبکہ تفریق ہوجائے احتیاطاً نسب ثابت ہوتا ہے، چنانچہ در مختار میں ہے: (و يثبت النسب) احتياطا۔ مگر شرط یہ کہ وطی کے بعد چھ مہینے یا اس سے زیادہ

مدت گذرنے کے بعد بچہ پیدا ہو ، اور اگر چھ مہینے سے کم میں بچہ کی ولادت ہو تو نسب ثابت نہیں ہوتا ، چنانچہ در مختار میں اسی جگہ ہے ؛ (و تعتبر مدته) و ھی ستة اشھر (من الوطیٔ فان کانت منه الیٰ وضع اقل مدة الحمل) یعنی ستة اشھر فاکثر (یثبت) النسب (والا) بان ولدته لاقل من ستة اشھر (لا) یثبت ۔ بناء بریں اگر زید نے ہندہ کی بھانجی سے وطی کی ہے تو زید کو چاہئے کہ بعد تفریق ہندہ کی بھانجی کو حسب تفصیل سابق مہر مثل اداء کرے اگر اس سے زید کو کوئی اولاد ہوئی ہے تو حسب تفصیل بالا زید کا اس سے نسب ثابت ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی شادی بزمانہ نابالغی ہوئی ، جب سن بلوغ متجاوز ہوا اور تقریبا بیس سال سے زائد اس کی عمر گذری جب اسی کو نہیں بلکہ اس کی زوجہ و والدین و اقارب و احباب کو بھی اس امر کا ثبوت و یقین ہوگیا کہ زید نامرد ہے اور یہ نامردی بوجہ خصی یا جادو یا قطع انثیین کے نہیں بلکہ خلقی و پیدائشی ہے ۔ نیز اس وقت زوجہ کی بھی عمر ۱۲ برس کی ہو گئی ہے ۔ زوجہ اور اس کے ولی جائز نے بگذاشت زر مہر زوج سے خلع کرلیا ہے اور باہمی مفارقت بھی بحکم قاضی ہو گئی ہے ، کیا ایسی صورت میں جبکہ نہ وطی ہوئی اور نہ زوج میں وطی کی صلاحیت تھی زوجہ پر عدت لازم ہے ؟ اگر ہے تو کتنی مدت ؟

الجواب

شرع میں عدت کے وجوب کا سبب وہ نکاح ہے جس کے بعد وطی یا خلوت یا موت ہوتی ہے ۔ پس جس عورت کے ساتھ وطی یا خلوت ہوئی ہے شرعا اس پر عدت واجب ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۶۱۵ باب العدۃ میں ہے ؛ (و سبب وجوبها) عقد (النکاح المتأکد بالتسلیم و ما جریٰ مجراہ) من موت او خلوة ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زوج عنین نے اپنی زوجہ سے خلوت کی ہے تو بعد تفریق زوجہ پر عدت واجب ہے ، اور اگر خلوت نہیں ہوئی ہے تو عدت واجب نہیں ہے ۔ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۹۰۹ باب العنین میں تحت قول فرق الحاکم مکتوب ہے ؛ و لها کل المهر و علیها العدة ان خلا بها عنده و عندهما لها نصفه کما لو لم یخل بها ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۵۲۳ باب العنین میں ہے ؛ و لها المهر کاملا و علیها العدة بالإجماع ان کان الزوج قد خلا بها و ان لم یخل بها فلا عدة علیها و لها نصف المهر ان کان مسمیٰ و المتعة ان لم یکن مسمیٰ کذا فی البدائع ۔

شرع میں حیض والی عورت کیلئے کامل تین حیض عدت رکھی گئی ہے ، اور جسکو حیض نہیں آتا اس کی عدت کامل تین مہینے ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد مختار جلد ۲ صفحہ ۶۱۹ میں ہے ؛ (و ھی فی حرة تحیض لطلاق) و لو رجعیا (او فسخ) بجمیع اسبابه و منه الفرقة بتقبیل ابن الزوج (بعد الدخول حقیقة او حکما ثلاث حیض کوامل و فیمن لم تحض لصغر او کبر او بلغت بالسن و لم تحض

ثلاثۃ اشہر) بالاَہلۃ لو فی الغرۃ و الا فبالاَیام ۔ بحر و غیرہ (ان وطئت فی الکل) و لو حکما کالخلوۃ و لو فاسدۃ ۔ رد المحتار میں تحت قول و الا فبالایام مکتوب ہے : فی المحیط اذا اتفق عدۃ الطلاق و الموت فی غرۃ الشہر اعتبرت الشہور بالاَہلۃ و ان نقصت عن العدد و ان اتفق فی وسط الشہر فعند الامام تعتبر بالاَیام فتعتد فی الطلاق بستین یوما و فی الوفاۃ بمائۃ و ثلاثین ۔

پس صورت مسئولہ میں اگر زید کی زوجہ کو حیض آتا ہے تو بعد تفریق جبکہ تین حیض کامل گذر جائیں تب اس کو دوسرے سے نکاح کرنے کی اجازت ہے ، اور اگر کمسنی کی وجہ سے حیض نہیں آتا ہے تو تفریق کے بعد اس کو تین مہینے کامل عدت گذارنا چاہئے ۔ چاند کی پہلی تاریخ میں اگر تفریق ہوئی ہے تو چاند سے چاند تک حساب لگاکر عدت پوری کرنا ہوگا ، اور اگر پہلی کے بعد تفریق ہوئی ہے تو فی مہینہ تیس دن کے حساب سے پورے نوے (۹۰) روز گذر جانے کے بعد اس کو دوسرے شخص سے نکاح کا حق حاصل ہے ، جیسا کہ روایت سابقہ سے ظاہر ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر زوج اپنے پر واجب حقوق مثل نان نفقہ وغیرہ زوجہ کو ادا کرتا رہے ، اور زوجہ اپنے زوج کی اطاعت میں نہ ہو اور اپنے بھائی بہن یا والدین کے مکان میں رہے اور زوج کی نافرمان ہو ، تو ایسی صورت میں زوج پر نان و نفقہ ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ جب نافرمان و ناشزہ ہے تو اس کا نفقہ و سکنیٰ زوج پر واجب نہیں ہے ۔ فتاویٰ انقرویہ جلد ا صفحہ ۱۴۳ میں ہے : و لو نشزت فی حال قیام النکاح من کل وجہ لم تکن لہا النفقۃ و السکنی و کذا اذا نشزت فی حال قیام النکاح من وجہ من انفصل المزبور ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر زید اپنی زوجہ کو " چلے جاؤ " کہے تو از روئے شرع شریف کیا اس لفظ سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں ؟ اگر طلاق واقع ہوتی ہے تو طلاق بائن ہوگی یا رجعی ؟ اور نیت کی متعلق اختلاف ہونے کی صورت میں زوج کا قول معتبر ہے یا زوجہ کا ؟

الجواب

چلے جاؤ کو عربی " اذھبی و اخرجی " ہے اور یہ طلاق کنایہ کے لفظ ہیں ۔ عالمگیریہ جلد ا صفحہ ۳۰۲ فصل الکنایات میں ہے : و ما یصلح جوابا و ردا لا غیر اخرجی اذھبی ۔ طلاق کنائی کے واقع ہونے کی

شرط نیت ہے ۔ اگر زوج بحالت رضا ایسے لفظ زبان سے نکالنے کے وقت طلاق کی نیت کرے تو ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے ۔ اگر طلاق کی نیت نہ کرے تو طلاق نہیں ہوتی ۔ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : ففی حالة الرضا لا یقع الطلاق فی الألفاظ کلها الا بالنیة ۔ اور اظہار نیت کے متعلق زوج کا حلفی بیان معتبر ہے ۔ یعنی اگر زوج قسم کھاکر یہ بیان کرے کہ میری نیت اس لفظ سے طلاق کی نہیں تھی تو شرعا زوج کا قول معتبر ہے ۔ عالمگیریہ میں اسی جگہ ہے : و القول قول الزوج فی ترک النیة مع الیمین ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد بلا گذاشت جائداد انتقال کیا ۔ بعد انتقال خالد کی زوجہ ہندہ ایام عدت گزر جانے کے بعد تمام سامان جہیز و سامان چڑھاوا لے کر اپنے باپ کے گھر گئی ۔ تا حال باپ کے مکان میں سکونت پذیر ہے اور مدعی ہے کہ خالد کے باپ زید کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ سے اپنا نفقہ و مہر حاصل کرے ۔ کیا اس کا یہ دعویٰ شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کا نفقہ اس کے زوج پر واجب ہے چاہے وہ بڑا ہو یا بچہ ، عقلمند ہو یا دیوانہ ، غنی ہو یا فقیر ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۴۵۹ میں ہے : نفقة الزوجة الغیر الناشزة التی لا مانع من قبلها واجبة علی زوجها کبیرا کان او صغیرا عاقلا کان او مجنونا غنیا کان او فقیرا لأنها جزاء الاحتباس ۔ اسی طرح مہر کا حال ہے کیونکہ مہر ملک بضع یعنی حق وطی کا معاوضہ ہے جس کا زوج مالک ہے اس لئے زوج ہی کے ذمہ اس کی ادائی ہے ۔

زوج و زوجہ میں سے کسی ایک کے مرجانے کے بعد نفقۂ مفروض ساقط ہوجاتا ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۳۸۸ میں ہے : فی التنویر و بموت احدهما او طلاقهما یسقط المفروض الا فی اذا استدانت بأمر قاض ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ خالد کا بحالتِ ناداری انتقال ہوگیا ہے اس لئے خالد کی زوجہ ہندہ کو خالد کے باپ کی ذاتی جائداد سے مہر و نفقہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔

نفقہ تو خالد کے انتقال کی وجہ سے ساقط ہوگیا ۔ البتہ زر مہر خالد کے ذمہ قرض ہے ۔ سامان چڑھاوا جو خالد کی جانب سے شادی کے وقت ہندہ کو دیا گیا تھا اگر خالد یا اس کے والد نے جو اس سامان کو اپنی ذاتی رقم سے ہندہ کو دے دینے کی نیت سے بھیجا تھا یا مہر کی ادائی میں بھیجا تھا تو یہ سامان ہندہ کی ملک ہے ۔ اگر اس کو دے دینے کی نیت نہیں تھی تو بھیجنے والے کی ملک ہے ۔ جو ہندہ سے واپس لینے کے قابل ہے ۔ کیونکہ سامان چڑھاوا اسی وقت ملک ہوتا ہے جبکہ زوجہ کو مفت دے دیا جائے یا مہر میں اداء ہو ۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۷ کتاب النکاح میں ہے : و اذا بعث الزوج الیٰ اهل زوجته اشیاء عند زفافها منها دیباج فلما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذا بعث الیها علی جهة التملیک ۔ اور صفحہ ۳۲۲ میں ہے : رجل بعث الیٰ امرأته متاعا و بعث ابو المرأة الی الزوج متاعا ایضا ثم قال الزوج الذی

بعثته لکن صداقا لکن القول قول الزوج مع یمینه الخ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ ہندہ ، زید کے سفر کی حالت میں دوسرے شخص سے ناجائز تعلق پیدا کرکے فرار ہوگئی جس کو تخمیناً ۲۴ سال کا عرصہ گذر گیا ۔ زید نے ہندہ کی فراری کی کیفیت سنکر دو آدمیوں کے سامنے اس کو طلاق دیدی ۔ چونکہ ہندہ اس وقت غائب تھی زید کے طلاق کی اس کو اطلاع نہیں ہوئی ۔ بعد انقضاء عدت بلکہ تخمیناً ۲۴ سال بعد زید نے فاطمہ سے جو ہندہ کی حقیقی بھانجی ہے نکاح کیا ۔ کیا زید کا فاطمہ سے عقد شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

خاوند اگر زوجہ کے غائبانہ دو شخصوں کو گواہ رکھکر طلاق دیدے تو یہ طلاق معتبر ہے ، اور گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوجاتی ہے ، جیسا کہ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۹ میں کتاب الطلاق کے اس جزئیہ سے ثابت ہے ، سئل فی امرأة بالغة رشیدة متزوجة برجل بالغ رشید دخل بها و مکث معها مدة ثم تشاجر الزوج مع ابیها فی غیبتها و ابرأ الزوج من صداقها بغیر اذنها و رضاها فطلقها بحضرة بینة شرعیة و تزوجت غیره بعد انقضاء العدة و الآن طلبت من زوجها المطلق الصداق فانکر طلاقها فهل اذا کان الطلاق ثابتا بالبینة الشرعیة لا یجاب لذلک و لا عبرة بانکاره و یکون لها مطالبة بما لها عنده من الصداق و لا عبرة بابراء الأب له ؟ اجاب : لا عبرة لانکار الزوج المذکور الطلاق حیث ثبت علیه الطلاق بالوجه الشرعی و للزوجة المطالبة بما لها من الصداق حیث لم یکن ابوها وکیلا عنها فی الإبراء منه و لم تجزه ۔ جن دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اگر ان میں سے ایک کو جو نکاح میں تھی طلاق دیدی جائے تو اس کی عدت ختم ہولینے کے بعد دوسری سے نکاح کرنا جائز ہے ، عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۸ باب المحرمات میں ہے : و ان انقضت عدتها جاز له ان یتزوج بأختها شاء کذا فی التبیین ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ زید نے دو گواہوں کے روبرو ہندہ کو طلاق دے دی ہے اور عدت بھی ختم ہوگئی ہے تو اب زید کا ہندہ کی بھانجی سے نکاح کرنا شرعاً درست ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ سے یہ تحریری اقرار کیا کہ ماہ بماہ مبلغ چار روپیہ سکۂ محبوبیہ سسرال میں رکھکر اور پارچہ وغیرہ سالانہ اس کے علاوہ ایصال کرے گا ، احیاناً کسی ماہ میں مبلغ مذکور نہ پہنچے تو دوسرے ماہ میں بلا عذر پہنچادیگا ، اگر تیسرا مہینہ بھی بلا ادائی زر خوراک گذر جائے تو طلاق بائن ہے اور مہر دین واجب ۔ زید سے اس اقرار کی پابندی نہیں ہوئی ، کیا اقرار کے موافق تین ماہ کے بعد طلاق بائن واقع ہوئی یا نہیں ؟ اور مہر واجب الاداء ہے یا نہیں ؟ بعد انقضائے عدت زید سے خوراکِ ایام عدت و

زد مہر زوجہ پانے کی مستحق ہے یا نہیں ؟ اور زوجہ کا دوسرے شخص سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جو طلاق کہ کسی شرط سے متعلق کی جاتی ہے اس کو طلاق معلق و یمین بالطلاق کہا جاتا ہے ، شرط کے موجود ہونے سے وہ طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ مصری جلد ۲ صفحہ ۵۰۵ باب التعلیق میں ہے : (هو ربط حصول مضمون جملة بحصول مضمون جملة اخرى) و يسمىٰ يميناً مجازاً ۔ اور صفحہ ۵۱۵ میں ہے : (و تنحل) اليمين (بعد) وجود (الشرط مطلقا) ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ زوج نے تین مہینے تک زر خوراک روانہ نہ کرنے پر طلاق بائن واقع ہونے کو معلق کردیا تھا ، اس لئے بدون ادائے زر خوراک تین مہینے کامل گذرنے کے بعد زوجہ پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ۔ زوج نے اگر زوجہ سے خلوۃ صحیحہ کی ہے تو بعدِ طلاق اس پر پورا مہر واجب الاداء ہے ، اور اگر خلوۃ صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو نصف مہر کی ادائی واجب ہے ۔

طلاق کے بعد ایام عدت کا نفقہ زوج کے ذمہ واجب ہے ، در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۶۸۷ باب النفقہ میں ہے : (و) تجب (لمطلقة الرجعي و البائن بالفرقة بلا معصية) ۔ رد المحتار میں ہے : و في المجتبى نفقة العدة كنفقة النكاح ۔ بعد ختم عدت یعنی غیر حاملہ کے لئے کامل تین حیض گذرجانے کے بعد اور حاملہ کے لئے وضع حمل کے بعد اختیار ہے کہ دوسرے شخص سے نکاح کرلے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ :

۱ ۔ اگر بکر اپنی زوجہ ہندہ کی خلافِ شرع و نا زیبا حرکتوں کا کسی عدالت میں کافی ثبوت دے تو ہندہ پر شرعاً کیا سزا عائد ہوسکتی ہے ؟

۲ ۔ ہندہ بلا اجازت زوج کے ، اپنی والدہ کے گھر سے اپنے برادر حقیقی کے سسرال میں تقریب یا ملاقات کے بہانہ سے جاکر رہا کرتی ہے ، ایسی صورت میں زوج اور زوجہ کی نسبت کیا حکم ہے ؟

۳ ۔ اگر ہندہ اپنے زوج سے دو ہفتہ کی اجازت لے کر اپنی والدہ محمودہ کے گھر جائے اور زد و کوب و دشنام دہی کا غلط الزام لگاکر زوج کے گھر واپس نہ آئے ، اور اگر زوج کے گھر سے منجانبِ زوج بغرض طلبی کوئی جائے تو اس کو یہ جواب دیا جائے کہ میں تا قیامت نہیں آتی ۔ اس کا کیا حکم ہے ؟

۴ ۔ ہندہ کسی محلہ دار یا شناسا یا خویش و اقارب کے گھر ، یا شفاخانہ کو جو خاص مستورات کے لئے ہو ، یا کسی میلہ یا مینا بازار کو جو مستورات کے لئے ہوتا ہے ، یا کسی بنگلہ یا لگی وغیرہ میں بغرض تماشہ بینی جائے تو اس کے متعلق شرعاً کیا احکام ہیں ؟

۵ ۔ بلا اجازت زوج کے مخفیہ کسی شخص کے سامنے جو برادری کا ہو بے پردہ ہوجائے تو ایسی صورت میں زوجہ ، زوج کے عقد سے باہر سمجھی جائے گی یا نہیں ؟ اگر سمجھی جاتی ہے تو مہر کی نسبت کیا حکم ہے ؟

الجواب

زوجہ سے جو قصور کہ سرزد ہوتے ہیں اگر وہ ایسے ہیں کہ جن پر حد واجب ہوتی ہے تو ان قصور کے لحاظ سے زوجہ شرعا حد کی مستحق ہے، اور جن قصور کے لئے شرع میں حد نہیں ہے ان کے متعلق زوج کو یہ حق دیا گیا ہے کہ زوجہ کو تنبیہ و تعزیر کرے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۱۹۳ باب التعزیر میں ہے: (یعزّر المولی عبده و الزوج زوجته) و لو صغیرة لما سیجیء (علی ترکها الزینة) الشرعیة مع قدرتها علیها (و) ترکها غسل الجنابة و علی (الخروج من المنزل) لو بغیر حق (و ترک الإجابة الی الفراش) لو طاهرة من نحو حیض و یلحق بذلک ما لو ضربت ولدها الصغیر عند بکائه او ضربت جاریة غیره و لا تتعظ بوعظه او شتمته و لو بنحو یا حمار او ادعت علیه او مزقت ثیابه او کلمته بحیث یسمعها اجنبی او کشفت وجهها لغیر محرم او کلمته او شتمته او اعطت ما لم تجر العادة به بلا اذنه۔ و الضابطة ان کل معصیة لا حد فیها فللزوج و المولی التعزیر و لیس منه ما لو طلبت نفقتها او کسوتها و الحت لان لصاحب الحق مقالا، بحر۔ رد مختار میں ہے: (قوله لا تتعظ بوعظه) مفاده انه لا یعزرها اول مرة۔ اور تحت قول و لو بنحو یا حمار لکھا ہے: اذ لا شک ان هذا إساءة الأدب منها فی حق زوجها الذی هو لها کالسید و قدّمنا عن الفتح ان له تعزیرها باساءة الأدب۔ جو عورت کہ بدون حق شرعی خاوند کے بلا اجازت گھر سے چلی جاتی ہے اور خاوند کی اطاعت نہیں کرتی ایسی عورت کو شرع میں ناشزہ کہا جاتا ہے، اور جب تک خاوند کے گھر میں واپس نہ آئے نفقہ سے محروم رہتی ہے۔ فتاویٰ مہدیہ کے جلد ۱ صفحہ ۴۰۶ میں ہے: سئل فی رجل نشزت منه زوجته فی دار ابیها مدة عامین فطلبها الزوج فی محل الحکومة الشرعیة الی طاعته فلم تجب و قالت انا کارهة له و لم ارض ان یجمع بینی و بینه فهدّدها القاضی و خوّفها بالضرب الشدید و ضرب الحاکم السیاسی اخاها ضربا شدیدا لأجل ان یحث اخته علی طاعة الزوج فلم ترض و قالت اقتل نفسی و لا ارجع له و مکثت فی بیت ابیها فهل و الحال هذه تکتب ناشزة و لا نفقة لها و لا یجوز ایلامها بالضرب فی کل حین حتی یؤلف اللّٰه بینهما؟ اجاب: لا نفقة للزوجة ما دامت ناشزة و خارجة عن طاعة الزوج بغیر حق و تؤمر بمطاعته و لا تقر علی النشوز لأنه معصیة و قد صرحوا بأن کل معصیة لیس فیها حد مقدر ففیها التعزیر و ذکر فی التنویر و شرحه من باب التعزیر یعزر المولی عبده و الزوج زوجته و لو صغیرة علی ترکها الزینة الشرعیة مع قدرتها علیها و ترکها غسل الجنابة و علی الخروج من المنزل لو بغیر حق و ترک الإجابة الی الفراش لو طاهرة من حیض۔ اور صفحہ ۲۹۳ میں ہے: سئل فی امرأة خرجت من بیت زوجها و مکثت عند الناس اجانب من غیر إذنه و من غیر رضاه و طلبت البقاء علی النشوز و الطلاق و هو لا یرضی بذلک فهل تسقط مؤنتها و نفقتها ما دامت کذلک؟ اجاب: لا نفقة للناشزة و هی من خرجت من بیت زوجها بغیر حق ما دامت کذلک۔ ← ...

پس صورت مسئولہ میں زوجہ کا خاوند کے گھر سے بلا اجازت باہر جانا ، اور بلا اجازت اجنبی اشخاص کے گھر میں رہنا ، اور ان سے بے پردہ ہونا ، خاوند پر زد و کوب کی تہمت لگاکر ماں باپ کے گھر بیٹھنا اور تا قیامت آنے سے انکار کرنا ، میلوں اور بنگلوں پر تماشہ بینی کے لئے بلا اجازت جانا ، ان تمام افعال کے ارتکاب سے زوجہ ناشزہ و نافرمان ہوتی ہے ، گھر میں واپس آنے تک زوج پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے ۔ اور گھر میں آنے کے بعد جبکہ خاوند کی اطاعت سے انکار کرے تو خاوند کو یہ حق حاصل ہے کہ اطاعت قبول کرنے تک غیر نقصان دہ زد و کوب کرتا رہے ، کیونکہ نقصان دہ زد و کوب سے شرعا زوج پر تعزیر واجب ہوتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۱۹۵ باب التعزیر میں ہے : لأن تأدیبه مباح فیتقید شرط السلامة ۔ قال المصنف : و بهذا ظهر انه لا یجب علی الزوج ضرر زوجته اصلا ۔ (ادعت علیٰ زوجها ضربا فاحشا و ثبت ذلک علیه عزر كما لو ضرب المعلم الصبي ضربا فاحشا) فانه يُعزَّر و یضمنه لو مات ۔ رد محتار میں ہے : (قوله ضربا فاحشا) قید به لأنه لیس له ان یضربها في التأدیب ضربا فاحشا و هو الذي یکسر العظم او یخرق الجلد او یسوده كما في التاتارخانیة قال في البحر و صرحوا بأنه اذا ضربها بغیر حق وجب علیه التعزیر اھ ای و ان لم یکن فاحشا ۔

نافرمانی کی وجہ سے زوجہ نکاح سے خارج نہیں ہوتی اور نہ مہر ساقط ہوتا ہے ، البتہ اگر مرتدہ ہوجائے یا اپنے سوتیلے لڑکے سے تعلق پیدا کرلے تو اس وقت مہر ساقط ہوجاتا ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۳۹ میں ہے : و افاد ان المهر وجب بنفس العقد مع احتمال سقوطه بردتها او تقبیلها ابنه او تنصفه بطلاقها قبل الدخول ۔

اگر زوجہ بحالت نکاح ، اجنبی شخص سے زنا کی مرتکب ہوجائے تو نکاح سے خارج نہیں ہوتی ۔ مگر زوج پر لازم ہے کہ حیض آکر اس کا رحم نطفۂ زنا سے پاک ہونے تک اس سے جماع نہ کرے ، اس کے بعد کرسکتا ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۴۳۱ باب العدۃ میں ہے : و المزني بها لا تحرم علی زوجها و في شرح الوهبانیة لو زنت المرأة لا یقربها زوجها حتی تحیض لاحتمال علوقها من زنا فلا یسقی ماءه زرع غیره ، فلیحفظ لغرابته ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے تو مسلہ ہندہ کے ساتھ بمعاوضہ پانچ سو سکۂ رائج اور پانچ دینار مہر مؤجل نکاح کیا ، کچھ عرصہ تک ہندہ زید کی مطیع رہی ، بعد انواع و اقسام کی کج بحثیوں و نااتفاقیوں کی وجہ سے زید نے ہندہ کو ایک مقام سے دوسرے مقام کو روانہ کرکے بذریعہ تحریر طلاق لکھ بھیجا اور اس کی اطلاع تحریراً اپنے دو ایک دوستوں اور دار القضاء کو بھی دیدی ۔ اس کے بعد ہندہ نے زید کا تعاقب کیا اور اپنے کو رکھنے پر مصر ہوئی ، نہ رکھنے کی صورت میں مرجانے پر آمادگی ظاہر کی ، تو زید نے ہندہ کو رکھ لیا اور پھر تعلقات زن و شوہر جاری ہوگئے ۔ مہر کا روپیہ اداء نہیں ہوا تھا اور بالمواجہ دینے میں خطرات تھے ۔ لہذا

علماء دین حوالہ کتب سے فتویٰ صادر فرمائیں کہ نکاح ساقط ہوا یا نہیں ؟ اور ایسا رجوع جائز ہے یا نہیں ؟ بصورت اسقاط نکاح و ناجواز رجوع ایسی عورت کی علیحدگی کی کیا صورت ہے ؟

الجواب

زید اگر ہندہ کو ایک یا دو طلاق صریح بایں لفظ کہ تجھے طلاق ہے یا ایک طلاق ہے یا دو طلاق ہے۔ لکھ بھیجا ہے تو ایسی حالت میں زید کو طلاق کے بعد عدت یعنی تین حیض کے اندر ہندہ کو رجوع کر لینے کا حق ہے اور یہ رجوع شرعاً صحیح ہے۔ اور اگر زید طلاق بائن یا تین طلاق لکھ بھیجا ہے تو زید کو اندرون عدت رجوع کا حق نہیں ہے۔ طلاق بائن میں تو دوبارہ نکاح کی ضرورت ہے اور بدون نکاح ہندہ حرام ہے۔ اور تین طلاق کی صورت میں حلالہ کے بعد ہی زید نکاح کر سکتا ہے اور بدون حلالہ ہندہ زید پر حرام ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۴۰۰ باب الرجعۃ میں ہے: و اذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقتين فله ان يراجعها في عدتها رضيت بذلك او لم ترض كذا في الهداية۔ کنز الدقائق مجتبائی صفحہ ۱۲۰ باب الرجعہ میں ہے: و تصح في العدة ان لم يطلق ثلاثا و لم ترض۔ اور صفحہ ۱۲۲ میں ہے: و ينكح مبانته في العدة و بعدها لا المبانة بالثلاث لو حرة و بالثنتين لو امة حتى يطأها غيره۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے اگر ہندہ کو طلاق صریح ایک یا دو تحریر کیا تھا اور بعد ختم عدت پھر اس کو رجوع کیا ہے یا طلاق بائن یا تین طلاق تحریر کر لینے کے بعد تعلقات زوجیت قائم کیا ہے تو شرعاً یہ حرام ہے۔ ایسے وقت میں اگر ہندہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتی ہے تو چاہئے کہ جس طرح بن پڑے اس سے قطعاً علیحدہ ہو جائے ہندہ کی خودکشی و تباہی کا اصلاً لحاظ نہ کرے۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ باب الرجعہ میں ہے: في الخانية سئل عن امرأة حرمت على زوجها و لا يتخلص عنها الزوج و لو غاب عنها سحرته فردته اليها هل له ان يحتال في قتلها بالسم و نحوه ليتخلص منها ؟ قال: لا يحل و يبعد عنها بأي وجه قدر كذا في التاتارخانية۔ اسی طرح رد محتار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۵۵۹ باب الرجعہ میں ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر عورت بحالت غصہ اپنے شوہر سے کہے کہ تو میرا باپ ہے اور میں تیری بیٹی، یا تو باپ کے سرابکا (مثل) اور میں تیری بیٹی کے برابر۔ یا اس کے عکس یعنی مرد اسی طرح کہے اور اپنی گفتگو پر قسم کھائے تو کیا ایک دوسرے میں تعلق شرعی باقی رہیگا ؟ یا تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی ؟ یا کفارہ لازم آئیگا ؟ اور اگر اس حالت میں مباشرت کریں تو ان کی نسبت کیا حکم ہے ؟

الجواب

خاوند اگر اپنی زوجہ کو یہ کہے کہ تو میری بیٹی ہے یا بہن ہے یا ماں ہے۔ تو اس سے ظہار نہیں ہوتا اور نہ کوئی حرمت لازم آتی ہے۔ مگر ایسا کہنا شرعاً مکروہ ہے۔ البتہ کظہر امی (تو میری ماں کی پیٹھ کی طرح

ہے) کہنے سے ظہار ہوتا ہے اور کفارہ بھی لازم آتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۵۰۰ میں ہے : لو قال لها انت امی لا یکون مظاهرا و ینبغی ان یکون مکروها و مثله ان یقول یا ابنتی و یا اختی و نحوه ۔ پس صورت مسئولہ میں خاوند کا اپنی زوجہ کو بیٹی کہنا یا زوجہ کا اپنے کو خاوند کی بیٹی کہنا اور اس پر قسم کھانا یا خاوند کا اپنے کو زوجہ کا بیٹا کہنا ان الفاظ سے شرعا مابین زوج و زوجہ کے کوئی حرمت نہیں آتی ۔ اور نہ اس کا کوئی کفارہ ہے ۔ ایسے الفاظ کہنے کے بعد ہر دو مباشرت کرسکتے ہیں ۔ مگر ایسے الفاظ کا زبان سے نکالنا شرعا مکروہ ہے اس لئے زوج و زوجہ پر لازم ہے کہ آئندہ سے احتیاط کریں اور کبھی ایسے کلمات زبان پر نہ لائیں ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ اپنے زوج خالد پر زد و کوب و دشنام دہی کا اتہام لگا کر اپنی والدہ کے گھر میں اپنے دو کمسن لڑکوں کے ہمراہ سکونت پذیر ہے ۔ اور زوج کو لڑکوں کی ملاقات سے محروم کرکے زوج کے گھر آنے سے ہمیشہ کے لئے انکار کررہی ہے ۔ حالانکہ ہندہ کو زوج کے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے ۔ زوج اپنے اقارب و احباء کو بغرض طلبی ہندہ کے پاس بھیجتا رہا مگر ہندہ کو انکار ہی رہا ۔ آخرکار دس ماہ کے بعد زوج خود چند احباب کے ساتھ ہندہ کے پاس گیا اور اور اس کو اپنے گھر لایا ۔ ہندہ دو چار روز زوج کے گھر میں اقامت کرکے زوج کو مجبور کررہی ہے کہ پھر اپنی والدہ کے پاس روانہ کرے ۔ اور زوج اس اندیشہ سے کہ پھر بیٹھ جائیگی اور اجنبیوں سے بےپردہ ہوگی بھیجنا نہیں چاہتا ۔ اس کے متعلق حکم شرعی کیا ہے ؟

زوج کو اگر زوجہ کے والدین و رشتہ دار قریبہ کے زوجہ کو بہکانے کا اندیشہ ہو تو کیا زوج ان کو زوجہ کی ملاقات سے روک سکتا ہے یا نہیں ؟ اور زوجہ اپنے شوہر کی بلا اجازت اپنی رائے سے کسی رشتہ دار سے بےپردہ ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کے والدین اگر صحیح و تندرست ہیں اور دیکھنے کے لئے خاوند کے گھر تک آسکتے ہیں اور زوجہ کے والدین کے گھر جانے سے زوج کو فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے تو ایسی حالت میں زوج کو یہ حق حاصل ہے کہ زوجہ کو بغرض ملاقات جانے سے منع کرے ۔ کیونکہ اس وقت زوجہ کے وہاں جانے سے والدین کا یہاں آنا آسان ہے ۔ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۶۶۲ میں ہے : و عن ابی یوسف فی النوادر تقیید خروجها بأن لا یقدرا علی اتیانها فان قدرا لا تذهب و هو احسن و قد اختار بعض المشایخ منعها من الخروج الیهما و اشار الی نقله فی شرح المختار و الحق الأخذ بقول ابی یوسف علیه الرحمة اذا کان الأبوان بالصفة التی ذکرت و الا ینبغی ان یأذن لها فی زیارتهما فی الحین بعد الحین علی قدر متعارف اما فی کل جمعة فهو بعید فان کثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصاً اذا کانت شابة و الزوج من

ذوی الھیئات بخلاف خروج الابوین فانه ایسر ۔

زوج کو اگر زوجہ کے والدین و عزیز و اقارب قریبہ کے آنے سے بہکانے و فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے تو چاہئے کہ والدین کو ہفتہ میں ایک دفعہ اور دوسرے محارم کو سال میں ایک دفعہ آنے سے منع نہ کرے ۔ مگر ان کو زوجہ کے پاس قیام کرنے کی اجازت نہ دے ۔ اور محارم کے سوا اجنبی اشخاص اور اقاربِ بعیدہ کے روبرو بےپردہ ہونے اور ملنے سے منع کرے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۶۸۲ میں ہے : و لا یمنعهما من الدخول علیها فی کل جمعة و فی غیرهما من المحارم فی کل سنة و یمنعهم من الکینونة و فی نسخة من البیتوتة لکن عبارة ملا مسکین من القرار عندها به یفتی خانیة و یمنعها من زیارة الأجانب و عیادتهم و الولیمة و ان اذن کانا عاصیین ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو بحالت غضب بلفظ طلاق ایک طلاق دی ۔ اور تین طہر کے اندر زوجہ سے ملاپ کرلیا ۔ کیا یہ رجوع شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

طلاق رجعی میں عدت کے اندر رجوع صحیح ہے ۔ اور مذہبِ حنفی میں حائضہ غیر حاملہ کیلئے طلاق کے بعد تین حیض عدت رکھی گئی ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر تین حیض ختم ہونے سے پہلے زبان سے یا فعل سے رجوع کی گئی ہے تو صحیح ہے ۔ کنز الدقائق مطبوعہ مجتبائی کے صفحہ ۱۳۰ باب الرجعہ میں ہے : و تصح فی العدة ان لم تطلق ثلاثا و لو لم ترض براجعتک و راجعت امراتی و بما یوجب حرمة المصاهرة ۔ اور صفحہ ۱۳۲ باب العدۃ میں ہے : هی تربص تلزم المراة و عدة الحرة للطلاق او الفسخ ثلاثة أقراء ۔ ای حیض ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید پر ہفتہ میں ایک دو بار ایک عارضہ طاری ہوتا ہے ۔ جس میں اس کی طبیعت نہایت پریشان ہوجاتی ہے ۔ اور ہوش و حواس برابر نہیں رہتے ۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی ۔ ایک دفعہ رات کے چار بجے اس کو یہ حالت شروع ہوئی اور وہ اپنی خوشدامن کے باہمی جھگڑے سے زوجہ کو طلاق طلاق دو دفعہ کہا ۔ اس کے بعد قاضی محلہ کے کہنے سے زوجہ کا نام لیکر تین طلاق کہا ۔ اس حالت سے افاقہ پانے کے بعد زید نے اس واقعہ کو سن کر نہایت افسوس کیا اور ناسمجھی سے ان الفاظ کے اپنی زبان سے نکلنے کا اقرار کیا ۔ کیا از روئے شرع شریف طلاق واقع ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

جب کسی شخص پر مرض یا دماغی خلل و فتور عقل کی وجہ سے یا شدت غضب سے ایسی مدہوشی طاری ہوجائے کہ اس کو بھلے برے کی تمیز نہ رہے اور نہ اس بات کا خیال رہے کہ اس وقت اس کی زبان سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں ۔ اگر ایسا شخص ایسی حالت میں زوجہ کو طلاق دیدے تو اس طلاق کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۲۶ طلاق مدہوش میں ہے : سئل نظما فیمن طلق زوجتہ ثلاثا فی مجلس القضاء و ھو مغتاظ مدھوش فاجاب ایضا بان الدھش من اقسام الجنون فلا یقع و اذا کان یعتادہ بان عرف منہ الدھش مرۃ یصدق بلا برھان اھ ۔ اسی صفحہ میں ہے : و الذی یظھر لی ان کلا من المدھوش و الغضبان لا یلزم فیہ ان یکون بحیث لا یعلم ما یقول بل یکتفی فیہ بغلبۃ الھذیان و اختلاط الجد بالھزل کما ھو المفتیٰ بہ فی السکران علی ما مرّ ۔ اس عبارت کے سلسلہ میں ہے : فالذی التعویل علیہ فی المدھوش و نحوہ اناطۃ الحکم لغلبۃ الخلل فی اقوالہ و افعالہ الخارجۃ عن عادۃ و کذا یقال فیمن اختل عقلہ لکبر او لمرض او لمصیبۃ فاجأتہ فما دام فی حال غلبۃ الخلل فی الأقوال و الأفعال لا یعتبر اقوالہ و ان کان یعلمھا و یریدھا ، لأن ھذہ المعرفۃ و الإرادۃ غیر معتبرۃ لعدم حصولھا عن ادراک صحیح کما لا یعتبر من الصبی العاقل ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر طلاق دینے کے وقت زید کی فی الواقع ایسی حالت تھی جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوئی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ زیب النساء نے نان و نفقہ کی عدم خبرگیری کی وجہ سے عدالت متعلقہ میں اپنے شوہر پر دعویٰ دائر کیا ۔ عدالت میں حاکم وقت کے روبرو مسمی عبد الواحد شوہر زیب النساء نے یہ اقرار نامہ داخل کیا کہ آئندہ سے میں برابر ماہ بماہ نان و نفقہ کے لئے پانچ روپیہ دیا کروں گا ، اگر چھ ماہ کی مدت تک میری طرف سے مسماۃ مذکورہ کو نان و نفقہ نہ پہنچے تو مسماۃ مذکورہ اس مدت کے گذر جانے کے بعد میرے نکاح سے باہر ہوجائیگی یعنی اس پر طلاق ثلاثہ عائد ہوگی ۔ اس اقرار نامہ کے بعد ایک سال تک مسمی عبد الواحد نے اپنی زوجہ کو کچھ بھی نان و نفقہ ادا نہیں کیا ۔ کیا مسماۃ زیب النساء اس وقت اس کے نکاح سے علیحدہ ہوئی اور اس پر طلاق ثلاثہ واقع ہوئی ؟ اور اب وہ نکاح ثانی کرسکتی ہے یا نہیں ؟ اور در صورت علیحدگی کے مہر کی مستحق ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

جو طلاق کسی شرط کے ساتھ متعلق کی جاتی ہے اس کو طلاق معلق و یمین بالطلاق کہا جاتا ہے ۔ شرط کے موجود ہونے سے طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار مصری جلد ۲ صفحہ ۵۰۰ باب التعلیق میں ہے : (و ھو ربط حصول مضمون جملۃ بحصول مضمون جملۃ اخریٰ) و یسمیٰ یمینا مجازا ۔ اور صفحہ ۵۱۵ میں ہے : (و تنحل) الیمین (بعد) وجود (الشرط مطلقا) ۔ پس صورت

مسئولہ میں چونکہ زوج نے چھ ماہ تک زر خوراک اداء نہ کرنے پر طلاق ثلاثہ کے وقوع کو معلق کردیا ہے اس لئے بدون ادائی زر خوراک چھ مہینہ کامل گذر جانے کے بعد زوجہ پر طلاق ثلاثہ سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئی ۔ اگر زوجہ حاملہ نہیں ہے تو وقوع طلاق سے تین حیض گذرجانے کے بعد اس کو دوسرے خاوند سے نکاح کرنے کا حق حاصل ہے ۔ زوج نے اگر زوجہ سے خلوت صحیحہ کی ہے تو بعد طلاق اس پر پورا مہر واجب الاداء ہے ۔ اگر خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو نصف مہر کی ادائی واجب ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو سے اقرار کیا کہ عمرو کے ہمراہ کل شرب خمر یا زنا یا قتل یا دیگر افعال شنیعہ کا مرتکب ہوگا ۔ اگر نہ ہوا تو زید کی زوجہ پر تین طلاق ہیں ۔ اس کے بعد زید نے ان افعال میں عمرو کی ساتھی داری نہیں کی ۔ کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

زوج اپنی زوجہ کی طلاق کو جس کام کے نہ کرنے پر متعلق کرتا ہے اگر اس کام کا مرتکب نہ ہو تو بلحاظ تعلیق زوجہ پر طلاق واقع ہوجاتی ہے ۔ فتاوی بزازیہ بر حاشیہ فتاوی عالمگیری مصری جلد ۴ صفحہ ۲۷۳ باب یمین الطلاق میں ہے : قال لغیرہ ان لم افعل کذا غدا آنکہ مرا بکانہ است بطلاق است و لم یفعل غدا طلقت ۔ بناء بریں اگر ترک شراب پر کوئی اپنی زوجہ کی طلاق کو معلق کرے تو استعمال شراب سے زوجہ مطلقہ نہ ہوگی ۔ اور ترک پر مطلقہ ہوجائیگی ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۴۳۸ باب تعلیق الطلاق میں ہے : و فی الفتاوی رجل عاتبت امرأتہ فی شرب الخمر فقال ان ترکت شربھا غداً فانت طالق ان کان یعزم ان لا یترک شربھا لا یحنث و ان کان لا یشربھا کذا فی الخلاصۃ ۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے چونکہ افعال شنیعہ کی ساتھ داری کے نہ کرنے پر طلاق کو معلق کیا ہے اس لئے بلحاظ تعلیق ساتھ داری نہ کرنے کی وجہ سے زوجہ پر تین طلاق واقع ہوگئیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے ایک اور نکاح کیا ۔ چند روز بعد زوجہ اولیٰ کو اس نکاح سے مغموم اور بے دل پاکر زوجہ ثانیہ کو اس کی عدم موجودگی میں زوجہ اولیٰ کی خوشی کی خاطر بلا ارادہ تین وقت طلاق دیا ہوں کہہ دیا ۔ یہ سنکر زوجہ اولیٰ بہت خوش اور تابعدار بن گئی ۔ کیا یہ طلاق شرعاً واقع ہوئی یا نہیں ؟ اگر واقع ہوئی ہے تو کیسی ؟ کیا دوبارہ نکاح کا موقعہ باقی ہے یا نہیں ؟

الجواب

کھیل اور مذاق سے بدون ارادہ کے محض زبان سے طلاق کا لفظ نکالنے سے بھی واقعی و یقینی طلاق واقع

ہوجاتی ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الطلاق فصل ممن یقع طلاقہ میں ہے : و طلاق اللاعب و الهازل به واقع ۔ پس صورت مسئولہ میں زوج نے بدون ارادہ کے زوجہ اولیٰ کو خوش کرنے کیلئے جو زوجہ ثانیہ کو طلاق دی ہے یہ طلاق واقع ہو گئی ۔ اور تین صریح طلاق واقع ہونے کی وجہ سے بدون حلالہ کے یعنی دوسرے خاوند سے نکاح و صحبت کرنے کے بعد اس سے طلاق حاصل کرکے عدت ختم کئے بغیر زوج اول پر حرام ہے ۔ کنز الدقائق کتاب الطلاق فصل فیما یحل بہ المطلقہ میں ہے : و ینکح مبانة في العدة و بعدها لا المبانة بالثلاث و لو حرة و بالثنتين لو أمة حتىٰ يطأها غيره ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے زید سے بقدر زر مہر مبلغ پانچ سو روپیہ عقد کیا ۔ بعد چندے زید نے فارغخطی دی اور ہندہ نے بذریعہ عدالت زر مہر تمام و کمال زید سے وصول پاکر عمرو کے ساتھ عقد کرلیا اور عمرو کے صلب سے ہندہ کو ایک لڑکا پیدا ہوا ۔ ہندہ کے والدین بھی زندہ موجود ہیں ۔ ہندہ نے مبلغ پانچ سو روپیہ رقم زر مہر شوہر ما بعد کو مبادلہ دیا ۔ چند عرصہ کے بعد ہندہ بیماری میں مبتلاء ہوئی اور اخیر وقت میں وصیت کی کہ مبلغ پانچ سو روپیہ زر مہر شوہر ما بعد کے پاس ہے میرے والدین کو دیا جائے ان کے سوائے کوئی نہ لے ۔ ہندہ کا انتقال ہوگیا ہے اس کے ورثاء میں والدین ، لڑکا اور شوہر ثانی موجود ہیں ۔ اور شوہر ثانی کا بیان ہے کہ اس نے بھی ہندہ کو طلاق دی ہے ۔ پس اس حالت میں رقم مذکور پانے کے کون مستحق ہیں ؟

عمرو شوہر ثانی نے سوا سو روپیہ زر مہر پر عقد کیا تھا ۔ اس کی نسبت کیا حکم ہے ؟

الجواب

شریعت میں بدون اجازت دوسرے ورثاء کے ، وارث کیلئے وصیت ناجائز ہے ۔ عالمگیریہ کی کتاب الوصایا میں ہے : و لا تجوز الوصية للوارث عندنا الا ان يجيزها الورثة ۔ خاوند اگر زوجہ کو طلاق رجعی دے تو اندرون عدت ہر ایک دوسرے کا وارث ہے اور عدت کے بعد وارث نہیں ۔ عالمگیریہ کی جلد ۱ کتاب الطلاق باب طلاق المریض میں ہے : قال الخجندي الرجل اذا طلق امرأته طلاقا رجعيا في حال صحته او في حال مرضه برضاها او بغير رضاها ثم مات و هي في العدة فانهما يتوارثان بالإجماع ۔ اور اگر زوجہ کو طلاق بائن یا مغلظ زوجہ کے بلا رضامندی اپنے مرض موت کی حالت میں دے تو اندرون عدت زوجہ اس کی وارث ہے اور یہ اس کا وارث نہیں ۔ اور اگر زوجہ کی رضامندی سے دے تو اندرون عدت ہر ایک دوسرے کا وارث نہیں ۔ اور عدت ختم ہونے کے بعد کسی طلاق میں بھی زوجین ایک دوسرے کے وارث نہیں ۔ اور اگر زوج اپنی صحت کی حالت میں زوجہ کو طلاق بائن یا مغلظ دے تو ہر ایک دوسرے کا نہ اندرون عدت وارث ہے اور نہ بعد عدت ۔ عالمگیریہ باب طلاق المریض میں ہے : و لو طلقها طلاقا بائنا او ثلاثا ثم مات

و هی فی العدة فکذلک عندنا ترث و لو انقضت عدتها ثم مات لم ترث و هذا اذا طلقها من غیر سؤالها فأما اذا طلقها بسؤالها فلا میراث لها کذا فی المحیط ۔ رد محتار کے باب طلاق المریض میں ہے : لو أبانها فی مرضه فماتت هی قبل انقضاء عدتها لا یرث منها ۔ تبیین شرح کنز کے باب طلاق مریض میں ہے ، بخلاف البائن لأن السبب و هو النکاح قد زال فلا ینبغی ان ترثه کما لا یرثها هو ۔ حاشیہ شبلی علی التبیین میں تحت قول فلا ینبغی لها ان ترثه مکتوب ہے ؛ یعنی لو أبان امرأته ثم ماتت لا یرثها لأن الزوجیة قد بطلت بهذا العارض ۔ اور اس عبارت کے ما قبل ہے ؛ و أجمعوا انه لو طلقها فی الصحة فی کل طهر واحدة ثم مات احدهما لا یرثه الآخر ۔ پس صورت مسئول میں ہندہ جو زر مہر والدین کو دینے کی وصیت کی ہے چونکہ وارث کیلئے ہے اس لئے دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہے ۔

ہندہ کے دوسرے خاوند نے جو اس کو طلاق دی ہے اس کے متعلق حسب تفصیل سابق صراحت کرلی جائے کہ کس قسم کی طلاق ہے ۔ آیا رجعی یا بائن ؟ اور بعد طلاق ، زوجہ عدت کے اندر مری ہے یا باہر ؟ اس تحقیق کے بعد جبکہ خاوند مستحق میراث ثابت ہو اور خاوند اور لڑکا بعد بلوغ جبکہ یہ دونوں اس وصیت کو جائز نہ رکھیں یعنی وصیت سے راضی نہ ہوں تو زر مہر اور جملہ مترکہ ہندہ سے اس کا قرض اداء کیا جائے ۔ اور اگر کوئی دوسری وصیت غیر وارث کیلئے کی ہے تو ثلث مترکہ میں وہ وصیت جاری کرنے کے بعد باقی کے بارہ حصے کرکے خاوند کو تین حصے اور ماں باپ سے ہر ایک کو دو دو حصے اور بیٹے کو پانچ حصے دیے جائیں ۔ اور اگر خاوند وارث ثابت نہ ہو تو ہندہ کے جملہ مترکہ سے امور مذکورہ بالا وضع کرنے کے بعد باقی کے چھ حصے کرکے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ایک ایک حصہ اور بیٹے کو چار حصے دیے جائیں ۔

زوجہ کا مہر جو دوسرے خاوند کے ذمہ واجب الاداء ہے یہ زوجہ کا مترکہ ہے ، دیگر مترکہ کے ساتھ یہ بھی تقسیم سابق میں شریک رہیگا ۔ فتاوی ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ باب المہر میں ہے ؛ یتأکد المهر بموت احد الزوجین فیکون ترکة یقسم بین ورثتها بالفریضة الشرعیة کجمیع ما یتحقق انه مملوک لها ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو طلاق بائن دی ۔ طلاق کے وقت ہندہ کے بطن سے زید کو پانچ سال کی عمر کا لڑکا موجود تھا ۔ پس زید کے انتقال کے بعد کیا یہ لڑکا زید کے مترکہ کا وارث شرعی ہے یا نہیں ؟

الجواب

ماں کے مطلقہ ہوجانے سے اولاد باپ کے ترکہ سے محروم نہیں ہوتی ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا لڑکا جو ہندہ کے بطن سے ہے زید کے مترکہ کا وارث شرعی ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص غصہ یا نشہ کی حالت میں بلا نیت اپنی منکوحہ کو کہے کہ چلی جا ، یا نکل جا ، یا گھر سے باہر ہو جا ، یا میں تجھ سے الگ ہوا ۔ تو ان جملوں کے کہنے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں ؟ اور اگر واقع ہوگی تو کونسی ؟

الجواب

ان الفاظ میں چونکہ عورت کے سوال طلاق کو رد کرنے اور جواب دینے کا احتمال ہے اس لئے یہ الفاظ غصہ کی حالت میں کہے جائیں تو جب تک ان سے طلاق کی نیت نہ کی جائے طلاق واقع نہیں ہوتی ۔ در مختار کے باب الکنایات میں ہے : (فنحو اخرجی و اذهبی و قومی) تقنعی تخمری استتری انتقلی انطلقی اغربی اعزبی من الغربة او من العزوبة (يحتمل ردا) ۔ اسی جگہ ہے : (و فی الغضب) توقف (الأولان) ای ان نوی وقع و الا لا ۔ رد محتار میں ہے : (قوله توقف الأولان) ای ما یصلح ردا و جوابا و ما یصلح سبا و جوابا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید خانہ زاد سرکاری کے انتقال کے بعد اس کی زوجہ کے نام بیوہ پروری کی ماہوار جاری ہوئی ۔ اب اس کی جائداد پر دوسرا خانہ زاد ماہور ہے ، اور زید کی زوجہ نے عقد ثانی کرلیا ہے ، کیا ماہوارِ بیوہ پروری لائق موقوفی ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کا نفقہ زوج پر واجب ہے ، اس لئے صورت مسئولہ میں جب زید کی زوجہ نے عقد ثانی کرلیا ہے تو اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا زوج ثانی ہے ، ماہوار کی ضرورت نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق باب النفقات میں ہے : تجب علی الرجل نفقة امرأته المسلمة و الذمية و الفقيرة و الغنية دخل بها او لم يدخل كبيرة كانت المرأة او صغيرة يُجامَع مثلها كذا فی فتاویٰ قاضی خان ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو ایک طلاق دی اور طلاق رجعی کی نیت کی ، طلاق دینے سے دو منٹ پہلے ہندہ نے ایک شخص کے اصرار پر مہر معاف کردیا تھا ۔ کیا یہ طلاق رجعی ہے یا خلع ؟ اگر رجعی ہے تو کب تک رجعت ہوسکتی ہے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں طلاق دینے کے قبل زوج و زوجہ میں مال دیکر طلاق لینے کی کوئی قرارداد نہیں ہوئی ہے اس لئے زوج کی نیت کے موافق یہ طلاق رجعی ہے ۔ تین حیض ختم ہونے سے پہلے زوج رجوع کر لے سکتا ہے ۔ خلع کیلئے بدل شرط ہے جیسا کہ عالمگیریہ جلد ۱ باب الخلع میں ہے : الخلع ازالۃ ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع کذا فی فتح القدیر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل میں کیا فرماتے ہیں ،

۱ ۔ طلاق رجعی کی کیا تعریف ہے ؟ اور اس میں کب تک رجوع ہوسکتا ہے ؟

۲ ۔ طلاق بائن کی کیا تعریف ہے ؟ اور اس میں رجوع کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟

۳ ۔ طلاق عورت کے غائبانہ ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

۴ ۔ طلاق واقع ہونے کے لئے کیا شروط ہیں ؟

۵ ۔ طلاق دینے کیلئے گواہ کی حاجت ہے یا نہیں ؟

۶ ۔ ایک وقت میں تین طلاقیں واقع ہوسکتی ہیں یا نہیں ؟

۷ ۔ عورت اگر بلا اجازت شوہر کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے تو کیا اس حرکت سے وہ مطلقہ ہوجائیگی یا نہیں ؟

۸ ۔ حیض کے ایام میں طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

۱ ۔ اگر " طلاق " کا لفظ کہکر طلاق دی جائے اور یہ لفظ تین دفعہ نہ کہا جائے ، اور اس کے بعد تین کا عدد صراحت یا اشارہ سے نہ کہا جائے ، اور نہ اس کے ساتھ ایسی صفت بیان کی جائے کہ جس سے صراحتاً یا اشارۃً طلاق کا بائن ہونا معلوم ہوتا ہو ، اور نہ ایسے الفاظ سے بیان کرے جس میں ایسے عدد یا صفت کی مشابہت ہو جو طلاق بائن پر دلالت کرے ، اور طلاق کا کوئی عوض بھی نہ لیا جائے تو ۔ اس طلاق کو طلاق رجعی کہا جاتا ہے ۔ رد المحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۴۴۳ کتاب الطلاق باب الصریح میں ہے : ففی البدائع ان الصریح نوعان صریح رجعی و صریح بائن فالاول ان یکون بحروف الطلاق بعد الدخول حقیقۃ غیر مقرون بعوض و لا بعدد الثلاث لا نصاً و لا اشارۃً و لا موصوف بصفۃ تنبئ عن البینونۃ او تدل علیہا من غیر حرف العطف و لا مشبہ بعدد او صفۃ تدل علیہا ۔

۲ ۔ حروف بائن سے اگر طلاق دی جائے ، یا عورت سے صحبت کرنے کے پہلے طلاق کے لفظ سے طلاق دی جائے ، یا صحبت کے بعد طلاق کے لفظ سے تین طلاقیں دی جائیں ، یا طلاق کے لفظ کے بعد صراحتاً یا

اشارۃ تین کا عدد بیان کیا جائے ، یا لفظ طلاق کے ساتھ ایسی صفت بیان کی جائے جس سے اس کا صراحتاً یا دلالتاً بائن ہونا معلوم ہو ، یا طلاق کو ایسے عدد یا صفت کے مشابہ کہا جائے جس سے اس کا بائن ہونا ثابت ہو تو ، ایسی طلاق کو طلاق بائن کہا جاتا ہے اور اس میں رجوع نہیں ہے ۔ اسی جگہ رد محتار میں ہے ؛ و اما الثانی فبخلافه و هو ان یکون بحروف الإبانة او بحروف الطلاق لکن قبل الدخول حقیقة او بعده لکن مقروناً بعدد الثلاث نصاً او اشارةً او موصوفا بصفة تنبئ عن البینونة او تدل علیها من غیر حروف العطف او مشبها بعدد او صفة تدل علیها ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق میں ہے ؛ و اما حکمه فوقوع الفرقة بانقضاء العدة فی الرجعی و بدونه فی البائن کذا فی الفتح القدیر ۔

۳ ۔ عورت کے غائبانہ اگر اس کا نام لےکر یا اس کی طرف طلاق کی نسبت کرکے طلاق دی جائے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے ۔ البحر الرائق جلد ۳ باب الطلاق الصریح میں ہے ؛ و ذکر اسمها او اضافتها الیه کخطابه کما بینا فلو قال طالق فقیل له من عنیت فقال امرأتی طلقت امرأته ۔

۴ ۔ طلاق کیلئے دو شرطیں ہیں ، ایک یہ کہ زوجہ بہ وقت طلاق نکاح یا عدت میں رہے ۔ دوسری یہ کہ مصاہرۃ کی وجہ سے حرام نہ ہوگئی ہو ، عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق باب اول میں ہے ؛ و اما شروطه علی الخصوص فشیئان احدهما قیام القید فی المرأة نکاح او عدة و الثانی قیام محل النکاح حتی لو حرمت بالمصاهرة بعد الدخول بها و وجبت العدة فطلقها فی العدة لم یقع لزوال الحل ۔

۵ ۔ محض زبان سے کہنے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے گواہ کی ضرورت نہیں ہے ۔ اگر عورت طلاق کے وقت غائب ہو اور طلاق سے انکار کرے تو بغیر گواہ کے طلاق ثابت نہ ہوگی ۔ بناء بریں عورت کے غائبانہ جو طلاق دی جاتی ہے ، گواہوں کے روبرو دینے کی ضرورت ہے تا کہ بروقت ثابت ہو سکے ۔ ہدایہ کی کتاب الشہادۃ میں ہے ؛ قال و ما سوی ذلک من الحقوق تقبل فیها شهادة رجلین او رجل و امرأتین سواء کان الحق مالا او غیر مال مثل النکاح و الطلاق و الوکالة و الوصیة و نحو ذلک ۔

۶ ۔ تین طلاق ایک ہی وقت میں واقع ہوجاتی ہیں ، مگر دینے والا گنہگار ہے اور اس کو طلاق بدعی کہا جاتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق باب اول میں ہے ؛ و اما البدعی فنوعان بدعی لمعنی یعود الی العدد و بدعی یعود الی الوقت فالذی یعود الی العدد ان یطلقها ثلاثا فی طهر واحد فی کلمة واحدة او بکلمات متفرقة او یجمع بین التطلیقتین فی طهر واحد بکلمة واحدة او بکلمتین متفرقتین فاذا فعل ذلک وقع الطلاق و کان عاصیا ۔

۷ ۔ اگر عورت شوہر کی بلا اجازت ، ماں باپ کے پاس چلی جائے تو اس حرکت سے اُس پر طلاق واقع نہیں ہوتی البتہ ناشزہ یعنی نافرمان ہے جو تا واپسی نفقہ کی مستحق نہیں ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ا صفحہ ۳۰۶ میں ہے ؛ لا نفقة للناشزة و هی من خرجت من بیت زوجها بغیر حق ما دامت کذلک ۔

۸ ۔ حیض کے ایام میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے مگر ایسی طلاق کو بدعی کہتے ہیں جو شرعاً گناہ ہے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق باب اول میں ہے ؛ و البدعی من حیث الوقت ان یطلق المدخول بها و هی من

ذوات الاقراء فی حالۃ الحیض ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کو بحالت حمل تین طلاق دی ۔ کیا طلاق واقع ہوسکتی ہے ؟ اور زید ہندہ کو تین طلاق کے بعد واپس لے سکتا ہے ؟

الجواب

حمل کی حالت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے ۔ تین طلاق کی وجہ سے بغیر حلالہ کے زید ہندہ سے عقد نہیں کرسکتا ۔ حلالہ کے یہ معنی ہیں کہ وضع حمل کے بعد اگر دوسرے شخص سے نکاح کرے اور وہ صحبت کے بعد اس کو طلاق دے جب اس طلاق کی مدت ختم ہوگی تب زید ہندہ سے عقد کرسکتا ہے ۔ کنز الدقائق کی کتاب الطلاق باب الرجعہ میں ہے : لا المبانۃ بالثلاث لو حرۃ و بالثنتین لو امۃ حتیٰ یطأھا غیرہ و لو مراھقا بنکاح صحیح و تمضی عدتہ لا بملک یمین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عابد نے زوجہ کے والدین کی خنبیہ کے خیال سے پہلے یہ بیان کیا کہ زوجہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس کے بعد زید نے عابد سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی زوجہ کو طلاق دیدی ہے؟ اس کے جواب میں عابد نے صرف ہاں کہا ۔ کیا ایسی صورت میں عابد کی زوجہ کو طلاق ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

عابد نے جو زید کے جواب میں " ہاں " کہا ہے اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوئی ۔ فتاوی قاضی خان کتاب الطلاق میں ہے : رجل قال لغیرہ أ طلقتَ امرأتک ، فقال نعم ، بالھجاء او قال بلیٰ ، بالھجاء و لم یتکلم بہ یقع الطلاق ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک تحریر اپنے نکاح کے وقت لکھدی جس میں بہت سارے معاہدے کئے اور یہ بھی لکھا کہ اگر میں ان معاہدوں کی خلاف ورزی کروں تو میری زوجہ ہندہ کو اختیار ہے کہ اپنے آپ کو طلاق بائن دیکر میری زوجیت سے علحدہ ہوجائے ۔ یعنی " امرھا بیدھا " ۔ زید نے خلاف ورزی کی اور زوجہ نے اپنے اختیار کے مطابق خود کو طلاق بائن دے لی اور عدت بھی ختم ہوگئی ۔ کیا اب ہندہ دوسرے سے عقد کرسکتی ہے ؟

الجواب

اگر زوجہ نے زوج کی خلاف ورزی معلوم کرنے کے بعد طلاق بائن دے لی اور اپنے اس اختیار کو رد نہیں کیا ہے تو بعد ختم عدت دوسرے شخص سے عقد کرسکتی ہے ورنہ نہیں ۔ البحر الرائق جلد ۳ فصل فی الامر بالید میں ہے : و لا یخفی ان ھذا کلہ اذا کان التفویض منجزا اما اذا کان معلقا بالشرط فلا یصیر الأمر بیدھا الا اذا جاء الشرط فحینئذ یعتبر مجلس العلم ان کان مطلقا و القبول فی ذلک المجلس لیس بشرط لکن یرتد بالرد ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ آمدنی ہے اور اس کی دو زوجہ ہیں ، پہلی زوجہ کے بطن سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا جوان و ملازم ہے ، دوسری زوجہ کو اولاد نہیں ہے ۔ زید پہلی زوجہ کو ماہانہ ایک سو بیس روپیہ دیتا ہے اور دوسری زوجہ کو تیس روپیہ دیتا ہے جس میں خود کے بھی خورد و نوش کے مصارف ہیں ۔ زید کا بیان ہے کہ پہلی زوجہ کا حق زیادہ ہے اور دوسری کا اس کے مقابل کم ہے ۔ اور زید نے کئی دفعہ دوسری زوجہ سے کہا کہ میں تجھکو چھوڑ دیتا ہوں چلی جا ۔کیا زید کا یہ فعل شرعا درست ہے ؟ اور کیا زوجہ اس قول سے نکاح سے خارج ہوجاتی ہے ؟

الجواب

زید کی دونوں زوجہ اگر ایک ہی حیثیت کی ہیں یعنی دونوں ذی عزت و ذی ثروت اشخاص کی لڑکیاں ہیں اور مال و دولت میں بھی مساوی ہیں تو ایسی حالت میں زید پر واجب ہے کہ دونوں کو برابر نفقہ دیا کرے ۔ اور اگر ایک مالدار اور ایک غریب ہے تو ہر ایک کو اس کی حیثیت کے موافق حصہ دیا جائے ۔ مگر دونوں خاوند کے متروکہ سے مساوی حصہ پانے کی مستحق ہیں ۔ خاوند جہاں رہے اس کو اپنا خرچ علحدہ دینا چاہئے تا کہ زوجہ کے حقوق تلف نہ ہوں ۔ جس زوجہ کو اولاد ہے اولاد کا خرچ زوجہ کے خرچ کے سوا دینا لازم ہے اور یہ خرچ ہر ایک کے حساب سے علحدہ علحدہ دیا جائے ۔ لڑکا جب جوان اور ملازم ہو تو وہ اپنا خرچ اپنی آمدنی سے برداشت کرے ، باپ پر اس کا نفقہ نہیں ہے ۔ زید جو اپنی دوسری زوجہ کو چلے جاؤ کہا ہے اگر اس قول سے اس کی نیت طلاق کی تھی تو زوجہ پر ایک طلاق بائن واقع ہوئی یہ زوجہ اب بغیر نکاح کے زید پر حرام ہے ، زید کو چاہئے کہ اس سے دوبارہ نکاح کرلے ۔ اور اگر طلاق کی نیت نہیں تھی تو طلاق واقع نہیں ہوئی ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ کتاب الطلاق باب القسم میں ہے : (یجب) و ظاھر الآیۃ انہ فرض ، نھر (ان یعدل فیہ) ای فی القسم بالتسویۃ و فی الملبوس و المأکول ۔ رد المحتار میں ہے : و الحق انہ قول من اعتبر حال الرجل وحدہ فی النفقۃ اما علی القول المفتیٰ بہ من اعتبار حالھما فلا فان احدھما قد تکون غنیۃ و الاخری فقیرۃ فلا یلزم التسویۃ بینھما مطلقا فی النفقۃ ۔ صفحہ ۴۸۹

باب النفقہ میں ہے: (و تجب النفقۃ) بأنواعہا علی الحر (لطفلہ) یعم الأنثی و الجمع (الفقیر) الحر فان نفقۃ المملوک علی مالکہ و الغنی فی مالہ الحاضر فلو غائبا فعلی الأب۔ رد المحتار میں ہے: (قولہ الفقیر) ای ان لم یبلغ حد الکسب فان بلغہ کان للاب ان یؤجرہ او یدفعہ فی حرفۃ لیکتسب و ینفق علیہ من کسبہ لو کان ذکراً بخلاف الأنثیٰ۔ صفحہ ۲۶۸ باب الکنایات رد المحتار میں ہے:

نحو اخرجی قومی اذہبی رداً یصح ☆ خلیــــة بریـــة صباً صلـــح
و استبرئی اعتدی جواباً قد حتم ☆ فالأول القصد لہ دوماً لـــزم
و الثانی فی الغضب و الرضا انضبط ☆ لا الذکر و الثالث فی الرضا فقط

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کے پاس طلاقنامہ تحریر روانہ کیا جس پر زید کی اور چند گواہوں کی دستخط تھی۔ جب زید سے اس بارے میں بالمشافہ دریافت کیا گیا تو طلاقنامہ لکھنے سے قطعاً انکار کیا اور گواہوں نے بھی دستخط سے انکار کیا۔ کیا ایسی حالت میں زید کی زوجہ شرعاً مطلقہ سمجھی جائے گی یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی زوجہ کو چاہیئے کہ عدالت دار القضاء میں زید کو طلب کرکے قاضی کے روبرو اس انکار پر حلف دلوائے۔ اگر زید نے قسم کھالی تو پھر زوج و زوجہ کے درمیان زوجیت کا تعلق باقی رہے گا۔ اگر قسم کھانے سے انکار کرے تو طلاق واقع ہوگئی۔ ہدایہ اخیرین مصطفائی کے صفحہ ۱۹۰ کتاب الدعویٰ باب الیمین میں ہے: و اذا ادعت المرأۃ طلاقا قبل الدخول۔ بین السطور لکھا ہے: او بعد الدخول کذا فی نتائج الأفکار۔ استحلف الزوج فان نکل ضمن نصف المھر فی قولھم جمیعا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا شوہر ایک جگہ ملازم تھا، بد عنوانی کی وجہ سے فرار ہوا، اور جاتے وقت اپنی زوجہ سے کہا کہ میں نے تم کو چھوڑ دیا، اب میں جاتا ہوں معلوم نہیں کہ مرتا ہوں یا زندہ رہتا ہوں۔ اب تم کو اختیار ہے کہ میرے ماں باپ کے پاس رہو یا کہیں اور چلی جاؤ۔ اب تم مجھ سے بے دخل ہیں۔ یہ الفاظ کہکر روانہ ہوگیا۔ کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب

یہ الفاظ کنائی کے ہیں، صورت مسئولہ میں شوہر نے ان الفاظ کو جس وقت زبان سے نکالا ہے اس وقت نہ تو غصہ کی حالت تھی اور نہ طلاق کا کوئی ذکر تھا اس لئے جب تک صاف یہ معلوم نہ ہو کہ شوہر کی نیت زوجہ کو طلاق دینے کی تھی ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ در مختار کی کتاب الطلاق باب الکنایات میں ہے : فنحو اخرجی و اذھبی و قومی و استبرئی رحمکِ ، انتِ واحدة ، انتِ حرة ، اختاری ، أمرکِ بیدکِ ، سرحتکِ فارقتکِ لا یحتمل السب و الرد ففی حالة الرضا فی غیر الغضب و المذاکرة تتوقف الأقسام الثلاثة تأثیرا علیٰ نیة الاحتمال ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے غصہ کی حالت میں اپنی زوجہ کو ایک یا دو طلاق دی جس کو ایک سال کا عرصہ ہوا، کیا اب رجوع ہوسکتا ہے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ طلاق کے بعد عدت بھی گذر گئی ہے اس لئے رجوع نہیں ہو سکتا ہے، زید کو چاہئے کہ زوجہ سے نکاح ثانی کرلے ۔ کنز الدقائق کے باب الرجعہ میں ہے : و ینکح مبانة فی العدة و بعدھا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ طلاق رجعی میں اندرون عدت، زوج کیا بلا رضامندی زوجہ کے رجوع کرسکتا ہے یا رضامندی شرط ہے ؟

الجواب

رجعت کے لئے زوجہ کی رضامندی شرط نہیں ہے ۔ زوج، زوجہ کی ناراضی کی حالت میں بھی رجوع کرسکتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب سادس میں ہے : و اذا طلق الرجل امرأته تطلیقة رجعیة او تطلیقتین فله ان یراجعها فی عدتها رضیتْ بذلک او لم ترض کذا فی الهدایة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ کا بیان ہے کہ زوج نے طلاق دی ہے مگر اس کو صحیح تعداد یاد نہیں، اور اس بیان کے ثبوت میں زوجہ کے پاس کوئی شہادت بھی نہیں ہے ۔ زوج کو طلاق دینے سے انکار ہے اور اس پر حلف بھی اٹھاتا ہے، ایسی حالت کیا زوج کا قول معتبر ہے یا زوجہ کا ؟

الجواب

جب زوجہ طلاق کا دعوی کرے اور اس کے پاس بینہ شرعی نہ ہو اور زوج کو طلاق سے انکار ہو اور انکار پر حلف بھی اٹھائے تو ایسی حالت میں شرعا زوج کا قول معتبر ہے۔ فتاوی مہدیہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۳ کتاب الطلاق میں ہے: سئل فی رجل حصل بینہ و بین صہرہ مشاجرۃ و منافسۃ فادعت زوجتہ بانہ طلقھا عنادا مع زوجھا فانکر دعواھا فھل اذا لم تقم علیہ بینۃ بالطلاق یکون القول قولہ بیمینہ فی عدم الطلاق المدعی بہ و علیھا اطاعتہ؛ اجاب القول للزوج بیمینہ حیث لا بینۃ للزوجۃ علی دعواھا الطلاق۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے خسر کو لکھا کہ میں نے تمہاری دختر کو طلاق دیدی، مہر وغیرہ کے متعلق عدالت دار القضاء سے تصفیہ کراسکتے ہیں۔ خسر نے اس تحریر کی اطلاع اپنی دختر کو نہیں دی، مطلقہ طلاق کے قبل سے اپنی باپ کے پاس مقیم ہے۔ کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب

زوجہ جبکہ طلاق کے وقت اپنے باپ کے پاس مقیم ہے اور وہی اس کی ضروریات کا کفیل ہے تو اس طلاقنامہ کا اس کے باپ کو مل جانا طلاق واقع ہونے کے لئے کافی ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الطلاق فصل سادس میں ہے: و لو کتب الیٰ امرأتہ اذا جاءک کتابی ھذا فانت طالق و وصل الکتاب الیٰ ابیھا فاخذ الاب و مزق الکتاب و لم یدفعہ الیھا ان کان الاب متصرفا فی جمیع امورھا فوصل الکتاب الی ابیھا فی بلدھا وقع الطلاق۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ سے کہا کہ اگر تو چاہتی ہے تو طلاق، طلاق، طلاق۔ ہندہ نے طلاق نہیں چاہی اور مجلس برخواست ہوگئی۔ کیا ہندہ پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اور اگر واقع ہوئی تو کونسی؟

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ طلاق ہندہ کے چاہنے پر موقوف تھی اور ہندہ نے اس مجلس میں طلاق نہیں چاہی اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی۔ رد المحتار کتاب الطلاق فصل فی المشیئۃ میں ہے: لو قال لھا انت طالق ثلاثا ان شئت فخالفت لم یقع شیء۔ اسی صفحہ میں ہے: و مشیئتھا تقتصر علی المجلس۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے حاضرین مجلس کے روبرو یہ لکھدیا کہ میں اپنی زوجہ سے دستبردار ہوگیا ۔ کیا یہ تحریر طلاق واقع ہونے کے لئے کافی ہے ؟

الجواب

اگر کوئی زوجہ سے یہ کہے کہ میں تجھ سے دست بردار ہوگیا ۔ تو اس قول سے ایک طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے ۔ فتاویٰ قاضی خان کی کتاب الطلاق فصل الکنایات میں ہے : و لو اُوقع الطلاق بالفارسیة فقال دست باز داشتمت و نویٰ الطلاق قال بعضهم هو تفسیر قوله خلیتُ سبیلک لا یقع الطلاق ما لم ینو و اذا نویٰ یقع واحدة رجعیة و قال بعضهم هو تفسیر قوله طلقتک یقع الطلاق بلا نیة و تکون رجعیة و قال الفقیه ابو اللیث و الشیخ الإمام ابو بکر محمد بن الفضل رحمهم الله تعالی تقع وحدة بائنة و لا یصدق انه لا ینو الطلاق و علیه الفتویٰ ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر پر جبر کرکے اگر طلاق لکھوائی جائے تو کیا طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں ؟

الجواب

جبراً طلاق لکھوائی جائے تو یہ طلاق واقع نہیں ہوتی ۔ البحر الرائق مصری جلد ۳ صفحہ ۲۶۴ کتاب الطلاق میں ہے : لو اُکرِہ علی ان یکتب طلاق امرأته فکتب لا تطلق لأن الکتابة اُقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة و لا حاجة هنا کذا فی الخانیة و فی البزازیة اُکرِہ علیٰ طلاقها فکتب فلانة بنت فلان طالق لم یقع ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو تین دفعہ " طلاق دیا " کہا ، کیا اس لفظ سے طلاق واقع ہوتی یا نہیں ؟ اگر ہوتی تو کتنی ؟

الجواب

طلاق کا لفظ جبکہ متعدد بار زبان سے نکالا جائے تو لفظ کی تعداد کے موافق طلاق ہوگی ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ زید نے تین دفعہ طلاق دیا کہا اس لئے ہندہ پر تین طلاقیں واقع ہوئیں ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الطلاق

باب صریح الطلاق میں ہے ، متیٰ کرّر لفظ الطلاق بحرف الواو او بغیر حرف الواو یتعدد الطلاق و ان عنی بالثانی الأول لم یصدق فی القضاء ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد نے اپنی زوجہ کو طلاق طلاق طلاق کہا ، کیا محض لفظ طلاق یعنی مصدر کے استعمال سے طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں ؟

الجواب

طلاق واقع ہونے کے لئے اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرنا ضروری نہیں ہے ، مصدر کے لفظ سے بھی بلا نیت طلاق واقع ہوجاتی ہے ۔ ہدایہ مجتبائی جلد ۲ صفحہ ۳۳۰ باب ایقاع الطلاق میں ہے ، و اما وقوعه باللفظة الأولیٰ فلأن المصدر یذکر و یراد به الاسم یقال الرجل العدل ای عادل بمنزلة قوله انت طالق و علی هذا لو قال انت طلاق یقع الطلاق به ایضا و لا یحتاج فیه النیة ۔ فتح القدیر جلد ۳ باب ایقاع الطلاق میں ہے ، قلنا المراد ان المصدر حیث استعمل کان إرادة طالق به هو الغالب فیکون صریحاً فی طالق الصریح فیثبت له حکم طالق ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ غیر مدخولہ و غیر خلوت شدہ و غیر محبوسہ عند الزوج کو طلاق دی ہے ۔ یعنی نکاح کے بعد زید نے زوجہ سے نہ خلوت کی اور نہ صحبت کی اور نہ زوجہ زید کے گھر آئی ، ایسی حالت میں زید نے اس کو طلاق دیدی اور چند روز کے بعد انتقال کیا ۔ کیا زوجہ پر عدت لازم ہے ؟ اور کیا اس کو مہر ملے گا ؟ اور کیا یہ متروکہ پائے گی ؟ اور کیا یہ قبل طلاق نفقہ کی مستحق تھی ؟ اگر مہر ملے گا تو کس قدر ؟ بیان فرمایا جائے ۔

الجواب

جس عورت کو صحبت کے قبل طلاق دی جائے اس پر عدت لازم نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب العدة میں ہے : اربع من النساء لا عدة علیهن المطلقة قبل الدخول الخ ۔ زوجہ زید کے ماں سے نصف مہر پانے کی مستحق ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب المھر میں ہے : و یجب نصفه بطلاق قبل وطء او خلوة ۔ زوجہ قبل طلاق اگر بلا وجہ شرعی زید کے پاس رہنے سے باز رہی ہے تو زید پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۱ باب النفقہ میں ہے : و اما اذا کان الامتناع بغیر حق بأن کان اوفاها المهر او کان المهر مؤجلا او وهبته فلا نفقة لها ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ زوجہ شوہر کی وفات کے قبل رشتہ زوجیت سے علحدہ ہو گئی ہے ، اس لئے زید کے متروکہ سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ سے کہا کہ ۔ اگر تو میری فلاں چیز فلاں تاریخ تک نہ لائے تو تجھے طلاق ہے ۔ ہندہ نے وہ چیز تاریخ مذکورہ تک نہیں پہنچائی ۔ کیا ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی یا نہیں ؟

الجواب

طلاق بالشرط ، شرط کے پائے جانے سے واقع ہوجاتی ہے ۔ صورت مسئولہ میں تاریخ مذکورہ تک چونکہ زوجہ نے زوج کی فرمائش پوری نہیں کی ہے اس لئے زوجہ پر طلاق واقع ہوگئی ۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب الطلاق باب الطلاق بالشرط میں ہے : الفاظ الشرط " ان " و " اذا " ففی ہذہ الألفاظ اذا وجد الشرط انحلت الیمین و انتہت لأنہا لا تقتضی العموم و التکرار فبوجود الفعل مرۃ تم الشرط و انحلت الیمین ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ، عمرو کی لڑکی سے عقد کرنا چاہتا ہے ۔ مگر عمرو کہتا ہے کہ میں لڑکی اس وقت دیتا ہوں جبکہ تو ایک تحریر اس طرح لکھدے کہ تیری موجودہ زوجہ ہندہ ، میری لڑکی کی پوری اطاعت کرے گی ۔ در صورت خلاف ورزی میری لڑکی کو اختیار ہوگا کہ ہندہ کو تیری طرف سے طلاق مغلظہ دیدے ۔ کیا زید کو اس قسم کی تفویض کا حق حاصل ہے ؟ اور کیا ہندہ ایسی طلاق سے مطلقہ ہوجائے گی ؟

الجواب

اگر کوئی شخص دوسرے شخص کو اپنی زوجہ کو طلاق دینے کے لئے وکیل بنا دے اور یوں کہے کہ " اگر تو چاہے تو میری زوجہ کو طلاق دیدے " تو درست ہے ۔ بدائع صنائع جلد ۳ صفحہ ۲۲۲ کتاب الطلاق میں ہے :

فان قیدہ بالمشیئۃ بأن قال طلق امرأتی ان شئت فہذا تملیک عند اصحابنا الثلاثۃ ۔

مگر صورت مسئولہ میں زید اپنا حق تطلیق جو عمرو کی لڑکی کو غیر مشروع و مبہم شرط پر دے رہا ہے صحیح نہیں ہے ، کیونکہ سوتن پر سوتن کی اطاعت فرض نہیں ہے بلکہ حکم شرع یہ ہے کہ شوہر اپنی زوجگان کے درمیان عدل کرے یعنی ہر ایک کو نفقہ و سکنیٰ وغیرہ میں برابر رکھے ۔ اگر ایسی تعدیل اس سے نا ممکن ہے تو چاہئے کہ ایک ہی زوجہ نکاح میں رکھے اور متعدد نہ کرے ۔ جیسا کہ آیت کریمہ " وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً " سے ثابت ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد کی زوجہ ہندہ نے خالد سے کہا کہ میرا کوئی تصفیہ کردو ! خالد نے کہا کہ " جا تجھے تین طلاق " اتنا کہا تھا کہ ایک تیسرے شخص نے کہا کہ یہ کیا کرتے ہو !

یہ سنکر پھر خالد نے کہا کہ " دیدیا " ۔ کیا اس صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوئی ؟ اگر ہوئی تو کونسی ؟ کیا اب دونوں میں زوجیت کا تعلق باقی رہا یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں ہندہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں ۔ اب دونوں میں زوجیت کا تعلق باقی نہیں ہے ۔ ہندہ کو چاہیئے کہ خالد سے علیحدہ ہوجائے اور پردہ کرے ۔ عالمگیریہ جلد ا کتاب الطلاق باب ثانی میں ہے : و لو قالت لزوجها طلقني ثلاثا فاراد ان يطلقها فاخذ انسان فمه بيده فلما رفع يده قال دادم فانها تطلق ثلاثا . هكذا حكي فتوى شمس الاسلام كذا في الذخيرة ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو تین طلاق دی اور حلالہ بھی ہوگیا ۔ اب اس کو پھر نکاح کرنا چاہتا ہے ۔ کیا زوج ثانی کی طلاق کے بعد پھر عدت کی ضرورت ہے ؟ اور عدت کس کو کہتے ہیں ؟ اور کیا طلاق اول کے لئے بھی عدت لازم تھی ؟

الجواب

ہر طلاق کے بعد عدت لازم ہے ۔ عدت غیر حاملہ کے لئے تین حیض ۔ اور حاملہ کے لئے وضع حمل ۔ اور جس کو حیض نہیں آتا اس کے لئے تین ماہ ۔ کنز الدقائق کے باب الرجعہ میں ہے : و ينكح مبانة في العدة و بعدها لا المبانة بالثلاث لو حرة و بالثنتين لو امة حتى يطأها غيره و لو مراهقا بنكاح صحيح و تمضي عدته ۔ باب العدت میں ہے : و عدة الحرة للطلاق او الفسخ ثلاثة اقراء اى حيض او ثلاثة اشهر ان لم تحض و للموت اربعة اشهر و عشرا ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو مجبور کیا کہ وہ اپنی زوجہ مدخولہ بالغہ سے خلع کرے اور بابراء مہر زوجہ کے غائبانہ میں جبراً حلفنامہ لکھوا لیا ۔ کیا یہ خلع واقع ہوئی یا نہیں ؟

الجواب

اگر عمرو نے اپنی زبان سے خلع کا لفظ نہیں کہا ہے تو جبراً لکھوانے سے خلع نہیں ہوتی ۔ اور اگر زبان سے بھی کہا اور حلفنامہ بھی لکھا ہے تو ایسی صورت میں خلع کی خبر پہنچتے ہی اگر زوجہ خلع کو قبول کرلے تو خلع ہوجائے گی ۔ بشرطیکہ زوجہ خلع کا مطلب سمجھتی ہو ۔ اور اگر قبول نہ کرے تو خلع نہیں ہوگی ۔ عالمگیریہ جلد ا

فصل فی الطلاق باب الکتابت میں ہے : رجل اُکرِہ بالضرب و الحبس علی ان یکتب طلاق امرأته فلانة بنت فلان فکتب امرأته فلانة بنت فلان طالق لا تطلق امرأته کذا فی فتاویٰ قاضی خان ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب الطلاق میں ہے : و لو کان هو المکرہ علی الخلع علی ألف درهم و قد دخل بها و هی غیر مکرهة وقع الخلع و لزمها الألف ۔ اور باب الخلع میں ہے : و اما ایقاع الخلع بإکراہ فصحیح ۔ اور صفحہ ۵۷۳ میں ہے : و عبارۃ البدائع و لا یشترط حضور المرأۃ بل یتوقف علیٰ ما وراء المجلس حتی لو کانت غائبة فبلغها فلها القبول لکن فی مجلسها لأنه فی جانبها معاوضة ۔ صفحہ ۵۸۳ میں ہے : فی البزازیة و ان لم یضمن توقف علی قبولها فی حق المال قال و هذا دلیل علی ان الطلاق واقع و قیل لا یقع الا باجازتها ۔ در مختار کے باب الخلع میں ہے : یشترط فی قبولها علمها بمعناہ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو طلاق دی مگر تعداد طلاق میں شک ہے کہ دو دی یا تین ۔ اس بارے میں حکم شرعی کیا ہے ؟ بیان فرمایا جائے ۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی زوجہ پر صرف دو طلاقیں واقع ہونگی ۔ عالمگیریہ جلد ۲ باب ایقاع الطلاق میں ہے : و فی نوادر ابن سماعة عن محمد رحمهما اللّٰه تعالی اذا شک فی انه طلق واحدۃ او ثلاثا فهی واحدۃ حتی یستیقن او یکون اکبر ظنه علی خلافه ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو نشہ کی حالت میں کہا کہ تو میری ماں ہے اور میں تیرا بیٹا ہوں ۔ کیا اس لفظ سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

اس لفظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی ، مگر ایسا لفظ کہنا سخت مکروہ ہے ۔ در مختار کی کتاب الطلاق میں ہے : (و ان نوی بأنت علیّ مثل اُمی برًا او ظهارا او طلاقا صحت نیته و الا) ینو شیئا او حذف الکاف (لغا) ۔ اسی جگہ رد المحتار میں ہے : (قوله او حذف الکاف) بأن قال انت امی ۔ دوسری جگہ لکھا ہے : و یکرہ قوله انت امی ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے زوجہ سے لڑائی کی حالت میں کہا کہ تو آج کے روز سے میری والدہ کے مثل ہے، اور نیت اس کی یہ تھی کہ زوجیت کے معاملہ میں مثل والدہ کے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد زوجہ سے علیحدہ ہوکر دو سال کا عرصہ گذرا۔ پس یہ ظہار ہے یا طلاق کنایہ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں شخص مذکور کا قول ظہار ہے، چاہیئے کہ کفارۂ ظہار ادا کرکے زوجہ سے مباشرت کرلے۔ در مختار کے باب الظہار میں ہے: (و ان نوی بأنت عليَّ مثل امی) او کأمی و كذا لو حذف علي خانية (برا او ظهارا او طلاقا صحت نيته و الا ينو) شيئا او حذف الكاف (لغا) و تعين الأول اي البر يعني الكرامة۔ رد المحتار میں تحت قول لغا کنایہ بحر سے منقول ہے: و الصحيح انه ظهار عند الكل لأنه تحريم مؤكد بالتشبيه۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میراں شاہ درویش اور اس کی زوجہ دونوں بیمار تھے، اور ویسی حالت میں ان کا بچہ بھی فوت ہوگیا۔ اس اثناء میں زن و مرد کے درمیان جھگڑا و فساد واقع ہوا اور غصہ کی حالت میں مرد کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ تو ماں ہے، تشبیہ کسی اجزائے محرمہ سے نہیں دی اور نہ عورت کو علیحدہ کرنے کی غرض تھی، بے قصد فقط یہ لفظ کہا کہ تو ماں ہے۔ اس وقت سے اب تک ہر ایک علیحدہ ہیں۔ کیا وہ عورت اس پر حرام ہے یا کفارہ لازم آتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

عورت کو ماں کہنے سے نہ تو ظہار ثابت ہوتا ہے اور نہ کفارہ لازم آتا ہے اور نہ اس پر عورت حرام ہوتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۵۰۰ میں ہے: و لو قال لها انتِ امی لا يكون مظاهرا الخ هكذا في فتح القدير۔ فتاویٰ رد المحتار شامی جلد ۱ صفحہ ۵۸۹ میں ہے: و احترز به عن نحو انت امی بلا تشبيه فانه باطل و ان نوی۔ قائل کو چاہیئے کہ آئندہ سے ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالے۔ اس لفظ سے اگرچہ کوئی حرمت نہیں آتی مگر شرعاً یہ مکروہ ہے۔ فتاویٰ در مختار بر حاشیۂ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۵۹۳ میں ہے: و يكره قوله انت امی و يا ابنتي و يا اختي و نحوه۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ کے صفحہ ۵۰۰ میں ہے: و ينبغي ان يكون مكروها و مثله ان يقول يا ابنتي يا اختي و نحوه۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اور اس کی زوجہ ہندہ میں چھ سال سے تعلقات خانہ

داری بالکل مفقود ہیں ، اور نزاع عقد کے چار ماہ بعد سے اب تک برابر چلی جارہی ہے ، علی ھذا نفقہ کی حالت بھی اس وقت سے یہ دیکھی جاتی ہے کہ مہینوں میں جاکر کبھی دو چار روپیہ دیا تو دیا ورنہ نہیں ، اس حالت پر بھی عورت برداشت کی ہوئی تھی ۔ ایک روز مجبور ہوکر عورت نے طلاق کی درخواست کی تو زید طلاق نامہ لکھنے بیٹھا ، عورت جو الفاظ کہتی جاتی تھی زید بھی وہی الفاظ اپنے منہ سے اداء کرکے قلم سے کاغذ پر لکھتا جاتا تھا جو اس وقت موجود ہے ۔ اس کے قبل بھی کئی مرتبہ زبان سے لفظ طلاق استعمال کیا ہے ، اور ایک دو دفعہ اسی طور سے لکھدیا ہے ۔ مستورات کو مسئلہ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے پرچہ گم ہوگیا ۔ معلوم نہیں اس میں کتنی طلاقیں مرقوم تھیں ، مگر بعض اشخاص گم شدہ طلاقنامہ کے گواہ ہیں اور موجودہ طلاقنامہ لکھتے وقت اس مقام پر سوائے ہندہ کی بہن کے کوئی اور موجود نہیں تھا اور وہ اس طلاقنامہ کی گواہ ہے ، اور وہ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ زید ان الفاظ کو زبان سے اداء کرتا جاتا تھا اور قلم سے لکھتا جاتا تھا ۔ پس وہ الفاظ یہ ہیں "تیرا اختیار ہے کدھر بھی جا میں تو چھوڑدیا اب پوچھنا کس کو ہے ، اور میرا اختیار نہیں تو خود مختار ہے ، میرا دعویٰ کچھ بھی نہیں ، میرے سے کھانا کپڑا کچھ نہیں ہو سکتا ، طلاق دیا میرا تو ہوگیا" ۔

اس کے قبل بھی ایک طلاقنامہ لکھا گیا تھا ، اس کو بھی زید نے چاک کردیا ، جس کا کچھ حصہ اس وقت موجود ہے ۔ موجودہ طلاقنامہ کو بھی لکھکر ہندہ کے حوالہ کرنے کے بعد کچھ وقفہ پر اس کو چھین کر چاک کرنا چاہا جس کی کشمکش سے اکثر حصہ اس کاغذ کا ہندہ کے ہاتھ میں رہ گیا ۔ اس آخری طلاقنامہ کے بعد سے اب تک اس قدر مدت گذری ہے کہ جس میں ہندہ تین حیض سے فارغ ہوچکی ہے ۔ پس ایسی صورت میں ہندہ پر کس قدر طلاقیں واقع ہوئیں ؟ اگر ہوئیں تو کونسی طلاقیں واقع ہوئیں ؟ رجعی ہوئیں یا بائن ہوئیں یا مغلظہ ہوئیں ؟ ہندہ زید کی زوجہ ہے یا نہیں ؟ ہندہ کو زید سے مثل غیر مردوں کے پردہ کرنا چاہئے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

شریعت میں یہ لفظ یعنی "تیرا اختیار ہے کدھر بھی جا" "اختاري" کے معنیٰ میں ہے ، اور "میرا اختیار نہیں تو خود مختار ہے" "امرک بیدک" کے معنیٰ میں ہے ۔ اس قسم کے الفاظ جبکہ مذاکرہ طلاق کے وقت کہے جاتے ہیں تو ان کے لئے یہ حکم ہے کہ ہر ایک سے بلا نیت ایک طلاق بائن ہوتی ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۶۳ میں ہے : (الکنایات) لا تطلق بها قضاء الا بنية او دلالة الحال و هي حالة مذاكرة الطلاق او الغضب (فنحو اخرجي و اذهبي و قومي) و تقنعي و تخمري و استتري (يحتمل ردا و نحو خلية و برية حرام بائن يصلح سبا و نحو اعتدي و استبرئي رحمك ، انتِ واحدة ، انتِ حرة ، اختاري ، امرکِ بيدکِ ، سرحتکِ ، فارقتکِ لا يحتمل السب و الرد ففي حالة الرضا) اي غير الغضب و المذاكرة (تتوقف الأقسام) على نيته و في الغضب الأولان و في مذاكرة الطلاق الأول فقط و يقع بالأخيرين و ان لم ينو لأن مع الدلالة لا يصدق قضاء في نفي النية لأنها أقوى لكونها ظاهرة و النية باطنة ۔ پس صورتِ مسئولہ میں جبکہ زوج نے ان الفاظ کو عورت

کے طلاق مانگنے پر زبان سے ادا کیا اور لکھدیا ہے اس لئے زوجہ پر لفظ "تیرا اختیار ہے کدھر بھی جا" سے طلاق بائن واقع ہوئی، اور اس کے بعد اخیر میں "طلاق دی" جو کہا اس سے ایک طلاق صریح واقع ہوئی۔ اور جب سابق میں بھی کئی دفعہ زبان سے طلاق کا لفظ ادا کیا گیا ہے اس پر غور کیا جائے، اگر سابق میں تین دفعہ صراحتاً طلاق کا لفظ ادا ہوا ہے تو ہندہ پر اسی وقت طلاق مغلظہ واقع ہوگئی۔ ایسی صورت میں دوبارہ شوہر سے نکاح کرنے کے لئے حلالہ یعنی دوسرے خاوند سے نکاح کرکے طلاق ہونے کی ضرورت ہے۔ اور سابق میں ایک دفعہ یا دو دفعہ صراحتاً طلاق کہی گئی تھی اور عدت ختم ہونے کے پہلے یہ طلاق نامہ لکھدیا گیا ہے تو پہلے وقت طلاق رجعی اور اس طلاق نامہ کے لفظ سے طلاق بائن اور اخیر لفظ "طلاق دی" اس سے رجعی، اس طرح تین طلاقیں واقع ہوئیں جو مغلظہ کی صورت ہے۔ کیونکہ طلاق رجعی کے بعد طلاق بائن اور بائن کے بعد رجعی ہوسکتی ہے۔ فتاوی در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۸۱ میں ہے: (الصریح یلحق الصریح و) یلحق (البائن) بشرط العدۃ (و البائن یلحق الصریح لا) یلحق البائن (البائن) اذ امکن جعلہ اخبارا عن الأول۔

مگر یہ ساری صورتیں لحوقت یعنی مکرر طلاق ہونے کی اسی وقت ہیں جبکہ زوج یہ ساری طلاقیں طلاق اول یعنی سب سے پہلی طلاق کی عدت میں دے۔ اگر پہلی طلاق کی عدت ختم ہونے کے بعد مکرر طلاق دی ہے تو وہ طلاقیں بے کار ہیں کیونکہ ختم عدت کے بعد زوجہ زوج کے نکاح سے خارج ہوجاتی ہے، اس لئے بعد والی طلاقیں بے محل ہیں۔ فتاوی رد المحتار کی جلد ۲ صفحہ ۳۸۱ عبارت سابق الذکر بشرط العدۃ میں ہے: (قولہ بشرط العدۃ) ہذا الشرط لا بد منہ فی جمیع صور اللحاق فالأولیٰ تأخیرہ عنہا۔ پس اس طلاقنامہ کی تحریر کے بعد اگر اس وقت تین مہینے دس روز گذر گئے ہیں تو زوجہ عدت سے بھی فارغ ہوگئی ہے اور اب وہ زوج اول کے سوا جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ اس زوج سے اس کو کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کو اس سے پردہ کرنا چاہئے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، اور بعد وفات اس کے دفتر میں زوجہ کے نام طلاقنامہ لکھا ہوا پایا گیا۔ کیا ایسی حالت میں زوجہ وراثت سے محروم ہوگی؟ اور ورثہ وراثت میں حصہ دینے سے احتراز کرسکتے ہیں؟

الجواب

زوج کی وفات کے بعد اس کے دفتر سے جو طلاقنامہ پایا جاتا ہے اس سے زوجہ محروم الارث نہیں ہوتی اور نہ ورثہ اس کو اس کے حصہ سے باز رکھ سکتے ہیں، بلکہ اس وقت بھی وہ حسب سہام شرعیہ اپنا پورا حصہ پانے کی مستحق ہے۔ فتاوی ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۳۷۹ میں ہے: سئل فی رجل مات و وجد مکتوبا بدفترہ بعد موتہ انہ طلق زوجتہ فہل اذا امتنعت الورثۃ من اعطاء الزوجۃ نصیبہا من الترکۃ بسبب ذلک

لا یجابون لذلک و یکون للزوجۃ شرعا اخذ نصیبها من الترکۃ بطریق الإرث الشرعی و اخذ مؤخر صداقها و مجرد ما وجد مکتوبا بالدفتر من الطلاق لا یکون مانعا للزوجۃ من المیراث و لا من مؤخر الصداق و لا یسری علیها حیث کانت منکرۃ؛ اجاب: نعم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کے خاوند کا گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر اس کا ذاتی باغ میں انتقال ہوا ۔ اب ہندہ اس مقام میں تکمیل عدت کے لئے مقیم ہے ۔ مگر چونکہ باغ آبادی سے باہر واقع ہے جس سے ہندہ کو اپنی جان و مال کی حفاظت کا خوف ہے ۔ اس لئے اگر گاؤں میں زید کے ذاتی مکان میں اندرون عدت منتقل ہوجائے تو کیا شرعا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

عدت والی عورت کو جب اپنی جان و مال کا خوف ہو اور نکلے بغیر چارہ نہیں تو ایسی حالت میں اس کو مکان منتقل کرنے کی اجازت ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۵۲۰ مطبوعہ مصر میں ہے : ان اضطرت الی الخروج من بیتها بأن خافت سقوط منزلها او خافت علیٰ مالها فلا بأس عند ذلک ان تنتقل ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

بَابُ العِنِّیْن

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ ہندہ کا نکاح زید سے ہوا ۔ اور ہندہ بوقت نکاح بالغہ نہ تھی ، وہ کہتی ہے کہ بالغہ ہونے کے بعد میں شوہر کے ساتھ چار مہینے رہی ، مگر خاوند بسبب عنین ہونے کے مجھ پر قادر نہ ہوسکا ، اس لئے میں علیحدگی و مفارقت چاہتی ہوں ۔ اور زید کا بیان ہے کہ ہندہ جھوٹی ہے ، بلکہ میں نے اس سے جماع کیا ہے اور میں پورا مرد ہوں ، زوجہ تہمت لگاتی ہے ، اور جبکہ میں مرد ہوں پس کیونکر اپنی زوجہ کو علیحدہ کرسکتا ہوں ۔ اس صورت میں از روئے شریعت محمدیؐ کیا کرنا چاہیئے ؟

الجواب

جبکہ زوجہ کو زوج کے عنین اور غیر قادر ہونے کا دعویٰ ہے ، اور زوج اس کی تکذیب کرتے ہوئے اس کے ساتھ مجامعت کرنے کا اقرار کرتا ہے ، تو ایسی حالت میں زوجہ کو چاہیئے کہ قاضی یعنی حاکم عدالت کے پاس اپنا دعویٰ پیش کرے ، کیونکہ اس معاملہ میں مہلت وغیرہ دینے کا حق شرعاً حاکم عدالت کے سوائے کسی کو نہیں ہے ۔ البحر الرائق جلد ۴ صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ مصر میں ہے ، وقال فی الخانیۃ ایضا و تأجیل العنین لا یکون الا عند قاضی مصر او مدینۃ فلا یعتبر تأجیل المرأۃ و لا تأجیل غیرھا ۔ عدالت میں دعویٰ ہونے کے بعد اگر مابین زوج و زوجہ کے جماع ہونے میں اختلاف ہوجائے تو قاضی کو چاہیئے کہ جاننے والی عورتوں کو مقرر کرکے یہ حکم دے کہ زوجہ کی حالت دیکھیں کہ آیا وہ اس وقت ثیبہ ہے یا باکرہ ؟ اگر عورتوں کی تحقیق سے ثیبہ ثابت ہوجائے تو حاکم کو چاہیئے کہ زوج کو اس طرح قسم کھلائے کہ " میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس عورت سے جماع کیا ہے "۔ زوج کے قسم کھانے کی صورت میں زوجہ کو تفریق و فسخ نکاح و تاجیل کا کوئی حق نہیں ہے ، قاضی کو چاہیئے کہ زوجہ کو جواب دیدے ۔

اور اگر زوج قسم کھانے سے انکار کرے یا عورتوں کی تحقیق سے زوجہ باکرہ ثابت ہوجائے تو ایسی حالت میں قاضی کو چاہیئے کہ زوج کو ایک سال ہلالی کی مہلت دے تاکہ وہ اس درمیان میں زوجہ پر قادر ہونے کی سعی کرے ، بعد ختم مدت قاضی کو چاہیئے کہ ان دونوں کو حاضر کرکے استفسار کرے ، اگر زوج نے مجامعت کی ہے تو ٹھیک ہے ، ورنہ دونوں میں تفریق کرادی جائے ۔

اور اگر دونوں میں اختلاف پیدا ہو یعنی زوج جماع کرنے کا دعویٰ کرے اور زوجہ اس سے انکار کرے تو ایسی حالت میں حاکم کو چاہیئے کہ عورتوں کے ذریعہ سے دوبارہ تحقیق کروائے کہ وہ ثیبہ ہے یا باکرہ ؟ اگر

ثیبہ ہے تو زوج کو اس طرح قسم کھلائے جیسے پہلے ذکر ہوا۔ اگر زوج قسم کھالے تو اس کا لحاظ کرے اور زوجہ کو عدم تفریق کے متعلق جواب دیدے۔ اگر زوج قسم سے انکار کرے یا زوجہ بعد تحقیق باکرہ ثابت ہو تو زوجہ کو اختیار دیا جائے کہ یا تو تفریق کرلے یا اسی کے ساتھ رہے۔ اگر زوجہ تفریق چاہتی ہے تو قاضی کو چاہئے کہ دونوں میں تفریق کروادے۔ اور اگر اسی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو پھر اس کو تفریق کا حق حاصل نہیں ہے۔

شرح وقایہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ مجتبائی دہلی باب العنین میں ہے: و ان اختلفا و کانت ثیباً او بکراً فنظرت النساء فقلن ثیب حلف فان حلف بطل حقها و ان نکل او قلن بکر اُجّل و لو اُجّل ثم اختلفا فالتقسیم هنا کما مر و بطل حقها بحلفه حیث یبطل ثمه کما لو اختارته۔ کنز الدقائق بر حاشیہ البحر الرائق جلد ۴ کتاب العنین میں ہے: و اُجّل سنة لو عنینا او خصیا فان وطئ و الّا بانت بالتفریق ان طلب فلو قال وطئت و انکرت و قلن بکر خُیّرت و ان کانت ثیباً صدقه بحلفه و اختارته بطل حقها۔ البحر الرائق جلد ۴ کتاب العنین میں ہے: و حاصله ان کانت ثیبا فالقول قوله فی الوطئ ابتداءاً و انتهاءاً مع یمینه فان نکل فی الابتداء یؤجّل سنة و لا یؤجله الا اذا ثبت عدم الوصول الیها و ان نکل فی الانتهاء تُخیّر للفرقة۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا شوہر عنین یعنی نا مرد ہے، جماع پر قادر نہیں ہے، ہندہ اس سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس بارہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب

ہندہ کو چاہئے کہ عدالت دار القضاء میں درخواست پیش کرے۔ اور حاکم کو چاہئے کہ معتبر ایک یا دو عورتوں کے ذریعہ ہندہ کا معائنہ کرائے۔ اگر ان عورتوں نے معائنہ کے بعد ہندہ کو ثیبہ کہا تو اس کے شوہر کو قسم دی جائے، اگر شوہر قسم کھالے تو پھر ہندہ کو اس سے علیحدہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر عورتوں نے اس کو باکرہ بتلایا تو حاکم کو چاہئے کہ شوہر کو قمری ایک سال کی مہلت دے تاکہ وہ علاج وغیرہ کے ذریعہ خود کو قادر بنالے، اگر ایک سال گذر جانے کے بعد بھی ہندہ باکرہ ثابت ہو تو حاکم کو چاہئے کہ دونوں میں تفریق کروادے۔ اگر ہندہ یہ کہے کہ اس کی بکارت کسی اور وجہ سے زائل ہوگئی ہے تو ایسی حالت میں بھی اس کے شوہر کو قسم دیجائے، اگر شوہر قسم کھالے تو پھر ہندہ کو اس سے علیحدہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

در مختار کے باب العنین میں ہے: (و لو ادعیٰ الوطأ و انکرته فان قالت امرأة ثقة) و اثنتان احوط (هی بکر) بأن تبول علی الجدار او یدخل فی فرجها مخ بیضة (خیرت) فی مجلسها (و ان قالت هی ثیب) او کانت ثیبة (صدق بحلفه)۔ اس کے بعد ہے: (کما) یصدق (لو وجدت ثیبا و زعمت زوال عذرتها بسبب آخر) غیر وطئه کاصبعه مثلا۔ دوسری جگہ ہے: (و لو وجدته عنینا او خصیا اُجّل سنة قمریة فان وطأ مرة) فبها (و الّا بانت بالتفریق بطلبها)۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

کتاب المفقود

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید چھ سال سے مفقود الخبر ہے۔ اور اس کی زوجہ نوجوان نان و نفقہ سے تنگ ہے۔ کیا از روئے شرع شریف ایسی حالت میں وہ دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے؟

الجواب

مفقود الخبر کی زوجہ کو علحدہ کرنے کے لئے اگرچہ مذہب حنفیہ میں بہ بناء قول مفتیٰ بہ مفقود کی ولادت سے نوے (۹۰) سال بعد قاضی کو اجازت دی گئی ہے۔ مگر بہ وقتِ ضرورت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر گمشدگی کے چار سال کے بعد بھی اگر قاضی تفریق کا حکم دیدے تو دے سکتا ہے۔ ہدایہ اولین مطبوعہ علوی کے صفحہ ۱۷۴ میں ہے: و الارفق ان یقدر بتسعین۔ بین السطور لکھا ہے: و علیہ الفتوی۔ فتح المعین کی جلد ۲ صفحہ ۳۸۶ کتاب المفقود میں ہے: قال القہستانی لو افتی بقول مالک فی موضع الضرورۃ ینبغی ان لا باس بہ۔ اور جامع الرموز مطبوعہ کشوری کے صفحہ ۳۳۸ میں ہے: و قال مالک و الاوزاعی الی اربع سنین فینکح عرسہ بعدھا کما فی النظم فلو افتی بہ فی موضع الضرورۃ ینبغی ان لا باس بہ علی ما ظن۔ پس جبکہ احناف کا مذہب مفتیٰ بہ نوے (۹۰) سال ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینے کے لئے بہ وقتِ ضرورت ظنی رائے دی گئی ہے۔ پس حاکم وقت کو چاہئے کہ بندہ کی ہر قسم کی شدید اور واقعی ضرورت پر غور و خوض کرکے امام مالک کے قول پر عمل کرے۔ صورت مسئولہ میں مفقود کی زوجہ کو چاہئے کہ مسلمان حاکم کے پاس اپنی حالت و ضرورت کا ثبوت پہونچاکر تفریق کی درخواست کرے۔ کیونکہ شریعت میں اس قسم کی تفریق کا حق صرف قاضی یعنی مسلم حاکم عدالت ہی کو دیا گیا ہے۔ بعد ثبوت واقعات جبکہ قاضی تفریق کا حکم دے تب زوجہ کو چاہئے کہ چار مہینے دس روز عدتِ موت پوری کرکے دوسرے سے نکاح کرے۔ مُلا مسکین کی کتاب المفقود میں ہے: خلافا لمالک فان عندہ یفرق بعد مضی اربع سنین ان طلبت و تعتد عدۃ الوفاۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمیٰ ناصر بن احمد نے آمنہ سے نکاح کیا۔ اور ایک ماہ بعد زوجہ کو چھوڑکر غائب ہوگیا۔ جسکو ساڑھے چار سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ آمنہ تا حال اس کی منتظر ہے۔ اور متعدد

شہروں میں اس کو تلاش کیا گیا لیکن اب تک اس کا کوئی پتہ نہیں ملا ۔ چونکہ آمنہ نان و نفقہ سے بے حد تنگ ہوگئی ہے ، چاہتی ہے کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلے ۔ کیا اس کا نکاح از روئے مذہب شافعی درست ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

مفقود الخبر کی زوجہ کے متعلق علمائے شوافع کا متفق بہ یہ قول ہے کہ اگر اس کے خاوند کا کوئی مال اس کے پاس یا اس کے کسی عزیز کے پاس زوجہ کے مقام سکونت میں یا دو منزل مسافت کے مقام میں موجود نہیں ہے ۔ اور اس کے غائب ہوجانے کے بعد تین روز تک اس کو زوج کی جانب سے نفقہ و کسوت نہیں ملا ہے ۔ تو زوجہ کو اختیار ہے کہ اپنے مقدمہ کو حاکم عدالت کے پاس پیش کرکے اس سے اپنا نکاح فسخ کروالے ۔ فسخ نکاح کے لئے نو (۹) شرائط ہیں ۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہیں پائی جائے تو فسخ نکاح جائز نہ ہوگا ۔

۱ ۔ زوج اس قدر مفلس ہو کہ ادنیٰ درجہ کا بھی نفقہ و لباس نہ دے سکے

۲ ۔ تین روز تک زوجہ کو زوج سے نفقہ حاصل کرنا مشکل و دشوار ہوگیا ہو

۳ ۔ حاکم کے پاس بذریعہ دو گواہ کے ، یا زوجہ کی یمین سے ، اگرچہ یمین مردودہ ہی کیوں نہ ہو ، یا حاکم کے علم سے یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ زوج مفلس و نادار ہے

۴ ۔ زوجہ اس بات کی قسم کھائے کہ وہ نفقہ کی مستحق ہے اور اس کے شوہر نے کوئی مال نہیں چھوڑا ہے اور اس پر دو گواہ بھی پیش کرے

۵ ۔ زوجہ اس بات کا بھی ثبوت پیش کرے کہ اس نے خاوند کی کوئی نافرمانی نہیں کی ہے اور اطاعت گزاری کے ساتھ زوج کے مکان میں رہی ہے

۶ ۔ زوجہ اپنا یہ مقدمہ حاکم کے پاس پیش کرکے حاکم سے فسخ کی درخواست کرے ، اگر بلا اجازتِ حاکم کے دوسرا نکاح کرلیا جائے تو جائز نہیں ہوگا

۷ ۔ حاکم کو چاہئے کہ زوجہ کے مقدمہ پیش کرلے کے بعد تین روز کی مہلت دے ۔ شاید اس مدت میں اس کو کوئی نفقہ بھیج دے ۔ یا اس کا کوئی مال ظاہر ہوجائے

۸ ۔ حاکم کو چاہئے کہ ان تمام امور کی تحقیق و تحقق و مہلت کے بعد جب زوجہ فسخ کی درخواست پیش کرے تو " فسخ " کا لفظ یا تو خود حاکم اپنی زبان سے کہے یا زوجہ کو کہنے کا حکم دے ، مثلاً یوں کہے کہ " فسخت نکاح فلان " یعنی میں نے فلاں کا نکاح فسخ کیا

۹ ۔ عورت کا مکلفہ ہونا ضروری ہے ۔ اگر غیر مکلفہ کا ولی فسخ نکاح کی درخواست کرے تو صحیح نہیں ہوگا ۔

بغیۃ المسترشدین باب فسخ النکاح بالاعسار صفحہ ۲۸۲ میں ہے : یجوز فسخ نکاح الزوجۃ من زوجھا حضر او غاب بتسعۃ شروط :

۱ ۔ إعسارہ بأقل النفقۃ و الکسوۃ و المسکن لا الادم

۲ ۔ و تعذر تحصیل النفقۃ فی ثلاثۃ ایام

۴۔ و ثبوت ذلک عند الحاکم بشاهدین او بعلمه او بیمینها المردودة ان رد الیمین

۳۔ و حلفها مع البینة انها تستحق النفقة و انه لم یترک مالا

۵۔ و ملازمتها للمسکن و عدم نشوزها

۶۔ و رفع امرها للحاکم

۷۔ و ضربه ثلاثة ایام لعله یاتی بالنفقة او یظهر للغائب او نحو ودیعة

۸۔ و ان یصدر الفسخ بلفظ صحیح بعد وجود ما تقدم اما من الحاکم بعد طلبها او منها باذنه بعد الطلب نحو " فسخت نکاح فلان "

۹۔ و ان تکون المراة مکلفة فلا یفسخ ولی غیرها۔ الخ ۰ و الله اعلم بالصواب ۰

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو عورتیں ۰ خاوندوں کے ۱۵ و ۲۵ و ۳۰ سال سے مفقود الخبر ہونے کے سبب اس وقت نان و نفقہ کی محتاج ہیں ۰ کیا قاضی ان کا عقد ثانی کرواسکتا ہے ؟ بینوا توجروا :

الجواب

حنفیہ کے پاس اگرچہ مفقود الخبر کی زوجہ کو علحدہ کرنے کے لئے بر بناء قول مفتیٰ بہ مفقود کی ولادت سے نوے (۹۰) سال بعد قاضی (مسلم حاکم) کو اجازت دی گئی ہے ۔ مگر بہ وقت ضرورت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر تاریخ روانگی سے چار سال بعد بھی اگر قاضی تفریق کا حکم دے تو ایسا کرسکتا ہے ۔ ہدایہ اولین کی کتاب المفقود میں ہے : و الارفق ان یقدر بتسعین ۔ بین السطور لکھا ہے : و علیه الفتویٰ ۔ اور فتح المعین کی کتاب المفقود میں ہے : قال القهستانی لو افتی بقول مالک فی موضع الضرورة ینبغی ان لا بأس به ۔ اور جامع الرموز کی کتاب المفقود میں ہے : و قال مالک و الاوزاعی الی اربع سنین فینکح عرسه بعدها کما فی النظم و لو افتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علی ما ظن ۔ چونکہ حنفیہ نے بلحاظ ضرورت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر اجازت دی ہے اس لئے صورت مسئولہ میں قاضی (مسلمان حاکم) کو چاہیئے کہ ان عورتوں کی ضرورت کو اچھی طرح بہ نظر تدقیق دریافت کرے ۰ اگر فی الحقیقت نکاح ثانی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور عورتیں اس کی طالب بھی ہیں تو اس وقت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر عمل کرے ۔ اور جب قاضی تفریق کا حکم دیدے تو عورتوں کو چاہیئے کہ اس کے بعد چار مہینے دس روز عدۃ موت گذارنے کے بعد دوسرے اشخاص سے نکاح کریں ۔ فتح المعین کے حاشیہ میں اسی جگہ ملا مسکین میں ہے : خلافا لمالک فان عنده یفرق بعد مضی اربع سنین ان طلبت و تعتد عدة الوفاة ۔ و الله اعلم بالصواب و الیه المرجع و المآب ۰

بابُ ثُبُوتِ النَّسَب

الاستفتاء

علمائے دین مندرجہ ذیل مسائل میں کیا فرماتے ہیں ؟ :

۱۔ بغیر نکاح بطور زنا بکر کا نامزد بیٹا زید غیر صحیح النسب موجود ہے ، بکر کا انتقال ہوگیا ہے ۔ کیا ایسی حالت میں بکر کا وارث شرعی زید قرار پاسکتا ہے ؟

۲۔ بکر کا جائز مگر علاتی بھائی خالد موجود ہے ۔ بکر کے نام عطیئے سلطانی معاش مشروط بھی ہے اور یہ معاش پیدا کردہ جد و پدر بکر و خالد ہے ، بکر کا لاولد انتقال ہوا ۔ ایسی صورت میں کیا بہ مقابل خالد ، زید غیر صحیح النسب مذکور کو ترجیح ہوسکتی ہے ؟ اور زید معاش مشروط پا سکتا ہے ؟

۳۔ زید جس کی ماں کا نکاح نہیں ہوا اور باپ بھی شک کی حالت میں ہے ، کیا یہ پیش امام نماز یا سجادگی یا قضاۃ وغیرہ امور شرعیہ کا پیشوا قرار پا سکتا ہے اور خدمت خطابت وغیرہ انجام دے سکتا ہے ؟

۴۔ کیا شرعاً خدمت قضائت اور اس کاصلہ قابل تقسیم ہے ؟ اگر ہے تو اس کا استحقاق ورثۂ جائز کو ہے یا شخص غیر صحیح النسب کو ؟

۵۔ شرعاً قاضی کیسا شخص مقرر ہونا چاہیے ؟

الجواب

۱۔ بکر نے اگر اپنے حین حیات زید کے اپنا بیٹا ہونے کا اقرار کیا ہے اور زنا سے ہونا بیان نہیں کیا تو زید کا نسب بکر سے ثابت ہے ، بشرطیکہ زید میں بلحاظ عمر بکر کا بیٹا ہونے کی صلاحیت ہو اور کسی دوسرے سے اس کا نسب ثابت نہ ہو ۔ اور اگر بکر کو زید کے زنا سے ہونے کا اقرار تھا تو زید کا نسب اس سے ثابت نہیں ۔ در مختار کی کتاب الطلاق باب ثبوتِ النَّسب میں ہے : (قال لغلام هو ابني و مات) المقر (فقالت اُمه انا امرأته و هو ابنه يرثانه استحسانا) ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله و هو ابنه) لم يظهر لي وجه التقييد به فان البنوة ثابتة باقرار الميّت ۔ اور عالمگیریہ کی جلد ۳ کتاب الدعوی فصل ثامن میں ہے : و لو قال المدعي هو ابني و هو غير الأب و لم يقل من الزنا ثم ملكه يثبت النسب و يعتق ۔ اور کتاب الاقرار باب سابع عشر فی الاقرار بالنسب میں ہے : يصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان يكون المقر له بحال يولد مثله لمثله و ان لا يكون المقر له ثابت النسب من غيره و ان يصدق المقر

له المقر في اقراره اذا كانت له عبارة صحيحة ۔ اس اقرار کے بعد زید بکر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وارث شرعی ہے اگرچیکہ اس وقت بکر کے دوسرے ورثاء اس کے بیٹا ہونے سے انکار کریں ۔ عالمگیریہ کے اسی صفحہ میں ہے ، حتی انه اذا اقر بالإبن مثلا فالإبن المقر له يرث مع سائر ورثة المقر و ان جحد سائر الورثة نسبه ۔

اور اگر بکر کو حین حیات زید کے اپنا بیٹا ہونے کا اقرار نہیں تھا تو اب بکر کے انتقال کے بعد تاوقتیکہ زید کی ماں کا نکاح ثابت نہو زید بکر کا لڑکا نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ شریعت میں ولد الزنا کا نسب زانی سے منقطع کردیا گیا ہے ۔ عالمگیریہ کی کتاب الدعوی فصل دعوة الولد من الزنا میں ہے ، فجاءت بولد فادعاه الزاني لم يثبت نسبه منه ۔ رد محتار کی کتاب النکاح فصل محرمات میں ہے ، لأن الشرع قطع نسبه منه ۔

۲ ۔ معاش مشروط الخدمت ، خدمت کی اجرت ہے اور اس کا مستحق وہی شخص ہے جس کو سرکار سے خدمت عطاء ہوئی ہے ، اور خدمت کا دینا سرکار کے اختیار میں ہے ، متروکہ و میراث نہیں ہے ، اہلیت و قابلیت پر اس کا مدار ہے ۔ اگر زید بکر کا وارث جائز یعنی بیٹا ثابت ہوجائے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) اور خدمت کا اہل بھی ہو تو یہی اس کا مستحق ہے ، ورنہ جو اہل ہے وہ اس کا مستحق ہے ۔ فتاوی قاضی خان میں ہے ، و ان كان الانعام بشرط الخدمة فهو اجرة فلا يورث و لا يقسم و لا يستحق الأجرة الا من قام بالخدمة ۔ فتاویٰ ابی اللیث میں ہے ، الوظيفة بشرط الخدمة لمن قام بها ۔ رد محتار کی جلد ۲ صفحہ ۲۹۰ فصل الجزیہ میں ہے ، فيجب على ولاة الأمور توجيهها على اهلها و نزعها من ايدي غير الأهل و اذا مات احد من اهلها توجه على ولده فان لم يخرج على طريقة والده يعزل عنها و توجه للاهل ۔

۳ ۔ ولد الزنا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے ، در مختار کی کتاب الصلاۃ باب الامامت میں ہے ، و يكره تنزيها امامة ولد الزنا ۔

خدمت قضائت کا اہل وہی ہے جس کی گواہی کا شریعت میں اعتبار ہے ۔ در مختار کی کتاب القضاء میں ہے : (و اهله اهل الشهادة) اى ادائها على المسلمين ۔ ولد الزنا اگر متدین ہو فاسق و فاجر نہ ہو تو اس کی گواہی کا شریعت میں اعتبار ہے ، در مختار کی کتاب الشہادۃ باب من تقبل شهادته میں ہے ، و تقبل من ولد الزنا ۔ رد محتار میں ہے ، قال في المنح و تقبل شهادة ولد الزنا لأن فسق الأبوين لا يوجب فسق الولد ، ككفرهما ۔ پس صورت مسئولہ میں ولد الزنا خدمت قضائت انجام دے سکتا ہے ۔ اور خدمت خطابت و سجادگی چونکہ عبادت سے متعلق ہے اس لئے اس کا حکم امامت کے ساتھ مربوط ہے ۔

۴ ۔ ۵ سوال چہارم کا جواب دوم سے ، اور سوال پنجم کا جواب سوم سے حاصل ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو اپنا فرزند بیان کیا ، اور دو گواہوں نے یہ

شہادت دی کہ عمرو کی والدہ کا نکاح عمرو کی ولادت کے قبل زید سے ہوا ہے۔ کیا اس شہادت کے بعد زید کو سیاھۂ نکاح بھی پیش کرنا چاہئے یا نہیں ؟

الجواب

جبکہ عمرو کی والدہ کا نکاح اس کی ولادت کے قبل زید سے ہونا دو معتبر گواہوں سے ثابت ہوگیا ہے، تو عمرو کا نسب زید سے شرعاً ثابت ہے، اس کے بعد ثبوت نسب کیلئے سیاھہ پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ عالمگیری جلد ۱ کتاب الطلاق باب ثبوت النسب میں ہے: قال اصحابنا لثبوت النسب ثلاث مراتب الأولى النكاح الصحيح و ما هو في معناه من النكاح الفاسد و الحكم فيه انه يثبت النسب من غير دعوة و لا ينتفي بمجرد النفي۔ در مختار کی کتاب الشهادة میں ہے: و نصابها لغيرها من الحقوق سواء كان الحق مالا او غيره كنكاح و طلاق و وكالة و وصية و استهلال صبي و لو للارث رجلان او رجل و امرأتان۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد نے عمرو کو اپنا فرزند بیان کرکے انتقال کیا۔ عمرو کا نسب بکر سے ثابت ہے۔ کیا عمرو، بکر کا فرزند ہوگا یا خالد کا ؟

الجواب

جبکہ عمرو کا نسب بکر سے ثابت ہے تو اب خالد کا اس کو اپنا فرزند کہنا لغو ہے۔ عالمگیری جلد ۴ کتاب الاقرار باب الاقرار بالنسب میں ہے: يصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان يكون المقر له بحال يولد مثله لمثله و ان لا يكون المقر له ثابت النسب من غيره۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کو اپنا فرزند بیان کرکے انتقال کیا۔ بکر کی ماں ہندہ کہتی ہے کہ میرا لڑکا زید کے نطفہ سے ہے مگر زید کا میرے ساتھ عقد نہیں ہوا۔ کیا بکر، زید کا فرزند ہوگا؟ اور اس کے ترکہ سے حصہ پائے گا ؟

الجواب

بکر کی ماں چونکہ زید کے ساتھ اپنا نکاح ہونے سے انکار کرتی ہے اس لئے بکر کا نسب زید سے ثابت نہیں ہوگا اور نہ بکر، زید کے ترکہ سے حصہ پائے گا۔ اگر ہندہ اپنے بیان سے رجوع کرکے نکاح کا اقرار

کرے تو پھر بکر، زید کا فرزند ہوگا اور ترکہ بھی پائے گا۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الدعویٰ فصل ثانی میں ہے : و کذلک لو ادعیٰ الرجل النکاح و ادعت المرأۃ ان الولد من الزنا من الزنا لم یثبت النسب فلن عادت الی التصدیق یثبت نسبہ منہ کذا فی الحاوی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوا، اس کی زوجہ ہندہ نے بوقت انتقال چار ماہ کے حمل کا اقرار کیا اور انتقال کے چار سال تین ماہ بعد بچہ جنی۔ کیا اس بچہ کا نسب زید سے ثابت ہوگا؟ اور یہ بچہ میراث کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

الجواب

اس بچہ کا نسب زید سے ثابت نہیں ہے، اور نہ یہ ترکہ کا مستحق ہے۔ در مختار کے باب النسب میں ہے : و یثبت نسب ولد معتدۃ الموت لاقل منہما من وقتہ اذا کانت کبیرۃ و لو غیر مدخول بہا و ان ولدت لاکثر منہما لا ۔ رد المحتار میں (منہما) کی شرح میں لکھا ہے : (قولہ لاقل منہما) ای من سنتین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ و الیہ المرجع و المآب ۔

باب الحضانۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا انتقال ہوا اور ورثہ میں شوہر، دختر شیرخوار، دو برادر شوہر، شوہر کے تین چچازاد بھائی، شوہر کے دو پھوپی زاد بھائی، شوہر کی ایک چچازاد بہن، شوہر کا ایک علاتی چچا، ہندہ کے والد و والدہ اور دو علاتی خالائیں ہیں۔ اب حق حضانت کس کو ہوگا اور کتنی مدت تک رہے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب

صورت مسئولہ میں حق حضانت ہندہ کی والدہ کو حاصل ہوگا، فتاوی قاضی خان مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیری مصری جلد ۱ صفحہ ۴۲۲ میں ہے: احق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح و بعد الفرقة الأم فان ماتت الأم او تزوجت فأم الأم۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۵۱۳ میں ہے: احق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح او بعد الفرقة الأم۔ الخ اسی صفحہ میں ہے: و ان لم تكن له أم تستحق الحضانة بأن كانت غير اهل للحضانة او متزوجة بغير محرم او ماتت فأم الأم أولىٰ من كل واحدة و ان علت فان لم تكن للأم أم فأم الأب أولىٰ ممن سواها و ان علت كذا في فتح القدير۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۵۳۵ میں ہے: و الام و الجدة احق بالجارية حتى تحيض یعنی لڑکی کی ماں اور نانی کو اس کے حائضہ ہونے تک حق حضانت حاصل ہے۔ فتاویٰ شامی مطبوعہ مصر جلد ۲ مطلب الحضانت صفحہ ۷۵۸ میں ہے: (و عن محمد عليه الرحمة ان الحكم في الام و الجدة كذلك) و به يفتى لكثرة الفساد۔ (قوله كذلك) اى في كونها احق بها حتى تشتهي یعنی امام محمد علیہ الرحمۃ سے منقول ہے کہ حق حضانت ماں اور نانی کو لڑکی کے قابل شہوت ہونے تک ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ فتاویٰ شامی میں اسی مقام میں ہے: بل في محرمات المنح: بنت تسع سنين فصاعدا مشتهاة اتفاقا۔ اور در مختار مطبوعہ بمبئی کے باب الحضانت صفحہ ۲۲۳ میں ہے: و قدر بتسع و به يفتى یعنی لڑکی کے قابل شہوت ہونے کی عمر مفتیٰ بہ نو (۹) سال ہے۔ فتاویٰ مھدیہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۱ میں ہے: و مدة الحضانة في الانثى مقدرة بتمام تسع سنين على المفتي به فاذا تحقق تمامها يكون لأبيها بل عليه ضمها اليه یعنی لڑکی کی مدت حضانت نو (۹) سال ہونے پر فتویٰ دیا گیا ہے، اور جب اس کے نو سال مکمل ہوجائیں تو باپ اپنی پرورش میں لے لے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میر سردار علی کا انتقال ہوا۔ ورثاء میں ایک برادر حقیقی سید احمد علی ایک زوجہ، ایک پسر اور تین دختر چھوڑا۔ زوجہ نے بعد انتقال کے دوسرے سے نکاح کرلیا۔ پس پسر و دختران کمسن کی نگہداشت کیا ماں کے ذمہ رہے گی یا چچا کے؟ بچوں کے نانا نانی بھی فوت ہوگئے ہیں۔

الجواب

بچوں کی ماں نے جس شخص سے نکاح کرلیا ہے اگر وہ بچوں کا رحمی قرابت دار نہیں ہے بلکہ اجنبی ہے تو حق حضانت دادی و پردادی کو حاصل ہے۔ اگر دادی زندہ نہیں ہے تو حقیقی بہن کو، پھر اخیافی بہن کو، پھر علاتی بہن کو، اس کے بعد حقیقی بھانجی کو، پھر اخیافی بھانجی کو، پھر علاتی بھانجی کو، پھر اسی سلسلہ سے حقیقی و اخیافی و علاتی خالات کو، پھر ان کے بعد اسی طرح پھوپیوں کو، پھر ماں کی خالہ کو، پھر باپ کی خالہ کو، پھر ماں کی پھوپیوں کو، پھر باپ کی پھوپیوں کو، پھر باپ کو، پھر دادا کو، پھر حقیقی بھائی کو، پھر علاتی بھائی کو، پھر حقیقی بھتیجے کو، پھر علاتی بھتیجے کو۔ اور ان سب کے نہ ہونے کی صورت میں چچا مستحق حضانت ہے۔ پس صورت مسئولہ میں اگر ان تمام رشتہ داروں میں سے حسب ترتیب کوئی بھی نہیں ہے تو چچا مسمیٰ سید احمد علی کو حق حضانت حاصل ہے۔ در مختار کے باب الحضانت صفحہ ۶۵۵ میں ہے: (ثم) ای بعد الأم بأن ماتت او لم تقبل او اسقطت حقها او تزوجت بأجنبي (أم الأم و ان علت) عند عدم اهلية القربى (ثم أم الأب و ان علت) بالشرط المذكور و اما أم ابي الأم فتؤخر عن أم الأب بل عن الخالة ايضا۔ بحر (ثم الأخت لأب و أم ثم لأم) لأن هذا الحق لقرابة الأم (ثم) الأخت (لأب) ثم بنت الأخت لأبوين ثم لأم ثم لأب (ثم الخالات كذلك) اى لأبوين ثم لأم ثم لأب ثم بنت الأخت لأب ثم بنات الأخ (ثم العمات كذلك) ثم خالة الأم كذلك ثم خالة الأب كذلك ثم عمات الأمهات و الآباء بهذا الترتيب ثم العصبات بترتيب الإرث فيقدم الأب ثم الجد ثم الأخ الشقيق ثم لأب ثم بنوه كذلك ثم العم ثم بنوه۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ماں کو بچہ کا حق حضانت بمقابل تایا کے کس عمر تک حاصل ہے؟

الجواب

اگر لڑکا ہے تو سات سال تک، اور لڑکی ہے تو نوجوان ہونے تک۔ در مختار کی کتاب النکاح باب الحضانت میں ہے: (و الحاضنة) أما كلن او غيرها (احق به) اى بالغلام حتى يستغنى عن النساء و قدر بسبع و به يفتى (و الأم و الجدة) لأم او لأب (احق بها) بالصغيرة (حتى تحيض) اى تبلغ فى

ظاهر الروایة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمیٰ داور علی کے انتقال کے بعد اس کی لڑکی مسماۃ ثابت النساء بیگم اپنی والدہ کے پاس تھی ۔ والدہ کے انتقال کے بعد اب وہ اپنی حقیقی خالہ کے پاس ہے ۔ مسمیٰ فتح اللہ اپنے کو داور علی کا وصی بیان کرکے چاہتا ہے کہ ثابت النساء کو اپنے پاس رکھے ۔ مگر ثابت النساء اس کے پاس رہنے سے ناراض ہے ۔ اور وہ عاقلہ و بالغہ ہے ۔ کیا ایسی حالت میں قاضی کو حق ہے کہ اس کو وصی کے پاس رہنے کیلئے جبر کرے ؟ یا ثابت النساء مختار ہے کہ جہاں چاہے رہے ؟

الجواب

ثابت النساء بیگم اگر عاقلہ و بالغہ ہے اور اس کی عمر اتنی ہے کہ اس کو اپنی بھلائی و برائی کی اچھی طرح تمیز ہے اور معاملات میں صاحب الرائے ہے ۔ تو اس کو حق حاصل ہے کہ ایسی جگہ رہے جو اس کو اچھی معلوم ہو اور کسی قسم کا خوف نہ ہو ۔ قاضی کو ایسی حالت میں جبر کا حق نہیں ۔ در مختار کی کتاب الطلاق باب الحضانت میں ہے و بلغت الجاریۃ مبلغ النساء ان بکرا ضمها الأب الیٰ نفسه الا اذا دخلت فی السن و اجتمع لها رأی فتکون حیث احبت حیث لا خوف علیها ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر نے اپنے انتقال کے وقت ایک لڑکا چھوڑا ۔ بکر کی زوجہ نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد نکاح ثانی کرلیا ۔ اس وقت لڑکے کی عمر سات سال ہے اور لڑکا ابھی اپنی والدہ ہی کے پاس ہے ۔ بکر کا حقیقی بھائی عمرو چاہتا ہے کہ اس لڑکے کو اپنے پاس رکھے ۔ کیا شرعاً اس کو اس طرح کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب

لڑکے کیلئے سات سال مدتِ حضانت ہے ۔ ساتواں سال ختم ہوجانے کے بعد اگر لڑکے کا دادا ۔ پڑدادا یا اس کا کوئی حقیقی یا علاتی بھائی پرورش کرنے والا نہیں ہے تو ایسی حالت میں چچا کو حق ہے کہ اس کو ماں سے لیکر خود پرورش کرے ۔ الدر المختار کی کتاب الطلاق باب الحضانت میں ہے و (و الحاضنة) اما کان او غیرها (احق به) ای بالغلام حتی یستغنی عن النساء و قدر بسبع و به یفتی ۔ رد المحتار میں اسی باب کے اخیر میں ہے : و الذی افتی به الرملی فی الخیریة هو انه اذا تزوجت باجنبی و للصغیر ابن عم له ضلبه ۔ قال فی المنهاج للعقیلی و ان لم یکن للصبی اب و انقضت الحضانة فمن سواه من العصبة اولی الأقرب فالأقرب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوا اور اس نے ایک فرزند سہ سالہ چھوڑا۔ زید کے انتقال کے بعد اس کی زوجہ یعنی لڑکے کی والدہ اس کی نگرانی و پرورش کرتی تھی۔ اب والدہ کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ اس لڑکے کا ایک ماموں اور ایک تایا یعنی باپ کا بڑا بھائی موجود ہے۔ پس لڑکے کی نگرانی کا حق شرعاً کس کو حاصل ہے؟

الجواب

صورت مسئولہ میں بچے کی پرورش کا حق ماں کے بعد نانی کو ہے۔ اگر وہ بھی نہیں تو دادی کو چاہے کتنے اونچے درجہ کی ہو۔ اگر وہ بھی نہیں تو حقیقی بہن کو۔ اس کے بعد اخیافی بہن کو۔ پھر علاتی بہن کو۔ پھر خالہ کو حسب سلسلہ حقیقی و اخیافی و علاتی۔ پھر پھوپی کو حسب سلسلہ حقیقی و اخیافی و علاتی۔ اگر یہ سب نہیں ہیں تو دادا کو۔ اگر وہ بھی نہیں تو بھائی کو حسب ترتیب حقیقی و علاتی۔ اگر یہ بھی نہیں تو تایا کو ہے۔
در مختار کے باب الحضانت میں ہے: (ثم) ای بعد الام (ام الام ثم ام الاب و ان علت ثم الاخت لاب و ام ثم لام ثم لاب ثم خالات کذلک) ثم العمات کذلک ثم العصبات بترتیب الارث فیقدم الاب ثم الجد ثم الاخ الشقیق ثم لاب۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں عبد اللہ بن عوض کا انتقال ہوا جس کی ایک زوجہ اور دو لڑکیاں ایک کتخدا دوسری ناکتخدا، ایک اخیافی بھائی اور ایک حقیقی بھتیجا مسمی عوض بن سعید موجود ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور ورثاء مرحوم کے یہاں موجود نہیں۔ البتہ عربستان میں ہیں۔ مرحوم نے انتقال کے وقت مسمیٰ مبارک بن علی کو اپنی ناکتخدا لڑکی خدیجہ بی کی پرورش کیلئے وصیت کی تھی۔ پس ایسی حالت میں خدیجہ بی کی پرورش شرعاً کس کے ذمہ ہے اور اس کے مال کی ولایت کس کو ہے؟

الجواب

صورت مسئولہ میں مرحوم کا حقیقی برادر زادہ مسمی عوض بن سعید خدیجہ بی کے بنی اعمام میں سے ہے جس کا نکاح خدیجہ بی سے جائز ہونے کی وجہ سے خدیجہ بی کے محارم سے نہیں ہے۔ اور مرحوم کا اخیافی بھائی اگرچہ ذوی الارحام سے ہے مگر خدیجہ بی کا چچا ہونے کی وجہ سے خدیجہ بی کے محارم سے ہے اور عصبہ نہونے کی صورت میں وہی مستحق حضانت ہے۔ بنی اعمام عصبہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ مستحق حضانت ہیں مگر اس میں شرط یہ ہے کہ جو لڑکی حضانت میں دی جاتی ہے وہ قابل شہوت نہو۔ اگر لڑکی قابل شہوت ہے تو ابن عم اگر متقی و محتاط ہے جس سے کوئی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہیں تو مستحق حضانت ہے۔ بہر حال اس بات کی تحقیق قاضی کے رائے پر موقوف ہے۔ جس میں مصلحت اور فتنہ کا اندیشہ نہ دیکھے اس کے ذمہ لڑکی کی

پرورش متعلق کرے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۵۵۰ باب الحضانۃ میں ہے : ثم العم ثم بنوہ و اذا اجتمعوا فالأورع ثم الأسن اختیار ، سوىٰ فاسق و معتوہ و ابن عم لمشتهاۃ و ھو غیر مأمون ثم اذا لم یکن عصبۃ فلذوی الأرحام فتدفع لأخ لأم ثم لابنه ثم للعم للام ۔ رد محتار میں ہے : (قولہ و ابن عم لمشتهاۃ ۔ الخ) اما اذا کانت لا تشتھی کبنت سنۃ فلا منع لأنہ لا فتنۃ و کذا اذا کانت تشتھی و کان مأمونا ، بحر بحثا ۔ و أیدہ بما فی التحفۃ و ان لم یکن للجاریۃ غیر ابن العم فالاختیار للقاضی ان رءاہ أصلح ضمھا الیہ و إلا توضع علیٰ ید امینۃٍ ۔ رد محتار میں تحت قول سویٰ فاسق مکتوب ہے : و فی البدائع حتیٰ لو کانت الإخوۃ و الأعمام غیر مأمونین علی نفسھا او مالھا لا تسلم الیھم و ینظر القاضی امرأۃً ثقۃً عدلۃ امینۃً فیسلمھا الیھا الیٰ ان تبلغ ۔ پس صورت مسئولہ میں قاضی کو چاہئے کہ اگر ابن عم مسمی عوض بن سعید ہر طرح سے قابل اطمینان و متدین ہے اور اس کا لڑکی کے ساتھ کوئی ناجائز برتاؤ نہ ہونے کا یقین ہے تو اسی کے ذمہ لڑکی کی پرورش رکھے ، ورنہ اخیافی چچا کی حضانت میں لڑکی دی جائے ۔ اگر اخیافی چچا سے بھی اچھی طرح نگرانی و نگہداشت کی امید نہ ہو تو اپنی رائے سے کسی اجنبیہ متدین اور نیک عورت کے پاس بالغ ہونے تک رکھے ۔

صورت مسئولہ میں اگر اس کے باپ نے ولایت مال کے متعلق کسی کو وصی کیا ہے تو لڑکی کے مال کی ولایت اس وصی کو ہے ، پھر اس وصی کے وصی کو ، پھر دادا کو ، پھر اس کے وصی کو ، پھر وصی کے وصی کو ۔ یہ تمام نہ ہونے کی صورت میں قاضی یا اس کے نائب کو ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۵ صفحہ ۴۴۳ میں ہے : و ولیہ ابوہ ثم وصیہ بعد موتہ ثم وصی وصیہ کما فی القھستانی عن العمادیۃ ثم بعدھم جدہ الصحیح و ان علا ثم وصیہ ثم وصی وصیہ ثم القاضی او وصیہ دون الأم او وصیھا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکا اپنی والدہ کی وفات ہونے کے بعد جبکہ اس کی عمر چھ مہینے کی تھی اپنی نانی کے پاس پرورش پاتا رہا ، اس وقت اس کی عمر نو سال کی ہے ۔ نانی کو اس سے بےحد محبت ہے اور وہ بھی نانی سے بےحد مانوس ہے ، در صورت مفارقت تعجب نہیں کہ لڑکے کو صدمہ ہو ۔ اس وقت لڑکے کا باپ چاہتا ہے کہ اس کو جبراً اپنے پاس رکھے ، حالانکہ باپ نے دوسری عورت سے شادی کرلی ہے اور اس کے بطن سے بھی ایک لڑکا موجود ہے ۔ کیا ایسی حالت میں جبکہ نانی کو اقسام کے اندیشے ہیں لڑکے کو باپ کے حوالہ کردینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

لڑکا اس وقت چونکہ نو (۹) سال کی عمر کو پہنچ گیا ہے اس لئے اب اس کو باپ کے حوالہ کرنا

چاہیئے تا کہ وہ اپنے منشاء کے موافق اس کی تعلیم و تربیت کرے۔ لڑکے چونکہ عموماً کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں اس لئے وہ ایسی جگہ رہنے کو پسند کرتے ہیں جہاں محبت و شفقت کے سبب کھیل کا زیادہ موقعہ ملتا ہے اور جہاں تعلیم و تنبیہ ہوتی رہنے کو پسند نہیں کرتے، اس لئے شریعت میں ان کی رضامندی و اختیار کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، اور نہ صحابہ کرام نے ایسا اختیار دیا۔ در مختار باب الحضانت میں ہے: (و لا خیار للولد عندنا مطلقا) ذکراً کان او اُنثیٰ۔ رد محتار میں ہے: (قوله و لا خیار للولد عندنا) ای اذا بلغ السن الذی ینزع من الأم یأخذه الأب و لا خیار للصغیر لأنه لقصور عقله یختار مَن عنده اللعب و قد صح ان الصحابة لم یخیّروا۔ اسی جگہ رد محتار میں ہے: (و الحاضنة) اما او غیرها (احق به) ای بالغلام حتی یستغنی عن النساء و قُدِّر بسبع و به یفتیٰ لأنه غالب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی عمر بارہ (۱۲) سال کی ہے، اس کے رشتہ داروں میں علاقی چچا اور نانی و ماموں ہیں۔ اس کی پرورش کس کے ذمہ ہے؟

الجواب

شریعت میں حضانت کی مدت لڑکے کیلئے سات سال ہے، صورت مسئولہ میں چونکہ زید کی عمر مدت حضانت سے متجاوز ہوگئی ہے اس لئے زید اس کے چچا کی نگرانی میں دیدیا جائے۔ رد المحتار جلد ۲ باب الحضانت میں ہے: و ان لم یکن للصبی اب و انقضت الحضانة فمن سواه من العصبة اولی الاقرب فالاقرب غیر ان الانثی لا تدفع الا الی محرم۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زینب کمسن ہے، اس کے اقرباء میں حقیقی چچا اور علاتی خالہ یعنی ماں کی علاتی بہن ہے، ان دونوں میں زینب کی پرورش کا حق کس کو ہے؟

الجواب

علاتی خالہ کو ہے، در مختار کے باب الحضانت میں ہے: (ثم) ای بعد الأم (اُم الأم ثم اُم الأبِ و ان علت ثم الأخت لأبٍ و اُم ثم لأمٍ ثم لأبٍ ثم الخالات کذٰلک) ای لأبوین ثم لامٍ ثم لأبٍ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا انتقال ہوا، اس نے ایک لڑکا تین سالہ اور

ایک لڑکی نو ماہ کی چھوڑی۔ ہندہ کے ماں باپ زندہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان بچوں کی پرورش خود کریں اور ہندہ کے شوہر سے اخراجات لیں۔ شوہر جز معاش ہے۔ چاہتا ہے کہ بچوں کو اپنے پاس رکھے۔ شوہر کی بہن بچی کو مفت دودھ پلاتی ہے اور بچوں کی دادی پھوپی دونوں بلا اخراجات کے بچوں کی پرورش و نگہداشت کررہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا بچے نانا نانی کے تفویض کئے جائیں یا دادی و پھوپی کے پاس رکھے جائیں؟

الجواب

جب شوہر کی بہن یعنی بچی کی پھوپی بچی کو مفت دودھ پلا رہی ہے اور دادی و پھوپی دونوں بلا اخراجات بچوں کی پرورش کررہے ہیں اور باپ جزمعاش بھی ہے تو ایسی حالت میں بچے باپ کے پاس دادی اور پھوپی کی پرورش میں رکھے جائیں، نانا نانی کو نہ دیئے جائیں۔ رد المحتار جلد ۲ باب الحضانت میں ہے، و لو کان للأب اُمٌّ او اُختٌ عنده تحضن الولد مجاناً و لا یرضیٰ من هو احق منها إلا بالأجرة فلها ان تربیه عند الأب۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کمسن حامد باپ کے انتقال کے بعد اپنی ماں سعیدہ کی حضانت و پرورش میں ہے۔ حامد کے دادا دادی عدالت میں دعویٰ پیش کرکے اپنے پاس لے جانا چاہتے ہیں، کیا بزمانہ حضانت ان کو ایسا حق حاصل ہے؟

الجواب

بچے کو پرورش کے زمانہ تک حاضنہ یعنی پرورش کرنے والی سے جدا کرنا ممنوع ہے۔ لہذا دادا دادی کو یہ حق نہیں ہے کہ حامد کو اس کی ماں کے پاس سے علیحدہ کریں۔ اگر ان دونوں کو بچہ کی ملاقات مطلوب ہے تو وہ خود سعیدہ کے پاس جاکر بچے کو دیکھ سکتے ہیں۔ رد المحتار کے باب الحضانت میں ہے، اذا کانت بها الحضانة یمنع من اخذه منها فضلا عن اخراجه۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زینب کمسن کے اقرباء میں حقیقی چچا اور دادی اور علاتی خالہ ہے۔ از روئے شرع ان اقرباء میں کس کو زینب کی پرورش کا حق حاصل ہے اور اس کا ولی نکاح کون ہے؟

الجواب

حق حضانت دادی کو حاصل ہے۔ اور چچا ولی نکاح ہے۔ در مختار باب الحضانت میں ہے، (ثم) بعد الأم (اُم الأم ثم اُم الأب و ان علت)۔ رد المحتار کے باب الولی میں ہے، ثم ابن الأخ الشقیق ثم لأب

ثم العم الشقیق - و اللہ اعلم بالصواب -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوا ، بچے کمسن ہیں ، زید کی زوجہ نے دوسرے شخص سے عقد کرلیا ہے ، کیا بچے اس کی پرورش میں رکھے جائیں گے یا نہیں ؟

الجواب

جبکہ ماں نے اجنبی سے نکاح کرلیا ہے تو بچوں کو اس کی پرورش سے علیحدہ کرلینا چاہئے - رد محتار کے باب الحضانت میں ہے : و یشترط فی الحاضنۃ ان تکون حرۃ بالغۃ عاقلۃ امینۃ قادرۃ و ان تخلو من زوج اجنبی - و اللہ اعلم بالصواب -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب بچہ کی ماں کا انتقال ہوجائے اور اس کی نانی و دادی دونوں موجود ہوں ، تو اس کی پرورش کا حق دونوں میں سے کس کو حاصل ہے ؟

الجواب

نانی کو حاصل ہے ، ہدایہ کے باب الحضانت میں ہے : فان لم تکن لہ اُم فاُم الاُم اَولیٰ من اُم الاَب و ان بعدت - و اللہ اعلم بالصواب -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد کا انتقال ہوا ، اس نے ایک کمسن لڑکا چار سالہ چھوڑا - بچے کا نانا موجود ہے ، اور خالد کے بھائی کی زوجہ بھی ہے ، ان دونوں میں حق حضانت کس کو حاصل ہے ؟ اور بچہ کس کی پرورش و نگہداشت میں دیا جائے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ بچہ کے عصبات میں سے کوئی نہیں ہے ، اور نانا ذوی الارحام میں سے ہے ، اس لئے بچہ نانا کی حضانت و نگہداشت میں دیا جائے - رد المحتار جلد ۲ باب الحضانت میں ہے : ثم اذا لم یکن عصبۃ فلذوی الاَرحام - و اللہ اعلم بالصواب -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے دو کمسن بچے ہیں ، بچوں کی ماں و نانی فوت

ہوگئی ہیں ۔ دادی اور پھوپی زندہ ہیں ۔ ان دونوں میں کون ان کی پرورش و نگہداشت کا ذمہ دار ہے ؟

الجواب

دادی کو حق ہے ۔ در مختار کے باب الحضانت میں ہے : الحضانۃ تثبت للأم ثم أم الأم ثم أم الأب و ان علت ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کمسن کی نانی ۔ دادی اور پرنانی موجود ہیں ۔ نانی نے ایک اجنبی شخص سے نکاح کرلیا ہے ۔ ہندہ ان تینوں میں سے کس کی پرورش میں دی جائے ؟

الجواب

نانی نے چونکہ اجنبی سے نکاح کرلیا ہے اس لئے اس کا حق حضانت ساقط ہوگیا ۔ ہندہ پرنانی کی حضانت میں دی جائے ۔ کنز الدقائق میں ہے : و من نکحت غیر محرمہ سقط حقھا ۔ تبیین الحقائق صفحہ ۳۰ باب الحضانت میں ہے : من تزوج ممن لہ حق الحضانۃ بغیر محرم للصغیر سقط حقھا ۔ رد المحتار جلد ۲ باب الحضانت میں ہے : الحضانۃ تثبت للأم ثم أم الأم و ان علت عند عدم اھلیۃ القربیٰ ۔ الخ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لڑکے کو قبل از بلوغ کیا یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے ورثاء میں سے جس کسی کے پاس چاہے رہے یا نہیں ؟

الجواب

بچہ کو بالغ ہونے کے قبل یہ حق نہیں کہ جس کسی کے پاس چاہے رہے ۔ بلکہ حسب شریعت جس کے ذمہ اس کی نگہداشت ہے اسی کے پاس رہنا ضروری ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد محتار جلد ۲ کتاب الطلاق باب الحضانت میں ہے : (و لا خیار للولد عندنا مطلقا) ذکرا کان او انثی ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ لا خیار للولد عندنا) ای اذا بلغ السن الذی ینزع من الأم یأخذہ الأب و لا خیار للصغیر لأنہ لقصور عقلہ یختار من عندہ اللعب و قد صح ان الصحابۃ لم یخیّروا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو طلاق مغلظہ دی ہے ۔ اور اس کے صلب سے ایک لڑکی مسماۃ زینب یکسالہ موجود ہے ۔ زید میں مقدرت نہیں ہے کہ مسماۃ زینب مذکورہ کا حق رضاعت و حضانت اداء کرے ۔ ایسے وقت میں زید کا کوئی قرابت دار بلا اخذ حق رضاعت و حضانت تبرعاً

زینب کی پرورش کرنے کے مستحق ہیں یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

در صورت صداقت مستفتی صورت مسئولہ میں زید کی مفلسی و محتاجی کے ساتھ اگر زید کی مطلقہ زوجہ یعنی والدہ زینب کو بھی ملت رضاعت و حضانت سے انکار ہے ۔ تو ایسی حالت میں زید کے وہ قرابتدار جن کو شرعاً حق حضانت حاصل ہے مسماۃ زینب کی حضانت ملت اداء کرنے کے مستحق ہیں ۔ فتاوی القرویہ جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ کے حاشیہ میں فتاویٰ امین الدین سے منقول ہے ؛ صرّح علماؤنا بأن العمة لو طلبت بلا اجر يقال للأُم إما أن تمسكيه بلا اجر او تدفعيه بالعمة و الظاهر ان العمة ليست بقيد بل كل من لا حق له في الحضانة كذلك ۔ فتاویٰ واقعات المفتین صفحہ ۳۹ کے حاشیہ میں البحر الرائق سے منقول ہے ؛ و الظاهر ان العمة ليست قيدا بل كل حاضنة كذلك بل الخالة أولىٰ لأنها من قرابة الأُم ۔

و اللّٰه اعلم بالصواب
و اليه المرجع و المآب ۔

بَابُ النَّفَقَۃِ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ سے مندرجہ ذیل شروط پر نکاح کیا، اور ان شروط کو بطور اقرار نامہ کے والدۂ ہندہ نے قبل از نکاح زید سے لکھوالیا۔ " والدۂ ہندہ یعنی مریم کی کسی جائداد سے مجھے کوئی تعلق نہیں اور نہ میں اس وقت اور نہ آئندہ ان سے کسی قسم کے جمع کا مطالبہ کروں گا، ہندہ چاہے میرے مکان میں رہے یا اپنی والدہ کے میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار در وجہ نفقہ اپنی ہر قسم کی جائداد سے ماہانہ اداء کروں گا، میرا خاصہ اور ماہوار ملازمین بھی اسی ڈیڑھ سو سے رہیگی، اگر میں کوئی دوسرا نکاح یا خواص کروں تو ہندہ کو اپنی جملہ جائداد کا نصف حصہ اسی وقت اداء کروں گا اور نفقہ مذکور بھی دیتا رہونگا۔" زید کے والد بکر نے یہ اقرار نامہ لکھدیا ہے کہ " پانچ سو روپیہ اپنی ذاتی رقم سے سالانہ ہندہ کو دیا کروں گا۔" زید کو صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہے جو دادا کی تھی، اب زید کی دادی بھی موجود ہے جس کو پچاس روپیہ ماہانہ اسی میں سے دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ استفسار ہے کہ ان شروط کے موافق پابندی شرعا زید پر واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جو شروط کہ نکاح کے قبل لگائی جاتی ہیں شرعاً ان کی دو ۲ قسمیں بیان کی گئی ہیں، بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز۔ شروط ناجائز مثلاً زوج کا یہ شرط لگانا کہ زوجہ کو نفقہ نہیں دیگا وغیرہ، اور جو شروط کہ شریعت کے خلاف ہیں اس قسم کی شروط شرعا باطل و فاسد ہیں اور ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ فتاوی رد المحتار مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ میں ہے: و لکن لا یبطل النکاح (بالشروط الفاسدۃ و) انما (تبطل الشروط دونہ) یعنی لو عقد مع شرط فاسد لم یبطل النکاح بل الشرط۔

شروط جائزہ کی ادائی کے متعلق اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ جو شروط مقتضائے عقد نکاح کے موافق ہوں مثلاً زوج کا یہ شرط لگانا کہ میں زوجہ کے ساتھ عرف بلد اور شریعت کے موافق معاشرت کرونگا اور اسی طرح نفقہ اور کسوت بھی اداء کروں گا، پس اس قسم کی شروط کا زوج کو اداء کرنا ضروری ہے، کیونکہ یہ شروط حقوق شرعیہ ہیں جن کی ادائی زوج کے ذمہ ہے۔ عمدۃ القاری للعینی شرح صحیح بخاری جلد ۶ مطبوعہ مصر صفحہ ۴۳۸ میں ہے: ثم اختلفوا ھل تلزم الشروط الجائزۃ کلھا او ما یتعلق بالنکاح من المھر و نحوہ فروی ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن ابی الشعثاء عن الشعبی قال اذا شرط لھا دارھا فھو بما

استحل من فرجها و قال النووی قال الشافعی رحمه الله تعالی و اکثر العلماء : هذا محمول علیٰ شروط لا تنافی مقتضی النکاح بل تکون من مقتضاه و مقاصده کاشتراط العشرة بالمعروف و الانفاق علیها و کسوتها و سکناها بالمعروف و انه لا یقصر فی شیء من حقوقها و یقسم لها کغیرها ۔ و اما شرط یخالف مقتضاه کشرط ان لا یقسم لها و لا یتسری علیها و لا ینفق علیها و لا یسافر بها و نحو ذلک فلا یجب الوفاء به بل یلغو الشرط و یصح النکاح بمهر المثل ۔

پس صورت مسئولہ میں بھی نفقہ کے متعلق جو شرط لگائی گئی ہے چونکہ وہ مقتضائے عقد کے موافق ہے اس لئے اس کی پابندی عرف بلد کے طریقہ پر کی جائے ۔ بناء بریں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عورت سے قبل نکاح یہ شرط لگائے کہ میں ماہانہ سو دینار تجھکو دیا کروں گا ، پس اس صورت میں نکاح ہوجائے گا اور اس عورت کو عرف بلد کے موافق اس کے ہم مثل اور ہمسر عورت کا نفقہ دیا جائے گا ۔ فتاوی قاضی خان بر حاشیہ عالمگیریہ صفحہ ۴۲۱ جلد ۱ میں ہے : رجل تزوج امرأة علی ان ینفق علیها فی کل شهر مائة دینار قال ابو حنیفة رحمه الله النکاح جائز و لها نفقة مثلها بالمعروف ۔

سکونت زوجہ کی زوج کے ساتھ ضروری ہے ، مگر اس وقت جبکہ زوج کوئی ایسا مکان جو اپنے متعلقین اور زوجہ کے متعلقین سے خالی ہو تجویز نہ کرے تو ایسی صورت میں زوجہ کا اپنے والدین کے گھر رہنا درست ہے ، اور زوج پر واجب ہے کہ اسی جگہ اس کا نفقہ پہنچا دیا کرے ۔ اور در صورت مکان خالی دینے کے پھر زوجہ کا اپنے ماں باپ کے گھر میں رہنا نشوز و نافرمانی میں داخل ہے ، اور ایسی عورت کو شرعا ناشزہ کہا جاتا ہے جس کا نفقہ زوج پر واجب نہیں ہے ۔ فتاوی ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۴۲۱ سطر ۱۹ میں ہے : یجب علی الزوج اسکان زوجته مسکنا شرعیا و هو الخالی عن اهله و اهلها فلا یکون المسکن الذی فیه اهله شرعیا حیث لم تکن منفردة فیه بمرافق و غلق علٰحدة و بامتناعها من السکنیٰ فیما ذکر لا تعد ناشزة ، و لو لم یتحقق الضرر منهم مع الاختلاط فتجب لها النفقة مع امتناعها من السکنی معهم علی هذا الوجه فلو مکثت فی بیت اهلها فیفرضها القاضی لان امتناعها بحق و الحال هذه ۔ اور اگر زوجہ بدون حق شرعی زوج کے گھر سے چلی جائے اور ماں باپ میں رہے تو شرعا اس کیلئے واپس آنے تک نفقہ نہیں ہے ۔ فتاوی شامی جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ میں ہے : لا نفقة لاحد عشر از ۳ تجملہ : و خارجة من بیته بغیر حق و هی ناشزة حتی تعود ۔

صورت مسئولہ میں زید نے جو یہ شرط قبول کی ہے کہ اس پر دوسرا نکاح نہیں کریگا اس قسم کی شروط کو شروط مباحہ کہا جاتا ہے ، ان کے متعلق امام اعظم رحمہ اللہ اور جمہور کا یہ ارشاد ہے کہ اس قسم کی شروط کی پابندی کیلئے زوج سے از روئے تقویٰ کہا جائے لیکن اس پر حکم نہ کیا جائے ۔ اگر زوج اس کی پابندی نہ کرے تو اس کو شرعا از روئے فتویٰ لزوم نہیں ہے ۔ عینی شرح بخاری میں ہے : و اختلف العلماء فی الرجل یتزوج امرأة و یشترط لها ان لا یخرجها من دارها او لا یتزوج علیها او لا یتسری او نحو ذلک من الشروط المباحة علی قولین الثانی ان یؤمر الزوج بتقوی الله و الوفاء بالشرط و لا

یحکم علیہ بذلک حکما و ان ابی الا الخروج لھا کان احق الناس باھلہ الیہ ذھب عطاء و الشعبی و سعید بن المسیب و النخعی و الحسن و ابن سیرین و ربیعۃ و ابو الزناد و قتادۃ و ھو قول مالک و ابی حنیفۃ و اللیث و النووی و الشافعی رحمھم اللہ تعالیٰ ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ ہندہ حسب شریعت و عرف بلد اپنے ہمسروں کی طرح نفقہ لینے کی مستحق ہے ۔ تو ایسی حالت میں زید کیلئے اپنی دادی کو اور در صورت عقد ثانی دوسری زوجہ کو نفقہ دینے کیلئے شرعاً کوئی امر مانع نہیں ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ ایک شخص نے ایک عورت سے اپنا عقد کیا ۔ اور چند سال بعد ایک دوسرے شہر میں جاکر دوسری عورت سے عقد کیا ۔ اور بلا سبب پہلی عورت کے پاس آنا جانا بند کرکے نان و پارچہ و دیگر ضروریات کی مد بھی چھوڑدی ۔ باوجودیکہ وہ مالدار ہے اور آنے جانے سے کوئی قانونی و شرعی مزاحمت اور روک ٹوک نہیں ہے ۔ عورت نے ہر چند بذریعہ خطوط اپنی پرورش اور اس کے آنے جانے کے واسطے کوشش کی لیکن وہ کسی خط کا جواب نہیں دیتا ۔ پانچ برس سے زیادہ شوہر کی علیحدگی کو گذر چکے ہیں ۔ اب عورت بالکل مایوس ہے ۔ ایسی حالت میں عورت کو شرعاً کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے کہ اس کو شوہر سے نجات مل جائے اور دوسرا عقد کرسکے ؟ بدلائل اس کا جواب مرحمت فرمایا جائے ۔

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی جو شخص کہ غائب ہو اور باوجود مالدار ہونے کے اپنی زوجہ کو نفقہ نہ دے ۔ تو ایسی حالت میں زوجہ کی تفریق کروانے کا قاضی یعنی حاکم عدالت کو حق نہیں ہے ۔ فتاویٰ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۹۷۳ میں ہے : (و لا یفرق بینھما بعجزہ عنھا و لا بعدم ایفائہ) لو غائبا (حقھا و لو مؤسرا) ۔ بلکہ زوجہ کو چاہئے کہ حاکم کے پاس درخواست پیش کرے ۔ اگر یہاں اس کی کوئی جائداد یا مال کسی کے پاس ہے تو حاکم کو چاہئے کہ بعد ثبوتِ زوجیت زوج کے مال سے زوجہ کو نفقہ دلائے ۔ فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ ۵۵۰ میں ہے : قال زفر رحمہ اللہ یسمع بینتھا و لا یقضی بالنکاح و تعطی النفقۃ من مال الزوج ان کان لہ مال و لا تؤمر بالاستدانۃ و بہ قالت الثلاثۃ و علیہ عمل القضاۃ الیوم و بہ یفتی کذا فی العینی شرح کنز ۔ نیز فتاویٰ عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۵۴۹ سطر ۲۴ میں ہے : و اذا غاب الرجل و لہ مال فی ید رجل یعترف بہ و بالزوجیۃ فرض القاضی فی ذلک المال نفقۃ الزوجۃ الغائب ۔ فتاویٰ حامدیہ صفحہ ۶۹ میں ہے : سئل فی رجل سافر من دمشق الی مصر و ترک زوجتہ بلا نفقۃ و لا منفق و لہ مال بذمۃ جماعۃ مقرین بہ و الزوجیۃ من جنس حقھا فھل یفرض لھا القاضی نفقۃ من مالہ المزبور؟ الجواب : نعم حیث کان الامر کذلک و یحلفھا القاضی انہ لم یعطھا النفقۃ و یأخذ منھا کفیلا کذا فی الملتقیٰ و التنویر و غیرھما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اگر یہاں زوج کی کوئی جائداد اور مال نہیں ہے تو اس وقت حاکم کو چاہئے کہ بعد ثبوت زوجیت و عدم طلاق و نافرمانی وغیرہ اس کے نفقہ کے موافق کسی سے قرض لینے کیلئے حکم کرے اور زوج کے حاضر ہونے کے بعد اسی قدر قرضہ قرض خواہ کو زوج سے اداء کروایا جائے ۔ فتاوی مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۴۲۶ میں ہے : للقاضی ان یفرض النفقة لزوجة الغائب مدة سفر حیث ترکها بلا نفقة و لا منفق و یامرها بالاستدانة لترجع علی الزوج اذا حضر بعد تحلیفها ان الغائب لم یعطها النفقة و لا کانت ناشزة و لا مطلقة مضت عدتها و اقامتها بینة علی النکاح ان لم یکن القاضی عالما به و تقبل البینة للقضاء بالنفقة لا بالنکاح و هذا علی قول زفر رحمه الله و هو المفتی به ۔ اور اگر زوج تنگدست ہو اور خود حاضر ہوکر طلاق دینے سے انکار کرے تو ایسی صورت میں فقہاء احناف نے بہ بناء ضرورت شافعی المذہب قاضی سے تفریق کے متعلق فتوی لینے کی اجازت دی ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زوج غائب اور مالدار ہے اس لئے زوجہ کو چاہئے کہ نفقہ کے موافق کسی سے قرضہ دلانے کے متعلق قاضی یا حاکم عدالت کے پاس دعویٰ پیش کرے ۔ البتہ مطالبۂ قرضہ کے وقت حاکم عدالت زوج کے نام اس کے مقام اور سکونت پر ڈگری روانہ کرسکتا ہے جس کی تعمیل شرعاً حاکم عدالتِ مقام مذکور پر لازمی ہے ۔ جیسا کہ ہدایہ اخیرین کے صفحہ ۱۲۸ میں مذکور ہے : و یقبل کتاب القاضی الیٰ القاضی فی الحقوق ۔ پس زوجہ کو ایسی حالت میں بدون طریقہ مذکورہ اختیار کرنے یا پھر زوج سے طلاق لینے کے، تفریق کی کوئی صورت نہیں ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

علمائے شرع متین مندرجہ مسائل میں کیا فرماتے ہیں :

۱ ۔ زوجہ کا کھانا اور کپڑا مرد پر شرعاً واجب ہے یا نہیں ؟

۲۔ زوجہ کو خاوند کے گھر پریشانی و تکلیف ہو تو زوجہ جہاں رہتی ہے وہاں جانا شوہر پر واجب ہے یا نہیں؟

۳ ۔ زوجہ کو بےاجازت شوہر کے اپنی ماں اور ماموں وغیرہ محرموں سے ملنے کا حق ہے یا نہیں ؟ بصورت حق ہونے کے اگر شوہر ملنے ملانے سے بند رکھتا ہے تو اس کا بند رکھنا جائز ہے یا نہیں ؟

بحوالہ کتب معتبرہ جواب مرقوم ہو ۔

الجواب

۱۔ زوجہ کا کھانا ، کپڑا اور مکان جس کو شرع میں نفقہ کہتے ہیں زوج پر واجب ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار شامی جلد ۲ صفحہ ۶۶۱ میں ہے : (هی الطعام و الکسوة و السکنی فتجب للزوجة علیٰ زوجها) ۔

۲۔ خاوند پر واجب ہے کہ زوجہ کو اپنے اور اس کے عزیز و اقارب سے علیحدہ مکان میں رکھے ، در صورت اس طرح نہ رکھنے کے اگر زوجہ اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے تو وہ شرعاً نافرمان نہیں ہے بلکہ وہ حق پر گئی ہے اس لئے زوج پر اس کا نفقہ اسی مقام میں پہنچانا لازم ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۱ صفحہ ۴۲۶ میں ہے : و

یجب علی الزوج اسکان زوجتہ مسکنا شرعیا و ھو الخالی عن اھلہ و اھلھا فلا یکون المسکن الذی فیہ اھلہ شرعیا حیث لم تکن منفردۃ فیہ بمرافق و غلق علیحدۃ و بامتناعھا من السکنی فیما ذکر لا تعد ناشزۃ و لو لم یتحقق الضرر منھم مع الاختلاط فتجب لھا النفقۃ مع امتناعھا من السکنی معھم علی ھذا الوجہ و لو سکنت فی بیت اھلھا فیفرضھا القاضی لان امتناعھا بحق و الحال ھذہ ۔
پس صورت مسئولہ میں جبکہ اس کو تکلیف ہے تو بدرجہ اولیٰ اس کا علیحدہ رہنا مناسب اور موافق شریعت ہے اور ایسے وقت میں جبکہ نفقہ بھی اس کو بحکم قاضی دلایا جارہا ہے تو خاوند کو بھی بیتوتت یعنی رات کو رہنے کیلئے جانا چاہئے کیونکہ خاوند پر زوجہ کو "محصنہ" رکھنا واجب ہے ۔ تحصین کے یہ معنی ہیں کہ عورت کی خواہش جنسی پوری کردی جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے دل میں شہوت کی زیادتی اور خاوند کے مقاربت نہ کرنے کی وجہ سے دوسرے مرد کی خواہش پیدا ہو اور عاصمہ کی حد سے نکلکر زانیہ بن جائے ۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ خاوند پر لازم ہے کہ چوتھے دن اپنی زوجہ سے مقاربت کیا کرے اور اگر اس میں کمی یا زیادتی کی ضرورت ہے تو حسب ضرورت تاخیر و تاجیل کرسکتا ہے ۔ چنانچہ احیاء العلوم کی جلد ۲ صفحہ ۳۳ میں ہے : و ینبغی ان یأتیھا فی کل اربع لیال مرۃ فھو اعدل اذ عدد النساء اربعۃ فجاز التأخیر الیٰ ھذا الحد نعم ینبغی ان یزید او ینقص بحسب حاجتھا فی التحصین فان تحصینھا واجب علیہ و ان کان لا یثبت المطالبۃ بالوطیٔ فذلک یعتبر المطالبۃ و الوفاء بھا ۔ بلکہ اگر مرد تحصین قائم کرنے کی نیت سے زوجہ کے ساتھ مقاربت کیا کرے تو شرعاً ثواب اخروی کا مستحق ہے ، چنانچہ رد محتار جلد ۲ صفحہ ۲۲۸ کتاب النکاح میں ہے : (قولہ و یثاب ان نوی تحصینا) ای منع نفسہ و نفسھا عن الحرام ۔

۴۔ عورت کو اپنے والدین و دیگر محرموں سے زوج کی اجازت کے بغیر ملنے اور ان کے گھر جانے کا حق حاصل ہے ، چنانچہ صاحب رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۸۲ میں بحر کی عبارت نقل کرتے ہیں : فی البحر انہ الصحیح المفتیٰ بہ من انھا تخرج للوالدین کل جمعۃ باذنہ و بدونہ و للمحارم فی کل سنۃ باذنہ و بدونہ ۔ مگر اس کو یہ حق اس وقت حاصل ہے جبکہ والدین و دیگر محارم اس کے پاس بوجہ پیری وغیرہ نہیں آسکتے ہوں ۔ اور اگر وہ خود آسکتے ہوں تو ایسی صورت میں صاحب رد المحتار ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق عورت کے نہ جانے کو مذہب حق تحریر فرماتے ہیں ۔ کیونکہ عورت کے بار بار جانے میں فتنہ کا دروازہ کھل جاتا ہے اور خصوصا جبکہ عورت جوان ہو تو اور بھی اندیشہ کا محل ہے ، چنانچہ اسی بناء پر صاحب رد المحتار کی یہی رائے ہے کہ عورت والدین سے ہر جمعہ کو (یعنی ہفتہ میں ایک بار) نہ ملا کرے ، بلکہ خاوند کو یہ چاہئے کہ موقعہ موقعہ پر جب کبھی جانے کی ضرورت محسوس ہو اجازت دیتا جائے ۔ چنانچہ رد المحتار میں صفحہ ۶۸۲ میں ہے : و عن ابی یوسف رحمہ اللہ فی النوادر تقیید خروجھا بان لا یقدرا علی اتیانھا فان قدرا لا تذھب و ھو حسن ۔ پھر اس کے آگے ایک سطر بعد لکھا ہے : و الحق الاخذ بقول ابی یوسف رحمہ اللہ اذا کان الأبوان بالصفۃ التی ذکرت و الا ینبغی ان یأذن لھا فی زیارتھما فی الحین بعد الحین علی قدر متعارف اما فی کل جمعۃ فھو بعید فان فی کثرۃ الخروج فتح باب

الفتنۃ خصوصا اذا کانت شابۃ و الزوج من ذوی الھیئات بخلاف خروج الابوین فانہ ایسر ۔

الاستفتاء

۱ ۔ ہندہ اپنے شوہر کی سخت گیری اور اس کے ناجائز مظالم سے ناراض ہوکر کسی حیلہ سے بدرضامندی شوہر اپنی بہن کے گھر گئی ، اور پھر بخیال انتقام دفع مظالم وغیرہ خاوند کے گھر جانے سے ناراض ہے ۔ ایسی صورت میں کیا وہ نان و نفقہ اپنی بہن کے گھر پانے کی مستحق ہے یا نہیں ؟

۲ ۔ کیا وہ ایسی صورت میں اپنے مہر کی نالش کرسکتی ہے اور مہر پانے کی مستحق ہے یا نہیں ؟ خاوند نے علانیہ یہ الفاظ یعنی " حرامزادی ناک کاٹ ڈالونگا " کہے ۔ اس کی نسبت شرع سے کیا تدارک ہوسکتا ہے ؟

۳ ۔ جو زیور کہ اس کے جسم پر تھا ہنگامہ کرکے بلا رضامندی خاوند چھین لے گیا ہے ۔ کیا وہ زیور زوجہ کو واپس مل سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

۱۔ زوجہ اگر اپنے خاوند کے گھر سے اس کے ناجائز مظالم و ایذاء رسانی کی وجہ سے اپنے اہل میں چلی جائے تو شرعا اس کو ناشزہ یعنی نافرمان نہیں کہا جاتا ۔ ایسی صورت حال میں زوجہ کو چاہئے کہ حاکم کے پاس فریاد کرے اور حاکم کو چاہئے کہ زوج کو تنبیہ کرے اور معاشرہ حسنہ یعنی نیک چلنی سے رہنے کے متعلق خدا کا خوف دلائے ، اور ناحق مار پیٹ سے اس کو منع کرے ۔ اگر زوج ان امور پر عند القاضی اقرار کرلے اور اس کے بعد زوجہ اس کے پاس جانے سے بلا وجہ انکار کرے تو ایسی صورت میں ناشزہ یعنی نافرمان سمجھی جائیگی جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ کی عبارت ذیل سے مفہوم ہوتا ہے : سئل فی امرأۃ خرجت من بیت زوجھا بسبب اضرار زوجھا لھا و ایذائہ لھا الایذاء الکلی و ضربہ لھا فھل یؤمر بحسن المعاشرۃ معھا بتقویٰ اللّٰہ العلی العظیم و یمنع عن ضربھا بغیر حق و اساءتھا و اذا طلبھا بعد ذلک و امتنعت عنہ بغیر حق یکون ناشزۃ ؟ اجاب : نعم یؤمر بحسن معاشرتھا و تؤمر بطاعتہ ۔ و اللّٰہ اعلم ۔ پس جبکہ زوجہ ، زوج کے مکان سے بدون اپنے قصور کے زوج کے ستانے اور اذیت دینے سے گئی ہے تو شرعا اس کا نفقہ تا تنبیہ و ہدایت زوج پر واجب ہے ۔ ہدایہ مجتبائی کے صفحہ ۳۲۷ میں مذکور ہے : و کل فرقۃ جاءت من قبل المرأۃ بمعصیۃ مثل الردۃ و تقبیل ابن الزوج فلا نفقۃ لھا و بخلاف ما اذا جاءت الفرقۃ من قبلھا بغیر معصیۃ کخیار العتق و خیار البلوغ و التفریق لعدم الکفاءۃ لأنھا حبست نفسھا بحق و ذلک لا یسقط النفقۃ کما اذا حبست نفسھا لاستیفاء المھر ۔

۲۔ زوجہ ایسی حالت میں بے شک مہر پانے کی مستحق ہے ، کیونکہ مہر شرعا زوجہ کے مرتد ہونے یا ابن زوج کا بوسہ لینے سے باطل ہوتا ہے ، اور یہاں یہ صورتیں پائی نہیں جاتیں ۔ زوج نے زوجہ کو حرامزادی جو کہا ہے شرعا تعزیر کا مستحق ہے ، شرح وقایہ مطبوعہ نور علی صفحہ ۱۶۸ میں مرقوم ہے : و من قذف مسلماً بیا فاسق او بیا حرام زادہ عُزِّر ۔ اسی طرح سے کنز وغیرہ دیگر کتب فقہ میں ہے ۔ تعزیر کی کیفیت کہ کس طرح کی جائے ؟

یہ حاکم کی رائے پر رکھی گئی ہے کہ جس حیثیت کا آدمی ہے اسی طرح اس کی تعزیر کی جائے۔ فتاویٰ الدر المختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۱۸۴ میں مرقوم ہے: (و) التعزیر (لیس فیه تقدیر بل هو مفوض الیٰ رأی القاضی) و علیه مشایخنا۔ زیلعی لأن المقصود منه الزجر و احوال الناس فیه مختلفة؛ بحر۔

۴۔ جو زیور کہ زوجہ سے چھین لیا گیا ہے اگر وہ زوج کا ذاتی ہے اور اس نے زوجہ کو ہبہ یا بمعاوضہ مہر نہیں دیا تھا تو وہ زوج کی ملک ہے اس میں زوجہ کا کوئی حق نہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو زوجہ کا ہے۔ عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۳۲۷ میں مسطور ہے: اذا بعث الزوج الی اهل زوجته اشیاء عند زفافها منها دیباج و لما زفت الیه اراد ان یسترد من المرأة الدیباج لیس له ذلک اذا بعث الیها علی وجه التملیک کذا فی الفصول العمادیة۔ مثلاً زوجہ کے ماں باپ نے جہیز میں دیا تھا یا زوج نے بطور ھبہ یا چڑھاوا دیا تھا تو ایسی صورت میں زوجہ کی ملک ہے اس میں زوج کا کوئی حق نہیں۔ زوج کا زوجہ کی ناراضی سے بغیر حق قبضہ کرلینا غصب ہے اور زوجہ اس کے واپس لینے کی مستحق ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کا دعویٰ یہ ہے کہ بغرض زیارت و ملاقات اپنی لڑکی کو داماد کے پاس سے اپنے مکان کو بلائے۔ اور ہندہ کا داماد کہتا ہے کہ حسب شرع شریف وہ خود آکر میرے مکان پر زیارت و ملاقات کرے۔ ہندہ کے مکان کو روانہ کرنے میں کئی نقصان ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس کا مکان ذاتی نہیں ہے اور جہاں وہ رہتی ہے صحبت اچھی نہیں ہے۔ پس ایسی حالت میں عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب

در صورت صدق بیان مستفتی شرعاً زوجہ کو ماں باپ سے ہر جمعہ میں (ہفتہ میں ایک بار) ملنے کی اس وقت اجازت دی گئی ہے جبکہ والدین اس کے پاس آنے کی طاقت و قدرت نہیں رکھتے ہوں۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۸۲ میں ہے: و لا یمنعها من الخروج الی الوالدین فی کل جمعة ان لم یقدرا علی اتیانها علی ما اختاره فی الاختیار۔ اور جبکہ والدین خود آسکتے ہیں تو زوجہ کو ان کے وہاں جانے کی ضرورت نہیں، چنانچہ رد المحتار کے اسی صفحہ میں ہے: نعم ما ذکر الشارح اختاره فی فتح القدیر حیث قال و عن ابی یوسف فی النوادر تقیید خروجها بان لا یقدرا علی اتیانها فان قدرا لا تذهب و هو حسن۔ اور صاحب رد المحتار، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو حق بتاتے ہوئے اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ ہر جمعہ میں زوجہ کے باہر نکلنے سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے اور خصوصاً جبکہ عورت جوان ہو تو اور بھی محل فساد ہے۔ ایسی حالت میں زوج اس کو موقعہ موقعہ پر عرف بلد کے موافق اس صورت میں اجازت دے جبکہ والدین اس کے پاس آنے کی طاقت نہیں رکھتے ہوں، کیونکہ والدین کا اس کے پاس آنا آسان ہے اور باعث فساد نہیں ہے، جیسا کہ اس کے ان کے پاس جانے میں فتنہ کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۸۲ میں ہے: و الحق الأخذ بقول ابی یوسف رحمه الله اذا کان

الابوان بالصفة التي ذكرت و الا ينبغي ان يأذن لها في زيارتهما في الحين بعد الحين على قدر متعارف اما في كل جمعة فهو بعيد فان في كثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصا اذا كانت شابة و الزوج من ذوي الهيئات بخلاف خروج الأبوين فانه أيسر - پس صورت مسئولہ میں جبکہ ہندہ جہاں رہتی ہے اگر وہ مقام مناسب نہیں ہے اور وہاں کی صحبت ٹھیک نہیں ہے تو زوج کو حق حاصل ہے کہ زوجہ کو وہاں جانے سے منع کرے ۔ مناسب موقعہ دیکھکر اجازت دینے کی اس وقت ضرورت ہے جبکہ والدین کو یہاں آنے کی طاقت و قدرت نہ ہو ، اور قدرت ہونے کی صورت میں اجازت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ کی تجہیز و تکفین زوجہ کے مالدار ہونے کی صورت میں آیا اس کے ذاتی مال سے کی جائے ؟ یا زوج کے ذمہ واجب ہے ؟

الجواب

شرعا زوجہ مالدار ہی کیوں نہ ہو اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف زوج کے ذمہ واجب ہیں ، اور یہ قاعدہ کلیہ بتلایا گیا ہے کہ زندگی میں جس پر نفقہ واجب ہے مرنے کے بعد اس پر تجہیز و تکفین بھی واجب ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۰۶ میں ہے : و اختلف في الزوج و الفتوى على وجوب كفنها عليه و ان تركت مالا - اور رد مختار کے اسی صفحہ ۶۰۶ میں ہے : و الاصل فيه ان من يجبر على نفقته في حياته يجبر عليها بعد موته - و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اگر بلا اجازت زوج کے ، زوج کی والدہ سے پوچھکر اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے تو کیا شرعا نکاح سے خارج ہو گئی ؟ اور اس کا مہر باطل ہو گیا یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کے ، خاوند کے گھر سے بلا اجازت و بدون حق شرعی باہر جانے کو نشوز کہتے ہیں ۔ اور ناشزہ نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے ۔ فتاوی انقرویہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۱ کے حاشیہ فتاوی ابن نجیم سے منقول ہے : سئل عن النشوز و اسقاط النفقة و الكسوة اجاب هو الخروج عن محل الزوج بلا اذنه بغير حق ، من فتاوي ابن نجيم في النفقة - اور اسی جلد کے صفحہ ۱۱۳ میں ہے : و لو نشزت في حال قيام النكاح من كل وجه لم تكن لها النفقة و السكنى فكذا اذا نشزت في حال قيام النكاح من وجه من المحل المزبور

شرعاً ناشزہ عورت کا نہ تو نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ وہ مہر سے محروم کی جاتی ہے ۔ البتہ مرتدہ ہوجائے یا اپنے سوتیلے لڑکے کا شہوت سے بوسہ لے تو اس وقت مہر ساقط ہوجاتا ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۹ سطر ۳ میں ہے : و افاد ان المھر وجب بنفس العقد لکن مع احتمال مقوطہ بردتھا او تقبیلھا ابنہ او تنصیفہ بطلاقھا قبل الدخول ۔ صورت مسئول میں اگر زوجہ بر بنائے ضرورت بلا اجازت خاوند کے والدین کے گھر گئی ہے تو یہ ناشزہ نہیں ہوسکتی کیونکہ زوجہ کو بہ وقت ضرورت بلا اجازت خاوند کے والدین سے ملنے کی اجازت دی گئی ہے ؛ فتاوی البحر الرائق کی جلد ۴ مطبوعہ مصر سطر ۱۵ صفحہ ۲۱۲ میں ہے ، فعلیٰ الصحیح المفتیٰ بہ تخرج للوالدین فی کل جمعۃ باذنہ و بغیر اذنہ و لزیارۃ المحارم فی کل سنۃ مرۃ باذنہ و بغیر اذنہ ۔ پس اس وقت زوجہ کا نہ نکاح فاسد ہوا اور نہ مہر ساقط ہوتا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نابالغہ کا نکاح خالد نابالغ سے بولایت والدین ہوا ۔ اب بغیر خلوت صحیحہ کے ہندہ بحالت نابالغی فوت ہوئی ، ہندہ کا والد خالد کے والد سے ہندہ کے مہر کا مطالبہ کررہا ہے کیونکہ خالد نابالغ اور نادار ہے ، اور خالد کا والد مالدار ہے ۔ پس ہندہ کے والد کا یہ مطالبہ شرعا درست ہے یا نہیں ؟ بحوالۂ کتبِ حنفیہ جواب عطاء ہو ۔

الجواب

ہندہ اگرچہ بدون خلوت صحیحہ کے فوت ہوئی ہے مگر ہندہ کا پورا مہر خالد کے ذمہ واجب الاداء ہے کیونکہ شرعا احد الزوجین کی وفات سے بھی مہر کامل واجب ہوجاتا ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۹ باب المہر میں ہے : و یتأکد (عند وطئ و خلوۃ صحت) من الزوج (او موت احد) ۔ چونکہ خالد نادار اور مفلس ہے اس لئے اس کی زوجہ کے مہر کا مطالبہ اس کے والد سے کرنا شرعا ناجائز ہے ، اگر بوقت نکاح خالد کا والد ہندہ کے مہر کا ضامن و ذمہ دار ہوا ہے تو ایسی حالت میں ہندہ کے والد کو خالد کے والد سے مہر کے مطالبہ کا حق حاصل ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۶۹ باب المہر میں ہے : و لا یطالب الأب بمھر ابنہ الصغیر الفقیر الا اذا ضمنہ ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۹۵ باب المہر میں ہے : لا یجبر اب الزوج الصغیر علی دفع صداق زوجۃ ابنہ المذکور من مال نفسہ بدون کفالۃ شرعیۃ ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہکر شوہر سے نفقہ لے سکتی ہے یا نہیں ؟ اور اگر بیمار ہوجائے تو طبیب کی فیس اور دواء کے اخراجات شوہر کے ذمہ ہونگے یا والدین کے ؟

الجواب

شوہر نے اگر نفقہ دینے کے وعدہ سے زوجہ کو ماں باپ کے گھر میں چھوڑا ہے تو شوہر پر زوجہ کا نفقہ لازم ہے ، اور اگر زوجہ بلا وجہ شرعی شوہر کی مرضی کے خلاف اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھی ہے تو زوج پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : و لو هي في بيت ابيها اذا لم يطالبها الزوج بالنقلة به يفتي ۔ اسی باب میں ہے : و خارجة من بيته بغير حق و هي الناشزة حتى تعود ۔

زوجہ کی دواء کا خرچ اور طبیب کی فیس شوہر پر لازم نہیں ہے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : كما لا يلزم مداواتها ۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے : اى اتيانه بدواء المرض و لا اجرة الطبيب و لا الفصد و لا الحجامة ۔ هندية عن السراج ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا ۔ ہندہ کو ایک شیر خوار فرزند ہے ۔ ہندہ بوجہ افلاس و تنگدستی بچہ کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے کے مصارف بچہ کے دادا سے طلب کرتی ہے اور دادا مالدار بھی ہے ۔ کیا شرعاً ہندہ کو ایسا حق حاصل ہے ؟

الجواب

باپ کے انتقال کے بعد جبکہ بچہ مالدار نہ ہو اور اس کے سرپرستوں میں دادا اور ماں ہوں تو اس کی پرورش ان دونوں کے ذمہ رہے گی اس طرح کہ اس کے مصارف کے تین حصہ کئے جائیں ، ایک حصہ ماں اداء کرے اور دو حصے دادا سے لئے جائیں ۔ پس صورت مسئولہ میں اجنبی انّا بچہ کو دودھ پلانے کے لئے جس قدر ماہوار لیتی ہے اور بچہ کے لباس وغیرہ میں جو کچھ صرف ہوگا اس مجموعہ کا تیسرا حصہ ماں کے ذمہ رہے گا ، باقی دو حصے دادا سے وصول کرکے ماں کو دیئے جائیں گے ۔ در مختار کے باب النفقہ میں ہے : و في الخانية له ام و ابو اب فكارثهما ۔ رد المحتار میں ہے : اى اثلاثا لأن كُلّاً منهما وارث ۔ رد المحتار میں دوسری جگہ ہے : ففي ام و جد لاب تجب عليهما اثلاثا في ظاهر الرواية ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کو جذام ہوگیا ہے ۔ شوہر اس سے نفرت کرتا ہے اور نفقہ نہیں دیتا ، کیا ایسی حالت میں ہندہ نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے ؟ اور کیا نکاح فسخ ہوجائے گا ؟

الجواب

زوجہ مرض کی وجہ سے نفقۂ شرعیہ سے محروم نہیں ہوسکتی ۔ اور نہ دونوں کو یہ حق ہے کہ مرض کی وجہ

سے فسخ نکاح کریں ۔ عالمگیری جلد ۱ کتاب النکاح باب النفقہ میں ہے : المرأۃ اذا کانت رتقاء او قرناء او صارت مجنونۃ او اصابہا بلاء یمنع من الجماع او کبرت حتی لا یمکن وطؤھا بحکم کبرھا کان لہا النفقۃ سواء اصابتہا ھذہ العوارض بعد ما انتقلت الی بیت الزوج او قبل ذلک اذا لم تکن مانعۃ بغیر حق کذا فی المحیط ۔ و ان نقلت و ھی صحیحۃ ثم مرضت فی بیت الزوج مرضا لا تستطیع معہ الجماع لم تبطل نفقتہا بلا خلاف کذا فی البدائع ۔ رد المحتار جلد ۲ کتاب النکاح باب العنین میں ہے : و لا یتخیر احد الزوجین بعیب الآخر فاحشا کجنون و جذام و برص و رتق و قرن ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے انتقال کے بعد اس کی منکوحہ کا نفقہ زید کی دوسری زوجہ کی اولاد پر لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب

باپ کے انتقال کے بعد اس کی منکوحہ یعنی علاتی ماں کا نفقہ اولاد پر لازم نہیں ہے ۔ اگر باپ زندہ اور تنگدست ہوتا اور اس کو خدمت کیلئے ایک خادمہ کی ضرورت ہوتی تو اس وقت اولاد پر لازم ہوتا کہ خادمہ کی حیثیت سے علاتی ماں کا نفقہ اداء کریں ۔ بدائع صنائع جلد ۴ صفحہ ۳۲ فصل نفقۃ الاقارب میں ہے : و لا تجب علی الابن نفقۃ منکوحۃ ابیہ لأنہا اجنبیۃ عنہ الا ان یکون الاب محتاجا الی من یخدمہ فحینئذ یجب علیہ نفقۃ امرأۃ الأب لأنہ یؤمر بخدمۃ الأب بنفسہ او بالأجیر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد کا انتقال ہوا ، اور اس نے ایک زوجہ فاطمہ اور شعیب فرزندِ خورد چھوڑا ، خالد کا باپ ولید بھی موجود ہے ، شعیب فرزند زید کا نفقہ کس پر لازم ہے ؟

الجواب

شعیب کا نفقہ دو حصے اس کے دادا ولید کے ذمہ ہوگا اور ایک حصہ والدہ فاطمہ کے ذمہ ہوگا ۔ رد محتار جلد ۲ باب النفقہ میں ہے : اذا مات الأب فالنفقۃ علی الأم و الجد علی قدر میراثہما اثلاثا فی ظاھر الروایۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر کے انتقال کے بعد زوجہ کا نفقہ کیا شوہر کے ورثاء کے ذمہ ہے یا نہیں ؟

الجواب

شوہر کے انتقال کے بعد زوجہ کا نفقہ شوہر کے ورثاء کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ زوجہ کے ورثاء پر ہے۔ اگر زوجہ کے ورثاء یعنی عزیز و اقارب نہیں ہیں تو بیت المال سے اس کا نفقہ دیا جائے۔ عالمگیری جلد ۱ باب النفقہ فصل خامس میں ہے: و النفقة لكل ذي رحم محرم اذا كان صغيرا فقيرا او كانت امرأة بالغة فقيرة او كان ذكرا فقيرا زمنا او اعمىٰ و يجب ذلك علىٰ قدر الميراث و يجبر عليه كذا في الهداية۔ اس کے کچھ بعد ہے: و تجب نفقة الاناث الكبار من ذوي الارحام و ان كن صحيحات البدن اذا كان بهن حاجة الى النفقة كذا في الذخيرة۔ رد المحتار جلد ۲ باب العشر مطلب فی بیان بیوت المال میں ہے: و اما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقيط الفقير و الفقراء الذين لا اولياء لهم فيعطي منه نفقتهم و ادويتهم و كفنهم و عقل جنايتهم كما في الزيلعي وغيره و حاصله ان مصرفه العاجزون الفقراء۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شوہر کی وفات کے بعد عدتِ موت ختم ہونے تک زوجہ کا نفقہ کیا شوہر کے متروکہ سے دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب

عدتِ موت کا نفقہ زوج کے مال سے نہیں دیا جائے گا، زوجہ کو چاہئے کہ ختمِ عدت تک خوراک کا انتظام اپنی ذات سے کرلے۔ رد المحتار جلد ۲ باب النفقہ میں ہے: (لا) تجب النفقة بانواعها (لمعتدة موت مطلقا)۔ ہدایہ کے باب النفقہ میں ہے: لا نفقة للمتوفى عنها زوجها لأن احتباسها ليس لحق الزوج۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کِتَابُ الأَیْمَان

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے متعدد کام نہ کرنے کی قسم کھائی۔ پھر وہ سب کام کئے۔ ان سب کا کفارہ ایک ہی ہوگا یا کئی؟

الجواب

ایک ہی کفارہ اخیر میں اداء کردے تو ذمہ سے بری ہوجائے گا۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۵۲ کتاب الایمان میں ہے: و فی البغیة کفارات الایمان اذا کثرت تداخلت و یخرج بالکفارة الواحدة عن عهدة الجمیع و قال شهاب الائمة هذا قول محمد قال صاحب الاصل هو المختار عندی اھ مقدسی۔ مثله فی القهستانی عن المنیة۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے ہاتھ میں قرآن شریف لیکر جھوٹی قسم کھائی۔ کیا اس قسم سے اس شخص کا ایمان گیا اور اس کی نماز و روزہ وغیرہ عبادات قبول نہیں ہوں گی؟ اب اس کو اس گناہ کے دفع کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ اور ایمان کس فعلِ بد کے کرنے سے جاتا ہے؟

الجواب

جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ اگر قسم کھانے والا توبۂ واثق کرلے تو اس سے نجات ہوجاتی ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۳ صفحہ ۳۸ کتاب الایمان میں ہے: (هی غموس) تغمسه فی الاثم ثم فی النار و هی کبیرة مطلقا لکن اثم الکبائر متفاوت۔ نهر (ان حلف علی کذب عمدا کوالله ما فعلت عالما بفعله او کوالله ما له علیّ الفٌ عالما بخلافه و والله انه بکر عالما بانه غیره و یاثم بها) فتلزمه التوبة۔ رد المحتار میں ہے: قوله (فتلزمه التوبة) اذ لا کفارة فی الغموس یرتفع بها الاثم فتعینت التوبة للتخلص منه۔ اہل سنت و جماعت کے پاس گناہ کبیرہ سے ایمان نہیں جاتا۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی لکھنؤ کے صفحہ ۱۸۲ میں ہے: و الکبیرة لا تخرج العبد المؤمن من الایمان و لا تدخله فی الکفر۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی نئی بیوی کا جس سے زید کو بے حد محبت تھی انتقال ہوا ۔ زید اس غم سے کچھ دیر بے ہوش رہا ۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کے اقارب نے کہا کہ ہم اس سے اچھی بیوی بیاہ کر لائیں گے ، تم غم نہ کرنا ۔ زید نے فرط غم میں خدا و رسول صلی اللہ علیہ و سلم کی قسم کھاکر کہا کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا ۔ اس کے بعد اگر وہ شادی کرنا چاہے تو ان قسموں کا کیا کفارہ اداء کرنا پڑے گا ؟

الجواب

جن کاموں کا کرنا ، چھوڑ دینے سے بہتر ہے ، اگر کوئی شخص ان کاموں کے نہ کرنے کی قسم کھائے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ قسم توڑ کر ان کاموں کو کرے اور قسم کا کفارہ اداء کردے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ ردالمحتار مصری جلد ۳ صفحہ ۹۳ کتاب الایمان میں ہے : و حاصله ان المحلوف علیه اما فعل او ترک و کل منهما اما معصیة و هی مسالة المتن او واجب کحلفه لیصلین الظهر الیوم و بره فرض او هو اولیٰ من غیره او غیره اولیٰ منه کحلفه علی ترک وطیٔ زوجته شهرا و نحوه و حنثه اولیٰ او مستویان کحلفه لا یاکل هذا الخبز مثلا و بره اولیٰ ۔ قسم کا کفارہ شریعت میں ایک غلام آزاد کرنا ، یا دس ۱۰ مسکینوں کو صبح و شام پیٹ بھر کھانا کھلانا ، یا صبح و شام یعنی پورے ایک دن کے کھانے کی قیمت دینا ، یا دس ۱۰ مسکینوں کو بدن ڈھکنے کے موافق متوسط لباس دینا ہے ۔ اگر کوئی شخص ان تمام کفاروں سے عاجز ہے تو اس کو چاہئے کہ تین ۳ روز پے در پے روزہ رکھے ، اگر روزوں کے درمیان بھی اس کو کہیں سے روپیہ مل جائے یا ملنے کی قوی امید ہو تو اس پر حسب تفصیل سابق تین چیزوں میں سے ایک چیز واجب ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۹۲ کتاب الایمان میں ہے : (و کفارته تحریر رقبة او اطعام عشرة مساکین) کما مر فی الظهار (او کسوتهم بما) یصلح للاوساط و ینتفع به فوق ثلاثة اشهر و (یستر عامة البدن و ان عجز عنها) کلها (وقت الاداء صام ثلاثة ایام ولاء و) الشرط استمرار العجز الی الفراغ من الصوم فلو صام المعسر یومین ثم) قبیل فراغه و لو بساعة (ایسر) و لو بموت مورثه مؤسرا (لا یجوز نه الصوم) و یستانف بالمال ۔ اور جلد ۲ صفحہ ۵۹۰ باب الکفارۃ میں ہے : او قیمة ذلک و ان غداهم و عشاهم جاز ۔ پس صورت مسئولہ میں قسم کھانے والے کو چاہئے کہ نئی شادی کرلے اور قسم کا کفارہ حسب تفصیل سابق اداء کرے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بحالتِ غضب اپنی زوجہ آمنہ کو کہا کہ " اب سے تمہارے ہاتھ کی روٹی کھاؤں تو سوّر کا گوشت کھانے کے برابر ہے " اور اس وقت یہ یاد نہیں ہے کہ " اب " کہا ، یا " اب سے " ۔ پس ایسی حالت میں زید کے لئے آمنہ کے ہاتھ کی روٹی کھانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر کوئی شخص اپنی قسم میں کسی کام کے کرنے یا کسی چیز کے کھانے کو حرام چیز کے کھانے کے برابر گردانے تو شرعاً یہ قسم نہیں سمجھی جاتی ۔ عالمگیریہ جلد ۲ صفحہ ۵۵ کتاب الیمین میں ہے : و لو قال هو یاکل المیتة ان فعل کذا لا یکون یمینا ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ میرا اس کام کو کرنا شراب و خنزیر کو حلال سمجھنا ہے ۔ شرعاً یہ بھی قسم نہیں ہے ۔ اسی جگہ عالمگیریہ میں ہے : و کذلک اذا قال هو یستحل المیتة او یستحل الخمر و الخنزیر لا یکون یمینا ۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ شریعت میں جو محرمات ایسے ہیں کہ کبھی ان کی حرمت ساقط نہیں ہوتی ، جیسے کہ کفر کسی حالت میں جائز نہیں ہے ۔ اگر کسی کام کے کرنے پر ان اشیاء کے حلال سمجھے جانے کی قسم کھائی جائے تو شرعاً معتبر ہے ۔ اور محرمات شرعی ایسے ہیں کہ بعض اوقات ان کی حرمت ساقط ہوجاتی ہے جیسے شراب و خنزیر کہ مخمصہ کی حالت میں جان بچانے کے لئے اس کی اجازت دی گئی ہے ۔ اگر کسی کام کے کرنے پر ان اشیاء کے حلال سمجھے جانے کی قسم کھائی جائے تو شرعاً یہ قسم نہیں ہے ۔ عالمگیریہ کے اسی صفحہ میں ہے : و الحاصل ان کل شیء هو حرام حرمته مؤبدة بحیث لا تسقط حرمته بحال من الاحوال کالکفر و اشباه ذلک فاستحلاله معلقا بالشرط یکون یمینا ۔ و کل شیء هو حرام بحیث تسقط حرمته بحال کالمیتة و الخمر و اشباه ذلک فاستحلاله معلقا بالشرط لا یکون یمینا کذا فی المحیط ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۵۹ کتاب الیمین میں ہے : و فی البحر ما یباح للضرورة لا یکفر مستحله کدم و خنزیر ۔ رد المحتار میں تحت قول فی البحر لکھا ہے : هو یستحل الدم او لحم الخنزیر ان فعل کذا لا یکون یمینا لان استحلال ذلک لا یکون کفرا لا محالة فانه حالة الضرورة یصیر حلالا ۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے جو اپنی زوجہ کے ہاتھ کی روٹی خنزیر کے گوشت یعنی شئے حرام کے کھانے کے برابر کہا ہے روایتِ سابقہ کے لحاظ سے شرعی قسم نہیں ہے ۔ جس کی پابندی از روئے شرع شریف زید پر واجب نہیں ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب متخاصمین باہم حلف برداری پر راضی ہوں تو حقوق کے متعلق حلف برداری محکمۂ مجاز یعنی عدالت میں قاضی کے روبرو ادا ہونا چاہئے یا جہاں چاہیں حلف اٹھاسکتے ہیں ؟ جاگیردار صاحب موضع دودھ پلی کو عدالتی اختیار اور انصاف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ۔ خود ان کے جزئی و کلی معاملات کا تصفیہ تحصیل متعلقہ و ضلع میں ہوا کرتا ہے ۔ جاگیر دار صاحب کے پاس سرکاری کوئی باضابطہ دفتر بھی نہیں ہے ۔ ایسی حالت میں اگر جاگیردار صاحب کے روبرو کسی سے حلف لیں تو ایسی حلف برداری شرعاً معتبر سمجھی جائے گی یا نہیں ؟ اور قاضی یعنی تحصیلدار صاحب یا تعلقہ دار صاحب جو منجانب سرکار عدالتی مقدمات کی سماعت کے مجاز ہیں ان کے پاس کی حلف برداری معتبر ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

عدالتی مقدمات میں فریقین سے قسم لینے کا مجاز قاضی (حاکم) ہے ایسے شخص کے پاس جسکو سرکار سے عدالتی مقدمات کی سماعت کا حق نہیں دیا گیا فریقین میں سے کسی کا قسم کھانا معتبر نہیں ہے ۔ در مختار کی کتاب الدعویٰ میں ہے : (اصطلحا علی ان یحلف عند غیر قاض و یکون بریئا فهو مع طلب القسم باطل) لان الیمین حق القاضی مع طلب الخصم و لا عبرة لیمین و لا نکول عند غیر القاضی ۔ اس عبارت کے ایک سطر بعد ہے : و نقل المصنف عن القنیة ان التحلیف حق القاضی فما لم یکن باستحلافه لم یعتبر ۔ پس صورت مسئولہ میں جبکہ جاگیردار صاحب کو سرکار سے عدالتی اختیارات نہیں دیے گئے ہیں تو یہ حلف لینے کے مجاز نہیں ہیں ، اور در صورت حلف لینے کے ان کے پاس کی حلف برداری شرعاً درست نہیں ہے ۔ بلکہ تحصیلدار و تعلقہ دار وغیرہ جو منجانب سرکار اس کے مجاز ہیں ان کے پاس حلف ہونا چاہئے اور اسی کا شرع میں لحاظ و اعتبار ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے کسی کام کے کرنے کے لئے قرآن شریف کی قسم کھائی ، اور وہ کام اس سے پورا نہیں ہوسکا ۔ کیا اس پر اس قسم کا کفارہ لازم ہے ؟ اگر ہے تو کیا کفارہ دینا چاہئے ؟ اور کیا قرآن شریف کی قسم شرعی قسم ہے جس کے توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے ؟

الجواب

قسم کا مدار زمانہ کے رواج پر ہے ۔ لوگ جس معظم و محترم چیز کی قسم پر رواج و عادت کرلیں وہ شرعاً قسم سمجھی جائے گی ۔ موجودہ زمانہ میں قرآن شریف کی قسم کا عام طور پر لوگوں میں رواج پڑگیا ہے اس لئے یہ شرعی قسم ہے جس کے توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے ۔ قسم کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے ، اگر یہ نہ ہوسکے تو دس مسکینوں کو ایک دن کی متوسط درجہ کی خوراک دینا یا بدن ڈھانکنے کے موافق کپڑا دینا ہے ، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو تین روزے مسلسل رکھنا ہے ۔ در مختار کی کتاب الایمان میں ہے : و الأیمان مبنیة علی العرف ما یتعارف الناس الحلف به یکون یمینا و ما لا فلا ۔ اسی جگہ رد محتار میں ہے : و لا یخفی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینا ۔ دوسری جگہ رد المحتار میں ہے : و کفارته تحریر رقبة او اطعام عشرة مساکین او کسوتهم لیستر عامة البدن ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی ، اور چند روز کے بعد بیان کیا کہ میں نے جان چھڑانے کے لئے جھوٹی قسم کھائی تھی ۔ کیا اس قسم پر اس کو کفارہ دینا لازم ہے جس سے وہ دروغ حلفی کے گناہ سے نجات پائے ؟

الجواب

جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانے کو " یمین غموس " کہا جاتا ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے ، اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ بلکہ ایسے شخص کو چاہیے کہ توبہ کرے اور خدائے پاک سے یہ عہد واثق کرے کہ آئندہ تا دم زیست پھر کبھی اس فعل کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ در مختار کی کتاب الایمان میں ہے : (و هي غموس) يغمسه في الاثم ثم في النار و هي كبيرة مطلقا لكن اثم الكبائر متفاوت ۔ نهر (ان حلف على كذب عمدا ۔۔۔۔۔ و يأثم بها) فيلزمه التوبة ۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے : (قوله فيلزمه التوبة) اذ لا كفارة في الغموس يرتفع بها الاثم فتعينت التوبة للتخلص منه ۔

و الله اعلم بالصواب و اليه المرجع و المآب ۔

کتاب الحُدُود

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ریاستِ دکن میں قاتل سے جو قصاص لیا جاتا ہے ۔ اس کام پر سرکار کی جانب سے ایک جلاد مقرر ہے ۔ جو نشہ کی حالت میں قاتل کو حد شرعی کے تحت قتل کرتا ہے ۔ چونکہ یہ ایک اسلامی ریاست ہے جس میں مسلمان وغیرہ اقوام کے قاتلوں کا قصاص ایک جلاد کے ہاتھ سے بحالتِ نشہ لیا جانا اور حدود شرعی کا اجراء سخت معیوب ہے !! کیا شرعاً یہ فعل قبیح ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو مسلمان کا اس کام پر مقرر ہونا مناسب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

قاتل سے قصاص لینے کا حق شرعاً مقتول کے ولی کو ہے ۔ عدالت کے فیصلہ کے بعد قاتل ، مقتول کے ولی کے سپرد کردیا جائے تاکہ جس طرح قاتل نے اس کے عزیز کو قتل کرکے اس کے دل کو رنجیدہ کیا ہے وہ بھی اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کرکے اپنا دل ٹھنڈا کرے ، یا پھر شفقت و رحمت سے معاف کردے ۔ جامع المسانید للامام الاعظم جلد دوم باب التاسع و العشرون فی الجنایات میں ہے : ابو حنیفة عن حماد عن ابراھیم ان رجلا من بنی شیبان قتل رجلا نصرانیا من اھل الجزیرة فکتب والی الکوفة الیٰ عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ بذلک فکتب الیہ عمر رضی اللّٰہ عنہ " ادفعہ الی اولیاء القتیل فان شاؤا قتلوہ و ان شاؤا عفوا عنہ " ۔ بدائع صنائع جلد ، صفحہ ۲۴۳ کتاب الجنایات میں ہے : فان کان کبیرا فلہ ان یستوفی القصاص لقولہ تبارک و تعالیٰ " وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا " ۔ چونکہ انسان مختلف الطبع ہیں اور ہر ایک شخص قتل کرنے کی قوت نہیں رکھتا ۔ کوئی کمزور ہوتا ہے اور کسی کا دل قتل کرنے سے خوف کرتا ہے ۔ اس لئے ولی کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ قاتل کو یا تو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعہ کرائے اور خود سامنے رہے کیونکہ ممکن ہے کہ قتل کے وقت ولی کو رحم آجائے اور معاف کردے ۔ بدائع کی اسی جلد کے صفحہ ۲۴۶ میں ہے : و لہ ان یقتل بنفسہ و بنائبہ بان یأمر غیرہ بالقتل اما لضعف بدنہ او لضعف قلبہ او لقلة ھدایتہ الیہ فیحتاج الیٰ الانابة الا انہ لا بدّ من حضورہ عند الاستیفاء لما ذکرنا فیما تقدم ۔ صفحہ ۲۴۳ میں ہے : لا یجوز للوکیل استیفاء القصاص مع غیبة الموکل لاحتمال ان الغائب قد عفا و لان فی اشتراط حضرة الموکل رجاء العفو عنہ معاینة حلول العقوبة بالقاتل ۔ و قد قال اللّٰہ تعالیٰ " وَ اِنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ " ۔ =

اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے تو مسلمان سے اس کا بھی قصاص لیا جاتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۶ کتاب الجنایات باب ثانی میں ہے ، و یُقتَل المسلم بالذمی و یُقتَل الذمی بالذمی کذا فی الکافی ۔ پس جبکہ روایاتِ سابقہ سے ثابت ہے کہ قاتل سے قصاص لینے کا ولی مستحق ہے اور ولی اپنے نائب کے ذریعہ سے بھی قصاص لے سکتا ہے اور مسلمان سے ذمی کا بھی قصاص لیا جاتا ہے ۔ تو صورت مسئولہ میں اگر قاتل مسلمان اور مقتول ذمی ہے تو ضرور قاتل ذمی کے ولی کے حوالہ ہوگا جو کافر ہوگا ۔ اور اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ یا تو خود اپنے ہاتھ سے قصاص لے یا اپنے کسی نائب کے ذریعہ قتل کرائے ۔

بناء بریں ذمیوں کی طرف سے قصاص لینے کے لئے تو موجودہ سرکاری جلّاد قوم چمار کو ہٹانے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہے ۔ اور خصوصاً جبکہ ریاست حیدرآباد میں عام طور پر مقتول کے ولی چاہے کسی قوم کے ہوں خود اپنے ہاتھ سے قصاص نہیں لیتے اور نہ کسی اور کو اپنا نائب مقرر کرتے ہیں ۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار نے انتظاماً جلّاد کا تقرر کردیا ہے ۔ اور ممکن ہے کہ بغرض تذلیل و عبرت ایک ذلیل قوم کے آدمی کو اس کام پر مقرر کیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اس سے نصیحت لے اور ایسی حرکات سے باز آئے ۔ اگر یہی جلّاد مسلمان ولی کی طرف سے بھی مسلمان قاتل کا قصاص لے تو اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے ۔ البتہ حیدرآباد اسلامی ریاست ہونے کے لحاظ سے اگر سرکار کسی مسلمان کو اس کام پر مقرر کرے تو مستحسن ہوگا ۔ کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خود اپنے ہاتھوں سے مجرمین پر حدود شرعیہ جاری فرمایا کرتے تھے ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانہ میں بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے حدود نافذ ہوا کرتے تھے ۔ صحیح بخاری شریف کی کتاب الحدود باب الضرب بالجرید و النعال میں ہے : حدثنا سلیمان بن الحارث حدثنا وھیب بن خالد عن ایوب عن عبد اللّٰہ بن ابی ملیکۃ عن عقبۃ بن الحارث ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم اُتی بنعیمان او بابن نعیمان و ھو سکران فشق علیہ و امر مَن فی البیت ان یضربوہ فضربوہ بالجرید و النعال ۔ اور کتاب المحاربین باب سؤال الامامِ المقرَّ ھل احصنت " میں ہے : قال ابن شھاب اخبرنی من سمع جابرا قال فکنت فیمن رجمہ فرجمناہ بالمصلی فلما اذلقتہ الحجارۃ جمز حتی ادرکناہ بالحرۃ فرجمناہ ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب السیر و الجہاد

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قصبۂ ناندیڑ کے ہنود چار چھ سال سے ایک جدید رسم اختراع کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اپنے ایک دیوتا گنپتی کی سواری پالکی میں بٹھاکر سیواجی کی تصویر کے ساتھ بصد کر و فر و اہتمام، باجے گھمن کے ساتھ بازارات، چوک وغیرہ آبادی میں گشت کرانا چاہتے ہیں۔ اور سرکار اس معاملہ میں مسلمانوں کی رضامندی دریافت کرتی ہے۔ کیا مسلمان از روئے شریعت اس پر راضی ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

بلادِ اسلام کے وہ مقام جہاں مسلمان اس قدر تعداد میں آباد ہیں کہ اگر وہاں کی بڑی مسجد میں مسلمانوں کے وہ افراد جن پر نماز فرض ہے جمع ہوجائیں تو ان کے لئے وہ مسجد ناکافی ہو، تو ایسے مقام شریعت میں "مصر" (شہر) کہے جاتے ہیں۔ در مختار کے باب الجمعۃ میں ہے: المصر و ہو ما لا یسع أکبر مساجدہ اہلہ المکلفین و علیہ فتوی أکثر الفقہاء۔ ایسے مقامات میں اہلِ ذمہ یعنی ہنود وغیرہ غیر مسلمین کو اپنے مذہبی رسوم مندروں، معبدوں و عبادت گاہوں کے باہر ادا کرنے کی شرعا ممانعت ہے۔ اور ان کو اس بات کی اجازت نہیں کہ اپنے دیوتاؤں کو شان و شوکت یا بلا شان و شوکت کے مندر سے باہر نکالیں۔ البتہ آبادی سے تین میل کے فاصلہ پر، یا ان دیہاتوں میں جہاں غیر مسلم کثیر التعداد اور مسلمان معدودے چند ہیں ان کو مذہبی رسوم مندروں سے باہر بھی ادا کرنے کی اجازت ہے۔ عالمگیریہ کی جلد ۲ کتاب الجہاد فصل فی احداث البیع او الکنائس میں ہے: و لیس للنصرانی ان یضرب فی منزلہ بالناقوس فی مصر المسلمین و لا ان یجمع فیہ بھم انما لہ ان یصلی فیہ و لا ان یخرجوا الصلیب او غیر ذلک من کنائسھم و لو رفعوا اصواتھم بقراءۃ الزبور و الانجیل لن کان فیہ اظہار الشرک منعوا عن ذلک۔ و ان لم یقع بذلک اظہار الشرک لا یمنعون و یمنعون عن قراءۃ ذلک فی اسواق المسلمین، و کذا عن بیع الخمور و الخنازیر و عن اظہار الخمور و الخنازیر فی المصر و ما کان فی فناء المصر، و لا بأس باخراج الصلیب و ضرب الناقوس اذا جاوزوا افنیۃ المصر۔ و فی کل قریۃ او موضع لیس من امصار المسلمین فانھم لا یمنعون عن ذلک و ان کان فیہا عدد المسلمین یسکنون فیہا، کذا قال محمد رحمہ اللہ تعالی فی السیر الکبیر۔ واللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ " ہندوستان " خاص کر علاقہ بنگال دار الحرب ہے یا دار الاسلام ؟ اور مسلمانوں کے لئے اس میں مسلمانوں سے یا اہل ذمہ سے سود لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

تین چیزوں سے " دار الاسلام " ، " دار الحرب " بن جاتا ہے ۔ اوّل یہ کہ اس میں اہل شرک کے احکام علانیہ طور پر جاری ہوجائیں اور اہل اسلام کا کوئی حکم نہ چلے ۔ دوسرا یہ کہ دار الاسلام ، دار الحرب سے متصل ہوجائے ۔ تیسرا یہ کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی اپنے سابق امن پر باقی نہ رہے ۔ اگر دار الحرب میں احکام اسلام یعنی جمعہ و عید جاری ہوجائیں تو وہ دار الاسلام بن جاتا ہے اگرچیکہ وہاں کافر بھی باقی ہوں اور وہ دار الاسلام کے متصل بھی نہ ہو ۔ در مختار کی کتاب الجہاد فی استئمان الکافر میں ہے : (لا تصیر دار الإسلام دار الحرب الا) بأمور الثلاثة (باجراء احکام اهل الشرک و باتصالها بدار الحرب و بأن لا يبقى مسلم او ذمی آمنا بالأمان الأول) علی نفسه (و دار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام الإسلام فيها) کجمعة و عيد (و ان بقی فيها کافر اصلی و ان لم تتصل بدار الاسلام) ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله باجراء احکام اهل الشرک) ای علی الاشتهار و ان لا یحکم فيها بحکم اهل الاسلام ۔

اگر کسی شہر میں اہل اسلام و اہل شرک دونوں کے احکام نافذ ہوں تو دار حرب نہیں ہے ۔ رد محتار میں عبارت سابقہ کے متصل ہے : و ظاهره انه لو جريت احكام المسلمين و احكام اهل الشرک لا تکون دار حرب ۔

اور اگر مسلمانوں کے کسی شہر میں مذکورہ بالا تین امور پائے جانے کے باوجود مسلمانوں کو امن دیدیا جائے اور ان پر احکام اسلام نافذ کرنے کیلئے مسلمان قاضیٔ (حاکم) مقرر کردیا جائے تو پھر وہ شہر دار الاسلام بن جاتا ہے ۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے (و فی شرح درر البحار قال بعض المتأخرين اذا تحققت تلک الأمور الثلاثة فی مصر المسلمين ثم حصل لأهله الأمان و نصب فيه قاض مسلم ينفذ احكام المسلمين عاد الی دار الاسلام ۔

پس صورت مسئولہ میں چونکہ تمام ممالکِ ہندوستان میں احکام شرعی جمعہ و عیدین وغیرہ نافذ ہیں ، اور مسلمانوں کو مذہبی رسوم کے اداء کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ، اور نکاح و طلاق و میراث کے قضیئے عدالتوں میں احکام شرعی کے موافق ہوتے ہیں ، اور مسلمانوں کو فرائض اسلام یعنی نماز ، روزہ ، حج ، زکاۃ کی ادائی کے متعلق پوری آزادی حاصل ہے ، بلکہ معاملات یعنی بیع و شراء و رہن وغیرہ کے متعلق بھی اکثر قانون شریعت کے موافق ہے ، اور مسلمانوں کے جان و مال کی کافی حفاظت کی جاتی ہے ۔ اس لئے ہندوستان دار الاسلام ہے ، دار الحرب نہیں ۔

مسلمانوں کیلئے مندرجہ ذیل ۶ مسائل کے سوا باقی تمام صورتوں میں سود حرام ہے : (۱) سید (آقا) اور عبد (غلام) غیر مکاتب کے درمیان جبکہ عبد مقروض مستغرق الدین نہ ہو ۔ (۲) (۳) : شرکتِ مفاوضہ

اور شرکت عنان کے دو شریکوں کے درمیان جبکہ مال کی شراکت سے آپس میں بیوپار کریں۔ (۴): دار الحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان۔ (۵)، دار الحرب میں ان دو مسلمانوں کے درمیان جن میں سے ایک پہلے کافر تھا اور مسلمان ہونے کے بعد دار الاسلام میں بہ نیت ہجرت آکر واپس نہیں گیا۔ (۶): دار الحرب میں ان دو مسلمانوں کے درمیان جو دار الحرب ہی میں مسلمان ہوئے اور بعد اسلام دار الاسلام میں بہ نیت ہجرت آکر واپس نہیں گئے۔ در مختار کی کتاب البیوع باب الربا میں ہے: (و لا ربا بین سیده و عبده) و لو مدبرا لا مکاتبا (اذا لم یکن دینه مستغرقا لرقبته و کسبه، و لا بین متفاوضین و شریکی عنان اذا تبایعا من مالها، و لا بین حربی و مسلم ثمه، و من اسلم فی دار الحرب و لم یهاجر کحربی) فللمسلم الربا معه خلافا لهما لان ماله غیر معصوم فلو هاجر الینا ثم عاد الیهم فلا ربا اتفاقا۔ جوهرة، قلت و منه یعلم حکم من اسلما ثمه و لم یهاجرا۔ و الحاصل ان الربا حرام الا فی هذه الست مسائل۔ پس صورت مسئول میں جبکہ ہندوستان دار الاسلام ہے تو اس کے کسی بھی علاقہ میں مسلمان کے لئے مذکورہ بالا پہلی تین صورتوں کے علاوہ تمام صورتوں میں مسلمانوں سے یا اہل ذمہ سے سود کا لین دین حرام ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

ما قولکم ادیم رفعکم فی رجل عرف الاسلام بقلبه و امکنه النطق بالشهادة و لم ینطق بها خوف التعبیر هل تنفعه هذه المعرفة عند اللہ تعالی ام لا ؟ و ایضا ما الفرق بین المعجزة و الکرامة ؟

الجواب

قال صاحب شرح العقائد النسفیة فی مبحث الإیمان فمن صدق بقلبه و لم یقر بلسانه فهو مؤمن عند اللہ تعالی و ان لم یکن مؤمنا فی احکام الدنیا ففی الصورة المسؤلة ان کان الرجل یصدق بقلبه فهو مؤمن عند اللہ لا عند الناس، و لا یکفی لکونه مؤمنا عند اللہ محض معرفة الاسلام و العلم به۔ قال صاحب شرح المقاصد فی مبحث الإیمان و المذهب انه غیر العلم و المعرفة لان من الکفار من کان یعرف الحق و لا یصدق به عنادا و استکبارا قال اللہ تعالی: "اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ"۔

قال صاحب شرح العقائد النسفیة فی مبحث الرسالة و المعجزة: المعجزة امر یظهر بخلاف العادة علی ید مدعی النبوة عند تحدی المنکرین علی وجه یعجز المنکرین عن الإتیان بمثله۔ و قال فی مبحث الکرامة: و کرامته ای الولی ظهور امر خارق للعادة من قبله غیر مقارن لدعوی النبوة، فما لا یکون مقرونا بالایمان و العمل الصالح یکون استدراجا، و ما یکون مقرونا بدعوی النبوة یکون معجزة۔ و قال فی آخر المبحث: و الحاصل ان الأمر الخارق للعادة

فهو بالنسبة الى النبي عليه السلام معجزة سواء ظهر من قبله او من قبل آحاد امته ، و بالنسبة الى الولي كرامة لخلوه عن دعوى نبوة ممن ظهر ذلك من قبله ، فالنبي لا بد من علمه بكونه نبيا و من قصده اظهار خوارق العادات و من حكمه قطعا بموجب المعجزات ، بخلاف الولي ۔ فتفصيل هذا المقال ظهر لمسائل جواب السوال و الله اعلم بحقيقة الحال ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص رسول و نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ، اور اپنے پر درود بھیجنے کے لئے لوگوں کو کہتا ہے ۔ کیا ایسا شخص شرعا کافر ہے یا مسلم ؟

الجواب

ایسا شخص کافر ہے ۔ عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ کتاب الجہاد میں ہے : و كذلك لو قال انا رسول الله او قال بالفارسية من پیغمبرم يريد به من پیغام می برم يكفر ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص خود کو موحد کہتا ہے اور لا اله الا الله کا قائل ہے ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی رسالت کا اقرار نہیں کرتا ۔ کیا ایسا شخص مسلمان ہے یا نہیں ؟

الجواب

ایسا شخص مسلمان نہیں ہے ، کیونکہ خاتم المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم کی رسالت کا منکر ہے ۔ رد محتار جلد ۳ صفحہ ۳۱۲ کتاب الجہاد باب المرتد میں ہے : فلو قال لا اله الا الله لا يحكم باسلامه لانه منكر الرسالة و لا يمتنع عن هذه المقالة ، و لو قال " اشهد ان محمدا رسول الله " يحكم باسلامه لانه يمتنع عن هذه الشهادة فكان الاقرار بها دليل الايمان ، بدائع ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زندیق ، منافق ، دہریہ اور ملحد میں کیا فرق ہے ؟

الجواب

" زندیق " اس کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لئے شریک جانے اور اس کی حکمتوں کا انکار کرے ، یا اس کے وجود کی نفی کرے ۔ " منافق " وہ ہے جو خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی رسالت کا انکار کرے ۔ اور " دہریہ " وہ ہے کہ جو انکارِ رسالت کے ساتھ حوادثاتِ عالم کی نسبت خدائے پاک کی طرف نہ

کرے بلکہ ان کو زمانہ اور اتفاقات کی طرف منسوب کرے۔ اور " ملحد " وہ ہے جو شریعت مستقیمہ کو چھوڑکر کفر کی کسی جہت کی طرف مائل ہوجائے۔ رد المحتار جلد ۳ کتاب الجهاد باب المرتد صفحہ ۳۲۲ میں ہے: قال العلامة كمال باشا في رسالته: " الزنديق " في لسان العرب: يطلق على من ينفي البارئ تعالىٰ و على من يثبت الشريك و على من ينكر حكمته۔ اس کے بعد ہے: و الفرق بين الزنديق و المنافق و الدهري و الملحد مع الاشتراك في إبطان الكفر ان المنافق غير معترف بنبوة نبينا محمد صلى الله عليه و سلم، و الدهري كذلك مع انكاره اسناد الحوادث الى الصانع المختار سبحانه و تعالى، و الملحد و هو من مال عن الشرع القويم الى جهة من جهات الكفر۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مؤمن گنہگار مرتے دم توبہ کرے تو کیا اس کی توبہ مقبول ہوگی؟ اسی طرح اگر کوئی کافر مرتے دم ایمان لائے تو کیا اس کا ایمان مقبول ہوگا؟

الجواب

مؤمن اگر مرتے دم توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی۔ مگر کافر اگر غرغرہ (نزع) کی حالت میں ایمان لائے تو اس کا یہ ایمان مقبول نہیں ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الجهاد باب المرتد میں ہے: و توبة اليأس مقبولة دون ايمان اليأس۔ رد المحتار میں ہے: و اما ايمان اليأس فمذهب اهل الحق انه لا ينفع عند الغرغرة و لا عند معاينة عذاب الاستئصال۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فرقہ غیر مقلدین مسمیٰ بہ عامل بالحدیث یا " اہل حدیث " سنی مذہب میں داخل ہیں یا خارج؟ سوائے اہل سنت و جماعت کے بہتر (۷۲) فرقوں میں سے کسی فرقہ کا نام سنی ہے یا نہیں؟ فرقۂ عامل بالحدیث یعنی وہابیین اپنے سنی ہونے کا جو دعویٰ کرتے ہیں حق ہے یا باطل؟ مذکورہ بالا فرقہ کی بناء کب پڑی؟ مذکورہ بالا فرقہ نو پیدا کے پیشتر جن مسلمانوں نے مساجد بنائی ہیں اُن کے ارادے کے موافق یہ فرقہ والے ان مساجد میں نماز پڑھنے کے مستحق ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب

صحیحین کی حدیث " عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ " سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک مسلمان پر آں سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم کی سنت اور ان کے خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا (جمے رہنا) واجب و لازم ہے۔ اسی طرح جامع ترمذی کے حدیث صحیح " ان الله لا يجمع امتي على ضلالة، و يد الله على

الجماعۃ مَن شَذَّ شُذَّ فی النار " سے ثابت ہے کہ جس مذہب پر امت کا اجماع ہو وہی مذہب حق ہے ۔ اور جماعت پر خدا کا ہاتھ ہے ۔ اور جو شخص جماعتِ عامہ سے خارج ہو وہ نار میں داخل ہوگا ۔ اور ایک حدیث میں " سواد اعظم " کی اتباع کا حکم بھی آیا ہے ۔ جبکہ حدیث سابق الذکر سے اتباعِ سنت اور بعد والی احادیث سے جماعتِ عامہ یعنی سواد اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم ثابت ہے ۔ تو اس وقت مذاہب اربعہ (یعنی حنفی ۔ شافعی ۔ مالکی ۔ حنبلی ۔ جس پر اجماع امت ہوگیا ہے اور ان میں سے ہر ایک مذہب کے علماء نے ایک دوسرے کی حقانیت پر فتویٰ دیدیا ہے) کے سوائے کوئی اور مذہب حق نہیں ہے ۔ اور چونکہ یہی مذاہب سواد اعظم ہیں اس لئے باجماع امت ان کے مجموعہ کا نام " اهل السنة و الجماعة " رکھا گیا ۔

الاشباہ و النظائر میں ہے : و ما خالف الائمة الاربعة مخالف للإجماع و قد صرح فی التحریر ان الإجماع انعقد علیٰ عدم العمل بمذهب مخالف الاربعة لانضباط مذاهبهم و كثرة اتباعهم ۔

تفسیر احمدی میں ہے : قد وقع الإجماع علی ان الإتباع انما يجوز للاربع فلا يجوز الاتباع لمن حدث مجتهدا مخالفا لهم ۔ اور دوسری جگہ ہے : و ان نضاق ان انحصار المذاهب فی الاربعة و اتباعهم فضل الهی و قبولیته عند الله تعالی لا مجال فی التوجیهات و الاطالة ۔

اور حافظ ابن حجر شافعی نے الفتح المبین فی شرح الاربعین میں لکھا ہے : اما فی زماننا فقال ائمتنا لا يجوز تقليد غير الائمة الاربعة الشافعی و مالک و ابی حنيفة و احمد رضوان الله عليهم اجمعين ۔

اور علامہ ابراہیم بن مرعی مرعی مالکی نے فتوحات وہبیہ میں لکھا ہے : اما فيما بعد ذلک فلا يجوز تقليد غير الائمة الاربعة مالک و ابی حنيفة و الشافعی و احمد رحمهم الله تعالى لأن هؤلاء عرفت قواعد مذاهبهم و استقرت احكامها و خدمها تابعوهم و حرروها فرعا فرعا و حكما حكما ۔

فتاویٰ شامی کی جلد ۳ صفحہ ۳۱۹ خوارج کے بیان میں اس طرح صراحت کی گئی ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں خارجیوں کا ایک فرقہ ابن عبد الوهاب نجدی کا تابع تھا ، جس نے اپنے آپ کو حنبلی مذہب کا ظاہر کیا تھا ۔ مگر اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا میں اس کے سوا کوئی مسلمان نہیں اور اس کے خلاف جتنے اہل مذہب ہیں وہ سب مشرک ہیں ۔ چنانچہ وہ اور اس کے متبعین ، اہل سنت اور ان کے علماء کو قتل کرنا مباح جانتے تھے ۔ اور اسی بنیاد پر انہوں نے صدہا مسلمانوں کی خونریزی کی ۔ اور حرمین شریفین پر قابض ہوگئے ۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر فتح دی جس سے ان کی شان و شوکت ٹوٹ گئی اور ان کے شہر ویران ہوگئے ۔

ھکذا عبارتہ : و الا فيكفی فيهم اعتقادهم كفر من خرجوا عليه كما وقع فی زماننا فی اتباع ابن عبد الوهاب الذين خرجوا من نجد و تغلبوا علی الحرمين و كانوا ينتحلون مذهب الحنابلة لكنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون و ان من خالف اعتقادهم مشركون ، اباحوا بذلک قتل اهل السنة و قتل علمائهم ، حتى كسر الله شوكتهم و خرب بلادهم و ظفر بهم عساكر المسلمين عام ثلاث و ثلاثين و مائتين و الف ۔

پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ خارجی فرقہ کے ہیں جو کسی طرح اہل سنت سے نہیں ہوسکتے ۔ بلکہ علامہ شامی کے اس جملہ و ظفر بهم عساكر المسلمين سے تو ان کے مسلمان ہونے میں تک کلام

ہے۔ پس ایسی حالت میں ان کا اپنے آپ کو سنی کہنا بالکل لغو و باطل ہے۔

شریعت میں اس قسم کے لوگوں کو کہ جن کے مسجد میں داخل ہونے سے فساد پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کو اذیت پہونچتی ہے مسجد میں آنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ در مختار مطبوعہ مجدی کے صفحہ ۱۰۲ میں ہے: و یمنع منه و کذا کل مؤذ و لو بلسانه۔ اور اہل محلہ کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جو ان میں سے نہیں ہے اس کو اپنی مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کریں۔ جیسا کہ در مختار کے اسی صفحہ میں ہے: بل و لاھل المحلة منع من لیس منھم عن الصلوٰة فیه۔ پس جبکہ یہ فرقہ (غیر مقلدین) اہل سنت و جماعت سے خارج ہے اور اعتقادات فاسدہ کی وجہ سے سنیوں کو ان کے مسجد میں آنے سے اذیت ہوتی ہے تو سنیوں کو چاہیئے کہ ان کو اپنی مسجد میں داخل ہونے اور نماز پڑھنے سے منع کریں۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کس تاریخ اور کس وقت سے بیمار ہوئے؟ اور آپ کی وفات کس روز اور کونسی تاریخ میں ہوئی؟

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کس روز اور کس مہینہ اور کس تاریخ میں ہوئی؟

۳۔ غدیر خم کا واقعہ کس روز کا ہے؟ ۱۸/ ذی الحجہ میں اگر یہ واقعہ اور شہادت عثمان دونوں واقعات پیش ہوتے ہیں تو وجہ توفیق بتلائی جائے؟ اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ کس تاریخ یہ ارشاد صادر ہوا؟ بصراحت بتلایا جائے!

الجواب

۱۔ آں سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم آخر صفر میں بیمار ہوئے۔ اور مسلسل بارہ روز بیمار رہنے کے بعد تیرھویں دن یعنی ربیع الاول کی (۱۲) بارھویں تاریخ روز دوشنبہ بعد زوال آپ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ تاریخ ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۱۲۱ میں ہے: ابتدأ برسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم مرضه اواخر صفر فی بیت زینب بنت جحش۔ سیرۃ حلبیہ جلد سوم میں ہے: و کانت مدۃ شکواہ صلی اللہ علیه و سلم ثلاث عشرۃ لیلة۔ ابن اثیر جلد دوم میں ہے: و کان موته یوم الاثنین لثنتی عشرۃ لیلة خلت من ربیع الاول۔ سیرۃ حلبیہ جلد سوم میں ہے: توفی رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم فی بیت عائشة و ذلک یوم الاثنین حین زاغت الشمس لاثنتی عشرۃ لیلة خلت من ربیع الاول۔

۲۔ ۱۸/ ذی الحجہ سنہ ۳۵ھ بروز جمعہ امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔ تاریخ کامل للعلامہ ابن اثیر جلد سوم میں ہے: و کان قتله لثمانی عشرۃ خلت من ذی الحجة سنة خمس و ثلاثین یوم الجمعة۔ فتوحات اسلامیہ جلد دوم اور الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ثانی میں بھی یہی لکھا ہے۔

۳۔ سنہ ۱۰ھ میں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم حجۃ الوداع سے مدینہ پاک واپس تشریف فرما ہورہے تھے تب آپ علیہ السلام نے رابغ کے قریب مقام غدیر خم پر صحابہ کو جمع کرکے خطبہ میں من کنت

مولاہ فعلی مولاہ ارشاد فرمایا۔ اس فرمان کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی حکومتِ یمن کی کچھ شکایات ان کے ساتھیوں نے آں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس پیش کی تھیں، جب آپ علیہ السلام نے اس شکایت کو دفع کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی براءۃ کے لئے ان کی یہ فضیلت بیان فرمائی۔ سیرۃ حلبیہ جلد سوم صفحہ ۳۰۱ بیان حجۃ الوداع میں ہے: و لما وصل صلی اللّٰہ علیہ و سلم الی محل بین مکۃ و المدینۃ یقال لہ غدیر خم بقرب رابغ جمع الصحابۃ رضی اللّٰہ عنہم اجمعین و خطبہم خطبۃ بیّن فیہا فضل علیٍّ کرم اللّٰہ وجہہ الکریم و براءۃ عرضہ مما تکلم فیہ بعض من کان معہ بأرض الیمن بسبب ما کان صدر منہ الیہم بالمعدلۃ التی ظنہا بعضہم جورا و بخلا و الصواب کان مع علیٍّ کرم اللّٰہ وجہہ الکریم فی ذلک۔ مصنف سیرۃ حلبیہ نے اس عبارت کے بعد آں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ و سلم کا بسیط خطبہ نقل کیا ہے، اور ختم خطبہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے جو ارشاد فرمایا ہے اس کو اس طرح لکھا ہے: و قال فی حق علیٍّ کرم اللّٰہ وجہہ الکریم لما کرر علیہم: أَلَستُ اولیٰ بکم من انفسکم؟ ثلاثا، و ہم یجیبون صلی اللّٰہ علیہ و سلم بالتصدیق و الاعتراف، و رفع صلی اللّٰہ علیہ و سلم یدَ علیٍّ کرم اللّٰہ وجہہ الکریم و قال: من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللہم والِ من والاہ و عاد من عاداہ و احب من احبہ و ابغض من بغضہ و انصر من نصرہ و اعن من اعانہ و اخذل من خذلہ و أدر الحق معہ حیث دار۔ اور اس واقعہ کی تاریخ ۱۸ / ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ بتلائی گئی ہے۔ سیرۃ حلبیہ میں اسی جگہ ہے: و کان ذلک الیوم الثامن عشر من ذی الحجۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کتاب اللُّقَطَة

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا کبوتر بھٹک کر عمرو کے گھر پر جا بیٹھا ۔ عمرو نے اس کو پکڑ لیا ۔ اور کہتا ہے کہ پرواز کنندہ جانور چاہے وہ کسی کی ملک ہو جبکہ وہ خود کسی کے مکان پر جا بیٹھے تو اس کو پکڑ لینا درست ہے ۔ کیا عمرو کا یہ بیان شرعاً درست ہے ؟

الجواب

غیر کا کبوتر اگر بھٹک کر کسی کے گھر پر آجائے تو صاحب خانہ کا اس کو پکڑ لینا سزاوار نہیں ہے ۔ اگر پکڑ لیا ہے تو چاہئے کہ اس کے مالک کو تلاش کرکے حوالہ کردے ۔ اگر مالک خود طلب کرے تو اس سے ثبوت لے کر واپس دیدے ۔ در مختار کتاب اللقطہ میں ہے : حمام اختلط بها اهلیٌّ لغیره لا ینبغی له ان یاخذه و ان اخذه طلب صاحبه لیرده علیه لانه کاللقطة ۔ رد المحتار میں ہے : قوله (اختلط بها اهلیٌّ لغیره) المراد بالاهلی ما کان مملوکا لغیره ۔ قوله (لا ینبغی له ان یأخذه) لأنه ربما یطیر فیذهب الی محله الاصلی فلا ینافی ما مر من ان اللقطة یندب اخذها ۔ والله اعلم بالصواب ۔

کتاب الشرکۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید فوت ہوا ۔ دو[۲] فرزند ۔ چھ[۶] بنت ، ایک[۱] زوجہ چھوڑا ۔ متروکہ ، رسوم دیشکمی ، و مقطعہ ، و اراضی ، و انعام مشروط الخدمت ، و اراضیات نہری تری و خشکی ہیں ۔ قرضۂ مورث تا تاریخ وفات ۲۰۰۰ ہے ۔ بوقتِ وفاتِ مورث ایک لڑکا معمر ۱۶ سالہ ، دوسرا ۵ سالہ تھا جو باہم برادر علاتی ہیں ۔ مورث کی وفات آبان ۱۳۰۴ فصلی میں ہوئی ۔ اب تک دونوں بھائی وغیرہ سب ملکر یکجا رہے ۔ جائداد موروثی کو فرزندِ اکبر نے اپنے ذاتی محنت سے المضاعف منافع کے قابل بنایا ۔ ۱۳۱۹ فصلی سے فرزند اکبر نے بلا نقصان جائداد موروثی و متروکہ متوفی تقریباً ۲۰۰ ایکڑ اراضی خشکی و تری اور ۲۰۰۰ تک قیمت کے جانوران زراعت اپنی ذات سے خریدے ۔ مخفی نہ رہے کہ یہ اراضیات جو فرزند اکبر نے حاصل کی ہیں وہ نہ کسی وقت مورث کے نام پٹہ پر تھیں اور نہ کبھی مورث کا قبضہ رہا ہے بلکہ سرکاری افتادہ اراضیات تھیں جس کو بذریعہ درخواست حاصل کیا گیا ۔ یہ اراضیات صرف ایک ہی موضع میں نہیں ہیں بلکہ دو تین مواضعات میں واقع ہیں۔

جائداد موروثی میں بغرض توفیر آمدنی ، آبپاشی کی ترقی تقریباً ۲۰۰۰ روپے تک قرضہ حاصل کرکے کی گئی ۔ اس وقت تقریباً ۲۰۰۰ کا قرضہ بحالتِ مشترکہ باقی ہے ۔ اس قرضہ میں مورث کا قرضہ شامل نہیں ہے ۔ بعد وفاتِ مورث فرزندِ اکبر نے اپنے ذاتی اعتبار پر قرضہ وغیرہ حاصل کرکے چار شادیاں بھی اپنی خواہرانِ ناکتخدا کی کردی ہیں ۔ اس وقت ما بین ہر دو بھائی کے نزاع علحدگی و تقسیم واقع ہوئی ہے ۔ بڑے فرزند کا دعویٰ ہے کہ اراضی موروثی و قرضہ علی السویہ تقسیم کرلیا جائے ۔ میری مکسوبہ اراضیات و جائداد قابل تقسیم نہیں ہے ۔ فریق ثانی کو اصرار ہے کہ کل جائداد خواہ موروثی ہو یا مکسوبہ علی السویہ تقسیم ہونی چاہئے ۔ فریقین حنفی المذہب ہیں ۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ما بین مورث و دعویداران اور ان کے بھائی کے جو تقسیم ہوئی تھی وہ اس طریقہ سے ہوئی تھی کہ جائداد موروثی تقسیم کرلی گئی ، بقیہ جائداد جس فریق کی پیدا کردہ تھی وہ اس کو چھوڑ دی گئی ۔ یہ فیصلہ پنچایتی ہوا تھا ۔ پس ارباب صاحب فقہ سے باظہار واقعات عرض ہے کہ جائداد موروثی کی نسبت از روئے احکام فرائض کیا حکم ہے ؟ اور جائداد مکسوبہ ذاتی و قرضہ مشترکہ فرزند اکبر کی نسبت کیا حکم ہے ؟

الجواب

فرزند اکبر نے جو جائداد اپنی کوشش سے اپنی ذات کے لئے پیدا کی ہے یہ فرزند اکبر کی ملک ہے ۔ اگر اس کو مال مشترکہ سے حاصل کیا ہے تو چاہئے کہ اس کے حاصل کرنے میں دوسرے شریک کے حصہ کی جس

قدر رقم صرف ہوئی ہے اس کو ادا کردے ۔ اور بحالت اشتراک فرزند اکبر نے جس قدر قرضہ اپنی ذات سے حاصل کیا ہے اس کی ادائی فرزند اکبر کے ذمہ ہے ۔ رد المحتار کی جلد ۳ صفحہ ۳۴۸ کتاب الشرکہ میں ہے : یقع کثیرا فی الفلاحین و نحوهم ان احدهم یموت و تقوم اولاده علیٰ ترکته بلا قسمة و یعملون فیها من حرث و زراعة و بیع و شراء و استدانة و نحو ذلک و تارة یکون کبیرهم هو الذی یتولی مهماتهم و یعملون عنده بامره و کل ذلک علیٰ وجه الاطلاق و التفویض لکن بلا تصریح بلفظ المفاوضة و لا بیان جمیع مقتضیاتها مع کون الترکة اغلبها او کلها عروض لا تصح فیها شرکة العقد و لا شک ان هذه لیست " شرکة مفاوضة " خلافا لما افتیٰ به فی زماننا من لا خبرة له بل هی " شرکة ملک " کما حررته فی تنقیح الحامدیة ثم رأیت التصریح به بعینه فی فتاوی الحانوتی ۔ فاذا کان سعیهم واحدا و لم یتمیز ما حصله کل واحد منهم بعمله یکون ما جمعوه مشترکا بینهم بالسویة و ان اختلفوا فی العمل و الرای کثرة و صوابا کما افتی به فی الخیریة و ما اشتراه احدهم لنفسه یکون له و یضمن حصة شرکائه من ثمنه اذا دفعه من المال المشترک و کل ما استدانه احدهم یطالب به وحده ۔ اور در مختار میں فصل فی الشرکۃ الفاسدہ میں ہے : (و ما حصله احدهما فله و ما حصلاه معا فلهما) نصفین ان لم یعلم ما لکل ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله و ما حصله احدهما) ای بدون عمل من الآخر ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی جائداد غیر منقولہ اس کے انتقال کے بعد تمام ورثاء نے اپنی رضامندی سے بغرض پرورش بطور امانت زید کی زوجہ ہندہ کے قبضہ میں دی تھی ۔ ہندہ نے اس جائداد مشترک کو جس میں ہندہ اور اس کے پانچ فرزند و دختر کا حق ہے اپنے چھوٹے لڑکے کے نام بمد خیرات لکھکر باضابطہ رجسٹری کرادی ۔ پس ہندہ کا یہ فعل شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

ورثاء میں سے ہر ایک شریک دوسرے کے حصہ کے متعلق بالکل اجنبی ہے ۔ اس لئے اس کو دوسرے کے حصہ میں بلا اجازت کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں ہے ۔ کنز الدقائق کی کتاب الشرکۃ میں ہے : شرکة الملک ان یملک اثنان عینا ارثا او شراء و کلٌ اجنبی فی قسط صاحبه ۔ ہدایہ کی کتاب الشرکۃ میں ہے : فشرکة الاملاک العین یرثها رجلان او یشتریانها فلا یجوز لاحدهما ان یتصرف فی نصیب الآخر الا باذنه و کل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالأجنبی ۔ پس صورت مسئولہ میں ہندہ چونکہ اپنے دوسرے شرکاء کے حصہ کے متعلق بالکل اجنبیہ ہے اور مال ودیعت شرعا امانت دار کی ملک نہیں ۔ اس لئے اس کا ہبہ کرنا یا وقف کرنا درست نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الودیعہ باب اول میں ہے : و اما حکمها فوجوب الحفظ علی المودع و صیرورة المال امانة فی یده و وجوب ادائه عند طلب مالکه ، کذا فی الشمنی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مورث کی وفات کے بعد ترکہ مشترکہ میں کوئی ایک وارث تجارت کرکے نفع حاصل کرے ۔ تو کیا یہ نفع بھی متروکہ میں شریک رہے گا یا نہیں ؟

الجواب

مشترکہ ترکہ سے اگر کوئی وارث تجارت کرے اور اس میں نفع حاصل کرے تو وہ نفع تجارت کرنے والے وارث ہی کا حق ہے ۔ دوسرے ورثاء اس میں شریک نہیں ہوں گے ۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب الشرکۃ میں ہے : لو تصرف احد الورثۃ فی الترکۃ المشترکۃ و ربح فالربح للمتصرف وحدہ کذا فی الفتاویٰ الغیاثیۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے انتقال کے بعد اس کے فرزند مشترکہ طور پر متروکہ میں تجارت کرتے رہے ۔ بڑا لڑکا چھ سال تک تنہا کام کرتا رہا ۔ اس کے بعد چھوٹے لڑکے بھی بھائی کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوگئے ۔ کیا متروکہ زید مع نفع تجارت سب کو مساوی ملے گا یا کم و زائد ؟

الجواب

بڑا لڑکا جو ۶ سال تنہا کام کرتا رہا ہے ان ایام کا نفع وہی پائے گا اور چھوٹے اس میں شریک نہ ہونگے ۔ اس کے بعد جس وقت سے چھوٹے بھی شریک کار ہوئے ہیں اس وقت سے نفع سب میں مساوی تقسیم ہوگا ۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب الشرکۃ باب السادس میں ہے : لو تصرف احد الورثۃ فی الترکۃ المشترکۃ و ربح فالربح للمتصرف وحدہ کذا فی الفتاوی الغیاثیۃ ۔ در مختار کی کتاب الشرکہ فصل بالشرکہ الفاسدۃ میں ہے : (و ما حصلہ احدھما فلہ و ما حصلاہ معا فلھما) نصفین ان لم یعلم ما لکل ۔ رد محتار میں اسی جگہ ہے : (قولہ و ما حصلہ احدھما) ای بدون عمل من الآخر ۔ صفحہ ۲۸۳ میں ہے : فاذا کان سعیھم واحدا و لم یتمیز ما حصل کل واحد منھم بعملہ یکون ما جمعوا مشترکا بینھم بالسویۃ و ان اختلفوا فی العمل و الرأی کثرۃ و صوابا کما افتی بہ فی الخیریۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر تجارت کی اور نفع حاصل کیا ۔ کیا یہ دونوں نفع میں بھی مساوی شریک رہیں گے ؟

الجواب

مساوی شریک رہیں گے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۵ میں ہے : اذا کان کل من الاخوۃ المذکورین مستقلا بنفسہ و اشترکوا فی الأعمال و حصلوا اموالا یکسبہم جمیعا فہی بینہم بالسویۃ ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو کے مکانوں کے ما بین ایک مشترکہ سیری ہے جو فریقین کی ضروریات تعمیر وغیرہ کی کارآمد ہے ۔ عمرو نے اس کو بند کرکے دروازہ نصب کردیا ہے اور اس میں درخت نصب کئے ہیں ، جس سے زید کے اغراض فوت ہوگئے ہیں ۔ کیا زید کو یہ حق حاصل ہے کہ سیری کی مشترکہ زمین کو عمرو کے ان تصرفات سے خالی کروائے ؟

الجواب

مشترکہ زمین میں دونوں شریکوں میں سے کسی کو بلا اجازت دوسرے کے کسی قسم کا تصرف کا حق حاصل نہیں ہے ۔ اگر کوئی شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر تعمیر کرلے یا درخت لگائے تو دوسرے شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی تعمیر کو منہدم کردے اور درخت اکھیڑ دے ۔ فتاویٰ انقرویہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۵ کتاب الشرکۃ میں ہے : احد الشریکین اذا بنی فی ارض مشترکۃ بغیر اذن شریکہ کان لشریکہ ان ینقض البناء لان لہ ولایۃ النقض فی نصیبہ و التمییز غیر ممکن و الغرس ہکذا ۔ کسی ہمسایہ کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے ہمسایہ کی مکانیت یا اس کے منافع کو ضرر پہونچائے ۔ اگر اس سے ایسے افعال سرزد ہوں تو اس کو روکنا چاہئے ، اور ان مضرتوں کا دفع کرنا ضروری ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب القضاء مسائل شتیٰ میں ہے : و الحاصل ان القیاس فی جنس ہذہ المسائل ان یفعل المالک ما بدا لہ مطلقا لأنہ متصرف فی خالص ملکہ لکن ترک القیاس فی موضع یتعدی ضررہ الی غیرہ ضررا فاحشا و ہو المراد بالبین و ہو ما یکون سببا للہدم او یخرج عن الانتفاع بالکلیۃ و ما یمنع الحوائج الاصلیۃ کسد الضوء بالکلیۃ و اختاروا الفتویٰ علیہ ۔ اسی جگہ در مختار میں ہے : و لا یمنع الشخص من تصرفہ فی ملکہ الا اذا کان الضرر بجارہ ضررا بینا فیمنع من ذلک و علیہ الفتویٰ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے تین فرزند مسمیان ولید ، بکر اور عمرو کے ساتھ تجارت کرتا رہا اور سب کی کمائی مشترک تھی اور ایک جگہ بسر کرتے تھے ۔ کیا تمام جائداد زید کی سمجھی جائے گی یا اس کے فرزندوں کا بھی اس میں حصہ رہے گا ؟

الجواب

زید نے جو کچھ کہ اس تجارت سے حاصل کیا ہے وہ سب زید ہی کی ملک ہے ، اس کے فرزند اس کے

معین و مددگار تھے ۔ ان کا اس میں کوئی خاص حصہ نہیں ہے ۔ زید کی وفات کے بعد یہ مال اس کے ورثہ میں حسب فرائض تقسیم ہوگا ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۸۳ میں ہے : الاب و ابنہ یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ و لم یکن لھما شیء فالکسب کلہ لہ ان کان الابن فی عیالہ لکونہ معینا لہ اُلا تری لو غرس شجرۃ تکون للاَب ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الوقف

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجدِ قدیم قطب شاہی مع متعلقات، مثل حوض و باولی و سرائے و زمین برائے مصارف مسجد، جس کے اوقاف مثل مسجد و سرائے حیات نگر و تالاب حیات بانصاحبہ وغیرہ حسبِ عرف و عادت قدیم زمانۂ قطب شاہی ایک وسیع احاطہ کے اندر واقع ہیں، جس کے آثار قدیمہ مثل باولی و سرائے وغیرہ ہنوز موجود ہیں، جس کے لئے ایک متولی بھی بغرض صیانتِ اوقاف زمانہ سابق میں مقرر کیا گیا تھا، جس کو تخمیناً تین سو (۳۰۰) سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس وقت نہ واقف زندہ ہے اور نہ وقف نامہ، اور نہ جائداد موقوفہ مذکورہ کے مسجد پر وقف ہونے کی دیکھی ہوئی شہادت ہے۔ مگر ہر طبقے کے متولی مع ساکنینِ محلہ جائداد مذکورہ کے وقف ہونے کی شہادت سماعی، تحریری، لسانی دیتے رہے۔ چنانچہ متولیان سابق و اہل محلہ نے اس زمین کو موقوفہ تحتِ مسجد ہونے کے متعلق اسناد پیش کرکے سرکار سے نزول بھی معاف کروایا ہے۔ اس وقت ایک شخص مسجد و متعلقات مسجد پر قابض ہے جس کو محاصل کا مسجد کے مصارف میں صرف ہونے پر اقبال ہے۔ چنانچہ عدالت میں جبکہ اس پر صیانت وقف کے بارے میں دعویٰ دائر ہوا تھا وہاں اس نے اس کے متعلق بضابطہ اقرار نامہ دیا ہے۔ با ایں ہمہ پھر اس نے اس زمین و سرائے متعلقہ مسجد اپنی ملکِ موہوبہ بتلاتا ہے جس کے لئے کوئی وثیقہ بجز قبضہ کے پیش نہیں کرتا۔ بناء بریں ساکنین مندرجہ ذیل سؤالات کو علمائے دین کی خدمت میں پیش کرکے مستدعی ہیں کہ وجوہاتِ مذکورہ بالا سے وقف ثابت ہے یا نہیں؟ آیا اس قسم کی جائداد موقوفہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کی حفاظت سرکار پر لازم ہے یا نہیں؟ جواباتِ شافی معتبر کتبِ فقہ سے ادا فرماکر عند اللہ ماجور ہوں :

سؤالات

۱۔ اوقافِ قدیمہ کے ثبوت اور ان کے تعیّن مصارف کے لئے شہادت بالتّسامُع و بالشُّهرۃ کافی ہے یا نہیں؟

۲۔ حسبِ عادت و عرفِ قدیم جائداد مذکورہ موقوفہ سمجھی جائے گی یا نہیں؟

۳۔ متولیان سابق کے اقرار، شہادتِ وقف کے ثبوت کے لئے کافی سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

۴۔ کسی جائداد کے متعلق وقفی یا ملکی نزاع واقع ہونے کی صورت میں اس کے مصارف وغیرہ کے متعلق متولیان سابق کا عملدرآمد قدیم ثبوت وقف کے لئے حجت بن سکتا ہے یا نہیں؟

۵۔ موقوفات میں تصرفات (مثلاً بیع و رہن وغیرہ) جائز ہیں یا نہیں؟ اور اس قسم کے تصرفات شرعاً باطل سمجھے جائیں گے یا نہیں؟ اور متصرف سے اس کا تاوان لیا جائے گا یا نہیں؟ کیا متولی ان تصرفات کی وجہ سے خائن اور غاصب سمجھا جائے گا یا نہیں؟ اور قاضی پر ایسے شخص کا معزول کرنا واجب ہے یا نہیں؟

درصورت معزول نہ کرنے کے قاضی عند اللہ گنہگار ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

۱ ۔ اوقاف قدیمہ کے ثبوت کے لئے شہادت بالتسامع و بالشہرۃ کافی ہے ۔ جیسا کہ واقعات المفتین کے صفحہ ۴۳ میں ہے : تقبل الشہادۃ علی الشہادۃ فی الوقف و کذا شہادۃ الرجال مع النساء و کذا الشہادۃ بالسماع و لو صرحوا الخ ۔ در مختار کے صفحہ ۵۲۸ میں ہے : و تقبل فیہ الشہادۃ علی الشہادۃ و شہادۃ النساء مع الرجال و الشہادۃ بالشہرۃ و ان صرحوا بہ ای بالسماع فی المختار و الوقف علی معنیین حفظا للاوقاف القدیمۃ عن الاستہلاک بخلاف غیرہ ۔ انتہی ۔ اور اسی طرح مصرف وقف کے ثبوت کے لئے بھی شہادت سماعی شرعا کافی ہے ۔ جیسا کہ فتاوی رد المحتار شامی کی جلد ۳ صفحہ ۴۱۷ میں ہے : (و بیان المصرف من اصلہ) ای فتقبل الشہادۃ علی المصرف بالتسامع کالشہادۃ علی اصلہ ۔ الخ ۔

۲ ۔ شہادت سماعی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بے شک از روئے عرف جائداد مذکورہ کے موقوف ہونے کا فتویٰ دیاجائے گا ، کیونکہ واقف کی نصوص شارع کی نصوص کی طرح ہوتی ہیں ۔ اور جہاں کہیں شارع کی نص نہ ہو وہاں عرف کا اعتبار کیا جاتا ہے ، بناء بریں جہاں واقف کی نص نہ ہو وہاں عرف کا لحاظ کیا جائے گا ۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو بہت سارے اوقاف قدیمہ تلف ہوجائیں گے ۔

عرف کی صورت یہ ہے کہ واقف جب کوئی مسجد وغیرہ بناتا ہے تو ضرور کوئی جائداد معتد بہ بھی اس کے مصارف و مصالح کے لئے وقف کرتا ہے خاص کر وہ مسجد جو نہایت وسیع و شاندار اور ایسی بیگم کی بناء کردہ ہو کہ جن کے متعدد اوقاف اس وقت موجود ہیں ۔ مجموعہ فتاویٰ مولوی عبد الحی صاحب مرحوم کے صفحہ ۴۹ میں ہے : در صورت عدم شہادت بالتسامع بنظر عرف فتویٰ وقف شدن دکاکین مذکورہ دادہ خواہد شد ، زیرا کہ نصوص واقف مانند نصوص شارع میشوند ۔ و ہر گاہ در صورت عدم نص شارع اعتبار عرف است ، در صورت عدم نص واقف نیز اعتبار عرف خواہد شد ۔ و الا یلزم ابطال کثیر من الاوقاف القدیمۃ ۔ و متعارف اینست کہ واقف ہر گاہ مسجد را وقف میسازد ، دکاکین وغیرہ نیز برائے مصالح مسجد وقف میسازد ۔ علی الخصوص ہر گاہ مسجد کلاں باشد و تعمیر کردہ کسے امیر یا نواب بود ۔ در اشباہ می آرد : نصوص الواقف کنصوص الشارع و فیما لا نص فیہ من الاموال الربویۃ یعتبر فیہ العرف و لا خصوصیۃ للربا و انما العرف غیر معتبر فی المنصوص علیہ ۔ انتہی ۔

۳ ۔ شرع میں ہر ایک عاقل و بالغ کا اقرار و شہادت معتبر اور اس کے ذمے لازم گردانے گئے ہیں ۔ ہدایہ کے صفحہ ۲ میں ہے : اذا اقر العاقل البالغ بحق لزمہ اقرارہ ۔ اسی طرح اگر متولی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کسی مکان کے مسجد پر وقف ہونے کی گواہی دے تو شرعا وہ گواہی مقبول و معتبر ہے ۔ جیسا کہ در مختار کی کتاب الوقف میں ہے : و لو شہد المتولی مع آخر بوقف مکان کذا علی المسجد فظاہر کلامہم قبولہا ۔ انتہی ۔

۴ ۔ اگر کسی موقوفہ جائداد کا ثبوت منقطع ہوجائے اور تنازع واقع ہو کہ وقفی ہے یا ملکی ؟ تو اس کے

ثبوت میں مصارف وغیرہ کے متعلق عملدرآمد قدیم کا لحاظ ضرور کیا جائے گا ۔ جیسا کہ فتاویٰ سعدیہ کی دوسری جلد کتاب الوقف کے صفحہ ۱۸۰ میں ہے : الذی صرح به علماؤنا فی الاوقاف القدیمة التی ماتت شهودها و اشتبهت مصارفها اذا لم یکن للوقف کتاب فی دیوان القضاة المسمی فی العرف بالسجل و تنازع اهله فیه ینظر الی المعهود من حاله فی ما سبق من الزمان من ان قوامه کیف کانوا یعملون فیبنی الامر علیه ۔ انتهی ۔ اور فتاویٰ شامی کی جلد ۳ صفحہ ۴۱۰ میں ہے : و به صرح فی الذخیرة حیث قال سئل شیخ الاسلام عن وقف مشهور اشتبهت مصارفه و قدر ما یصرف الی مستحقیه ؟ قال : ینظر الی المعهود من حاله فیما سبق من الزمان من ان قوامه کیف کانوا یعملونه فیه و الی من یصرفونه ذلک فیبنی علی ذلک لان الظاهر انهم کانوا یفعلونه ذلک علی موافقة شرط الواقف و هو المظنون بحال المسلمین فیعمل علی ذلک ۔ انتهی ۔

۵ ۔ موقوفات میں تصرفات مذکورہ ہرگز جائز نہیں ، اور واقع ہونے کی صورت میں شرعاً باطل سمجھے جاتے ہیں ، اور متصرف پر اس کا تاوان لازم آتا ہے ۔ متولی تصرفات مذکورہ کی وجہ سے خائن و غاصب سمجھا جاتا ہے ، اور قاضی پر ایسے شخص کا معزول کرنا واجب ہے ، اور علحدہ نہ کرنے کی صورت میں قاضی عند اللہ گنہگار ہوگا ۔ فتاویٰ شامی کی جلد ۳ صفحہ ۳۹۹ میں البحر الرائق سے منقول ہے : ان امتناعه من التعمیر خیانة و کذلک لو باع الوقف او بعضه او تصرف تصرفا غیر جائز عالما به ۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ کے صفحہ ۴۳۰ جلد ۲ میں ہے : رجل وقف ارضا او دارا و دفعها الیٰ رجل و ولاه القیام بذلک فجحدها المدفوع الیه فهو غاصب یخرج الارض من یده و الخصم فیه الواقف فان کان الواقف میتا و جاء اهل الوقف یطالبون به نصب القاضی فیما یخاصمهم فیه فان کان دخل فیه نقص ضمن ما کان من نقصان بعد جحوده و یامر به ما انهدم منهم ۔ انتهی ۔ فتاویٰ رد المحتار شامی کی جلد ۳ صفحہ ۳۹۹ میں ہے : و فی الجواهر اذا لم یراع الوقف یعزله القاضی ۔ اور اسی صفحہ میں ہے : (و ینزع وجوبا) مقتضاه اثم القاضی بترکه و الاثم بتولیته الخائن لا شک فیه ، بحر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد قدیم قطب شاہی زمانہ کی ہے ، اور اس کے اطراف میں سرائے و زمین ہے جس پر متولیوں نے لوگوں کو مختلف حیثیت سے قابض بنایا ہے ، اور ان سے نزول وصول کرکے اخراجات مسجد میں صرف کرتے رہے ۔ اب ایک شخص اپنے کو ان متولیان سابق کا قائم مقام بتلاکر مدعی تولیت ہے ، اور زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کرتا ہے ، اور متولیان سابق کے تصرفات کو دلیل ملک گردانتا ہے ، اور ثبوت ملک میں اپنے انہیں تصرفات سابقہ کو وثیقہ ملک موروثی اور قبضۂ تولیت کو قبضۂ مالکانہ تصور کرکے مدعی ملک و تولیت ہے ۔ اور کہتا ہے کہ " اگر زمین مسجد کی موقوفہ بھی ثابت ہوجائے تو چونکہ اس زمین پر میرا قبضہ تینتیس (۳۳) سال سے ہے اس لئے اب یہ زمین موقوفہ نہیں رہی "۔ پس آیا مدعی تولیت کا یہ بیان شرعاً صحیح ہے ؟ اور تینتیس سالہ قبضہ سے جائداد موقوفہ تعریف وقف سے نکل کر ملک میں داخل

ہوجاتی ہے اور حسب دعویٰ شخص قابض کی ملک ہوجاتی ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ؛

الجواب

دعویٰ کی سماعت کے لئے اگرچہ فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں ، بعض پندرہ (۱۵) سال کے بعد دعویٰ کو ناقابل سماعت لکھتے ہیں اور بعض تیس (۳۰) سال کے بعد اور بعض تینتیس (۳۳) کے بعد اور بعض چھتیس (۳۶) سال کے بعد دعویٰ کو غیر مسموع لکھتے ہیں ۔ مگر فقہاء کے یہ سارے اختلاف وقف اور میراث کے دعویٰ کے ما سوا دیگر دعووں میں ہیں ۔ وقف اور میراث کے دعویٰ کی سماعت کے لئے شرعاً کوئی میعاد نہیں رکھی گئی ، بلکہ یہ دونوں دعوے ہر وقت چاہے کتنی ہی مدت کیوں نہ گذر جائے قابل سماعت ہیں ۔ جیسا کہ فتاویٰ مہدیہ مصری کی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ میں ہے : سئل فی رجل من مدینة انطاکیة واضع یده علی منزل مشتمل علی بیت و دکان قهوة تحته بمدینة انطاکیة المذکورة تلقاهما عن ابیه و جده ابی ابیه و مدة وضع یده و ید ابیه و جده نحو مائة سنة و تسع سنین و لم ینازع من ذکر احد فی تلک المدة ثم ادعی الآن ناظر وقف علی واضع الید بان ذلک العقار وقف من جملة ما هو ناظر علیه و لم یسبق لذلک الناظر و لا لمن قبله من النظار وضع یده علی العقار المذکور بل و لم یدع احد منهم بذلک مع مشاهدتهم للتصرف فهل و الحال هذه لا تسمع دعوی ذلک الناظر حیث کان واضع الید منکرا لدعواه ذلک و یعمل بوضع الید و التصرف المذکور ؟ اجاب : لا تسمع الدعویٰ بعد مضی خمس عشرة سنة الا فی الإرث و الوقف و وجود عذر شرعی . و ما فی الخلاصة المدعی و المدعیٰ علیه اذا کانا فی موضع و لا مانع و ادعی بعد ثلاثین سنة و فی المبسوط بعد ثلاث و ثلاثین سنة و فی فتاوی العتابی بعد ست و ثلاثین سنة لا تسمع الا ان یکون المدعی غائبا او مجنونا و لیس له ولی او المدعی علیه والیا جائرا یخاف منه ، و ذلک فیما عدا الإرث و الوقف کما فی صرة الفتاوی ، فذلک قبل صدور النهی عن سماعها . و قد تظاهرت نصوص المتأخرین علی عدم السماع بعدها الا فی المستثنی و لم یقیدوا دعوی الارث و الوقف بمدة افاده فی حواشی الدرر للعلامة السید الطحطاوی من اواخر فصل الحبس ۔ و سماع الدعوی فی الوقف و لو بعد مضی المدة الطویلة هو ما علیه القضاة و العلماء الاسلاف بمصر و ان افتی فی تنقیح الحامدیة بخلافه بعد طول المدة ۔ اور در مختار مصری مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۳۰۰ میں ہے : حتی لو امر السلطان بعد سماع الدعوی بعد خمس عشرة سنة فسمعها لم ینفذ قلت فلا تسمع الآن بعدها الا بامر الا فی الوقف و الإرث و وجود عذر شرعی و به افتی ابو السعود فلیحفظ ۔

پس فتاویٰ مہدیہ کے اس جزیہ سے ثابت ہے کہ جائداد موقوفہ پر کسی شخص کا قبضہ اگرچیکہ ایک سو نو (۱۰۹) سال تک رہا ہو اس جائداد کو وقف سے خارج نہیں کرسکتا ، اور نہ اس قدر قبضہ و تصرف سے وہ شخص قابض و متصرف اس کا مالک بن سکتا ہے ۔ اگرچہ تنقیح حامدیہ میں اس کے خلاف فتویٰ دیا گیا ہے مگر متقدمین علماء و قضاۃ مصر نے تنقیح حامدیہ کے خلاف یعنی وقف کے دعویٰ کے لئے شرعاً کوئی مدت مقرر نہ ہونے کے

متعلق فتویٰ دیا ہے۔ اور یہی متاخرین کے پاس معتبر ہے۔ پس صورت مسئولہ میں شخص قابض کا تینتیس سال مدت گذر جانے سے اپنے کو اس کا مالک بتلانا اور شئے موقوفہ کو وقف سے خارج اور اپنی ملک میں داخل جاننا بالکل لغو اور باطل ہے۔ شئے موقوفہ تا حال موقوفہ ہے۔ اور از روئے شریعت اس وقت بھی اس کا دعویٰ قابل سماعت ہے۔ اور متولی کا اس طرح ناجائز قبضہ قابل برخاست ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہر ایک محلہ دار اہل اسلام۔ محلہ کی مسجد کے انتظام و حساب فہمی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب

مسجد کے اوقاف اور اس کے انتظامات واقف کے ذمہ ہیں۔ جب تک واقف زندہ ہے اسی کو ان اوقاف کی ولایت حاصل ہے۔ متولی کو مقرر کرنا یا معزول کرنا، حساب و کتاب دیکھنا اسی کا کام ہے۔ فتاوی شامی جلد ۳ صفحہ ۴۲۲ میں البحر الرائق سے منقول ہے: قال فی البحر الرائق ان الولایۃ للواقف ثابتۃ مدۃ حیاتہ و ان لم یشترطہا و ان لہ عزل المتولی۔

پس صورت مسئولہ میں اگر اہل محلہ ایسے اشخاص ہیں کہ جنھوں نے چندہ کو خود وقف کیا ہے تو ان کو بےشک اس اوقاف کی ولایت کا حق حاصل ہے، اور حساب و کتاب و عزل و تقرر متولی بطور خود کر سکتے ہیں اگر وہ خود واقف نہیں ہیں اور واقف فوت بھی ہوگیا ہے تو ایسی صورت میں ان کو اس کے متعلق حق حاصل نہیں ہے، بلکہ قاضی (حاکم) کو اس کی ولایت و نگرانی کا حق حاصل ہے۔ فتاویٰ در مختار بر حاشیۂ رد المحتار کے اسی صفحہ ۴۲۲ میں ہے: ولایۃ نصب القیم الی الواقف ثم لوصیہ ثم للقاضی۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

حاکم وقت اپنے خاندان میں جو شئے اعزازاً دیتا ہے وہ شئے بعد وفات معطیٰ لہ بطور متروکہ تقسیم ہوسکتی ہے یا نہیں؟ مثلاً زید کو سرکار سے ایک ہاتھی کی ماہوار ملا کرتی تھی، زید کی وفات کے بعد وہ ماہوار چندہ زوجہ زید کے قبضہ میں بوجہ صغر سنی اولاد رہی۔ اب زوجہ کا انتقال ہوگیا۔ پس ماہوار اعزازی جملہ ورثائے زید پر بحیثیت متروکہ تقسیم ہوگی یا نہیں؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی عطائے سلطانی متروکہ نہیں ہوسکتی ہے۔ اور نہ بعد وفاتِ معطیٰ لہ ما بین ورثاء قابل تقسیم ہے۔ الاشباہ و النظائر میں ہے: العطاء لا یورث۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ متولی وقف نے اراضیِ موقوفہ زیرِ درگاہ کو اپنے قبضہ کی حیثیت سے ایک شخص کے ہاتھ فروخت کردیا۔ سررشتہ انعام میں جب اس کی دریافت ہوئی تو وثائق سے اراضیِ مذکورہ، موقوفہ و مشروط باخراجات درگاہ ثابت ہوئیں۔ سررشتہ انعام نے یہ فیصلہ کیا کہ اگرچہ اراضیِ مذکورہ موقوفہ ہیں مگر قبل نفاذ احکام امتناعیِ بیع و رہن جائداد ہائے موقوفہ کے ۱۳۱۶ ف میں بیع ہوئی ہے، جس پر مشتری پوشیدہ بیعنامہ قابض ہے، اس لئے اراضی مذکورہ قابض کے نام بحال رہیں۔ اور اس کا سرکاری مقطعہ پن درگاہ کے خرچ میں باہتمام سرکاری صرف ہوا۔ اصل خریدار مرگیا ہے، اب اس کا بیٹا قابض ہے۔ بر بنائے اطلاع سررشتہ اوقاف نے بعد دریافت اس کا وقف ثابت کیا ہے۔ ایسی حالت میں کہ شرعاً جائدادِ موقوفہ رہن و بیع نہیں ہوسکتی، اگر خریدار یا اس کا وارث باوجود اس علم کے اس جائداد موقوفہ سے اپنا قبضہ نہ چھوڑے تو اس کا قبضہ بذریعہ سرکار اٹھادیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ از روئے شرع شریف اس کے متعلق جو احکام ہوں براہ کرم ان سے مطلع فرمایا جائے!

الجواب

چونکہ جائداد موقوفہ کی تملیک ناجائز ہے۔ اس لئے بعد ثبوت وقف، خریدار پر واجب ہے کہ اس جائداد کو واپس کردے۔ اور حاکم کو چاہئے کہ خریدار کو رد کرنے کا حکم صادر کرے۔ فتاوی مہدیہ جلد ۲ صفحہ ۳۶۸ میں ہے: الوقف بعد تمامه و لزومه لا یقبل التملیک و حیث لم یتحقق مسوغ شرعی لبیع عقار الوقف یکون الواجب رده لجهة وقفه۔ اور صفحہ ۳۶۹ میں ہے: و لا یسوغ لاحد المستحقین بیع شیء من الوقف بل و لا لناظره بدون مسوغ شرعی و یؤمر المشتری برفع یده عن الارض المذکورة حیث تحققت وقفیتها بالوجه الشرعی۔ اور در صورت رد نہ کرنے کے حاکم بہ جبر رد کرلینے کا پابند ہے۔ کیونکہ شرعاً حقوق اللہ کی نگرانی و حفاظت حاکم وقت کے ذمہ گردانی گئی ہے۔ فتح القدیر جلد ۵ صفحہ ۴۴۳ میں ہے: ان الحاکم هو الذی یتولی حقوق الله تعالیٰ۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۱ میں علامہ قنلی زادہ سے منقول ہے: فیجب علی کل قاض عادل عالم و علی کل قیم امین غیر ظالم ان ینظر فی الاوقاف۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے جائداد مصرف خیر میں وقف کی، اور اس کے انتظام تولیت کے متعلق یہ وصیت نامہ تحریر کیا کہ: "میں اپنی حین حیات آمدنی و پیداوارِ مواضعات کو اپنے اختیار سے حسبۃً للہ صرف کرتا رہوں گا، اور میرے بعد میری اولاد سے ایک شخص از قسم ذکور جو لئیق ہو نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ میرے دستور و طریقہ کے موافق صرف کرتا رہے۔ مگر انتقالِ جائداد کا اختیار کسی کو نہ ہوگا۔ اور نہ یہ حقیت لائق توریث ہوگی"۔ چنانچہ زید کے انتقال کے بعد اس کا بڑا لڑکا خالد جو لائق و اہل تھا بائیس (۲۲) سال تک متولی تھا۔ اب یعنی بعد وفات خالد، خالد کا بڑا لڑکا جس کے اہل و لائق ہونے کے سبب

سے جوائنٹ کلکٹر و کمشنر صاحبان نے اس کو مہتمم و متولی بنایا ہے ۔ پانچ سال سے کارگزار ہے ۔ مگر اس وقت خالد کے حقیقی و علاتی بھائی بھی مدعی تولیت ہیں اور خالد کی حین حیات بھی مدعی تھے ۔ کیا از روئے شریعت خالد کے حقیقی و علاتی بھائی خالد کے فرزند کے مقابل مستحق تولیت ہیں ؟ اور خالد کا فرزند جو بعد منظوری حکام مذکور الصدر بلا ثبوت خیانت اس خدمت سے علحدہ کیا جاسکتا ہے ؟

الجواب

جب واقف " نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ " کا لفظ تحریر کرتا ہے جب بطن اول کے اشخاص موجود ہوتے ہوئے دوسرے بطن کے اشخاص مستحق تولیت نہیں ہوتے ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۵۲ کتاب الوقف میں ہے : و الحاصل انه اذا رتب بين البطون لا يعطي للبطن الثاني ما لم ينقرض الأول ۔ الإسعاف في احكام الأوقاف کے باب وقف علی الأولاد میں ہے : او قال بطنا بعد بطن فحينئذ يبدأ بما بدأ الواقف و لا يكون للبطن الأسفل شيء ما بقي من البطن الأعلیٰ احد و هكذا الحكم في كل بطن حتى تنتهي البطون موتا ۔ اور جب تک واقف کے شرط کئے ہوئے اشخاص قابل تولیت ہیں تو قاضی (حاکم) ان کے سوا کسی اور کو متولی بنانے کا مجاز نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۳۳ کتاب الوقف میں ہے : فأفاد ان ولاية القاضي متأخرة عن المشروط و وصيه ۔ البتہ جبکہ اس متولی سے خیانت و بے دیانتی ثابت ہو جب قاضی کو حق ہے کہ اس کو بدلدے ۔ رد المحتار کے صفحہ ۴۳۳ میں ہے : ثم لا يخفى ان تقديم من ذكر مشروط بقيام الأهلية فيه حتى لو كان خائنا يولي اجنبي حيث لم يوجد فيهم اهل لأنه اذا كان الواقف نفسه يعزل بالخيانة فغيره اولیٰ ۔ پس صورت مستفسرہ میں جبکہ بطن اول کے اشخاص یعنی خالد کے بھائی موجود ہیں تو خالد کے بعد جو ان میں اہل ہے وہی متولی ہونے کا مستحق ہے ۔ ان کے موجود اور اہل ہونے کی حالت میں بطن ثانی کے شخص یعنی خالد کے لڑکے کو کوئی حق نہیں ۔ حکام مقامی نے جو خالد کے بیٹے کو متولی بنایا ہے وہ واقف کے وصیت نامہ کے خلاف ہے اس لئے نا درست ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو جاگیرات مشروط بہ روضۂ بزرگ بر بنائے اسناد سلاطینِ سلف بغرض مصارفِ درگاہِ حضرت خواجہ بندہ نواز چشتی قدس اللہ سرہ العزیز عطاء ہوئے ہیں ۔ کیا ان جاگیرات کی آمدنی کے کچھ حصہ سے شرائط وقف کے خلاف کسی دوسری درگاہ کے مصارف کا تقرر شرعاً درست ہے یا نہیں ؟ اور اگر سلطانِ وقت ایسا کرے ، اور ایک عرصہ تک اس پر عمل بھی ہو تو کیا یہ حکم شرعاً قابل تنسیخ ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

سلاطینِ سابق کی وقف کردہ جاگیرات و دیہات چونکہ اصل میں بیت المال کی زمینات ہیں ، اس لئے

سلطان وقت شروطِ واقف کے خلاف بلحاظِ ضرورت و مصلحت ایک درگاہ کی آمدنی کا کچھ حصہ دوسری درگاہ کی طرف منتقل کرسکتا ہے، اور اس کا یہ حکم شرعاً واجب التعمیل ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف مطلب للسلطان مخالفۃ الشرط اذا کان الوقف من بیت المال میں ہے ، و نقل عن المبسوط ان السلطان یجوز له مخالفة الشرط اذا كان غالب جهات الوقف قرى و مزارع فيعمل بامره و ان غاير شرط الواقف لأن اصلها لبيت المال ۔ رد المحتار میں ہے : قال المولى ابو السعود مفتي دار السلطنة ان اوقاف الملوك و الأمراء لا يراعى شرطها لأنها من بيت المال و ترجع اليه ۔ باب العشر و الخراج کے (مطلب في وقف الاراضي التي لبيت المال و مراعات شروط الوقف) میں بھی صاحب رد المحتار نے بھی یہی لکھا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ، بانی مسجد کا وارثِ شرعی اور متولی موروثی ہے ، جس کی تولیت نسلاً بعدَ نسلٍ چلی آتی ہے ۔ طغیانی میں مسجد منہدم ہوگئی ۔ اور مصارف نہ ہونے سے سردست اس کی تعمیر نہ کرواکر متولی کسی ضرورت پر چلاگیا تھا ۔ اس کے غیاب میں چند مصلیوں نے رقم چندہ سے مسجد دوبارہ تعمیر کروائی اور مسجد پر قابض ہوکر مدعی تولیت ہیں ۔ کیا ایسی حالت میں متولیِ قدیم کا حق تولیت زائل ہوجاتا ہے ؟ اور جدید اشخاص متولی ہوسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

بانی مسجد کا قرابت دار تولیت کا اہل ہوتے ہوئے کوئی اجنبی شخص متولی مقرر نہیں ہوسکتا ۔ در مختار کے کتاب الوقف میں ہے : و ما دام احد يصلح للتولية من اقارب الواقف لا يجعل المتولي من الأجانب ۔ خالی زمین پر مسجد کی بنیاد رکھنے والے کو بانیِ مسجد کہا جاتا ہے ، مُغرب لغت فقہ کے صفحہ ۳۷ میں ہے : بنى الدار بناه و قوله و ان كان رجل اخذ ارضا و بناها اى بنا فيها دارا او نحوها و في موضع آخر اشتراها غير مبنية اى غير مبني فيها ۔ منہدمہ مسجد کی تعمیر کرنے والا بانی نہیں کہلاتا ، بلکہ بانی وہی ہے جس نے پہلے اس کی بنیاد رکھی ۔

پس صورت مسئولہ میں متولی قدیم جبکہ بانی مسجد کا قرابت دار اور موروثی متولی ہے تو قاضی کو بلا ثبوت خیانت اس کو معزول کرنے کا حق نہیں ، اور نہ جدید تعمیر کرنے والے اشخاص مستحق تولیت ہوسکتے ہیں ۔ در مختار کی کتاب الوقف میں ہے : ليس للقاضي عزل الناظر بمجرد شكاية المستحقين حتىٰ يثبتوا عليه خيانة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورت کا اوقاف پر متولیہ ہونا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

عورت اگر دیانت دار اور عقل و فراست والی ہے اور پردہ نشینی کے سبب اپنے نائب کے ذریعہ سے اوقاف کے کام کو انتظام اور امانت داری کے ساتھ انجام دے سکتی ہے تو شرعاً اس کو اوقاف پر متولیہ بنانا درست ہے۔ الاسعاف فی احکام الاوقاف صفحہ ۴۱ باب الولایۃ میں ہے: و لا یولی الا امین قادر بنفسہ او بنائبہ لأن الولایۃ مقیدۃ بشرط النظر و لیس من النظر تولیۃ الخائن لأنہ یخل بالمقصود و کذا تولیۃ العاجز لأن المقصود لا یحصل بہ، و یستوی فیہا الذکر و الأنثی و کذا الأعمیٰ و البصیر و کذلک المحدود فی القذف اذا تاب لأنہ امین۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے ذاتی چند ملکیات و مکان کو مسجد کے لئے وقف کیا۔ اور اس جائداد کے ٹکس کی معافی کی درخواست سرکار میں پیش کرکے ٹکس معاف کروایا، اور اس کے آٹھ (۸) سال بعد فوت ہوگیا۔ زید کے فرزند بکر کو اب وقف سے انکار ہے اور کہتا ہے کہ وقف نہیں ہے بلکہ باپ نے محض ٹکس سے بچنے کے لئے اس قسم کی درخواست بلدیہ میں پیش کی تھی۔ پس بکر کا یہ ادعاء زید کی درخواست کے خلاف شرعاً کہاں تک قابل لحاظ ہوگا؟ اور ملکیات و مکان کے وقف کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب

اگر زید کا مکان و ملکیات کو وقف کرنا بینہ شرعیہ (شرعی شہادت) سے ثابت ہے تو مکان و ملکیات زید کی عین حیات ہی اس کی ملک سے خارج ہوگئے۔ زید کو خود بھی اپنی زندگی میں وقف سے رجوع کرنے کا حق نہیں تھا۔ اب اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کو اس میں کوئی حق نہیں، اور نہ خلاف بینہ شرعیہ ورثاء کا قول قابل لحاظ ہوسکتا ہے۔ در مختار کی کتاب الوقف میں ہے: فیلزم فلا یجوز لہ ابطالہ و لا یورث عنہ و علیہ الفتویٰ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید متولی عاشورخانۂ موقوفہ لا ولد فوت ہوا۔ اور ورثاء میں ایک خواہر عینی، دو زوجگان چھوڑیں۔ جائداد موقوفہ کو زید نے اپنے ننھیال سے پایا تھا۔ اور یہ سلسلہ تولیت زمانہ شاہان قطب شاہی سے برابر زید ہی کے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ پس حسب شرع شریف حق تولیت کس کو حاصل ہے؟

الجواب

متولی اوقاف وہی ہوسکتا ہے جو امانت دار ہو اور وقف کا انتظام کرسکے ، مرد یا عورت کی اس میں خصوصیت نہیں ہے ۔ اگر عورت میں انتظام کی صلاحیت اور امانت داری ہے تو اوقاف کی متولیہ بن سکتی ہے ۔ الاسعاف فی احکام الاوقاف کے صفحہ ۳۱ باب الولایۃ میں ہے : لا یولی الا امین قادر بنفسہ او بنائبہ لان الولایۃ مقیدۃ بشرط النظر و لیس من النظر تولیۃ الخائن لانہ یخل بالمقصود و کذا تولیۃ العاجز لان المقصود لا یحصل بہ و یستوی فیھا الذکر و الانثیٰ و کذا الاعمیٰ و البصیر و کذلک المحدود فی القذف اذا تاب لانہ امین ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ خواہر حسینؔ کا زید کے ساتھ رشتہ قوی ہے اس لئے اگر وہ امانت دار ہے اور انتظام کی صلاحیت کی حامل ہے تو اسی کو تولیت دی جائے ۔ ورنہ زوجگان میں جو اہل ثابت ہو اس کو دی جائے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایک زمین قبرستان اندرون رقبۂ درگاہ کا متولی ہے ۔ زید کی بلا اجازت کسی اجنبی شخص کو اس زمین میں اموات دفن کرنے کا حق ہے یا نہیں ہے ؟

الجواب

متولی اوقاف چونکہ منجانب سرکار اوقاف کا نگران و محافظ ہوتا ہے ، اس لئے اس کی بلا اجازت کسی اجنبی شخص کو اوقاف میں مداخلت و تصرف کا حق حاصل نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص مکان یا زمین کو وقف کرکے اس کے لئے متولی مقرر کرے ، تو بغیر خیانت کے بادشاہِ وقت اس متولی کو معزول کرسکتا ہے یا نہیں ؟ اور واقف کو متولی بنانے کا اختیار ہے یا نہیں ؟

الجواب

متولی مقرر کرنے کا حق واقف کی حین حیات واقف ہی کو ہے ، اس کے مقرر کئے ہوئے متولی کو بدون خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کرسکتا ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۲۲ کتاب الوقف میں ہے : ولایۃ نصب القیم الی الواقف ثم لوصیہ ثم للقاضی ۔ اور صفحہ ۳۴۲ میں ہے : لیس للقاضی عزل الناظر بمجرد شکایۃ المستحقین حتیٰ یثبتوا علیہ خیانۃ ۔ رد المحتار میں ہے : عن الاشباہ لا یجوز للقاضی عزل الناظر المشروط لہ النظر بلا خیانۃ و لو عزلہ لا یصیر الثانی متولیا و یصح عزلہ لو منصوب القاضی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

۱ ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زمین موقوفہ زیر مسجد جس کا محلہ وغیرہ بارش سے منہدم ہوگیا ، اور متولی مسجد عدم استطاعت کے سبب سے اس کو دوبارہ نہ بناسکا ۔ ایک شخص اجنبی اس زمین پر قبضہ کرکے اس کی آمدنی اپنے تصرف میں لارہا ہے ۔ کیا اس کا قبضہ شرعا درست ہے یا نہیں ؟

۲ ۔ نابالغ کو اگر چچا سے مخالفت ہو تو چچا ایسے نابالغ کا ولی بن سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

۱ ۔ صورت مسئولہ میں شخص قابض غاصب ہے ، اور اس کا قبضہ قطعا جائز نہیں ۔

۲ ۔ نابالغ کو اگر بلا وجہ شرعی چچا سے مخالفت ہے تو اس مخالفت کا اثر اس کی ولایت پر نہیں پڑسکتا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کے حوض کے پتھر کو بیچ کر اس کی قیمت سے صحن کا فرش بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

مسجد یا حوض و رباط جبکہ شکستہ ہوجائیں اور لوگوں کو ان کی ضرورت نہ رہے ، تو ایسے وقت میں ان کے انقاض یعنی پتھر لکڑی وغیرہ کو کسی دوسری مسجد و حوض و رباط میں باجازت قاضی صرف کرنا شرعا جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۸۲ میں ہے : و لو خرب ما حوله و استغنی عنه يبقی مسجدا عند الامام و الثانی رحمهما الله تعالی ابدا الی قيام الساعة (و به يفتی) حاوی القدسی (و عاد الی المِلک) ای مِلک البانی او ورثته (عند محمد) و عن الثانی رحمه الله ينقل الی مسجد آخر باذن القاضی (و مثله) فی الخلاف المذکور (حشيش المسجد و حصيره مع الاستغناء عنهما و) کذا (الرباط و البئر اذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد و الرباط و البئر) و الحوض (الی اقرب مسجد او رباط او بئر) او حوض (اليه) ۔ رد المحتار میں ہے : و الذی ينبغی متابعة المشايخ المذکورين فی جواز النقل بلا فرق بين مسجد و حوض کما افتیٰ به الإمام ابو الشجاع و الإمام الحلوانی و کفی بهما قدوة و لا سيما فی زماننا فان المسجد او غيره من رباط او حوض اذا لم يُنقل يأخذ انقاضَه اللصوصُ و المتغلبون کما هو مشاهَد و کذلک اوقافه يأکلها النُظّار او غيرهم و يلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج الی النقل اليه ۔

اسی طرح اگر کسی مسجد یا متعلقات مسجد کے انقاض یعنی پتھر یا لکڑی وغیرہ جبکہ وہ غیر ضروری و بے کار ثابت ہوں تو ان کو فروخت کرکے مسجد کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا شرعا جائز ہے ۔ رد المحتار میں اسی مقام میں ہے : ثم رأيت الآن فی الذخيرة قال و فی فتاویٰ النسفی سئل شيخ الاسلام من اهل قرية

رحلوا و تداعی مسجدھا الی الخراب و بعض المتغلبة یستولون علی خشبه و ینقلونه الی دورھم ھل لواحد من اھل المحلة ان یبیع الخشب بأمر القاضی و یمسک الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی ھذا المسجد ؟ قال نعم ۔ الاسعاف فی احکام الاوقاف کے صفحہ ۴۳ میں ہے : و لو بسط من ماله حصیرا فی المسجد و استغنی عنھا فانھا تکون له ان کان حیا و لورثته ان کان میتا عند محمد رحمه اللّٰه تعالی و ان بلیت کان له ان یبیعھا و یشتری بثمنھا حصیرا اخری ، و ھکذا الحکم لو اشتری قندیلا و نحوه للمسجد و استغنی عنه ۔ و عند ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالی یباع و یصرف ثمنه فی حوائج المسجد ۔ و ان استغنی عنه ھذا المسجد یحول الی مسجد آخر ۔ و ھذا الاختلاف بناءاً علی الاختلاف فی المسجد عینه و ان استغنی عنه لخراب ما حوله ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر مسجد کے لئے حوض کی ضرورت نہیں ہے اور حوض شکستہ ہوگیا ہے تو اس کے پتھر یا ان کی قیمت سے مسجد کے فرش کی تعمیر کرنا جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

(صفحہ ۳۵۰ بھی دیکھا جائے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب کسی مسجد کی آمدنی اس قدر وسیع ہو کہ اس کے حوائج اور ضروریات سے بچ رہتی ہے ۔ اور اگر اس مسجد کے موجودہ مصارف میں بلحاظ کثرت آمدنی زیادتی کی جائے تو اسراف ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں از روئے شرع شریف اس کی فاضل آمدنی کو دوسری مسجد میں جہاں ضرورت ہے صرف کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

ایک مسجد کی فاضل آمدنی دوسری مسجد یا مدرسہ میں یا فقراء پر صرف کرنا شرعاً ناجائز ہے ۔ بلکہ اس فاضل آمدنی سے اسی مسجد کے لئے جائداد خریدنا چاہیے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار مصری جلد ۳ صفحہ ۳۸۳ میں ہے ، اتحد الواقف و الجھة و قل مرسوم بعض الموقوف علیه بسبب خراب وقف احدھما جاز للحاکم ان یصرف من فاضل الواقف علیه لأنھما حینئذ کشیء واحد ، و ان اختلف احدھما بأن بنی رجلان مسجدین او رجل مسجدا و مدرسة و وقف علیھما اوقافا لا یجوز له ذلک ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری کی جلد ۲ صفحہ ۴۶۳ میں ہے ، الفاضل من وقف المسجد ھل یصرف الی الفقراء ؟ قیل ، لا یصرف و انه صحیح و لکن یشتری به مستغلا کذا فی المحیط ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک زمین مصارف مسجد کے لئے سرکار سے وقف ہے ۔ جس کے متولی محمد غوث تھے ۔ ان کی وفات کے بعد شیخ داود و غلام حسین فرزندان محمد غوث کے نام اس کی

تولیت ہوئی ۔ اس زمین پر شیخ داود کا ایک قرض خواہ زید ڈگری لانا چاہتا ہے ۔ کیا از روئے شریعت متولی کے ذاتی قرضہ کی ڈگری جائداد موقوفہ پر ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائداد موقوفہ شرعاً کسی کی ملک نہیں ہے ۔ اس پر ملک کے احکام اصلاً نافذ نہیں ہوسکتے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۰۸ کتاب الوقف میں ہے ، فاذا تم و لزم لا یملک و لا یملک و لا یعار و لا یرھن و لا یقسم ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا زمین موقوفہ پر شیخ داود متولی کے ذاتی قرضہ کی ڈگری لانا شرعاً جائز نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوگیا ۔ اس کے سات لڑکے ہیں ۔ کیا زید کا لڑکا بکر تنہا تمام جائداد پدری کو بلا اطلاع دوسرے بھائیوں کے وقف کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

وقف کی شرائط سے ملک بھی ایک شرط ہے ، یعنی شئے موقوف وقف کے وقت واقف کی ملک میں رہے ۔ فتاوی عالمگیریہ مصری جلد ۲ صفحہ ۳۵۳ کتاب الوقف میں ہے ، (و منہا) الملک وقت الوقف ۔ صورت مسئولہ میں بکر کو اپنے حصہ کے وقف کرنے کا اختیار ہے ۔ دوسرے بھائیوں کا حصہ چونکہ اس کی ملک نہیں ہے اس لئے اس کے وقف کرنے کا بکر کو حق نہیں ہے ۔ در صورت وقف کرنے کے یہ وقف باطل ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایک مسجد کا متولی ہے ۔ مسجد کے جانب شمال زید کا مکان واقع ہے ۔ اور اس کے مکان کے متصل شاہراہ عام نذدہ ہے ۔ مسجد کے دو ۲ راستے ہیں ، ایک راستہ جانب شرق کوچۂ ناظرہ جو مسجد سے تخمیناً پچاس ساٹھ قدم فاصلہ پر شاہراہ عام سے ملا ہے ۔ اور دوسرا راستہ مسجد کی جانب شمال متولی کے وسط مکان سے ہوتے ہوئے تخمیناً تیس چالیس قدم کے فاصلہ پر شاہراہ عام سے ملا ہے ، اور اسی راستہ کے اختتام پر شاہراہ عام سے تخمیناً سات آٹھ قدم پر مسجد کا قدیم دروازہ سنگ بستہ موجود ہے ۔ مسجد چونکہ متولی کے دو منزلہ مکان کے بالکل عقب میں واقع ہے اس لئے شاہراہ عام سے اصلاً نمایاں نہیں ہوتی ، اور نہ دروازہ پر کوئی علامت مسجد کی ہے کہ جس سے راہرو مسجد کو دریافت کرسکیں ۔ البتہ محلہ کے بعض واقف لوگ اس راستہ سے آتے ہیں ، اور اکثر مصلیوں کی آمد و رفت مسجد کے شرقی دروازہ سے جو کوچۂ ناظرہ میں واقع ہے ہوا کرتی ہے ۔ مسجد کی جانب شمال جو راستہ کہ متولی کے مکان میں واقع ہے اس سے

اکثر مسجد میں سے پانی لے جانے والوں کی آمد و رفت ہوا کرتی ہے ، اس آمد و رفت سے متولی کا اسباب متعدد اوقات چوری ہوگیا اور ہر وقت چوری کا اندیشہ رہتا ہے ۔ ایسی حالت میں جبکہ اس راستہ کے باقی رہنے سے شاہراہِ عام کے چلنے والوں کو مسجد دکھائی دیتی ہے اور نہ دروازہ پر کوئی علامت ہے جس سے اجنبی شخص مسجد جان کر نماز کے لئے آئے ۔ البتہ بے نمازی پانی لینے والے اس راستہ سے آتے ہیں جن سے ہر وقت متولی کے مال کے تلف کا اندیشہ ہے ۔ متولی کا ارادہ ہے کہ اس راستہ کو بند کرکے اس کی زمین کا نزول جو از روئے پیمائش چالیس درعہ ہے مسجد کی آمدنی میں داخل کرے ، اور ایک نیا دروازہ مسجد کے جانبِ شرق کوچۂ نالہ میں شاہراہِ عام سے تخمیناً پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر اپنی ذاتی رقم سے قائم کردے ۔ پس از روئے شرع شریف متولی کا ایسا کرنا جس میں مسجد اور مصلیوں کے لئے کوئی حرج نہیں ہے بلکہ مسجد کے لئے ایک جدید آمدنی قائم ہوجاتی ہے اور متولی کو بھی امن ملتا ہے ، جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

مسجد کا دروازہ ایک مقام سے بند کرکے دوسرے مقام میں نصب کرنا شریعت میں اہل محلہ و اہل مسجد کی صوابدید پر رکھا گیا ہے ۔ یعنی محلہ کے اکثر معتبر اشخاص اس بات کو مناسب جانتے ہیں تو ایک جگہ سے بند کرکے دوسری جگہ دروازہ کھولنا جائز ہے ۔ عالمگیریہ مصری کی جلد ۲ صفحہ ۴۵۹ کتاب الوقف میں ہے : فی الکبری مسجد اراد اهله ان یجعلوا الرجعة مسجدا و المسجد رجعة و اراد ان یحدثوا له بابا و ارادوا ان یحولوا الباب عن موضعه فلهم ذلک فان اختلفوا نظر ایهم اکثر و افضل فلهم ذلک کذا فی المضمرات ۔ الاسعاف فی احکام الاوقاف مصری کے صفحہ ۸۹ میں ہے : و لو حول اهل المحلة باب المسجد من موضع الی موضع آخر جاز ۔ فتاویٰ قاضی خان مطبوعہ کشوری کے صفحہ ۲۹۸ میں ہے : و لأهل المحلة تحويل باب المسجد من موضع الی موضع ۔ مسجد کے دروازہ سے چونکہ تمام مصلیان محلہ کی آمد و رفت ہوا کرتی ہے ، اس لئے شریعت میں دروازہ کا منتقل کرنا مصلیوں کی آمد و رفت کی سہولت کے لحاظ کرتے ہوئے انھیں کی رائے اور مصلحت پر رکھا گیا ہے ۔ پس صورت مسئولہ میں بھی جبکہ متولی خود بھی اہل مسجد و اہل محلہ سے ہے اس لئے اگر متولی کی اس رائے کے ساتھ اکثر و معتبر اہل محلہ شریک ہوں تو متولی کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے شمالی دروازہ کو بند کرکے اس کے معاوضہ میں جانبِ شرق شاہراہ عام سے قریب دروازہ کشادہ کرے ۔

ف : مسجد کی موقوفہ زمین کو اگر متولی اجرت سے لینا چاہے تو شریعت میں اس کی اجازت ہے ، مگر شرط یہ ہے کہ متولی اس زمین کی اجرت مقررہ اجرت سے ڈیوڑھی ادا کرے ۔ یعنی اگر اس زمین کو لوگ ایک روپیہ کرایہ سے لیتے ہیں ، تو متولی ڈیڑھ روپیہ کرایہ دے کر اس کو لے سکتا ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۴۳ کتاب الوقف میں ہے : و کذا المتولی آجر من نفسه لو خیرا صح و الا لا ۔ و معنی الخیر ان یأخذ بخمسة عشر ما یساوی عشرة او یبیع منه بعشرة ما یساوی خمسة عشر و به یفتی ۔

صورت مسئولہ میں حسبِ صواب دید اعیانِ محلہ ، شمالی دروازہ مسدود ہوجانے کے بعد اس کی زمین کو

متولی ڈیوڑھے کرایہ پر اپنے استعمال کے لئے لے سکتا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید متولی نے ایک زمین وقفی عمرو کو اجرت سے دی ، جس پر عمرو نے گلی (دکان) بنائی تھی ، اور یہ اقرار نامہ لکھدیا تھا کہ ایک گلی ٹین پوش جس کا عملہ میرا زر خریدہ و مملوکہ ہے جس کا نزول ماہانہ ۲ آنہ زید متولی کو دیاکروں گا ۔ اس کے بعد وہ گلی سیلاب و طغیانی میں بہہ گئی ، اور ایک سال یا دو سال تک وہ زمین افتادہ رہی ۔ اس زمانہ میں عمرو نے اس کا نہ تو نزول اداء کیا اور نہ ہی دوبارہ گلی بنائی اس ملئے زید نے بلا اطلاع عمرو کے اس زمین پر گلی بنادی اور اس کی آمدنی مصارف وقف میں خرچ کرتا رہا ۔ اب عمرو چاہتا ہے کہ اپنے حقِ قبضہ کے لحاظ سے دوبارہ بنی گلی کے اخراجات اداء کرکے اس پر متصرف ہوجائے اور حسبِ قرار دادِ سابق نزول اداء کیا کرے ۔کیا حق قبضہ عمرو کا پھر عود کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

زمین موقوفہ جبکہ اجرت پر کسی شخص کو مکان بنانے کے لئے دی جائے ، اور وہ اس پر مکان نہ بنا کر ایک عرصہ تک اس کو بے کار رکھے تو ایسی حالت میں متولی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس زمین کو کسی دوسرے شخص کو اجرت پر دیدے ۔ خصوصاً جبکہ متولی خود وقف کی آمدنی زیادہ ہونے کے لئے وہاں کوئی تعمیر کرنا چاہتا ہے تو متولی کو اس معاملہ کے فسخ کرنے کا بدرجہ اولیٰ حق حاصل ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ مصری جلد ۲ صفحہ ۳۴۷ کتاب الوقف میں ہے ؛ سئل فی ناظر آجر ارض الوقف الخالیۃ عن البناء لامرأۃ مسانھۃ باُجرۃ المثل و اذنھا بالبناء علی ان ما بنتہ و جددتہ فیھا یکون ملکا لھا مستحق البقاء و القرار فاستمرت واضعۃ یدھا علی الارض مدۃ سنین و لم تجدد فیھا شیئا فاراد آخر استئجارھا من الناظر فھل یصح و الحال ھذہ ؟ اجاب ؛ اذا آجر الناظر عقار الوقف لآخر مسانھۃ باُجرۃ المثل و اذنہ بالبناء و العمارۃ علی ان یکون جمیع ما یجددہ خلوا لہ مستحق البقاء و القرار صح ذلک فان بنی المستاجر لا ینتزع العقار من یدہ ما دام قائما بدفع اجرۃ المثل و ان لم یجدد شیئا یکون للناظر الاجارۃ فی آخر کل سنۃ ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۱۰ کتاب الوقف میں ہے ؛ و لیس لہ الاقالۃ الا ان کانت اصلح للوقف ۔ اور در مختار کی اسی جلد کے صفحہ ۴۳۱ میں ہے ؛ للمتولی الاقالۃ لو خیرا ۔

پس صورت مسئولہ میں جبکہ عمرو نے ایک عرصہ تک زمین موقوفہ بلا تعمیر و ادائے نزول بے کار چھوڑی ہے ، اس لئے اب متولی کا اس زمین پر مسجد کی آمدنی کے لئے گلی تعمیر کرنا شرعاً صحیح ہے ۔ اور عمرو کو قیمت دیکر اس کے واپس لینے کا حق نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشائخین کرام کے پاس یہ معمول ہے کہ کسی مورث کی

قائم مقامی و جانشینی یعنی تولیت اوقاف کے لئے جبکہ ورثاء مساوی درجہ کے ہوں تو ان میں جو کلاں ہو وہی جانشین و متولی ہونے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس عملدرآمد و رواج کے متعلق شرع شریف میں کیا حکم ہے ؟

الجواب

ورثاء میں جب سب مساوی درجہ کے ہوں، تو جو بڑا ہو وہی تولیت کا مستحق ہے۔ بناء بریں مشائخین عظام کے پاس اولاد اکبر کو جانشین و متولی بنانے کا جو طریقہ مروج ہے وہ شریعت کے مطابق ہے۔ اور اس میں مرد و عورت برابر ہیں۔ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف مطلب فی شرط التولیۃ الأرشد فالأرشد میں ہے: فیقدم بعد الاستواء فیه الأسن ولو انثی۔ الإسعاف فی احکام الأوقاف باب الولایۃ علی الوقف میں ہے: و لو جعل الولایۃ لأفضل اولاده و کانوا فی الفضل سواء یکن لأکبرهم سناً. ذکرا کان او انثیٰ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے اجداد کی بنائی ہوئی مسجد کا متولی تھا، جس کے بارے میں محکمہ سرکار میں تولیت کی کارروائی جاری تھی۔ دوران کارروائی زید کا انتقال ہوگیا۔ زید نے ورثاء میں دو فرزند کمسن چھوڑے۔ کیا ان فرزندوں کو بر بنائے توریث، تولیت کی سند مل سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

واقف کے اقارب جب موجود ہوں تو اجنبی کو ان کے مقابل متولی بنانا درست نہیں ہے، بناء بریں زید کے فرزند ہی متولی ہونے کے مستحق ہیں۔ مگر سر دست چونکہ یہ کمسن ہیں اس لئے ان کے بالغ ہونے تک زید کے قرابت داروں میں سے کسی متدین شخص کو نگران و متولی مقرر کیا جائے، اور بعد بلوغ فرزند ان کو متولی بناکر سند عطاء کی جائے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف میں ہے: و ما دام احد یصلح للتولیۃ من اقارب الواقف لا یجعل المتولی من الأجانب لأنه اشفق و من قصده نسبۃ الوقف الیهم۔ رد المحتار میں (و ما دام احد) کی شرح میں ہے: و لا یجعل القیم فیه من الاجانب ما وجد فی ولد الواقف و اهل بیته من یصلح لذلک فان لم یجد فیهم من یصلح لذلک فجعله الی اجنبی ثم صار فیهم من یصلح له صرف الیه۔ رد المحتار کے صفحہ ۴۹۰ میں ہے: و یشترط للصحۃ بلوغه و عقله لا حریته و اسلامه لما فی الاسعاف لو اوصی الی صبی تبطل فی القیاس مطلقا و فی الاستحسان هی باطلۃ ما دام صغیرا فاذا کبر تکون الولایۃ له۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید متولی مسجد نے پانچ قطعہ ملگی (دکانات) اور ایک قطعہ

مکان اپنی ذاتی رقم سے بناکر معافی ٹکس کے لئے سرکار میں درخواست پیش کی ۔ اور یہ ظاہر کیا کہ یہ مسجد کے لئے وقف ہیں ۔ کیا اس بیان سے یہ وقف سمجھے جائیں گے ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

مالک جائداد اگر اپنی جائداد کے متعلق یہ کہدے کہ یہ وقف ہے تو بر بنائے عرف اس بیان سے وقف ثابت ہوجاتا ہے ۔ حسبِ صراحت اس کی آمدنی مسجد کی ضروریات میں صرف کی جائے گی ۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب الوقف فصل فی الألفاظ التی یتم الوقف بها میں ہے : و ذکر الوقف وحده او الحبس معه یثبت به الوقف علی ما هو المختار و هو قول ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالی کذا فی الغیاثیة ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف میں ہے : و اکتفی ابو یوسف بلفظ " موقوفة " فقط قال الشهید و نحن نفتی به للعرف ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله و اکتفی الخ) ای بدون ذکر تأبید او ما یدل علیه کلفظ صدقة او لفظ المساکین و نحوه کالمسجد ۔ البحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۲۰۰ کتاب الوقف میں ہے : الخامس " موقوفة " فقط لا یصح الا عند ابی یوسف فانه یجعلها بمجرد هذا اللفظ موقوفة علی الفقراء و اذا کان مفیدا لخصوص المصرف اعنی الفقراء لزم کونه مؤبدا لأن جهة الفقراء لا تنقطع قال الصدر الشهید و مشایخ بلخ یفتون بقول ابی یوسف و نحن نفتی بقوله ایضا لمکان العرف ۔ الاسعاف فی احکام الاوقاف کے صفحہ ۱۴ میں ہے : و لو قال وقفت ارضی هذه علی عمارة المسجد الفلانی یجوز عنده لأنه لو لم یزد علی قوله " وقفت " یجوز عنده فبالأولی اذا عین جهته ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی ذاتی زمین مسجد کے لئے وقف کی ، اور اس پر مسجد تعمیر ہوئی جس کا خود زید متولی تھا ۔ اب وہ مقام ویران ہوگیا اور مسجد باقی نہیں رہی ۔ ایسی حالت میں کیا زید یا اس کا کوئی وارث یا کوئی اجنبی شخص اس زمین پر مکان بناکر اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

مسجد کے ویران و منہدم ہوجانے کے بعد بھی اس کی زمین بر بنائے قول مفتیٰ بہ قیامت تک مسجد ہی سمجھی جاتی ہے ، اس لئے اس زمین کو مسجد کے سوا کسی اور کام میں لینا شرعاً درست نہیں ہے ۔ پس چاہیئے کہ اس زمین کو غلاظت وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر حصار کھینچ دی جائے ، اور جب کوئی وہاں مسجد بنانا چاہے تو اجازت دی جائے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف میں ہے : و لو خرب ما حوله و استغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام و الثانی ابدا الی قیام الساعة و به یفتی ۔ رد المحتار میں ہے : و کذا لو خرب و لیس له ما یعمر به و قد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر ۔ و اللّٰہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ متولی مسجد یا کوئی اور شخص اگر مسجد کی زمین میں آم وغیرہ کے درخت لگائے تو کیا اس کا ثمرہ مسجد کی ضروریات میں صرف ہوگا ؟ یا درخت لگانے والا اس کا مستحق سمجھا جائے گا ؟ اسی طرح مسجد کے حوض میں اگر کسی نے مچھلیاں چھوڑیں یا کہیں سے خود بخود آگئیں تو ان کا مالک کون ہوگا ؟

الجواب

مسجد کی زمین میں جو درخت نصب کئے جاتے ہیں وہ مسجد کی ملک ہیں ۔ اس لئے ان کا ثمرہ مسجد کی ضرورتوں میں صرف کیا جائے ۔ مچھلیوں کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے ۔ الإسعاف فی احکام الأوقاف صفحہ ۹۱ فصل فی غرس الواقف وغیرہ میں ہے : و لو غرس في المسجد يكون للمسجد لأنه لا يغرس فيه ليكون ملكاً ثم ان كان لها ثمرة كالتفاح مثلا اباح بعضهم للقوم الأكل منها و الصحيح انه لا يباح لأنها صارت للمسجد فتصرف في عمارته ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی مسجد کے زائد از ضرورت سامان کو فروخت کرکے اس کی رقم دوسری مسجد کی ضرورتوں میں صرف کرنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر دو ۲ مسجدوں کے بانی و واقف علحدہ علحدہ ہیں تو ایک مسجد کی زائد از ضرورت اشیاء کا دوسری مسجد میں صرف کرنا جائز نہیں ہے ۔ اور اگر دونوں مسجدیں ایک ہی شخص کی بنائی ہوئی اور وقف کی ہوئی ہیں تو پھر ایک کا سامان بہ وقت ضرورت دوسری پر صرف کرسکتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۸۴ کتاب الوقف میں ہے : اتحد الواقف و الجهة و قل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف احدهما جاز للحاكم ان يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه لأنهما كشيء واحد ، و ان اختلف احدهما بأن بنىٰ رجلان مسجدين او رجل مسجدا و مدرسة و وقف عليهما اوقافا لا يجوز له ذلك ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر متولی مسجد کی جائداد فروخت کرکے اپنے تصرف میں لائے تو کیا وہ تولیت کی خدمت پر قائم رہ سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

یہ شخص خائن ہے ، تولیت کی خدمت سے علحدہ کردیا جائے ۔ الاسعاف کے صفحہ ۴۱ باب الولایۃ میں ہے : لا یولی الا امین قادر بنفسہ او بنائبہ لأن الولایۃ مقیدۃ بشرط النظر و لیس من النظر تولیۃ الخائن لأنہ یخل بالمقصود ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اگر اپنی جائداد کو بایں شرط وقف کرے کہ اس میں ربیعین کے وعظ ہوں ، اور متولی وقف سکونت کرے ۔ تو کیا ایسے مکان میں متولی سکونت رکھ سکتا ہے ؟ اور اس کی تعمیر و ترمیم بھی اسی کے ذمہ رہے گی یا نہیں ؟ اور اس مکان کے تحت جو ملگیاں (دکانیں) ہیں واقف اگر ان کی آمدنی اپنی ذات پر وقف کرے تو کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

واقف جو شروط بیان کرتا ہے ان کی پابندی لازمی ہے ۔ بناء بریں متولی حسب صراحتِ واقف ، مکانِ موقوفہ میں سکونت کرسکتا ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ کتاب میں ہے : و یراعی فیہا شروطہ سواء کان سلطانا او امیرا او غیرھما ۔ موقوفہ مکان میں جو شخص سکونت کرے گا اس کی تعمیر و ترمیم اسی کے ذمہ ہوگی ، اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ اپنے مال سے اس کی تعمیر کرے اور اسی حالت پر قائم رکھے جس حالت پر کہ واقف نے وقف کیا ہے ۔ واقف کی موقوفہ عمارت سے زائد تعمیر کرنا درست نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۹۲ کتاب الوقف میں ہے : (و لو) کان الموقوف دارا (فعمارتہ علی من لہ السکنیٰ) و لو متعددا من مالہ لا من الغلۃ اذ الغرم بالغنم ۔ درر (و لم یزد فی الأصح) یعنی انما تجب العمارۃ علیہ بقدر الصفۃ التی وقفھا الواقف ۔

واقف اگر جائداد موقوفہ کی آمدنی اپنی ذات کے لئے وقف کرے تو کرسکتا ہے ۔ در مختار میں اسی جگہ صفحہ ۳۹۸ میں ہے : و جاز جعل غلۃ الوقف او الولایۃ لنفسہ عند الثانی رحمہ اللہ تعالی و علیہ الفتویٰ ۔ رد المحتار میں ہے : لو وقف علیٰ نفسہ قیل لا یجوز و عن ابی یوسف جوازہ و ھو المعتمد ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو اگر سلطانِ وقت مکان یا زمین بر بنائے تملیک عطاء کرے تو کیا زید اس کو وقف کرسکتا ہے ؟

الجواب

جو زمین کہ سلطان سے بر بنائے تملیک عطاء ہوئی ہے اگر یہ سلطان کی ملک تھی یا اس کا کوئی مالک

ہوا۔ پھر وصی نے اپنے جانشین کے لئے تولیت کی وصیت کی۔ کیا ایسے شخص کو جو کہ متولی کے وصی کا وصی ہے خدمتِ تولیت سے علٰحدہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

واقف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی حین حیات جس کو چاہے متولی مقرر کردے۔ پھر متولی کو یہ حق ہے کہ اپنی وفات کے وقت جس کو اہل سمجھے متولی بنادے۔ اسی طرح وصی کے وصی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت کسی کو اپنا جانشین و وصی بنادے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وصی متدین ہو اور متولی ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۲۲ کتاب الوقف میں ہے: (ولایۃ نصب القیم الی الواقف ثم لوصیہ ثم) اذا مات المشروط له بعد موت الواقف و لم یوص لاحد فولایۃ النصب (للقاضی)۔ رد المحتار میں ہے: و وصی الوصی کالوصی۔ اسی صفحہ میں ہے: فان اوصی زید لعمرو فلعمرو مثل ما کان لزید۔ قال فی انفع الوسائل فقد جعل وصی الوصی بمنزلۃ الواقف۔ صفحہ ۴۹۹ میں ہے: و ینزع وجوبا لو الواقف غیر مامون او عاجزا او ظهر به فسق کشرب خمر و نحوه۔ پس صورت مسئولہ میں وصی کا وصی اگر متدین ہے اور تولیت کی اہلیت رکھتا ہے تو خدمتِ تولیت سے علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ واقف کی وفات کے بعد، اس کے ورثاء میں سے کوئی شخص موقوفہ جائداد کسی کو ھبہ کردے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جائداد موقوفہ وقف کی تکمیل کے بعد کسی کی ملک نہیں رہتی، اس لئے کا ھبہ وغیرہ شرعا درست نہیں ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۰۸ کتاب الوقف میں ہے: فاذا تم و لزم لا یملک و لا یملک۔ رد المحتار میں ہے: ای لا یکون مملوکا لصاحبه و لا یقبل التملیک لغیره بالبیع و نحوه۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ "متولیِ وقف" کی کیا تعریف ہے؟ اور اس کی شروط کیا ہیں؟

الجواب

اوقاف پر نگران، جو کہ اوقاف کی آمدنی کو مستحقین پر صرف کرتا ہے، اور اوقاف کی ضروریات کی

تکمیل کرتا ہے، اور اوقاف کو تلف ہونے سے بچانا اور نگہداشت کرتا ہے، اور مزدوروں و کارکنوں سے کام لیتا ہے اور ان پر اپنا حکم نافذ کرتا ہے ایسے شخص کو، قیم، ناظر اور متولی کہتے ہیں۔ اور اس کی شروط یہ ہیں کہ یہ متدین یعنی امانت دار، عاقل، بالغ اور کام کی قابلیت رکھنے والا ہو۔ فاسق، فاجر، کیمیا میں اپنا مال صرف کرنے والا مسرف نہ ہو۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ باب الولی میں ہے: و الولاية تنفيذ القول على الغير۔ رد المحتار میں تحت قول و الولایۃ مذکور ہے: و افاد ان المذكور في المتن غير خاص بهذا الباب بل منه ولاية الوصي و قيم الوقف و ولاية وجوب صدقة الفطر بناء على ان المراد بتنفيذ القول ما يكون في النفس او في المال او فيهما معا۔ فتح القدیر جلد ۵ صفحہ ۴۵۱ میں ہے: و ليس على الناظر ان يفعل الا ما يفعله امثاله من الامر و النهي بالمصالح و يصرف الأجر من مال الوقف للعملة بأيديهم۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۹۰ کتاب الوقف میں ہے: و ينزع وجوبا و لو الواقف غير مامون او عاجزا او ظهر به فسق كشرب الخمر و نحوه۔ فتح، او كان يصرف ماله في الكيمياء۔ رد المحتار میں ہے: قال في الإسعاف و لا يولى الا امين قادر بنفسه او بنائبه لأن الولاية مقيدة بشرط النظر و ليس من النظر تولية الخائن لأنه يخل بالمقصود و كذا تولية العاجز لأن المقصود لا يحصل به و يستوي فيه الذكر و الانثى و كذا الاعمىٰ و البصير و كذا المحدود في القذف اذا تاب۔ صفحہ ۳۹۰ میں ہے: و يشترط للصحة بلوغه و عقله لا حريته و اسلامه۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کتنے آدمیوں کی گواہی سے وقف ثابت ہوتا ہے؟

الجواب

دو ۲ مرد، یا ایک ۱ مرد اور دو ۲ عورتوں کی گواہی سے وقف ثابت ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ زمین موقوفہ کے حدود وغیرہ واضح طور پر بیان کردیے جائیں۔ بدائع صنائع جلد ۶ صفحہ ۲۷۷ کتاب الشهادة میں ہے: ثم الشرط عدد المثنى في عموم الشهادات القائمة على ما يطلع عليه الرجال الا في الشهادة بالزنا۔ عالمگیریہ جلد ۳ کتاب الشهادة میں ہے: منها الشهادة بغير الحدود و القصاص و ما يطلع عليه الرجال و شرط فيها شهادة رجلين او رجل و امرأتين سواء الحق مالا او غير مال كالنكاح و الطلاق و العتاق و الوكالة و الوصية ونحو ذلك مما ليس بمال كذا في التبيين۔ بزازیہ مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیریہ جلد ۶ کتاب الوقف میں ہے: شهدا بأنه وقف ارضه و لم يحدها لنا و لكنا نعرف ارضه، لا تقبل شهادتهما لجواز ان يكون له ارض اخرىٰ، و ان بيّنا و عرفاه تقبل۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اوقاف میں شہادت سماعی یعنی گواہوں سے سنکر گواہی دینا معتبر ہے یا نہیں ؟

الجواب

معتبر ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۱۵ کتاب الوقف میں ہے : و تقبل فیہ الشهادة علی الشهادة و شهادة النساء مع الرجال و الشهادة بالشهرة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سرکاری زمین پر مکان بناکر وقف کرنا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر زمین ، سرکار سے اجارۂ دائمی پر لی گئی ہے تو درست ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۰۳ مطلب وقف البناء بدون الارض کے تحت لکھا ہے : قال فی الإسعاف و ذکر فی اوقاف الخصاف ان وقف حوانیت الأسواق یجوز ان کانت الأرض باجارة فی ایدی الذین بنوها لا یخرجهم السلطان عنها من قبل انا رأیناها فی ایدی اصحاب البناء توارثوها و تقسم بینهم لا یتعرض لهم السلطان فیها و لا یزعجهم و انما له غلة یأخذها منهم و تداولها خلف عن سلف و مضی علیه الدهور و هی فی ایدیهم یتبایعونها و یؤجرونها و تجوز فیها وصایاهم و یهدمون بناءها و یعیدونه و یبنون غیره فکذا الوقف فیها جائز ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو مسجد کہ شکستہ و منہدم ہوگئی ہے اور وہاں کوئی آبادی بھی نہیں رہی ہے ، ایسے ویران مقام کی افتادہ و منہدمہ مسجد کا ملبہ اگر آبادی کی جدید مسجد میں جو اس کے قریب ہی تیار ہو رہی ہے لگایا جائے تو شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

قدیم مسجد کے آس پاس جبکہ آبادی نہیں ہے اور مسجد منہدم و ویران ہوگئی ہے ، تو اس کا ملبہ سرکار کی اجازت سے آبادی کی مسجد میں لگا سکتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف مطلب فی نقل انقاض المسجد و نحوہ میں ہے : و عن الثانی رحمه اللّٰه تعالیٰ ینقل الی مسجد آخر باذن القاضی (و مثله) فی الخلاف المذکور (حشیش المسجد و حصیره مع الاستغناء عنها و) کذا (الرباط و البئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد و الرباط و البئر) و الحوض (الی اقرب مسجد او رباط او

بئر) اور حوض (الیہ)۔ اگرچہ اس بارے میں متقدمین نے عدم جواز کا حکم دیا ہے اور اس زمانہ میں بھی قول مشتیٰ یہ رہا، مگر متاخرین نے اس کو اس وجہ سے جائز قرار دیا ہے کہ اگر یہ کسی دوسری مسجد میں نہ لگائے جائیں گے تو ضرور چور یا جابر اشخاص اٹھالے جائیں گے، یا ناظر اوقاف اپنے تصرف میں لائیں گے۔ ایسی حالت میں دو خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ جدید مسجد جو اس کی محتاج تھی بے تعمیر رہ جائے گی، دوسری یہ کہ بانی مسجد کی اصلی غرض کہ اس کی بناء کردہ عمارت راہ خدا میں کام آئے ہمیشہ کے لئے مفقود ہوجائے گی۔

مصنف رد المحتار علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا تھا کہ دمشق کی جامع اموی میں فرش کرنے کے لئے ایک ویران مسجد کا پتھر لینا درست ہے یا نہیں؟ علامہ نے متقدمین فقہاء کے عدم جواز کے قول پر اس کو ناجائز بتایا۔ اس کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ بعض جابر اشخاص اس ویران مسجد کے پتھر کو اپنے تصرف میں لارہے ہیں، اور اس طرح ایک مال موقوف تباہ ہو رہا ہے تو علامہ کو اپنے سابق فتویٰ پر بڑی ندامت ہوئی، پھر انہوں نے ذخیرہ میں دیکھا کہ متاخرین نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے تو علامہ کی رائے بعد میں جواز ہی پر قائم ہوئی۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے: و الذی ینبغی متابعة المشایخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد و حوض کما افتی بہ الإمام ابو الشجاع و الإمام الحلوانی و کفی بھما قدوة و لا سیما فی زماننا فان المسجد وغیرہ من رباط او حوض اذا لم ینقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد و کذلک اوقافہ یأکلھا النظار او غیرھم و یلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج الی النقل الیہ و قد وقعت حادثة سئلت عنھا فی امیر اراد ان ینقل بعض احجار مسجد خراب فی سفح قاسیون بدمشق یبسط بھا صحن الجامع الأموی فأفتیت بعدم الجواز متابعة للشرنبلالی ثم بلغنی ان بعض المتغلبین اخذ تلک الأحجار لنفسہ فندمت علی ما افتیت بہ ثم رأیت الآن فی الذخیرة قال و فی فتاویٰ النسفی سئل شیخ الإسلام عن اھل قریة رحلوا و تداعی مسجدھا الی الخراب و بعض المتغلبة یستولون علی خشبہ و ینقلونہ الیٰ دُورھم ھل لواحد من اھل المحلة ان یبیع الخشب بأمر القاضی و یمسک الثمن لیصرفہ الی بعض المساجد او الی ھذا المسجد؟ قال: نعم۔ و حکی انہ قد وقع مثلہ فی زمن سیدنا الإمام الأجل فی رباط فی بعض الطرق خرب و لا ینتفع المارة بہ و لہ اوقاف عامرة فسئل ھل یجوز نقلھا الی رباط آخر ینتفع الناس بہ؟ قال: نعم لأن الواقف غرضہ انتفاع المارة و یحصل ذلک بالثانی۔

صورت مسئولہ میں ویران مسجد کے پتھر کو چوروں اور غاصبوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ قریب کی مسجد میں باجازت سرکار اس کو لگایا جائے، جس سے ویران مسجد کے بانی کی غرض بھی پوری ہوگی، اور پتھر بھی تلف ہونے سے محفوظ ہوجائے گا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سامان منقولہ مثلاً میز، کرسی، ہتھیار، گھوڑے وغیرہ وقف

کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

درست ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الوقف مطلب فی وقف المنقول قصدا میں ہے: و کما صح ایضا وقف کل منقول قصدا فیہ تعامل للناس کفاس و قدوم بل و دراھم و دنانیر۔ رد المحتار میں ہے: کما لا خلاف فی صحۃ وقف السلاح و الکراع ای الخیل للآثار المشھورۃ و الخلاف فیما سوی ذلک فعند ابی یوسف لا یجوز و عند محمد یجوز ما فیہ تعامل من المنقولات و اختارہ اکثر فقھاء الأمصار کما فی الھدایۃ و ھو الصحیح کما فی الاسعاف و ھو قول اکثر المشایخ کما فی الظھیریۃ لأن القیاس قد یترک بالتعامل۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اوقاف کی آمدنی سے جو مدارس قائم ہیں ان کے مدرسین کو اور اہل خدماتِ شرعیہ مثلاً قاضیوں وغیرہ کو تعطیل کے ایام کی ماہوار لینا درست ہے یا نہیں ؟ اور اگر مدرسین تدریس کے لئے آمادہ ہیں مگر طلباء حاضر ہوکر درس نہ لیں تو کیا ایسے ایام کی ماہوار بھی مدرسین کو دینا پڑے گا ؟

الجواب

مدرسین اور قاضیوں وغیرہ کو ایام تعطیل مثلاً جمعہ، عیدین و رمضان شریف وغیرہ کی ماہوار لینا جائز ہے۔ اسی طرح جن ایام میں کہ مدرس آمادہ رہیں اور طلباء غیر حاضر ہوں ان ایام کی ماہوار بھی لینا درست ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۱۲ میں ہے: و ھل یأخذ ایام البطالۃ کعید و رمضان لم ارہ و ینبغی الحاقہ ببطالۃ القاضی و اختلفوا فیھا و الأصح انہ یأخذ لأنہ للاستراحۃ۔ اسی صفحہ میں رد المحتار میں ہے: فحیث کانت البطالۃ معروفۃ فی یوم الثلثاء و الجمعۃ و فی رمضان و العیدین یحل الأخذ و کذا لو بطل فی یوم غیر معتاد لتحریر درس۔ اسی صفحہ میں عبارت بالا کے ما فوق ہے: سئل المصنف عمن لم یدرس لعدم وجود الطلبۃ فھل یستحق المعلوم ؟ اجاب: ان فرغ للتدریس بأن حضر المدرسۃ المعینۃ لتدریسہ استحق المعلوم۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عین حیات اپنی جائداد کا کچھ حصہ طالبان علم، اور اپنی قرابت کے محتاجوں، اور ان کے بعد فقراء و مساکین کے لئے وقف کیا۔ قبل اس کے کہ اس کی نگرانی و حفاظت کے لئے کسی متولی کو مقرر کرے زید کا انتقال ہوگیا۔ ورثاء کا بیان ہے کہ یہ شرعی وقف نہیں ہے۔ کیونکہ واقف نے اس کو وقف کے بعد کسی متولی کے سپرد نہیں کیا بلکہ خود اس کا متولی رہا حالانکہ وقف کے

لئے متولی کے سپرد کرنا لازم ہے ، اور اس وقف میں دوام تابیہ کا لفظ بھی نہیں ہے ۔ کیا یہ جائداد وقف شرعی سمجھی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب

لزوم وقف کے لئے جائداد موقوفہ کا متولی کے سپرد کرنا امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہے ۔ مگر امام ابویوسف رحمہ اللہ کے پاس محض زبان سے کہنے سے وقف لازم ہوجاتا ہے ، جائداد کو متولی کے سپرد کرنا ضروری نہیں ہے ، جس پر ائمہ ثلاثہ اور اکثر علماء و مشائخین بلخ کا اتفاق ہے اور ظاہر مذہب بھی یہی ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب الوقف باب اول میں ہے : و اذا کان الملک یزول عندھما یزول بالقول عند ابی یوسف رحمہ اللّٰہ تعالی و ھو قول اکثر اھل العلم و علی ھذا مشایخ بلخ و فی المنیۃ و علیہ الفتویٰ کذا فی فتح القدیر و علیہ الفتویٰ کذا فی السراج الوھّاج ۔ اسی صفحہ میں ہے : و کذا جعل الولایۃ لنفسہ یصح عند ابی یوسف رحمہ اللّٰہ تعالی و ھو ظاھر المذھب ۔

وقف کے لئے دوام شرط تو ہے مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس دوام کا لفظ زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے اور یہی قول صحیح ہے ۔ صفحہ ۳۶۰ میں ہے : و منھا التأبید و ھو شرط علی قول الکل و لکن ذکرہ لیس بشرط عند ابی یوسف و ھو الصحیح ھکذا فی الکافی ۔ صفحہ ۳۸۶ میں ہے : و لو لم یذکر الصدقۃ و لکن ذکر الوقف و قال ارضی ھذہ وقف او جعلت ارضی ھذہ وقفا او موقوفۃ فانہ یکون وقفا علی الفقراء عند ابی یوسف رحمہ اللّٰہ و قال الصدر الشھید و مشایخ بلخ یفتون بقول ابی یوسف رحمہ اللّٰہ و نحن نفتی بقولہ ایضا لمکان العرف ۔ ھذا اذا لم یذکر الفقراء اما اذا ذکر فقال ارضی ھذہ موقوفۃ علی الفقراء و کذا فی الألفاظ الثلاثۃ یکون وقفا عند ابی یوسف رحمہ اللّٰہ و کذا عند ھلال رحمہ اللّٰہ لأنہ زال الاحتمال بالتنصیص علی الفقراء کذا فی الخلاصۃ ۔

و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب البیوع

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چرم قربانی جو بطور بیع سلم بیچے جاتے ہیں، ان میں اچھے، برے، بے کار سب شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ بعض غیر قابل الانتفاع ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی بیع سلم درست ہے؟

الجواب

چرم کی بیع اس وقت جائز رکھی گئی ہے جبکہ اس کی مقدار یعنی طول و عرض، اور اس کی قسم یعنی گائے اور بکری کا، اور ان کی تعداد واضح طور پر بیع سلم کے وقت بیان کردی جائے۔ چنانچہ فتاویٰ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۲۱۳ میں ہے: قال في الفتح و لا في الجلود عددا و كذا في الأخشاب و الجوالقات و الفراء و الثياب المخيطة و الخفاف و القلانس الا ان يذكر العدد لقصد التعدد في المسلم فيه ضبطا للكمية ثم يذكر ما يقع به الضبط لكن يذكر في الجلود مقدارا من الطول و العرض بعد النوع كجلود البقر و الغنم۔ اور ذخیرہ میں ہے: ان بين الجلود ضربا معلوما يجوز لانتفاء المنازعة۔

بیع سلم کی صحت کے لئے فقہاء نے سات شروط مقرر کی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی فوت ہو تو بیع سلم ناجائز ہے۔ منجملہ ان کے ایک شرط بیان صفت مسلم فیہ ہے، یعنی پہلے ہی سے یہ بیان کردیا جائے کہ مشتری کو مبیع مسلم فیہ جید یعنی عمدہ دی جائے گی یا ردی یعنی خراب۔ ہدایہ طبع مصطفائی باب السلم صفحہ ۹۰ میں ہے: و لا يصح السلم عند ابي حنيفة الا بسبع شرائط جنس معلوم كقولنا حنطة او شعير، و نوع معلوم كقولنا سقية او بخسية، و صفة معلومة كقولنا جيد او ردي۔ فتاویٰ شامی جلد ۴ صفحہ ۲۱۱ میں ہے: (و شرطه) اي شروط صحته التي تذكر في العقد السبعة (بيان جنس) بيان نوع (كسقي او بعلي) (و صفة) كجيد او ردي الخ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر پہلے ہی سے عمدہ اور خراب کی علاحدہ علاحدہ قیمت ٹھہرا کر ہر ایک کی الگ الگ بیع کرلی جائے تو اس قسم سے بیع سلم درست ہے ورنہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں مشتری کا نقصان ہے، جو بہ وقتِ اخذ مبیع جھگڑا پیدا کرنے والا ہے۔ ہدایہ طبع مصطفائی باب السلم صفحہ ۹۴ میں ہے: و كل ما امكن ضبط صفته و معرفة مقداره جاز السلم فيه لأنه لا يفضي الي المنازعة۔ و ما لا يضبط صفته و لا يعرف مقداره لا يجوز السلم فيه لأنه دين و بدون الوصف يبقي مجهولا جهالة تفضي الي المنازعة۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو سے کوئی چیز بغرض امتحان لی کہ بعد امتحان و تصدیق خریدی جائے گی۔ حالت امتحان میں شئے مبیع جو بغرض امتحان مشتری کے ہاتھ میں گئی تھی مشتری کے فعل اضطراری کے سبب ٹوٹ گئی۔ صورت مسئولہ میں مشتری کے ہاتھ سے جو نقصان بائع کا ہوا ہے اس کا عوض بائع کو ملے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب

جو چیز امتحان اور آزمائش کی غرض سے لی جاتی ہے اور جس کے جانچنے اور دکھا لینے کے بعد بیع و شراء ٹھہرنے والی ہے، ایسی چیز کو مشتری اگر عمداً تلف نہ کرے بلکہ اس کے فعل اضطراری سے تلف ہوجائے تو شرعاً اس کا مشتری پر کوئی تاوان واجب نہیں ہے۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵۳ میں ہے: (اما علیٰ سوم النظر فغیر مضمون مطلقا) بأن یقول هاته حتیٰ انظر الیه او حتیٰ اریه غیری و لا یقول فان رضیته اخذته - (و قوله مطلقا) ای سواء ذکر الثمن او لا۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایک جائداد عمرو کے پاس بطریق بیع بالوفاء بمعاوضہ مبلغ معین رکھنا چاہتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ مدت معینہ تک اگر جائداد واپس لی جائے تو فبہا، ورنہ بعد انقضائے مدت وہ جائداد عمرو کی ملک ہوجائے گی، اور روپیہ زید کی ملک۔ اور اس اثناء میں جو کچھ منافع اس جائداد سے حاصل ہوگا اس کا مالک عمرو ہوگا اور اس کی تعمیر و ترمیم وغیرہ عمرو ہی کے ذمہ رہے گی۔ آیا اس طریقہ سے بیع بالوفاء جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

بیع وفاء کے طریقہ سے جو چیز رکھی جاتی ہے اس کا حکم بعینہٖ رہن کا ہے۔ یعنی جو احکام شرعاً بعد رہن شئے مرہونہ کے ہیں، مبیع بہ بیع بالوفاء کے بھی وہی احکام ہیں۔ فتاویٰ ہندیہ کی جلد ۵ صفحہ ۲۶۳ کتاب الرہن میں ہے: قد وقع الاختلاف فی بیع الوفاء و الذی علیه اکثر المشایخ منهم السید الامام ابو شجاع و القاضی الامام ابو علی السغدی ان حکمه حکم الرهن و افتی بذلک العلامة الرملی و فی تنقیح الفتاوی الحامدیة و لا ریب فی ان بیع الوفاء حکمه حکم الرهن فی جمیع الاحکام علیٰ ما علیه الاکثر کما فی الخیریة و حاوی الزاهدی و هو الصحیح کما فی جواهر الفتاویٰ۔

شئے مرہونہ سے نفع حاصل کرنے کے متعلق شرعاً یہ حکم ہے کہ اگر راہن نے مرتہن کے لئے اس سے نفع حاصل کرنا بخوشی تمام بلا کسی مجبوری کے مباح کردیا ہے اور اجازت بھی دے دی ہے تو ایسی حالت میں مرتہن کا اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۲۰ مطبوعہ مصر

میں ہے: (لا الانتفاع به مطلقا) حالا باستخدام و لا سكنى و لا لبس و لا اجارة و لا اعارة سواء كان من مرتهن و راهن (الا باذن) كل للآخر ۔ مگر اس صورت کو بھی فقہاء نے بر بنائے احتیاط مکروہ تحریر کیا ہے، اور وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ اس میں ربا یعنی سود کا شبہ و شائبہ ہے ۔ حموی شرح الاشباہ و النظائر طبع مصطفائی صفحہ ۲۱۰ میں ہے: و الاحتياط في الاجتناب عنه قلت لما فيه من شبهة الربا ۔

اگر مرتہن (اشیاء لیکر قرض دینے والا) نے راہن (چیز دیکر قرض لینے والا) سے بوقت رہن یہ شرط ٹھہرائی ہے کہ شئے مرہونہ سے مرتہن ہر قسم کے منافع حاصل کرنے کا مجاز ہے، تو ایسی صورت میں مرتہن کے لئے شئے مرہونہ سے نفع حاصل کرنا حرام ہے ۔ کیونکہ یہ قرض بالنفع کی صورت ہے، جو سود ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام ہے ۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ صفحہ ۳۲۰ مطبوعہ مصر کتاب الرہن میں ہے: ثم رأيت في جواهر الفتاوىٰ اذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة و هو ربا و الا فلا بأس ۔

اور اگر مرتہن راہن کے اس مباح کردہ نفع کو اس نیت سے قبول کرتا ہے کہ یہ اس رہن کا نفع ہے ۔ اگر راہن اس کو میرے لئے مباح نہ کرتا تو میں ہرگز رقم نہ دیتا، پس یہ صورت بھی بعینہ شرط کی صورت ہے جو سابق میں ناجائز بتلائی گئی ہے ۔ رد المحتار شامی جلد ۵ صفحہ ۳۲۰ مطبوعہ مصر کتاب الرہن میں ہے: و الغالب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الدفع الانتفاع و لولاه لما اعطاه الدراهم و هذا بمنزلة الشرط لأن المعروف كالمشروط و هو مما يعين المنع ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ پیسوں کو روپیہ کے معاوضہ میں بازار کے نرخ سے زائد بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو تھوڑی زیادتی سے درست ہے یا جس قدر چاہے؟ اور اس تجارت میں کیا تقابض فی المجلس شرط ہے یا نہیں؟

الجواب

پیسوں کو روپیہ کے معاوضہ میں بازار کے نرخ سے زائد خریدنا اور بیچنا جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بائع اور مشتری میں سے کوئی ایک اپنے بدل کو نقد یعنی ایجاب و قبول کی مجلس ہی میں اداء کردے ۔ اگر دونوں ایک مجلس میں بیع و شراء کی بات چیت کرکے علٰحدہ ہوجائیں اور اس کے بعد ہر ایک اپنے بدل کو اداء کرے تو یہ بیع ناجائز ہے ۔ در مختار کی کتاب البیوع باب الربا میں ہے: (باع فلوسا بمثلها او بدراهم او بدنانير فلن نقد احدهما جاز) و ان تفرقا بلا قبض احدهما لم يجز لما مر ۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۱۹۲ کتاب البیوع باب الربا میں ہے: في البزازية لو اشترىٰ مائة فلس بدرهم يكفي التقابض من احد الجانبين قال و مثله لو باع فضة او ذهبا بفلوس كما في البحر عن المحيط ۔

اگر کوئی شخص کسی کو روپیہ قرض دے اور یہ شرط لگائے کہ میں ادائی کے وقت تجھ سے اس روپیہ کا خردہ (چلر) بازار کے نرخ سے زائد لوں گا، تو اس طرح کا قرض دینا اور لینا حرام ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ

۱۸۲ کتاب البیوع باب القرض میں ہے : و فی الخلاصة القرض بالشرط حرام و الشرط لغو بأن یقرض علیٰ ان یکتب به الیٰ بلد کذا ۔ فی الأشباہ کل قرض جر نفعا حرام ۔

اگر معاملہ بظاہر قرض کے الفاظ سے نہ کیا جائے اور جائز بنانے کے لئے یہ حیلہ کیا جائے کہ قرض لینے والے کو قرض دینے والا یہ کہے کہ ۔ جس قدر رقم تم چاہتے ہو میں تم کو قرض نہیں دیتا بلکہ میں اس رقم سے تمہارے ساتھ غُردہ کا بیوپار کرتا ہوں ، یعنی یہ روپیہ خردہ کی قیمت ہے ، روپیہ اس وقت لے جاؤ اور مدت معینہ پر اس کا خُردہ بازار کے نرخ سے اس قدر زائد مجھے اداء کرنا " تو یہ معاملہ بیع عینہ ہے جو شرعاً مکروہ و مذموم ہے ، اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس کی برائی کو بڑے بڑے پہاڑوں کے مشابہ بیان فرمایا ہے ۔ در مختار کی کتاب الکفالۃ میں ہے : بیع العین بالربح نسیئة لیبیعها المستقرض بأقل لیقضی دینه اخترعه آکلة الربا و هو مکروہ و مذموم شرعا لما فیه من الاعراض عن مبرۃ الاقراض ۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے : (قوله و هو مکروہ) ای عند محمد و به جزم فی الهدایة ۔ و قال محمد هذا البیع فی قلبی کأمثال الجبال ذمیم اخترعه آکلة الربا و قد ذمهم رسول الله صلی الله علیه و سلم فقال " اذا تبایعتم بالعینة و اتبعتم اذناب البقر ذللتم و ظهر علیکم عدوکم " ای اذا اشتغلتم بالحرث عن الجهاد ۔ فی روایة " سلط علیکم شرارکم فیدعو خیارکم فلا یستجاب لکم " ۔ و قیل : ایاک و العینة فانها لعینة ۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۲۵۵ کتاب البیوع باب الصرف میں ہے : اختلف المشایخ فی تفسیر العینة التی ورد النهی عنها قال بعضهم تفسیرها ان یاتی الرجل المحتاج الی آخر و یستقرضه عشرۃ دراهم و لا یرغب المقرض فی الاقراض طمعا فی فضل لا یناله بالقرض فیقول لا اقرضک و لکن ابیعک هذا الثوب ان شئت باثنی عشر درهما و قیمته فی السوق عشرۃ لیبیعه فی السوق بعشرۃ فیرضی به المستقرض فیبیعه کذلک فیحصل لرب الثوب درهمان و للمشتری قرض عشرۃ ۔ و قال بعضهم هی ان یدخلا بینهما ثالثا فیبیع المقرض ثوبه من المستقرض باثنی عشر درهما و یسلم الیه ثم یبیعه المستقرض من الثالث بعشرۃ و یسلم الیه ثم یبیعه الثالث من صاحبه هو المقرض بعشرۃ و یسلمه الیه و یأخذ منه العشرۃ و یدفعها للمستقرض فیحصل للمستقرض عشرۃ و لصاحب الثوب علیه اثنا عشر درهما ۔ کذا فی المحیط ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ، ضروریات معیشت کی تکمیل کے لئے ہر طرح سے مجبور ہوکر سود سے روپیہ لینا چاہتا ہے ۔ کیا ایسا کرنا شرعا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

سود دینے والا شرعاً گنہگار ہے ، اور حدیث شریف میں سود کھانے والے ، کھلانے والے ، اس معاملہ کو لکھنے والے اور اس پر گواہی دینے والے اشخاص پر لعنت وارد ہے ۔ عینی شرح بخاری جلد ۵ صفحہ ۳۲۶ کتاب البیوع

فصل مؤکل الربا میں ہے: ان مؤکل الربا و آکلہ آثمان۔ فتاویٰ کمالیہ مصری صفحہ ۲۸۲ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے: و قد ورد فی ذم آکل الربا من الاحادیث ما لا یحصی فمنها: لعن اللہ آکل الربا و مؤکلہ و کاتبہ و شاهدہ کلهم فی اللعنۃ سواء۔

معیشت دنیاوی کی مجبوری و تنگ دستی سود کے لین دین اور دیگر محرمات شرعی کو اصلا جائز نہیں کرتی، البتہ جبکہ کسی انسان پر فاقہ کشی ہے "مخمصہ" یعنی جان جانے کی حالت آجائے جب اس کے لئے جان بچنے کے موافق حرام چیز کا کھانا پینا شرعا جائز ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے: (الاکل) للغذاء و الشرب للعطش و لو (من حرام او میتۃ او مال غیرہ) و ان ضمنہ (فرض) یثاب علیہ بحکم الحدیث و لکن (مقدار ما یدفع) الانسان (الهلاک عن نفسہ و مأجور علیہ)۔ جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ کتاب الکراهۃ الباب الحادی عشر میں ہے: اکل المیتۃ حالۃ المخمصۃ قدر ما یدفع الهلاک لا باس بہ کذا فی السراجیۃ۔ صفحہ ۳۳۸ میں ہے: خاف الهلاک عطشا و عندہ خمر لہ شربہ قدر ما یدفع العطش ان علم انہ یدفعہ کذا فی الوجیز للکردری۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جن اشیاء کا استعمال شرعا حرام ہے مثلا حریر، طلاء، خمر، خوک، افیون، بھنگ، گل مہوا، سیندھی، تاڑی، کوکین وغیرہ اور ان کے سواء دوسری اشیاء مثلاً تمباکو اور ماہی خلنک وغیرہ، کیا شرعاً مسلمانوں کے لئے ان کا بیوپار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

جس چیز کا استعمال شرعاً حرام ہے اس کی بیع و شراء یعنی تجارت مسلمانوں کے لئے چاہے وہ کافر و مشرک کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو شرعا نا جائز ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۴ صفحہ ۱۰۸ کتاب البیوع باب بیع فاسد میں ہے: (و) بطل (بیع مال غیر متقوم) ای غیر مباح الانتفاع بہ ابن کمال فلیحفظ (کخمر و خنزیر و میتۃ لم تمت حتفا بالثمن) ای بالدین کدراهم و دنانیر و مکیل و موزون بطل فی الکل۔ عالمگیریہ مصری جلد ۳ صفحہ ۱۱۶ کتاب البیوع فصل بیع محرمات میں ہے: و لا یجوز بیع الحر و الخمر و الخنزیر و المیتۃ۔ کذا فی التهذیب۔ پس صورت مسئولہ میں خمر، خوک، افیون، بھنگ، سیندھی، تاڑی، کوکین وغیرہ جن کا استعمال شرعاً حرام ہے ان کا بیوپار بھی نا جائز ہے۔

حریر و طلاء کا پہننا مسلمان مردوں کے لئے اگرچہ حرام ہے مگر عورتوں کے لئے ان کا استعمال جائز ہے، اس لئے ان کی بیع و شراء درست ہے۔ گل مہوا اگر خالی کھانے سے نشہ پیدا کرتا ہے تو اس کا بیوپار بھی ناجائز ہے، اور اگر نشہ نہیں پیدا کرتا تو درست ہے۔ کیونکہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے اور فی نفسہ وہ خلقی نہیں ہیں، شراب نکالنے والوں کے ہاتھ ان اشیاء کا بیچنا شرعا جائز ہے۔ عالمگیریہ کے اسی صفحہ میں ہے: و لا باس ببیع العصیر ممن یتخذها خمرا و لا بیع الأرض ممن یتخذها کنیسۃ کذا فی التاتارخانیۃ۔

تمباکو کے مباح و مکروہ ہونے میں چونکہ اختلاف ہے اس لئے اس کا بیوپار نا جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ماہی خشک کے استعمال میں جبکہ کوئی قباحت نہیں، اور پیاز و لہسن وغیرہ بودار اشیاء جن کو خام استعمال کرکے مسجد میں جانا بدبو کی وجہ سے اگرچہ شرعاً ممنوع کیا گیا ہے مگر ان کا بیوپار بلا کلام جائز ہے۔ تو مچھلی جیسی حلال چیز جس کی تعریف قرآن شریف میں لَحْمٌ طَرِیٌّ کے ساتھ کی گئی ہے خشک ہونے کے بعد بدبو کی وجہ سے کس طرح اس کی تجارت میں کلام ہوسکتا ہے!! و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید تاجر ہے، اور بکر سے ایک ہزار روپیہ تجارت کے لئے اس وعدہ سے لینا چاہتا ہے کہ جو نفع ہوگا وہ نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔ بکر روپیہ دینا تو چاہتا ہے مگر یہ وعدہ بھی لینا چاہتا ہے کہ بصورتِ نقصان اس کی عین رقم یعنی ایک ہزار (۱۰۰۰) روپیہ میں کسی قسم کی کمی نہ ہو۔ کیا ایسا وعدہ سود کی تعریف میں داخل ہوگا یا نہیں؟

الجواب

روپیہ ایک شخص کا ہو، اور دوسرا شخص اس کی تجارت کرے، اور نفع میں دونوں شریک رہیں، شرع شریف میں اس معاملہ کو "مضاربت" کہا جاتا ہے۔ اب اگر مضاربت میں صاحب مال یہ شرط رکھے کہ نفع تو نصف نصف ہوگا مگر مال تلف ہوجانے کی صورت میں مضارب یعنی تاجر اس کا ضامن ہوگا، تو ایسی شرط فاسد ہے اور اس سے نفس معاملہ مضاربت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مضاربت صحیح اور شرط نا قابل اعتبار ہے۔ اس شرط کے بعد مضارب یعنی تاجر کی احتیاط و کافی نگہداشت کے باوجود نرخ کے اختلاف یا کسی ایسے سبب سے جس کے پیدا ہونے میں تاجر کی جانب سے کوئی افراط و تفریط نہ ہو اور مال تلف ہوجائے تو اس مال کی بھرپائی نفع سے کی جائے گی، اور نفع نہ ہونے کی صورت میں صاحب مال کا نقصان سمجھا جائے گا، تاجر پر اس کا ضمان نہیں اگرچیکہ تاجر بوقت معاملہ نقصان کا ضامن تھا۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۳ صفحہ ۵۱۳ کتاب المضاربۃ میں ہے: شرط الخسران على العامل فاسد و لا يوجب فساد المضاربة و اذا كانت المضاربة صحيحة و حصل فيها خسران بعد الربح و قسمته قبل الفسخ يجبر الخسران من الربح و لا يعتبر الشرط المذكور و يترادان الربح ليجبر الخسران منه۔ صفحہ ۴۹۱ میں ہے: خسران مال المضاربة على رب المال بعد جبره بالربح ان وجد و القول للمضارب في الربح و الخسران مع اليمين و لا يلزم المضارب شيء من الخسران و لو التزمه و كتبه على نفسه۔ صفحہ ۴۲۲ میں ہے: شرط الخسران على المضارب باطل و المضاربة على حالها فاذا حصل خسران في مال المضاربة بدون تعدٍ و لا تفريط من العامل كأن يتنازل الأسعار و نحوه لا يضمنه المضارب و لو شرط عليه ذلك فلا يطالب العامل بشيء من الخسران المذكور حيث لم يوجد في المضاربة ربح سابق اصلا۔ قال في الدرر من كتاب المضاربة نقلا عن الجلالية كل شرط يوجب جهالة في الربح او يقطع الشركة فيه يفسدها و الا

بطل الشرط و صح العقد اعتبارا بالوكالة ۔ قال في حواشيه للسيد الطحطاوي : (قوله و الا بطل الشرط) اى ان لم يكن واحدا منهما كاشتراط الخسران على المضارب اھ حلبي۔ او عليهما ، حموي ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص چرم کے بدلے جس میں تیل یا گھی وغیرہ ڈالا جاتا ہے تیار کرکے بیوپار کرتا ہے۔ کیا یہ شخص شرعاً گنہگار ہے ؟

ایک قاضی نے چند جاہلوں کی ترغیب سے مولود شریف کی ایک مجلس میں یہ کہا کہ : آئندہ سے مسلمان اس شخص سے راہ و رسم ترک کردیں اور اس کی دعوت وغیرہ میں شریک نہ ہوں اور نہ اس کو اپنی محفلوں میں شریک کریں ۔ جب حاضرین نے اس کی شرعی وجہ دریافت کی تو یہ بیان کیا کہ اس وقت شرع کو بازو رکھو ، میں ان لوگوں کی خوشی کے لئے یہ حکم دیتا ہوں ۔ پس ایسے شخص کے لئے جو کہ ایسا حکم دے اور ایک دیندار شخص کی اس دھندے کی وجہ سے جبکہ اس نے اس کو ترک بھی کردیا ہے اس طرح ہتک کرے شرعاً کیا حکم ہے ؟ اور جو مسلمان قاضی کے حکم سے اس کے ساتھ ترک موالات کریں ان کے لئے کیا حکم ہے ؟

الجواب

ذبح کئے ہوئے جانور یا مردار کے چمڑے کا دباغت دینے کے بعد بیوپار کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا شرع میں جائز ہے ۔ ہدایہ جلد ۲ صفحہ ۳۹ کتاب البیوع میں ہے : و لا بأس ببيعها و الانتفاع بها بعد الدباغ لأنها طهرت بعد الدباغ ۔ بناء بریں چمڑے کے بدلے بناکر بیوپار کرنے والا جو اکثر مذبوحہ جانور کے چمڑے سے بناتا ہے شرعاً گنہگار نہیں ہے ، اور نہ اس میں کوئی برائی ہے ۔

مقامی قاضی نے راہ و رسم بند کرنے کے متعلق جو مسلمانوں کو حکم دیا وہ خلاف شریعت ہے ۔ خصوصاً قاضی کا یہ کہنا کہ " اس وقت شرع کو بازو رکھو " اس میں شرع سے انکار اور شرع کی توہین ہے جو کفر ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ مصری جلد ۲ صفحہ ۲۸۱ میں ہے : و الاستهزاء بأحكام الشرع كفر كذا في المحيط ۔ اور استہزاء کے معنی منتہی الارب میں اس طرح لکھے گئے ہیں : (استهزاء) فسوس کردن و انکار چیزے نمودن ۔ غیاث اللغات میں ہے : فسوس بکسر اول و واو مجہول بازی و ظرافت و تمسخر ۔ بیضاوی شریف مطبوعہ مجتبائی کے صفحہ ۲۱ میں ہے : الاستهزاء السخرية و الاستخفاف ۔ پس قاضی کو چاہیئے کہ انکار شریعت سے جو شرعاً ارتکاب کفر ہے توبۂ واثق کرکے اپنی نجات حاصل کرے ۔

قاضی نے بلا وجہ شرعی ایک مسلمان کی توہین و ایذاء رسانی کی ہے ، اس کے معاوضہ میں تعزیر و تنبیہ کا مستحق ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۳ صفحہ ۱۸۷ میں ہے : و عزر كل مرتكب منكر او مؤذي مسلم بغير حق بقول او فعل و لو بغمز العين ۔ اور تعزیر و تادیب شرعیہ میں حاکم وقت کی رائے پر رکھی گئی ہے کہ حسب حیثیت ہر ایک کو تنبیہ کرے ۔ اسی جگہ صفحہ ۱۸۳ میں ہے : التعزير (ليس فيه تقدير بل هو مفوض الى رأي القاضي) و عليه مشايخنا ۔ زيلعي ، لأن المقصود منه الزجر و

احوال الناس فیہ مختلفۃ ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر نے ہندہ کے ساتھ نکاح کیا ، بوقت نکاح ہندہ کی ذاتی جائداد منقولہ تخمیناً چار سو کی تھی اور بکر بلا جائداد تھا ۔ اس کے بعد بکر نے ہندہ کا ذاتی زیور رہن رکھ کے قرض حاصل کیا اور اس سے ایک زمین ہندہ کے نام سے خریدی ، اس کے بعد رہن کا زیور چھڑایا ۔ پھر ہندہ کو بکر نے طلاق دیدی ، اور مہر نہیں ادا کیا گیا تھا کہ ہندہ بکر کے پاس واپس ہوئی اور بمثل سابق تعلقات عود کئے ۔ اس کے بعد بکر نے اسی خرید کردہ قطعہ کے متصل ایک زمین مع مکان ہندہ کے نام سے ہندہ کا زیور بیچکر خریدی ، اور ایک تیسرا قطعہ زمین کا اپنے روپیہ سے ہندہ کے نام خریدا ، اور تینوں قطعات کو ملا کر عمدہ مکانات بنوائے ، اور جس قدر ہندہ کا زیور بیچا تھا وہ بھی بنوادیا ، بلکہ ہندہ کے زیور کے وزن سے زیادہ وزن و قیمت کا سابق سے زائد زیور ہندہ کو بنواکر دیا ۔ اور بہت سا اسباب بھی ہندہ کو فراہم کیا ۔ ہندہ کہتی ہے کہ : یہ سب جائداد منقولہ و غیر منقولہ مالیتی تخمیناً تین ہزار روپیہ میری ملک ہے ۔ کیا یہ تمام جائداد شرعاً ہندہ کی ملک ہے یا بکر کی ؟

الجواب

بکر نے جو ہندہ کا ذاتی زیور رہن رکھکر قرض لیا ہے اور اس رقم سے ہندہ کے نام سے زمین خریدی ہے ، اگر یہ قرضہ کی رقم بکر نے ہندہ کے کہنے سے ہندہ کے لئے لی ہے اور اسی کے کہنے سے اس کے نام پر زمین بھی خریدی ہے تو یہ زمین ہندہ کی ملک ہے ، اور بکر اس فعل میں ہندہ کا وکیل بالاستقراض و وکیل بالشراء ہے ۔ اس کے بعد بکر نے ہندہ کا مرہونہ زیور جو اپنی ذاتی رقم اداء کرکے چھڑوایا ہے وہ رقم بکر کی ہندہ پر قرض ہے ۔ اور اگر بکر کا یہ فعل ہندہ کے کہنے اور مامور کرنے پر نہیں تھا بلکہ بکر نے ہندہ کا زیور اپنی ذات کے لئے بطور قرض لیا ہے اور ہندہ کے کہنے اور مامور کرنے کے بغیر اس رقم سے زمین ہندہ کے نام سے خریدی ہے حالانکہ اس کو خود اپنے لئے لینا تھا تو ایسی حالت میں بکر ہندہ کی جانب سے فضولی ہے ، جو بلا اجازت اور بلا امر ہندہ کے اس کے لئے خرید رہا ہے ۔ پس اس وقت اگر بکر نے بائع سے یہ کہا ہے کہ میں اس زمین کو ہندہ کے لئے لیتا ہوں اور بائع نے اس کو منظور کرلیا ہے تو خریدی ہندہ کی اجازت پر موقوف تھی ۔ اس کے بعد اگر ہندہ کو اس کی اطلاع دی ہے اور ہندہ نے اس کی اجازت بھی دی ہے تو یہ زمین ہندہ کی ملک ہے اور رقم ہندہ کے ذمہ قرض ہے ، ورنہ شرعاً یہ بیع نہیں ہوئی ، چاہئے کہ بائع سے از سرِ نو اپنے لئے بیع و شراء کرلے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ فصل الفضولی میں ہے : ھذا اذا لم یضفہ الفضولی الی غیرہ فلو اضافہ بأن قال بع ھذا العبد لفلان فقال البائع بعتہ لفلان توقف ۔ ردالمحتار میں ہے : الحاصل انہ اذا اضیف الی فلان فی الکلامین توقف علی اجازتہ و الا نفذ علی المشتری ما لم یضفہ الی الآخر صریحا فیبطل ۔ فتح القدیر مصری جلد ۶ صفحہ ۱۹۰ میں ہے : ذکر فی شرح

الطحاوی و لو اشتری رجل لرجل شیئا بغیر امرہ کان ما اشتراہ لنفسہ اجاز الذی اشتراہ لہ او لم یجز ، اما اذا اضافہ الی آخر بان قال للبائع بع عبدک من فلان بکذا فقال بعت و قبل المشتری ھذا البیع لفلان فانہ یتوقف ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۵ میں ہے: سئل فی اخوین کل منھما فی معیشۃ علیحدۃ اشتری احدھما حصۃ من دار بمبلغ معلوم لہ و لأخیہ مع غیبتہ من غیر توکیل عنہ فحضر الأخ الغائب عن مجلس الشراء و لم یجزہ بعد عرضھا علیہ بل ردہ فھل یقع الشراء للمشتری حیث لم یجز الاخ الشراء للعقد و لم یکن وکیلا عن اخیہ سیما و قد دفع المشتری الثمن من مالہ الخاص بہ ؟ اجاب: حیث اشتری لأخیہ بدون توکیل عنہ فی ذلک و لم یجزہ الأخ المشتری لہ نفذ الشراء علی المباشر للعقد ۔ و ھذا اذا لم یضف الی المشتری لہ فی الإیجاب و القبول او فی احدھما علی الخلاف فی ذلک و الا لا ینفذ علی المباشر ۔ اس کے بعد ہندہ کا مرحونہ زیور جو بکر نے اپنی ذاتی رقم اداء کرکے چھڑایا ہے حسب تفصیل بالا زمین مشترۃ (خریدی ہوئی) ہندہ کی ملک ہونے کی صورت میں رقم ہندہ پر قرض ہے ۔ اور بکر کے جدید شراء کرلینے (خریدنے) کی صورت میں بکر کی جانب سے ذاتی قرض کی ادائی ہے ۔

طلاق کے بعد بکر نے ہندہ کا تمام زیور بیچکر جو جدید زمین و مکان ہندہ کے نام سے خریدا ہے اس کا بھی وہی حال ہے ، اگر ہندہ کے کہنے سے یہ سب کیا ہے تو اس معاملہ میں ہندہ کا وکیل ہے ۔ اور اگر بلا اطلاع ہندہ کے بائع سے ہندہ کا نام کہکر ہندہ کے لئے خریدا ہے تو اس فعل میں فضولی ہے ، اور یہ خریدی ہندہ کی اجازت پر موقوف ہے ، اس کے بعد اگر ہندہ نے اجازت دی ہے تو زمین و مکان ہندہ کی ملک ہے ، اور اگر اجازت نہیں دی تو بیع نہیں ہوئی ، چاہیئے کہ از سر نو بائع سے اپنے لئے بیع کرالے ۔ اس کے بعد ہندہ کا فروخت شدہ زیور جو بکر نے اپنی ذات سے بنوادیا ہے مکان و زمین حسب تفصیل سابق ہندہ کے ہوجانے کی صورت میں یہ سارا زیور بکر کی ملک ہے ۔

زمین کا تیسرا قطعہ جو اپنی ذاتی رقم سے ہندہ کے نام خریدا ہے ، اس کا بھی وہی حال ہے جو مذکورہ ہوا ۔

بکر نے ہندہ کے لئے اپنے روپیہ سے جو مکانات تعمیر کرواتے ہیں اور زیور پہلے سے زیادہ تیار کروایا ہے اور سامان فراہم کیا ہے ، یہ تمام جائداد اگر بکر نے ہندہ کو ھبہ کی ہے اور قبضہ بھی دے دیا ہے یا کچھ مہر میں دیا اور کچھ قرضہ میں اور باقی ھبہ بالقبض کیا ہے ، تو یہ ہندہ کی ملک ہے ۔ ورنہ بکر کی ملک ہے جو ہندہ کے پاس بطور عاریت ہے ۔ کیونکہ شرعاً زوج و زوجہ جب تک کہ اپنی چیز ایک دوسرے کو ھبہ بالقبض نہ کردیں وہ دوسرے کے پاس عاریت یعنی مستعار ہوتی ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵ کتاب البیوع میں ہے: و ھذا یوجد کثیرا بین الزوجین یبعث الیھا متاعا و تبعث لہ ایضا و ھو فی الحقیقۃ ھبۃ حتی لو ادعیٰ الزوج العاریۃ رجع و لھا ایضا الرجوع لأنھا قصدت التعویض عن ھبۃ فلما لم توجد الھبۃ بدعویٰ العاریۃ لم یوجد التعویض عنھا فلھا الرجوع ۔

طلاق کے بعد بکر نے ہندہ کو اگر کچھ مال و اسباب ھبہ بالقبض کیا ہے اور وہ تا حال باقی ہے تو اس وقت بکر اس کو واپس لے سکتا ہے ۔ اور طلاق کے قبل اگر کچھ دیا ہے تو واپس نہیں لے سکتا ۔ کیونکہ شرع

میں ھبہ سے تو رجوع ہوسکتا ہے مگر زوجین میں بحالت زوجیت نہیں ہوتا ۔ ہدایہ مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۲۶۳ کتاب الھبہ میں ہے: و اذا وھب ھبة لأجنبي فله الرجوع الا ان یعوضه او یزید زیادة متصلة او یموت احد العاقدین ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵۳۸ میں ہے: (و یمنع الرجوع فیھا دمع خزقة) فـ "الدال" الزیادة المتصلة کبناء و غرس، و "المیم" موت احد العاقدین، و "العین" العوض، و "الخاء" خروج الھبة عن ملک الموھوب له، و "الزای" الزوجیة وقت الھبة، و "القاف" القرابة، و "الھاء" ھلاک العین الموھوبة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محمد وزیر مورث، پیچش و بخار سے علیل ہوکر چار ماہ بیمار رہا ایک ماہ سے علالت سخت رہی حتی کہ نشست و برخواست کی طاقت نہیں تھی ۔ موت سے تین یوم قبل مسماۃ عائشہ بی زوجہ نے براہ بدنیتی بغرض اتلاف حق ورثہ، مرحوم سے حسبِ دلخواہ فرضی طور پر مرحوم کے مکانات میں سے ایک اپنے نام سے اور ایک اپنے بھتیجے کے نام سے اور ایک اپنے متبنیٰ کے نام سے بیعنامے کرالئے۔ کیا بحالتِ اشتدادِ مرضِ موت، مریض کی جانب سے ایسے فرضی انتقالات شرعاً جائز سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

الجواب

مرضِ موت کی حالت میں بعض ورثاء کے لئے جو بیع کی جاتی ہے یہ بیع دوسرے ورثہ کی رضامندی پر موقوف ہوتی ہے ۔ اگر تمام ورثہ بعد وفاتِ مورث اجازت دیں تو جاری ہوتی ہے، اور اگر نامنظور و رد کردیں تو باطل ہوجاتی ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۹ باب اقرار المریض میں ہے: بیع المریض فی مرض الموت لبعض ورثته موقوف علی اجازة الباقی فیبطل برده و لو بمثل القیمة عند الإمام الأعظم رحمه اللہ تعالی و ینفذ بالإجازة و الرضیٰ بعد الموت لا قبله ۔ پس جبکہ خود مریض کا جان بوجھ کر اپنی کسی ملک کو بیچنا شرعاً ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، صورت مسئولہ میں زوجہ کا فرضی طور پر بلا اجازت دیگر ورثہ کے بیع کرنا شرعاً درست نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ مسائل میں:

۱ ۔ محمد بخل خان رسالدار مرحوم نے باوقات مختلف چند قطعات اراضیات من ابتدائے ۲۱ / رمضان المبارک ۱۳۰۰ھ لغایۃ ۱۳۶۹ھ اپنی ذاتی رقم سے خریدے ۔ بہ وقت خریدی ان کو بجز محمد عمر خان کے اور کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے اراضیات مذکورہ کے قبالے محمد عمر خان کے نام سے مرتب کرائے، اور قبالوں میں خریدی بحیثیت ولایت نہیں لکھی ہے ۔ قبالۂ اول کے وقت محمد عمر خان کی عمر دو (۲) سال اور قبالۂ اخیر کے وقت آٹھ (۸) سال کی تھی ۔ اور انہیں اراضیات سے بعض کے پن کا دعویٰ بحیثیت مالکانہ محمد بخل خان پر

۱۲۸۸ھ میں رجوع اور ۱۲۸۹ھ میں منتقل ہوا اس وقت محمد عمر خان کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ اور محمد بچل خان اراضیات مذکور پر بحیثیت مالکانہ خریدی سے تا تاریخ انتقال قابض رہے اور دفتری عمل بھی بنام محمد بچل خان تھا حالانکہ محمد بچل خان کے انتقال کے وقت محمد عمر خان کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ اس صورت میں اراضیات مذکورہ عمر خان کی ملک سمجھی جائیں گی یا بچل خان کی؟ اور بلحاظ حصص شرعی دیگر فرزندانِ محمد بچل خان اراضیات مذکور سے شرعی حصہ پانے کے مستحق ہیں یا نہیں؟

۲۔ محمد عمر خان نے بوقت دعویٰ متروکہ محمد بچل خان اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اراضیات زرخرید محمد بچل خان کی ہیں لیکن میری موہوبہ ہیں۔ مگر کوئی ھبہ نامہ پیش نہیں کیا، بلکہ قبالوں کو ھبہ سے تعبیر کیا۔ حالانکہ ان اراضیات پر محمد عمر خان کی عمر ۳۲ سال تک بچل خان ہی کا قبضہ رہا، کبھی عمر خان کا قبضہ نہ تھا۔ کیا یہ قبالے ھبہ کی تعریف میں آسکتے ہیں؟ اور عمر خان اراضیات مذکور کے مالک سمجھے جائینگے یا محمد بچل خان؟

۳۔ عمر خان کے انتقال کے بعد ان کی زوجہ مسماۃ عزت النساء بیگم نے بھی اولاً اراضیات مذکور کو محمد بچل خان کی ملک حسب بیان محمد عمر خان تحریراً تسلیم کیا ہے۔ ثانیاً اپنے اور اپنے شوہر کے بیان کے خلاف زرخرید عمر خان بیان کرکے دعویٰ دار ہوئی ہے۔ کیا شرعاً عزت النساء بیگم کا اپنے مورث اور خود اپنے بیان کے خلاف بیان کرنا قابل لحاظ ہے یا نہیں؟ اور اراضیات مذکورہ شرعاً بچل خان کی سمجھی جائیں گی یا عمر خان کی؟

الجواب

باپ جو اپنے کمسن لڑکے کے لئے کپڑا، یا غلام، یا مکان، یا زمین اپنی ذاتی رقم سے خریدتا ہے، اس خریداری سے وہ چیز لڑکے کی ملک ہوجاتی ہے۔ اگر بہ وقت خریداری باپ نے لوگوں کو گواہ رکھا ہے کہ اس کی قیمت اگرچہ میں اس وقت اپنی ذات سے ادا کررہا ہوں مگر آئندہ اس قیمت کو میں لڑکے سے واپس لے لوں گا، تو ایسی حالت میں باپ کے لئے اس قیمت کا واپس لینا درست ہے۔ اگر اس پر کسی کو گواہ نہیں رکھا اور نہ بہ وقت خریداری کسی سے اس کا ذکر کیا تو ایسی حالت میں لڑکے سے اس کی قیمت کو واپس کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ باپ کے ایسے افعال لڑکے کے لئے شرعا تبرع اور صلہ رحمی اور لطف و کرم سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے لڑکے کے جوان و قابل تصرف ہوجانے کے بعد باپ کا ایسی جائداد کو لڑکے کے قبضہ میں نہ دیکر اپنے قبضہ میں روک رکھنا درست نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۱۹۳ باب بیع الأب و الوصی میں ہے:

رجل اشتری لولدہ الصغیر ثوبا اور خادما و نقد الثمن من مال نفسہ لا یرجع بالثمن علی ولدہ الا ان یشھد انہ اشتراہ لولدہ لیرجع علیہ، و ان لم ینقد الثمن حتی مات یؤخذ الثمن من ترکتہ ثم لا ترجع بقیۃ الورثۃ بذلک علی ھذا الولد ان کان المیت لم یشھد انہ اشتراہ لولدہ۔ و ان اشتری لابنہ الصغیر و ضمن الثمن ثم نقد الثمن فی القیاس یرجع علی الولد و فی الاستحسان لا یرجع۔ و ان قال حین نقد الثمن نقدتہ لارجع علی الولد کان لہ لن یرجع کذا فی فتاوی قاضیخان۔ و لو اشتری لولدہ الکسوۃ و الطعام یرجع بثمنہ علیہ و ان لم یشھد علیہ لأنہ مأمور بہ غیر متطوع فیہ بخلاف شراء الدار و العقار کذا فی محیط السرخسی۔ امراۃ اشترت لولدھا الصغیر ضیعۃ بمالھا علی

ان لا ترجع علی الولد بالثمن جاز استحسانا و تکون الأم مشتریة لنفسها ثم تصیر ھبة منھا لولدھا الصغیر و صلة و لیس لھا ان تمنع الضیعة عن ولدھا کذا فی فتاوی قاضیخان ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ہ صفحہ ۵۳۶ کتاب الھبہ میں ہے : اتخذ لولدہ او لتلمیذہ ثیابا ثم اراد دفعھا لغیرہ لیس لہ ذلک ما لم یبین وقت الاتخاذ انھا عاریة ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ لولدہ) ای الصغیر ۔

پس صورتِ مسئولہ میں محمد بخل خان نے عمر خان کی کمسنی میں جو جائداد اپنی ذاتی رقم سے عمر خان کے نام سے خریدی ہے وہ عمر خان کی ملک ہے ۔ اگر بہ وقت خریدی محمد بخل خان نے اس کی رقم عمر خان سے واپس لینے کا کسی سے ذکر کیا ہے یا گواہ رکھا ہے تو بعد ثبوتِ شرعی عمر خان کی جائداد سے وہ رقم واجب الاداء ہے ، اور محمد بخل خان کے تمام ورثہ بحیثیت متروکہ اس میں حصہ دار ہیں ۔ اور اگر بخل خان نے بہ وقت خریداری اس قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور نہ اس پر کسی کو گواہ رکھا ہے تو یہ رقم عمر خان کی جائداد سے قابل ایصال نہیں بلکہ یہ خریدی بخل خان کی جانب سے عمر خان کے لئے بر سبیلِ تبرع و صلہ رحمی ہوئی ہے ، جو عموماً اولاد کے ساتھ کی جاتی ہے ۔ ایسی حالت میں بخل خان کا اس جائداد کا حین حیات اپنے قبضہ میں رکھنا اور عمر خان کے عاقل و بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو اس جائداد پر قبضہ نہ دینا شرعا درست نہیں تھا ، اور نہ اب دیگر ورثاء کے لئے بخل خان کا اس طرح قبضہ ان کی ملک کی دلیل ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خالد مالک زراعت نے زید سے یہ کہا کہ اس وقت بازار کا نرخ چالیس روپے فی کھنڈی ہے ، آئندہ جو نرخ بازار کا ہوگا اس سے پانچ یا دس روپے کمی سے میں تم کو غلہ دوں گا ۔ زید نے اس اقرار پر خالد کو روپیہ دیا ۔ کیا یہ بیع شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

یہ بیع سلم ہے ، اس کی شرط یہ ہے کہ معاملہ کے وقت غلہ کی مقدار (یعنی اتنی کھنڈی اتنے روپے میں دی جائیں گی ، اس کی) صراحت کردی جائے ۔ صورت مسئولہ میں ادائیگی کے وقت کی نرخ کا لحاظ کیا گیا ہے ، اور اس وقت یہ نہیں معلوم کہ اداتی کے وقت نرخ کیا ہوگا اور کتنے روپے کے معاوضہ میں دینا ہوگا ، فریقین چونکہ اس سے لاعلم ہیں ، پس بوجہ لا علمی یہ بیع شرعاً نا جائز ہے ۔ ہدایہ مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۹، کتاب البیوع باب السلم میں ہے : و لا یصح السلم عند ابی حنیفة الا بسبع شرائط : جنس معلوم کقولنا حنطة او شعیرة ، و نوع معلوم کقولنا سقیة او نجیة ، و صفة معلومة کقولنا جید او ردیء کان ، و مقدار معلوم کقولنا کذا کیلا بمکیال معروف او کذا وزنا ، و اجل معلوم ، و معرفة مقدار رأس المال اذا کان یتعلق العقد علی مقدارہ کالمکیل و الموزون و المعدود ، و تسمیة المکان الذی یوفیہ فیہ اذا کان لہ حمل و مؤنة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چند حصہ دار اپنی رقم کو جو لوگوں پر قرض ہے جس کی مقدار بیس ہزار روپے ہے : ایک حصہ دار کو چار ہزار روپے کے عوض فروخت کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ حصہ دار چار ہزار دے کر بیس ہزار قرض داروں سے وصول کرلے گا ۔ کیا یہ بیع شرعاً درست ہے ؟

الجواب

چاندی کو چاندی کے عوض فروخت کرنے کو بیع صرف کہتے ہیں ۔ اس میں شرط یہ ہے کہ ثمن و مبیع دونوں ہم مثل یعنی ہم مقدار ہوں اور اسی مجلس میں بائع مشتری کو مبیع دیدے اور مشتری بائع کو ثمن یعنی قیمت حوالہ کردے ۔ صورت مسئولہ میں چونکہ تماثل و تقابض دونوں مفقود ہیں ، اس لئے یہ بیع شرعاً درست نہیں ہے ۔ کنز الدقائق کی کتاب الصرف میں ہے : فلو تجانسا شرط التماثل و التقابض و ان اختلفا جودة و صياغة ۔ ہدایہ کی کتاب الصرف میں ہے : فان باع فضة بفضة او ذهبا بذهب لا يجوز الا مثلا بمثل و ان اختلف في الجودة و الصياغة قال و لا بد من قبض العوضين قبل الافتراق ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو سے ایک مکان پانچ سو ۵۰۰ روپے میں خریدا ، اور تین سو روپے دے بھی دئے ۔ عمرو نے پورا مکان زید کے قبضہ میں دیدیا مگر ایک ملگی (دکان) دو سو ۲۰۰ روپے کی ادائیگی تک روک رکھی ۔ اس کے بعد عمرو کا انتقال ہوگیا ۔ عمرو کے ورثاء چاہتے ہیں کہ تین سو ۳۰۰ روپے واپس دیکر زید سے مکان واپس لے لیں ، اور معاملہ کالعدم قرار دیں ۔ اور زید چاہتا ہے کہ باقی دو سو ۲۰۰ روپے دیکر ملگی بھی قبضہ میں لے لے ۔ اس بارے میں حکم شرعی کیا ہے ؟

الجواب

چونکہ ایجاب وقبول کے ذریعہ بائع و مشتری کے درمیان بیع کا انعقاد ہوگیا ہے ، اس لئے مکان زید کی ملک ہے ۔ عمرو کے ورثاء کو اس بیع کے کالعدم قرار دینے کا حق نہیں ہے ۔ ورثاء کو چاہئے کہ زید سے باقی دو سو ۲۰۰ روپے لے کر ملگی بھی اسی کے قبضہ میں دیدیں ۔ ہدایہ کی کتاب البیوع میں ہے : البيع ينعقد بالايجاب و القبول اذا كان بلفظ الماضي ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب البیوع میں ہے : و يسقط بتسليم البائع المبيع قبل قبض الثمن فليس له رده بعده اليه ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کے مہر کی رقم اس شرط پر تجارت میں

لگائی کہ اس کا جس قدر نفع آئے گا وہ زوجہ کو دیا جائے گا ۔ چنانچہ تجارت میں معقول نفع ہوا ، اور زید کا انتقال ہوگیا ۔ کیا نفع کی رقم زوجہ کو دی جائے گی یا زید کے متروکہ میں شریک ہوگی ؟

الجواب

زید اس معاملہ میں چونکہ وکیل تھا اس لئے زر مہر کے نفع کی جس قدر رقم ہے وہ زوجہ کی ملک ہے ۔ زید کے متروکہ میں شریک نہیں ہوگی ۔ در مختار کی کتاب المضاربہ میں ہے : (و دفع المال الی آخر مع شرط الربح) کلہ (للمالک بضاعۃ) فیکون وکیلا متبرعا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کو ۱۰۰ سو روپے اس شرط پر بطور قرض دیئے تھے کہ بکر اس کو ایک سال کے بعد ۱۲۵ سوا سو روپے کا غلہ دے ۔ اور خالد نے بکر کو ایک روپیہ اس شرط پر قرض دیا کہ ایک مہینہ کے بعد پچیس گنڈے (ایک روپیہ سے زائد) خردہ دے ۔ کیا یہ نفع شرعاً درست ہے ؟

الجواب

جس قرض میں منفعت شرط ہے ایسا قرض دینا اور نفع لینا شرعاً حرام ہے ۔ در مختار کی کتاب البیوع فصل القرض میں ہے : و فی الخلاصۃ القرض بالشرط حرام و الشرط لغو و فی الأشباہ کل قرض جر نفعا حرام ۔ محیط سرخسی میں ہے : و لا یجوز قرض جر منفعۃ الخ ۔ لأن النبی صلیٰ اللّٰہ علیہ و سلم نہیٰ عن قرض جر منفعۃ ، و لأنہ یحصل لہ زیادۃ منفعۃ مالیۃ فیشبہ الربا ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے مرض موت میں مرنے کے ایک دن قبل اپنی ملکیت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی لڑکی کا حق تلف کرنے کے خیال سے ایک اجنبی شخص کو کم قیمت میں فروخت کردی ۔ کیا یہ بیع شرعا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

مرض موت میں کم قیمت میں کسی چیز کے فروخت کرنے کو شریعت میں " بیع محابات " کہا جاتا ہے ۔ ایسی بیع شرع میں وصیت کے حکم میں داخل ہے ۔ فروخت شدہ شئے کی مالیت مثلاً ۱۰۰ سو روپیہ کی تھی اور ہندہ نے اس کو ۵۰ پچاس روپیہ میں فروخت کیا ہے تو مشتری سے پچاس روپیہ اصل قیمت کے علاوہ پچاس کے دو ثلث (یعنی تینتیس روپے چونتیس پیسے) اور لئے جائیں ، باقی ایک ثلث (سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے) معاف

کردیے جائیں۔ در مختار کی کتاب الوصایا باب العتق فی المرض میں ہے: (اعتاقه و محاباته و هبته و وقفه و ضمانه) کل ذلک حکمه (کـ) حکم (وصیة فیعتبر من الثلث)۔ رد المحتار میں اسی جگہ ہے: (قوله و محاباته) ای فی الإجارة و الاستئجار و المهر و الشراء و البیع بأن باع مریض مثلا من اجنبی ما یساوی مائة بخمسین کما فی النتف قهستانی، ای او یشتری ما یساوی خمسین بمائة فالزائد علیٰ قیمة المثل فی الشراء و الناقص فی البیع محاباة۔ واللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کتابُ القَضاء

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں خدمت قضاء و امامت و خطابت و احتساب و سجادگی و مؤذنی و ملاگیری وغیرہ خدمات شرعیہ پر مامور ہوسکتی ہیں یا نہیں ؟ اور اس بارے میں مرجح قول کیا ہے ؟
اگر عورت ان خدمات پر مامور نہیں ہوسکتی تو پھر روایاتِ فقہ میں جو صراحت ہے کہ جو شہادت کا اہل ہو وہ قضاءت کا بھی اہل ہے ، اور عورت حدود و قصاص کے سوا باقی تمام معاملات میں فیصلے کرسکتی ہے ، اس کا کیا مطلب ہے ؟ چنانچہ در مختار میں ہے : و اھلہ اھل الشھادۃ ای ادائھا علی المسلمین۔ ہدایہ میں ہے : و کل من کان اھلا للشھادۃ یکون اھلا للقضاء و ما یشترط لأھلیۃ الشھادۃ یشترط لأھلیۃ القضاء۔ قدوری میں ہے : و یجوز قضاء المرأۃ فی کل شیء الا فی الحدود و القصاص۔ ہدایہ میں ہے : و یجوز قضاء المرأۃ فی کل شیء الا فی الحدود و القصاص اعتبارا نشھادتھا بینھما۔ اگر عورت کو ان خدمت پر مامور کرکے نائب کے ذریعہ سے کام لیا جائے تو جائز ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

جو خدمات کہ پادشاہِ وقت یا اس کے نائب کے کرنے کے ہیں مثلاً قضاء و امامت و احتساب و مؤذنی و ملاگیری ان خدمات پر عورت کو مامور کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے ، اور مامور کرنے والا گنہگار ہے ۔ اور جب مامور کرنا صحیح نہیں ہے تو مامور کرکے نائب کے ذریعہ سے کام لینا بھی صحیح نہیں ہے ، کیونکہ جب اصل تقرر نا درست ہے تو نائب بنانا جو تقرر کا فرع ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب القضاء مطلب تقریر المرأۃ فی وظیفہ میں ہے : و اما تقریرھا فی نحو وظیفۃ الإمام فلا شک فی عدم صحتہ لعدم اھلیتھا خلافا لما زعمہ بعض الجھلۃ انہ یصح و تستنب لأن صحۃ التقریر یعتمد وجود الأھلیۃ و جواز الاستنابۃ فرع صحۃ التقریر۔
بعض روایتِ فقہ میں جو عورت کو خدمتِ قضاء کا اہل بتایا گیا ہے اور حدود و قصاص کے سوا باقی تمام معاملات میں عورت کے فیصلے قابل نفاذ سمجھے گئے ہیں ، اس کا مطلب یہ ہے کہ باوجود ممانعت کے اگر عورت خدمتِ قضاء پر مامور کردی جائے تو حدود و قصاص کے سوا اس کے باقی تمام فیصلے نافذ کئے جائینگے ۔
اگر کوئی شخص خدمت کا اہل ہو تو اس کو خدمت پر مامور کردینا شرعاً ضروری نہیں ہے ، کیونکہ فاسق خدمت قضاء کا اہل تو ہے مگر اس کو قضاء کی خدمت دینا گناہ ہے ۔ چنانچہ رد المحتار جلد ۴ کتاب القضاء میں

ہے : و الفاسق اهلها لکنه لا یقلد وجوبا و یأثم مقلده ۔ اسی طرح عورت کو بھی باوجود اہلیت کے قضاء پر مامور کرنا نا جائز و معصیت ہے ۔ کیونکہ جواز وقوع کو نہیں چاہتا ۔ یعنی اس کے فیصلہ کا جائز و نافذ ہونا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ اس کو خدمت پر مامور بھی کیا جائے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب القضاء مطلب لا یصح تقریر المراۃ فی وظیفۃ الامام میں ہے : و الجواز لا یقتضی الوقوع ۔ صفحہ ۴۲۰ در مختار میں ہے : و المرأۃ تقضی فی غیر حدود و قود و ان اثم المولّی لها لخبر صحیح البخاری " لن یفلحَ قوم ولّوا امرهم امرأۃ " ۔ عینی شرح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۲۵۸ کتاب الفتن میں لن یفلح قوم ولّوا امرهم امرأۃ کے تحت ہے : و احتج به من منع قضاء المرأۃ و هو قول الجمهور ۔ اور جلد ۸ کے صفحہ ۲۴۰ کتاب المغازی میں ہے : قال الخطابی فی الحدیث ان المرأۃ لا تلی الإمارۃ و لا القضاء ۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی لاہور کے صفحہ ۲۲۵ حاشیہ میں ہے : و اخرجه احمد من وجه آخر عن ابی بکرۃ " لن یفلح قوم أسندوا امرهم الیٰ امرأۃٍ " یعنی ہرگز فلاح نہیں پائے گی وہ قوم جس نے اپنے معاملات میں عورت کی طرف ٹیکا کیا ۔ اسی جگہ ہے : و من وجه آخر عن ابی بکرۃ مرفوعا اتاه بشیر یبشره بظفر جند له علی عدوهم و رأسه فی حجر عائشۃ فقام فخر ساجدا ثم انشأ یسأل البشیر فأخبره و مما اخبره انه ولیهم امرأۃ فقال " الآن هلکت الرجال اذا اطاعت النساء " قاله ثلاثا و اخرجه الحاکم بنحوه و صححه ۔ یعنی ایک قاصد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس مسلمانوں کے ایک لشکر کی فتح کی خبر پہنچائی ، آپ صلی اللہ علیہ و سلم اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے گود میں سر مبارک رکھکر لیٹے ہوئے تھے ، اس خبر کے سنتے ہی آپ کھڑے ہوکر بارگاہِ ایزدی میں سجدہ شکر بجا لائے ، اور وہاں کے لوگوں کا حال دریافت فرمانے لگے ۔ اثناء بیان میں قاصد نے یہ بھی کہا کہ ان پر حکمران عورت ہے ! یہ سنتے ہی آپ فرمانے لگے کہ : " جب مرد عورتوں کی اطاعت کرنے لگے تو اب ان کی تباہی و بربادی ہے " لأنها واجبة الستر و الحجاب و ورد " من ولّاه اللّٰه شیئا من امر المسلمین فاحتجب عن حاجتهم و فقرهم احتجب اللّٰه دون حاجته " اخرجه ابو داود و الترمذی و الحاکم عن ابی مریم و احمد عن معاذ و الطبرانی فی کبیره عن ابن عباس کلهم مرفوعا ۔ یعنی عورت اس وجہ سے بھی خدمت پر مامور ہونے کے اہل نہیں کہ شرعاً اس پر پردہ لازم ہے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ خداوند عالم جس کو مسلمانوں پر حاکم بنائے اور وہ پردہ میں رہکر ان کی حاجتوں اور ان کے فقر سے نا واقف رہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حاجتوں سے پردہ کرتا ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قاضی (حاکم) اپنے نائبین کو خدمت سے علٰحدہ کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر نائبین کی بحالی و برطرفی کا اختیار قاضی کو سرکار سے دیا گیا ہے تو قاضی ان کو معزول کرسکتا ہے اور ملازم بھی رکھ سکتا ہے ، ورنہ نہیں ۔ ہدایہ کی کتاب ادب القاضی میں ہے : و اذا فوّض الیه الاستخلاف

یملکه فیصیر الثانی نائبا عن الاصل یعنی السلطان حتی لا یملک الاول عزله الا اذا فوض الیه العزل، هو الصحیح۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ، مطلقہ ہونے کے بعد مہر مؤجل کی ادائی کے لئے زوج کو عدالت دار القضاء میں درخواست پیش کرکے قید کرواسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

زوج اگر ناداری کا دعویٰ کرے اور اس پر قسم بھی کھائے، مگر زوجہ اس کا مالدار ہونا بیّنہ شرعیہ سے ثابت کرے، تو ایسی حالت میں طلاق کے بعد مہر مؤجل کی ادائی کے لئے زوج کو قید کرواسکتی ہے، ورنہ نہیں۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۳۰۵ کتاب القضاء فصل حبس میں ہے: لا یحبس فی غیرہ ای غیر ما ذکر و هو تسع صور: بدل خلع، و مغصوب، و متلف، و دم عمد، و عتق حظ شریک، و ارش جنایة، و نفقة قریب، و زوجة، و مؤجل مهر۔ قلت بظاهره و لو بعد الطلاق۔ صفحہ ۳۱۱ میں ہے: ان ادعی المدیون الفقر اذ الاصل العسرة الا ان یبرهن غریمه علی غناه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

کتاب الشَّهادة

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی ہمشیرۂ طلاقی کا نکاح شخصِ غیر کفوء مسمیٰ عمرو سے کردیا۔ ہندہ کو نکاح سے انکار ہے۔ اور عمرو نے ثبوت نکاح میں حاضرین مجلس سے دو ۲ شخصوں کو پیش کیا جو مجلس عقد میں اپنے شریک رہنے کی گواہی دیتے ہیں، اور ایک تیسرا گواہ یہ بیان کرتا ہے کہ میں وکیل کے ساتھ ہندہ کے پاس گیا اور میرے روبرو وکیل نے ہندہ سے قبول نکاح کروایا، میں ہندہ سے بخوبی واقف ہوں۔ پس ایسی حالت میں جبکہ اصل واقعہ نکاح کا ایک ہی گواہ ہے، کیا عقد نکاح شرعاً ثابت ہے؟

الجواب

انعقادِ نکاح کے لئے ایسے دو ۲ گواہوں کی ضرورت ہے جو ناکح و منکوح کے ایجاب و قبول کو سنیں۔ اس لئے صورت مسئولہ میں مجرد ایک گواہ کا بیان عقدِ نکاح کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۲۶۷ کتاب النکاح میں ہے: و یشترط العدد فلا ینعقد النکاح بشاھد واحد ھکذا فی البدائع۔ اور صفحہ ۲۶۸ میں ہے: (و منھا) سماع الشاھدین کلامھما معا ھکذا فی فتح القدیر۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قصاص و حدود شرعیہ و دیگر خصومات میں مسلمان پر ذمی کی گواہی از روئے شرع معتبر ہے یا نہیں؟

جہاں مسلمان کم ہوں اور غیر ملت بکثرت، ویسے مقام میں بلحاظ ضرورت غیر ملت کے افراد کی گواہی مسلمان پر معتبر ہوسکتی ہے یا نہیں؟ در صورت معتبر نہ ہونے کے حاکم کو اس پر تعزیر کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب

مشہود علیہ یعنی جس پر گواہی دی جاتی ہے اگر وہ مسلمان ہے تو شہادت کی شروط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ گواہی دینے والا بھی مسلمان ہو۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۱ کتاب الشہادات میں ہے: و منھا الاسلام اذا کان المشھود علیہ مسلما۔ بناء بریں شریعت میں مسلمان پر غیر مسلم مشرک و کافر کی گواہی کسی بھی معاملہ اور کسی بھی حالت میں معتبر و مقبول نہیں ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ مہدیہ جلد ۳ صفحہ ۳۲۱

کتاب الشہادۃ کے جزئیہ سے بھی ثابت ہے ، سئل فی امرأۃ ذمیۃ تدعی علیٰ امرأۃ مسلمۃ بأنھا ضربتھا و کسرت ذراعھا و اتت بجماعۃ من الذمیین یشھدون لھا بدعواھا و الحال انھا عاجزۃ من قدیم و لم یکن عندھا بینۃ من المسلمین یشھدون بدعواھا ھذہ فھل لا یحکم بھذہ الشھادۃ شرعا و اذا عجزت عن البینۃ من المسلمین تصدق المدعی علیھا بیمینھا و لا عبرۃ بالدعوی المجردۃ عن الإثبات الشرعیۃ ؟ اجاب ، لا تقبل شھادۃ اھل الذمۃ علی المسلمۃ ۔ اور صفحہ ۲۷۷ میں ہے ، اذا کان المدعی علیہ بالقتل مسلما یکون اللازم شرعا کون الشھود بالوکالتین فی الخصومۃ او بالقتل مسلمین عدولا اما اذا کان المدعی علیہ بالقتل غیر مسلم فلا مانع من قبول شھادۃ غیر المسلمین علیہ اذا کانوا عدولا فی دیانتھم ۔ اگر گواہی دینے والا فساد و شرارت میں مشہور ہو اور قاضی یعنی حاکم عدالت کو بھی اس کی یہ حالت معلوم ہو تو اس وقت قاضی اپنے علم پر اس کو تعزیر کرسکتا ہے ۔ ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۱۹۲ باب التعزیر میں ہے ، لو کان المتھم مشھورا بالفساد فیکفی فیہ علم القاضی ۔ اور در مختار میں ہے ، للقاضی تعزیر المتھم و ان لم یثبت علیہ ۔ اور رد المحتار میں ہے ، (قولہ و ان لم یثبت) ای ما اتھم بہ و اما نفس التھمۃ ای کونہ من اھلھا فلا بد من ثبوتھا ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حبہ نامہ اور ہبہ نامہ ، اناث کی شہادت سے مکمل ہوسکتا ہے یا نہیں ؟ اور زنا و قتل و نکاح میں اناث کی شہادت معتبر ہے یا نہیں ؟ شریعت میں نصابِ شہادت کیا ہے ؟

الجواب

شہادت کا نصاب زنا کے لئے چار مرد ہیں ۔ اور باقی حدود شرعیہ اور قصاص کے لئے دو ۔ اور کافر کا مسلمان ہونا ، اور مسلمان کا مرتد ہونا بھی دو مردوں سے ثابت ہوتا ہے ۔ بچہ کا پیدا ہونے کے وقت رونا نماز جنازہ پڑھنے کے لئے اور لڑکی کا باکرہ ہونا اور عورتوں کے وہ عیوب جن پر مرد مطلع نہیں ہوسکتے یہ تمام امور صرف ایک عورت کی گواہی سے ثابت ہوجاتے ہیں ۔ اب ان کے سوا باقی تمام حقوق چاہے مالی ہوں یا غیر مالی جیسے نکاح ، طلاق ، وکالت ، وصیت ، بچہ کا پیدا ہونے کے وقت رونا استحقاقِ میراث کے لئے یہ تمام چیزیں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے ثابت ہوتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۰۸ میں ہے ، و نصابھا للزنا اربعۃ رجال ، و لبقیۃ الحدود و القود و اسلام کافر و ردۃ مسلم رجلان ، و للولادۃ و استھلال الصبی للصلاۃ علیہ و البکارۃ و عیوب النساء فیما لا یطلع علیہ الرجال امرأۃ ، و لغیرھا من الحقوق سواء کان مالا او غیرہ کنکاح و طلاق و وکالۃ و وصیۃ و استھلال صبی للارث رجلان او رجل و امرأتان و لا یفرق بینھما لقولہ تعالی " فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ " ۔ ر ، لا تقبل شھادۃ اربع بلا رجل ۔ پس صورت مسئول میں حبہ نامہ

و بیعنامہ کی تکمیل اور زنا و قتل و نکاح کا ثبوت محض عورتوں کی شہادت سے شرعا معتبر نہیں ہے۔
واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ میر تراب علی مرحوم نے چند آدمیوں کے روبرو فرادیٰ فرادیٰ اقرار کیا تھا کہ : میں نے اپنی بی بی کو تین طلاق دی ۔ اس قول کے چند آدمی شاہد ہیں ۔ کیا یہ شہادت شرعا معتبر ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

مشہود بہ یعنی جس چیز کی گواہی دی جاتی ہے اگر " قول " ہے جیسے بیع و شراء ، طلاق و عتاق ، وکالت و وصیت تو اس میں گواہوں کا ایک ساتھ ایک وقت ایک جگہ میں سننا ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ قول ہے جس کا اعادہ و تکرار ہوسکتا ہے ۔ دو گواہ اگر مختلف اوقات اور مختلف مکان میں بھی قائل کے قول کو سنکر گواہی دیں تو یہ گواہی شرع میں معتبر ہے ۔ اور اگر مشہود بہ " فعل " ہو جیسے غصب ، جنایت ، قتل وغیرہ تو اس میں گواہوں کا وقت اور مکان میں مختلف ہونا مقبول نہیں ہے ۔ تنقیح حامدیہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۳ کتاب الشہادۃ میں ہے : و فی البحر عن الکافی و اذا اختلفا الشاھدان فی الزمان و المکان فی البیع و الشراء و الطلاق و العتق و الوکالة و الوصیة و الرھن و الدّین و القرض و البراءة و الکفالة و الحوالة و القذف تقبل ، و ان اختلفا فی الجنایة و الغصب و القتل و النکاح لا تقبل ۔ و الأصل ان المشھود بہ اذا کان قولا کالبیع و نحوہ فاختلف الشاھدان فیہ فی الزمان او المکان لا یمنع قبول الشھادة لأن القول مما یعاد و یکرر ، و ان کان المشھود بہ فعلا کالغصب و نحوہ او قولا لکن الفعل شرط لصحتہ کالنکاح فانہ قول و حضور الشاھدین فعل و ھو شرط فاختلافھما فی الزمان و المکان یمنع القبول لأن الفعل فی زمان او مکان غیر الفعل فی زمان او مکان آخر فاختلف المشھود بہ ۔

پس صورت مسئولہ میں میر تراب علی مرحوم نے جو متعدد اشخاص کے روبرو اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا اقرار کیا ہے اگر یہ اقرار ایک ہی زوجہ کی طلاق ثلاثہ کے متعلق ہے تو اس کے ثبوت کے لئے گواہوں کا فرادیٰ فرادیٰ مختلف اوقات و مقام میں سنکر گواہی دینا شرعاً معتبر ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتابُ الوَکالۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ وکیل کو کیا یہ حق حاصل ہے کہ بلا اجازت موکل کے کسی کو وکیل مقرر کرے ؟

الجواب

بلا اجازت موکل کے وکیل ، کسی کو وکیل نہیں بنا سکتا ۔ در مختار کتاب الوکالت میں ہے : الوکیل لا یوکل اِلّا باذن آمرہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حینِ حیات بکر کو اپنا نائب مقرر کیا تھا ۔ زید کے انتقال کے بعد اس کے فرزند خالد نے بھی بکر کو اسی خدمت پر بحال رکھا ۔ مگر بکر معاملات میں خالد کی خلاف ورزی کررہا ہے اور بطور خود جو کچھ چاہتا ہے کرلیتا ہے ۔ کیا ایسی حالت میں خالد کو یہ حق حاصل ہے کہ بکر کو اس کی خدمت سے علحدہ کردے یا نہیں ؟

الجواب

نیابت فی الحقیقت وکالت ہے ، کیونکہ شریعت میں وکالت کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شخص کسی کو جائز و معلوم تصرف کی اجرائی کے لئے اپنا قائم مقام بناتے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۱۶ کتاب الوکالۃ میں ہے : و ھو اقامۃ الغیر مقام نفسہ ترفھا او عجزا فی تصرف جائز معلوم ۔ موکل یا وکیل دونوں میں سے اگر ایک مرجائے تو وکالت باقی نہیں رہتی ۔ صفحہ ۳۲۵ میں ہے : و ینعزل بموت احدھما او جنونہ مطبقا ۔ موکل کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ اپنے وکیل کو معزول کردے ۔ ہدایہ کی کتاب الوکالۃ باب عزل الوکیل میں ہے : قال و للموکل ان یعزل الوکیل عن الوکالۃ لان الوکالۃ حقہ فلہ ان یبطلہ ۔ پس صورت مسئولہ میں زید کے انتقال کی وجہ سے بکر نیابت سے علحدہ ہوگیا ۔ اس کے بعد خالد بھی جس نے کہ اس کو اپنا نائب مقرر کیا ہے بر بنائے خلاف ورزی خدمت سے علحدہ کرسکتا ہے ۔ واللہ اعلم ۔

کتاب الدَّعوَیٰ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ وراثت اور وقف میں سماعتِ دعویٰ کے لئے از روئے شریعت کتنی مدت مقرر ہے ؟ بینوا توجروا ؛

الجواب

شرع میں وقف اور میراث کے دعویٰ کی سماعت کے لئے کوئی مدت نہیں ہے ۔ ہر وقت ان دونوں دعووں کی سماعت ہوسکتی ہے ۔ فتاویٰ حمدیہ مصری جلد ۲ صفحہ ۴۲۳ میں ہے ؛ لا تسمع الدعوی بعد مضی خمس عشرۃ سنۃ الا فی الارث و الوقف و وجود عذر شرعی و ما فی الخلاصۃ المدعی و المدعی علیہ اذا کان فی موضع و لا مانع و ادعی بعد ثلاثین سنۃ و فی المبسوط بعد ثلاث و ثلاثین سنۃ و فی فتاویٰ العتابی بعد ست و ثلاثین سنۃ لا تسمع ، الا ان یکون المدعی غائبا او مجنونا او لیس لہ ولی او المدعی علیہ والیا جائرا یخاف منہ ، و ذلک فیما عدا الإرث و الوقف کما فی صرۃ الفتاوی فذلک قبل صدور النہی عن سماعہا و قد تظاہرت نصوص المتأخرین علیٰ عدم السماع بعدہا الا المستثنی و لم یقیدوا دعوی الإرث و الوقف بمدۃ افادہ حواشی الدرر للعلامۃ السید الطحطاوی من اواخر فصل الحبس و سماع الدعویٰ فی الوقف و لو بعد مضی المدۃ الطویلۃ ہو ما علیہ القضاۃ و العلماء و الأسلاف بمصر ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۵۶ کتاب القضاء میں ہے ؛ حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعویٰ بعد خمس عشرۃ سنۃ فسمعہا لم ینفذ قلت فلا تسمع الآن بعدہا الا بأمر الا فی الوقف و الإرث و وجود عذر شرعی و بہ افتیٰ المفتی ابو السعود فلیحفظ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو کے ما بین ایک زمین نمبری میں جھگڑا ہے ۔ محکمۂ مجاز میں دعویٰ دائر ہونے کے بعد عمرو نے زید سے کہا اگر تم قسم کھالو کہ اس زمین میں میرا حصہ نہیں ہے تو میں اس زمین کو چھوڑ دیتا ہوں ۔ چنانچہ حاکم مجاز کے روبرو بموجبِ قواعدِ شرعیہ زید سے حلف

لیا گیا اور فیصلہ زید کی جانب کردیا گیا ۔ اب چند روز کے بعد عمرو نے عدالت میں علماء کا فتویٰ پیش کیا ہے کہ میں نے لوگوں کے بہکانے سے حلف دلوایا تھا ورنہ میرا ارادہ قسم کھلانے کا نہیں تھا ، لہٰذا فیصلہ منسوخ فرمایا جائے ۔ کیا عمرو کا یہ قول شرعاً قابل لحاظ ہے یا نہیں ؟

الجواب

مدعیٰ علیہ کے حلف کے بعد اگر مدعی بینہ شرعیہ پیش کرکے پچھلے فیصلہ کی تنسیخ چاہے تو شرعاً قاضی کے لئے یہ حکم ہے کہ اس کے بیّنہ شرعیہ کو قبول کرے اور پچھلا فیصلہ منسوخ کردے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۴۲ کتاب الدعویٰ میں ہے : (و تقبل البینة لو اقامها) المدعی و ان قال قبل الیمین لا بینة لی (بعد یمین) المدعی علیه کما تقبل البینة بعد القضاء بالنکول (عند العامة) و هو الصحیح لقول شریح : الیمین الفاجرة احق ان ترد من البینة العادلة ، و لأن الیمین کالخلف عن البینة فاذا جاء الأصل انتهی حکم الخلف کأنه لم یوجد اصلا ۔ بحر

پس صورت مسئولہ میں اگر عمرو ، زید کے قسم کھانے کے بعد بیّنہ شرعیہ پیش کرکے تنسیخ فیصلہ چاہتا ہے تو قاضی کو چاہئے کہ پچھلے فیصلہ کو منسوخ کرکے دوبارہ حسب بیّنہ فیصلہ کرے ۔ اور اگر بغیر بیّنہ پیش کرنے کے تنسیخ چاہتا ہے تو اس کی درخواست قابل لحاظ نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حاکم عدالت نے ایک مقدمہ میں پیشی مقرر کرکے مدعی کو گواہ پیش کرنے کا حکم دیا ۔ مدعی مقررہ تاریخ پر گواہ نہیں پیش کرسکا ، اور حاکم سے مہلت چاہی ۔ حاکم نے اس کو مہلت دینے سے انکار کیا اور مدعی کا حق تقدیم شہود ساقط کرکے مدعیٰ علیہ کو یہ حکم دیا کہ وہ آئندہ پیشی پر تردیدی گواہ پیش کرے ۔ دوسری تاریخ پر مدعی نے اپنے گواہ حاضر کئے اور گواہی لینے کے لئے حاکم کے پاس درخواست کی ، مگر حاکم نے اس کی درخواست رد کردی ۔ کیا حاکم عدالت کا یہ فعل شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

حاکم عدالت کو تردیدی گواہی مدعیٰ علیہ سے لینے کا یا حلف اٹھوانے کا اس وقت حق حاصل ہے جب کہ مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہوگیا ہو ، یا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے مدعیٰ علیہ کے حلف پر منحصر کردے اور جب ایسا نہیں ہے تو حاکم کو یہ حق نہیں ہے کہ مدعی کے پیش کردہ گواہ کو رد کرکے مدعیٰ علیہ کی تردیدی شہادت لے ۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ مدعی اگر گواہ پیش کرنے سے عاجز آکر مقدمہ حلف پر منحصر کردے اور حلف بھی لے لیا جائے اس کے بعد مدعی گواہ پیش کرنے پر قادر ہو اور گواہوں کو حاضر عدالت

کرے تو حاکم پر لازم ہے کہ گواہی قبول کرکے حسب شریعت فیصلہ صادر کرے اور حلف کو رد کردے۔ کیونکہ بیّنۂ شرعیہ یعنی گواہی اصل ہے اور حلف اسکا قائم مقام ہے۔ اصل کے پیش ہونے کے بعد قائم مقام کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ ہدایہ کی کتاب الدعویٰ میں ہے: و ان حضرھا قضی بھا لانتفاء التھمۃ عنھا و ان عجز عن ذلک و طلب بیمین خصمہ استحلفہ علیھا۔ مجمع الانھر جلد ۲ صفحہ ۲۵۳ کتاب الدعویٰ میں ہے: فان اقامھا بعد الحلف تقبل قال علیہ السلام " الیمین الفاجرۃ احق ان ترد بالبینۃ " لاحتمال انھا غائبۃ او حاضرۃ فی البلد و لم تحضر و لأن الیمین بدل البینۃ فاذا قدر الأصل بطل حکم الخلف۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کے زر مہر میں اپنی ۲/۳ غیر منقولہ جائدادیں لکھدی تھیں، مگر حین حیات جائدادوں کو ہندہ کے قبضہ میں نہیں دیا۔ زید کے انتقال کے بعد چوبیس (۲۴) سال تک ہندہ نے سکوت اختیار کیا اور اب دستاویز کی بناء پر حصولِ قبضہ کا دعویٰ کررہی ہے۔ کیا اتنی مدت کے بعد ہندہ کو دعویٰ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب

ہندہ نے اگر بلا وجہ شرعی اتنی مدت گذرنے تک سکوت اختیار کر رکھا تھا تو اب بلا اجازتِ سرکار، اس کو دعویٰ پیش کرنے کا حق نہیں ہے۔ تنقیح حامدیہ جلد دوم صفحہ ۵ کتاب الدعویٰ میں ہے: سئل فیما اذا کان لجماعۃ دار ساکنین فیھا و متصرفین بھا بطریق الملک مدۃ تزید علی عشرین سنۃ بلا معارض لھم و الآن قام رجل یدعی الیھم بحصتہ فی الدار و ھم ینکرون و مضت ھذہ المدۃ و لم یدّع ذلک بلا مانع شرعی و الکل ببلدۃ واحدۃ تکون دعواہ غیر مسموعۃ للمنع السلطانی؟ الجواب: لا تسمع الا بأمر السلطان حیث خصص السلطان نصرہ اللہ تعالی القضاء بذلک و امر بعدم سماعھا۔ واللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کتاب الإقرار

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید بکر کا بیٹا ثابت ہوا ، اور اس کی موروثی جائداد بھی پائی۔ اس کے بعد زید نے خالد کو بھی اپنا باپ مشہور کردیا۔ مگر خالد نے پہلے تو صاف الفاظ میں بخلاف اس کے اپنا بیٹا ہونے سے حاکم کے روبرو انکار کردیا لیکن بعد میں اپنے مقدمات کی سرکار میں پیروی کے لئے زید کو اپنا مختار نامہ دیکر اس میں زید کو اپنا بیٹا لکھدیا۔ اب خالد کے انتقال کے بعد بجز اس کے حقیقی بھائی کے نواسے عمرو کے کوئی دوسرا وارث نہیں ہے۔ اب زید اس کے مقابلہ میں اپنے کو خالد کا فرزند صلبی ہونا بیان کرتا ہے ، مگر یہ نہیں ثابت کرتا کہ اس کی والدہ کا عقد حسب شرع شریف خالد کے ساتھ عمل میں آیا تھا ، اور نہ کوئی سیاھہ باضابطہ پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا زید کا نسب خالد سے بھی ثابت ہوگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا!

الجواب

ایک شخص کا کسی کو اپنا بیٹا بیان کرنا اور اپنے ساتھ اس کے نسب کا اقرار کرنا ایسے وقت صحیح ہوتا ہے جبکہ دوسرے شخص میں بلحاظ عمر کے بیٹا ہونے کی صلاحیت ہو ، اور اس کے علاوہ کسی اور سے اس کا نسب بھی ثابت نہ ہو۔ عالمگیریہ جلد ۳ کتاب الاقرار باب سابع عشر فی الاقرار بالنسب میں ہے : یصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان یکون المقر له بحال یولد مثله لمثله و ان لا یکون المقر له ثابت النسب من غیرہ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زید کا نسب بکر سے ثابت ہوچکا ہے جس کی بناء پر زید نے بکر سے میراث بھی پائی ہے اس لئے اب زید کا نسب خالد سے ثابت نہیں ہوسکتا ، اور نہ یہ اس کی میراث کا مستحق ہے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو اپنا بیٹا بیان کیا اور فوت ہوگیا۔ حالانکہ عمرو کا نسب خالد سے ثابت ہے۔ کیا ایسی حالت میں عمرو بموجب اقرار زید کا لڑکا ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

نسب کا اقرار شریعت میں اسی وقت صحیح اور قابل لحاظ ہے جبکہ مقر لہ کا نسب کسی اور سے ثابت نہ ہو ، اور مُقر لہٗ میں مُقِر کا بیٹا بننے کی صلاحیت بھی ہو۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ عمرو کا نسب خالد سے ثابت

ہے اس لئے وہ زید کا لڑکا نہیں ہوسکتا ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الاقرار باب سابع عشر فی الاقرار بالنسب میں ہے :
یصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان یکون المقر له بحال یولد مثله لمثله و ان لا یکون المقر له ثابت النسب من غیره ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید زندہ موجود ہے ، اور بکر کو اپنا فرزند صلبی بیان کرتا ہے ۔ مگر زید کی دوسری زوجہ کے فرزند بکر کو زید کا فرزند ہونا تسلیم نہیں کرتے ۔ کیا زید کا یہ اقرار اعتبار کے لائق ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر بکر کی عمر اتنی ہے کہ وہ زید کا فرزند صلبی بن سکتا ہے اور بکر کا کسی اور سے نسب ثابت نہیں ہے تو زید کا اقرار درست ہے ۔ دوسری زوجہ کے فرزندوں کے انکار سے اس پر کچھ اثر نہیں پڑتا عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الاقرار بالنسب میں ہے : یصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان یکون المقر له بحال یولد مثله لمثله و ان لا یکون المقر له ثابت النسب من غیره ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید زندہ موجود ہے ۔ بکر و ہندہ اپنے کو زید کے فرزند صلبی اور زوجہ ہونا بتلاتے ہیں ۔ مگر زید کو ہندہ کی زوجیت و بکر کے صلبی فرزند ہونے سے قطعاً انکار ہے ۔ اور نہ کبھی زید و ہندہ کا عقد نکاح ہوا ہے ۔ اور نہ کوئی اس قسم کے تعلقات دونوں کے درمیان رہے ہیں ۔ ایسی حالت میں ہندہ و بکر کا یہ کہنا کہ ہم زید کے زوجہ و فرزند صلبی ہیں اعتبار کے لائق ہے یا نہیں ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں چونکہ زید کو انکار قطعی ہے ۔ اس لئے تا وقتیکہ بیّنہ شرعیہ سے ہندہ کا زوجہ ہونا اور بکر کا بحالت زوجیت ہندہ کے بطن سے پیدا ہونا ثابت نہ ہو ، ہندہ کا زوجہ ہونا اور بکر کا فرزند صلبی ہونا شرعاً ثابت نہیں ہے ۔ و الله اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا ایک لڑکا فوت ہوا ۔ زید نے اس کی ماہوار اپنے دوسرے لڑکے یعنی خالد کے نام اجراء کروانے کی درخواست میں خالد کو اپنا بیٹا تسلیم کیا

اب بیان کرتا ہے کہ ماہوار اپنے نواسہ کے نام اجراء ہونی چاہئے ، اور خالد کے اپنے بیٹے ہونے سے بھی انکار کرتا ہے ۔ کیا یہ قولِ ثانی قولِ اول کو رد کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

زید نے جبکہ خالد کے فرزند ہونے کا ایک دفعہ اقرار کرلیا ہے تو پھر زید کا اپنے اس اقرار سے رجوع کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے ، بشرطیکہ خالد بھی اپنے کو زید کا بیٹا تسلیم کرے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۶۵ میں ہے ، لو قال لصبی هذا الولد منی ثم قال لیس منی لا یصح نفیه لأنه بعد الاقرار به لا ینتفی بالنفی فلا حاجة الی الإقرار به ثانیا ، و هذا اذا صدقه الابن و اما بدونه فلا الا اذا عاد الابن الی التصدیق لبقاء اقرار الابن ۔ و لو انکر الأب الإقرار فبرهن علیه الابن قبل ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محمود نے ہندہ سے بطور خانگی نکاح کرلیا ۔ اور ایک سال کے بعد باضافۂ مہر اس خانگی عقد کا باقاعدہ سیاہہ مرتب کروالیا ۔ ترتیب سیاہہ سے تین ماہ بعد ہندہ کو لڑکا تولد ہوا ۔ محمود کو اس لڑکے کے نسب کا اقرار ہے اور ہندہ بھی اس لڑکے کو محمود کا صلبی ہونا بیان کرتی ہے ۔ کیا یہ لڑکا محمود کا سمجھا جائے گا ؟ اور کیا اس خانگی عقد کی وجہ سے لڑکے کے نسب پر کوئی اثر پڑے گا ؟

الجواب

خانگی نکاح اگر گواہوں کے روبرو احکام شرعیہ کے موافق ہوا ہے تو وہ شرعی نکاح ہے ، جس کی وجہ سے نسب ثابت ہے ۔ قطع نظر اس کے جبکہ محمود کو اس لڑکے کے نسب کا اقرار ہے اور اس کو اپنا فرزند صلبی بیان کرتا ہے تو یہ خود نکاح کا اقرار ہے ۔ الاشباہ و النظائر مصری کے صفحہ ۰، کتاب النکاح میں ہے : الإقرار بالولد من حرة اقرار بنکاحها لا الاقرار بمهرها ۔ تنقیح حامدیہ کی جلد ۱ باب ثبوت النسب میں ہے : و فی فتاویٰ ابن نجیم من باب التعزیر ان جاءت به لستة اشهر فأکثر یثبت نسبه منه و الا فلا ، الا ان یدعیه و لم یقر انه من زنا ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الاقرار باب سابع عشر میں ہے : یصح اقرار الرجل بالولد بشرط ان یکون المقر له بحال یولد مثله لمثله و ان لا یکون المقر له ثابت النسب من غیره و ان یصدق المقر له المقر فی اقراره اذا کانت له عبارة صحیحة ۔ و الله اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک دفعہ ہندہ کو اپنی منکوحہ بیان کیا ۔ پھر اس

کے بعد اس کے نکاح سے انکار کردیا۔ زید کا کونسا بیان قابل اعتبار ہوگا؟

الجواب

اس بارے میں ہندہ کا حلفی بیان لیا جائے۔ ہندہ زید کے جس بیان کی تصدیق کرے اس پر عمل کیا جائے۔ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۷۰۰ کتاب الاقرار میں ہے: و ظاهره ان المقر اذا ادعی الاقرار کاذبا یحلف المقر له او وارثه علی المفتی به۔ ملا مسکین مطبوعہ بر حاشیۂ فتح المعین جلد ۲ صفحہ ۵۵۸ مسائل شتیٰ میں ہے: اقر بدین او غیرہ ثم قال کنت کاذبا فیما اقررت حلف المقر له ما کان کاذبا فیما اقر و لست بمبطل فیما تدعیه علیه هذا عند ابی یوسف و علیه الفتویٰ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کتاب الودیعۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص شمس الدین نامی اپنا سامان حاجی اسحاق صاحب میمن کے پاس مکہ معظمہ میں رکھکر مدینہ منورہ روانہ ہوا، جس کو سات سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ تا حال سامان امانت ہے، اور شمس الدین کی کوئی خبر نہیں ہے۔ کیا وہ سامان مکہ معظمہ یا حیدرآباد میں خیرات کیا جائے؟ یا مدینہ منورہ کو روانہ کیا جائے؟ بینوا توجروا!

الجواب

امانت دار کو چاہئے کہ مالک کی موت یا حیات کی کیفیت دریافت کرے۔ اور معلوم ہونے تک اس مال کو اگر تلف ہونے والا نہیں ہے تو اپنے پاس، چاہے کتنی ہی مدت گذرے محفوظ رکھے۔ اگر تلف ہونے والا ہے تو اس کو قاضی (حاکم) کی اجازت سے فروخت کرکے اس کی قیمت اپنے پاس محفوظ رکھے پھر جب مالک کے زندہ ہونے کی خبر معلوم ہو تو وہ مال اس کو پہونچا دے۔ اور اگر مالک کے مرنے کی خبر ملے تو اس کے ورثہ کو تلاش کرکے ان سے دریافت کرے کہ مرحوم پر کوئی قرضہ تو نہیں ہے؟ اگر قرضہ ہے تو ادائی قرضہ کے لئے اس کے وصی کو دیدے۔ اور قرض نہ ہونے کی صورت میں حسب فرائض ورثاء پر تقسیم کردے۔ اگر مالک کی موت و حیات کی کوئی خبر بھی تلاش کے بعد معلوم نہ ہو تو اس مال کو محکمہ قضاء میں پیش کرے تا کہ قاضی اس کے ہم عمر اشخاص کے مرنے پر اس کے بھی مرنے کا حکم لگائے اور قرضہ کی تحقیق کے بعد حسب فرائض ورثاء پر تقسیم کردے۔ از روئے شریعت اس مال کو خیرات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ فتاویٰ بزازیہ مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیریہ جلد ۶ صفحہ ۲۰۷ میں ہے: غاب المودع و لا یدری حیاتہ و لا مماتہ یحفظھا ابدا حتیٰ یعلم بموتہ و وارثہ وان مات و لم یکن علیہ دین یستغرق یرد علی الورثۃ و ان کان یدفع الی وصیہ۔ عالمگیریہ جلد ۴ صفحہ ۳۵۴ میں ہے: غاب المودع و لا یدری حیاتہ و لا مماتہ یحفظھا ابدا حتی یعلم بموتہ و ورثتہ کذا فی الوجیز للکردری۔ و لا یتصدق بھا، بخلاف اللقطۃ کذا فی الفتاوی العتابیۃ۔ و اذا مات رب الودیعۃ فالوارث خصم فی طلب الودیعۃ کذا فی المبسوط۔ فان مات و لم یکن علیہ دین مستغرق یرد علیٰ الورثۃ و ان کان یدفع الی وصیہ کذا فی الوجیز للکردری۔ المودَع اذا دفع الودیعۃ الیٰ وارث المودِع و فی الترکۃ دین یضمن للغرماء و لا یبرأ بالرد علی الوارث کذا فی خزانۃ المفتین۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۳ صفحہ ۲۵۵ میں ہے: و یباع منقولہ باذن القاضی اذا خیف علیہ الفساد و یحفظ ثمنہ فان جاء حیا دفع لہ مالہ و ان ثبت موتہ یقسم بین ورثتہ و ان استمر مفقودا

یحکم بموتہ اذا ماتت اقرانہ فی بلدتہ علی المذھب و انما یثبت بقضاء لأنہ امر محتمل ۔ پس صورت مسئولہ میں حسب تفصیلِ مذکورہ بالا عمل کیا جائے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو کچھ سامان دیا کہ فلاں شہر میں بکر کو پہنچا دے ۔ عمرو نے سامان ریل پر اپنے ساتھ رکھا مگر اتفاقاً کسی نے اس کو چرا لیا ۔ کیا عمرو کو اس کا ڈنڈ دینا پڑیگا ؟

الجواب

امانت دار جبکہ امانت کی کافی حفاظت کرے اور پھر وہ چوری ہوجائے، تو اس پر ضمان یعنی ڈنڈ دینا لازم نہیں ہے ۔ در مختار کی کتاب الایداع میں ہے ؛ فلا تضمن بالھلاک مطلقا سواء امکن التحرز ام لا ھلک معھا شیء ام لا لحدیث الدار قطنی ؛ لیس علی المستودع غیر المغل ضمان ۔ و اشتراط الضمان علی الأمین باطل و بہ یفتی ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الودیعہ میں ہے ؛ رجل دفع الی رجل الف درھم و قال لہ ادفعہ الی فلان بالری ثم مات الدافع فدفع المودع المال الی رجل لیدفعہ الی فلان بالری فأخذ فی الطریق فلا ضمان علی المودع ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کے پاس سامان امانت رکھوایا ۔ بکر نے کسی ضرورت کے تحت یہ سامان بغرضِ حفاظت اپنے بھائی خالد کی حفاظت میں دیدیا، اور خالد نے اس کو تلف کردیا ۔ اس کا ضمان بکر کے ذمہ ہے یا خالد کے ؟

الجواب

اس کا ضمان خالد کے ذمہ ہے ۔ کیونکہ اس نے عمداً تلف کیا ہے، بکر نے سامان چونکہ ضرورتاً اپنے پاس سے منتقل کیا تھا اس لئے بکر پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الودیعہ باب ثانی میں ہے ؛ و ان اخرجھا عن یدہ عند الضرورۃ بأن وقع الحریق فی دارہ فخاف علیہ الحرق او کانت الودیعۃ فی سفینۃ فلحقھا غرق او خرج اللصوص و خاف علیھا او ما اشبہ ذلک فدفعھا الی غیرہ لا یکون ضامنا کذا فی فتاوی قاضیخان ۔ اسی صفحہ میں ہے ؛ و لو استھلک الثانی الودیعۃ ضمن بالاجماع ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب العاریۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو اپنی ذاتی رقم سے زیور اور قیمتی لباس بنواکر پہنایا ۔ اس کے بعد زید کا انتقال ہوگیا ۔ یہ زیور کیا زوجہ کی ملک ہے یا زید کا متروکہ ہے ؟ اسی طرح قیمتی لباس کا کیا حکم ہے ؟

الجواب

قیمتی لباس و زیور کا زوجہ کو دے دینا بینہ شرعیہ سے اگر ثابت ہوجائے تو یہ زوجہ کی ملک ہے ، ورنہ زید کا متروکہ ہے جو حسبِ فرائض ورثہ میں تقسیم ہوگا ۔ شوہر کا زوجہ کو پہنانا زوجہ کے ملک ہونے کی دلیل نہیں ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۴ صفحہ ۷۱۵ کتاب العاریۃ میں ہے ؛ اذا اعترفت الزوجۃ بأصل الملک فی المصاغ المذکور لزوجها و لم تثبت انتقالها بناقلٍ شرعي يكون تركة عن الزوج و لا يكون استمتاعها به حال حياته و رضاه بذلك دليلا على انه ملكها كما تفهمه النساء و العوام ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الھبـــہ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی حالت صحت میں اپنی کل املاک، منجملہ چار زوجہ کے ایک زوجہ کو ھبہ کرکے اپنی زندگی ہی میں قبضہ دے دیا اور انتقال کرگیا۔ ان چار زوجات میں سے کسی کا بھی مہر اداء نہیں کیا۔ کیا ایسی صورت میں یہ زوجات املاک مذکورہ سے اپنے مہر لے سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی جب زید نے اپنی کل املاک حالت صحت میں ھبہ کرکے ایک زوجہ کو قبضہ بھی دے دیا ہے، تو اب بعد وفات زید کی ان املاک سے دیگر زوجات کا زر مہر اداء کرنا شرعاً نا جائز ہے۔ کیونکہ زوجہ کو جو ھبہ کیا جاتا ہے اس کا واپس لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور اسی طرح ھبہ کرنے والے اور ھبہ لینے والے ان دونوں میں سے کسی ایک کے فوت ہوجانے سے بھی ھبہ کردہ شے کا واپس لینا درست نہیں ہے۔ ہدایہ طبع مصطفائی کی کتاب الھبہ میں ہے: و ان وھب ھبة لذی رحم محرم منه لم یرجع فیها و کذلک ما وھب احد الزوجین للآخر۔ اور صفحہ ۲۸۳ میں ہے: و اذا وھب ھبة لأجنبی فله الرجوع فیها الا ان یعوضه عنها او یزید زیادة متصلة او یموت احد المتعاقدین۔ بناء بریں جبکہ زید کا اپنی حین حیات زوجہ سے بوجہ زوجیت ھبہ کردہ شئے کا خود واپس لینا شرعاً جائز نہیں تھا، تو اب جبکہ زید واھب فوت ہوگیا ہے تو ورثائے زید کا ان املاک کو واپس لینا یا ان سے زید کا دین اداء کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ولی محمد نے اپنی زوجہ کے نام بمعاوضہ پانچ سو (۵۰۰) روپئے زر مہر اپنا مکان ھبہ کردیا، جس کی رجسٹری با ضابطہ محکمۂ سرکار میں کروادی گئی۔ بعد ھبہ و رجسٹری اس مکان سے علحدہ ہوکر زوجہ کو قبضہ نہیں دیا بلکہ حسب سابق زوج و زوجہ دونوں ہی اس مکان میں رہے۔ اس کے بعد زوجہ اپنی تین (۳) لڑکیوں کو مکان ھبہ کرکے فوت ہوگئی۔ اب زوج مسمیٰ ولی محمد یہ چاہتا ہے کہ ہر سہ دختران کو اس مکان اور متروکۂ زوجہ سے محروم و بے دخل کرے۔ اس کے متعلق شرعی کیا حکم ہے؟

الجواب

ھبہ بالمعاوضہ کے لئے شرعاً قبضہ ضروری ہے۔ اگر قبضہ کے پہلے کوئی ایک مرجائے تو ھبہ باطل ہوجاتا

ہے ۔ در مختار کتاب الھبہ باب الرجوع میں ہے : و اذا وقعت الھبة بشرط العوض المعین فھی ھبة ابتداء فیشترط التقابض فی العوضین ۔ اسی باب میں ہے : و المیم موت احد العاقدین بعد التسلیم فلو قبله بطل ۔ رد المحتار میں ہے : یعنی عقد الھبة الأولی بطلت ای لانتقال الملک للوارث قبل تمام الھبة ۔ سائحانی ۔ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۲۸۰ کتاب الھبہ باب ثانی میں ہے : ھبة الشاغل تجوز و ھبة المشغول لا تجوز و الأصل فی جنس ھذه المسائل ان اشتغال الموھوب بملک الواھب یمنع تمام الھبة ، مثاله وھب جرابا فیه طعام لا تجوز و لو طعام فی جراب جازت ۔ و علی ھذا نظائره کذا فی الفصول العمادیة ۔ اسی صفحہ میں ہے : و فی المنتقیٰ عن ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ لا یجوز للرجل ان یھب لامرأته و لا ان تھب لزوجھا او لأجنبی دارا و ھما فیھا ساکنان و کذلک للولد الکبیر کذا فی الذخیرة ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ ھبہ و رجسٹری کے بعد زوج نے مع سامان علحدہ ہوکر زوجہ کو اس مکان پر قبضہ نہیں دیا ہے یا بدون قبضہ کے زوجہ کا انتقال ہوگیا ہے اس لئے شرعا یہ ھبہ باطل ہے ، اور اس کے بطلان سے زوجہ کا اپنی لڑکیوں کو ھبہ کرنا بھی باطل ہے ۔ پس اس وقت مکان زوج کی ملک ہے ۔ البتہ زر مہر مبلغ پانچ سو روپے زوج کے ذمہ واجب الاداء ہیں اور یہ زوجہ کا متروکہ ہے ، اس کے ساتھ زوجہ کا دوسرے متروکہ یعنی اثاثہ وغیرہ تمام چیزوں سے زوجہ کا قرض اور وصیت در ثلث مال اداء کرنے کے بعد باقی کے چار حصے کرکے زوج اور تینوں لڑکیاں ایک ایک حصہ لینے کے مستحق ہیں ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے انتقال کے بعد زید کا ایک لڑکا بکر ھبہ نامہ پیش کرکے جس پر زید کی وفات کے چند سال پیشتر کی تاریخ ہے بیان کرتا ہے کہ میرے والد نے اس ھبہ نامہ کی رو سے مجھے اپنی تمام املاک ھبہ کی ہے ، لہٰذا ان سب کا میں ہی مالک ہوں ، دوسرے ورثاء کا اس میں کوئی حق نہیں ہے ۔ حالانکہ زید اپنی وفات تک اپنی تمام جائداد پر خود قابض و متصرف رہا ، اور بکر کو اس پر قبضہ نہیں دیا ۔ کیا ایسی صورت میں اس ھبہ نامہ کی بناء پر تمام ورثاء محروم ہوں گے ؟ اور تنہا بکر ہی اس کا مالک رہے گا یا نہیں ؟

الجواب

ھبہ کے لئے قبضۂ کامل شرط ہے ۔ چونکہ زید حین حیات اپنی تمام جائداد پر خود قابض و متصرف رہا ہے اس لئے بر تقدیر ثبوت ھبہ نامہ قبضہ نہ دینے کی وجہ سے ھبہ نامہ نا تمام ہے ۔ بلکہ از روئے ھبہ نامہ جن اشیاء کے موھوبہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ھبہ نہیں بلکہ متروکہ ہیں ، زید کے تمام ورثاء کو حسب فرائض ان میں حق ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۳ صفحہ ۵۰۳ کتاب الھبہ میں ہے : سئل فی رجل وھب مقدارا معلوما من الدراھم للآخرین مکلفین و حصة من حانوت یملکھا و مات قبل قبضھما الموھوب من الدراھم و الحصة المذکورة فھل لا تکون ھذه الھبة نافذة لا سیما و الحانوت مشغولة بأمتعة فیھا الی ان مات ؟

اجاب : اذا مات الواهب قبل قبض الموهوب له الهبة بطلت و تكون ميراثا عن الواهب كما في متروكاته ۔ اور صفحہ ۵۸۵ میں ہے : سئل في رجل ادعى على اعمامه بان جده كتب له قبل موته في حال صحته و سلامته وثيقة مضمونها انه اعطاه من ماله مشاعا كذا قراريط و الحال ان الجد المذكور لم يفرزه و لم يسلمه له قبل موته فهل تكون هذه الهبة غير صحيحة لما ذكر حيث بالغا وقت الإعطاء له المذكور ؟ اجاب : لا عبرة بهذا الإعطاء لابن الابن البالغ المذكور حيث كان الواقع ما هو مسطور بالسؤال ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ ہوا ۔ اور کچھ مدت بعد ہندہ بگذاشتِ والدین و زوج فوت ہوئی ۔ اب ہندہ کے مال و زیور کا کون وارث ہے ؟ اور ہندہ کے والدین نے ہندہ کے شوہر کو جو کپڑے اور جوڑا وقت نکاح دے دیا تھا وہ جوڑا اب تک بلا تغیر و تبدل زید مالک میں موجود ہے ۔ کیا اس کو واپس لے سکتے ہیں ؟

الجواب

در صورتِ صداقتِ مستفتی بعد وضع مصارف تجہیز و تکفین و ادائے دیون و اجرائے وصیت ، باقی مال کے $\frac{1}{6}$ چھ حصے کرکے زوج کو تین $\frac{3}{6}$ حصے ، اور والد کو دو $\frac{2}{6}$ حصے ، اور والدہ کو ایک $\frac{1}{6}$ حصہ دیا جائے ۔ شئے موہوبہ کا رجوع اگرچہ شرعاً حرام ہے اور اس کا مرتکب گنہگار ہے مگر جبکہ شئے موہوبہ بلا تغیر و تبدل موجود ہو اور واہب اس کو واپس لینا چاہے اور ہبہ بھی بلا معاوضہ ہو تو واہب یہ شئے موہوب لہٗ کی رضامندی یا قاضی کے حکم سے واپس لے سکتا ہے ۔ در مختار کے باب الرجوع فی الہبۃ میں ہے : صح الرجوع فيها بعد القبض مع انتفاء مانعه و ان كره تحريما ۔ اسی باب کے اخیر میں ہے : لا يصح الرجوع الا بتراضيهما او بحكم الحاكم ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اگر اپنا زر مہر زوج کو معاف کردے ، تو کیا اس کو پھر رجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ اگر عاقلہ بالغہ ہے اور اس نے بلا جبر و تعدی کے اپنا زرِ مہر زوج کو معاف کیا ہے ، تو ایسی صورت میں اس کو رجوع کرنے کا حق نہیں ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ا کے صفحہ ۱۸۱ میں ہے : اذا ابرأت المرأة زوجها عن المهر و اسقطت حقها منه لا يكون لها الرجوع من ذلك ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شئے موہوبہ خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ ، بعد تکمیل ھبہ و قبضہ ، کن صورتوں میں موہوب لہ سے واہب واپس لے سکتا ہے ؟

الجواب

بعد تکمیل ھبہ و قبضہ سات صورتوں میں شئے موہوبہ کا موہوب لہ سے واپس لینا ممنوع ہے :

۱ ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ، بعد تکمیل ھبہ ، موہوب لہ شئے موہوبہ پر ایسی زیادتی کردے جو بالکل متصل ہو ، جیسے ھبہ کی ہوئی زمین پر مکان بنانا یا درخت لگا دینا ۔

۲ ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ، واہب یا موہوب لہ میں سے کوئی ایک فوت ہوجائے ۔

۳ ۔ تیسری صورت ، عوض ہے ، یعنی اگر کوئی عوض لیکر ھبہ کرے تو اس میں بھی رجوع نہیں ۔

۴ ۔ چوتھی صورت ، شئے موہوبہ کا موہوب لہٗ کی ملک سے خارج ہوجانا ، مثلاً موہوب لہٗ بھی شئے موہوبہ کسی کو بیچ دے یا ھبہ کردے ۔

۵ ۔ پانچویں صورت ، واہب و موہوب لہٗ کا باہم ھبہ کے وقت زوج و زوجہ ہونا ۔ یعنی زوج اگر کوئی چیز زوجہ کو ھبہ کرے ، یا زوجہ زوج کو ھبہ کردے تو تا قیام زوجیت ہر ایک کا دوسرے سے اس چیز کو واپس لینا صحیح نہیں ہے ۔

۶ ۔ چھٹی صورت ، واہب و موہوب لہٗ کا باہم قرابت دار رحمی ہونا ہے ، یعنی قرابت داران رحمی کو بھی کوئی چیز دیکر واپس لینا صحیح نہیں ہے ۔

۷ ۔ ساتویں صورت ، شئے موہوبہ کا ھلاک یا تلف ہوجانا ہے ۔ فتاویٰ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵۲۸ میں ہے : (یمنع الرجوع فیھا "دمع خزقة") فالدال الزیادة المتصلة کبناء و غرس ، و المیم موت احد العاقدین ، و العین العوض ، و الخاء خروج الھبة عن ملک الموھوب لہٗ ، و الزای الزوجیة وقت الھبة ، و القاف القرابة ، و الھاء ھلاک العین الموھوبة ۔ ان صورتوں کے سوا واہب اگر موہوب لہ سے قبضہ و تکمیل ھبہ کے بعد بھی شئے موہوبہ کو واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے ۔ مگر ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے ۔ در مختار کے اسی صفحہ میں ہے : (صح الرجوع فیھا بعد القبض) اما قبلہ فلم تتم الھبة (مع انتفاء مانعہ و ان کرہ) الرجوع (تحریما و لو مع اسقاط حقہ من الرجوع) فلا یسقط باسقاطہ ۔ خانیة ، واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے آباء و اجداد سے ایک جاگیر مشروط الخدمت چلی آرہی ہے ۔ زید کا چچا عمرو جو اس خدمت پر قائم نہیں ہے اس لے معاش کو اپنے پوتے خالد کے نام ھبہ کردیا ۔ کیا یہ ھبہ شرعاً درست اور واجب التعمیل ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

شرح میں ھبہ کے صحیح ہونے کی شروط میں سے ملک بھی ایک شرط ہے ۔ یعنی شئے موہوبہ ، واہب یعنی ھبہ کرنے والے کی ملک ہو ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۴ صفحہ ۵۴۱ کتاب الھبہ میں ہے : و شرائط صحتها في الواهب العقل و البلوغ و الملك ۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ شئے موہوبہ ھبہ کرنے والے کے قبضہ تصرف میں بھی ہو ۔ چنانچہ در مختار میں اسی جگہ ہے : (و) شرائط صحتها (في الموهوب ان يكون مقبوضا) غير مشاع مميزا غير مشغول ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ معاش مشروط الخدمت زید کے چچا عمرو کی نہ ملک ہے اور نہ اس کے قبضہ تصرف میں ہے ، اس لئے یہ ھبہ شرعا صحیح نہیں ہے ، اور نہ اس کی تکمیل واجب ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شمشیر خان نے اپنی عین حیات اپنی کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ یعنی جاگیر وغیرہ اپنی لڑکی یاسین بی کو ھبہ بالقبض کیا ۔ جس کو سرکار نے بھی منظور کرلیا ۔ یاسین بی کے انتقال کے بعد یاسین بی کا لڑکا میر مظفر علی بر بنائے وراثت جملہ جائداد پر قابض تھا ۔ اب میر مظفر علی کا بگذاشت یک عم حقیقی و دو زوجہ انتقال ہوگیا ۔ اور میر مظفر علی کے نانا شمشیر خان مرحوم کے حقیقی بھائی حمید خان مرحوم کے فرزند غفور خان کا یہ دعویٰ ہے کہ جملہ جائداد میرے چچا شمشیر خان کی ہے ، جس کا میں وارث ہوں ۔ کیا غفور خان کا یہ دعویٰ شرعا درست ہے ؟ اور غفور خان مستحق میراث ہے یا نہیں ؟

الجواب

در صورت صداقت مستفتی ، ھبہ قبضۂ کامل سے تمام ہوجاتا ہے ، اور واہب یا موہوب لہٗ کسی ایک کے مرجانے سے اس کا رجوع بھی صحیح نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۵۴۳ میں ہے : (و تتم) الهبة (بالقبض) الكامل ۔ اور ہدایہ طبع مصطفائی کے صفحہ ۲۷۳ کتاب الھبہ میں ہے : و اذا وهب هبة لأجنبي فله الرجوع الا ان يعوضه او يزيد زيادة متصلة او يموت احد المتعاقدين ۔ پس صورت مسئولہ میں شمشیر خان نے چونکہ اپنی مملوکہ جملہ جائداد کو اپنی عین حیات اپنی لڑکی یاسین بی کے نام ھبہ کرکے قبضہ میں دے دیا تھا ، اس لئے یہ ھبہ شرعاً کامل و تمام ہے ۔ شمشیر خان کے انتقال کے بعد یاسین بی سے اس کا واپس لینا درست نہیں ہے ۔ اس وقت شمشیر خان کی جملہ جائداد یاسین بی کی ملک ہے ، جس کے مستحق یاسین بی کے وارث ہیں ۔ میر مظفر علی فرزند یاسین بی کے انتقال کے بعد ان املاک کا استحقاق ورثائے میر مظفر علی کو ہے ۔ غفور خان کو ان املاک کے متعلق اپنے چچا شمشیر خان مرحوم کی جائداد بتاکر دعوائے وراثت کرنے کا شرعاً حق نہیں ہے ۔

جاگیر جو عطیۂ سلطانی ہے اس کے ھبہ کرنے کا شمشیر خان کو کوئی حق نہیں تھا ۔ مگر جبکہ سلطانِ وقت نے یاسین بی کے نام اس کو منظور کرلیا ہے ، تو یہ سلطانِ وقت کی جانب سے یاسین بی کے نام عطاءِ جدید

ہے ۔ یاسین بی کے انتقال کے بعد سلطانِ وقت کو یہ اختیار تھا کہ جس کے نام چاہے بحال کرے ، اور اب مظفر علی کے انتقال کے بعد بھی سلطانِ وقت کو یہی اختیار حاصل ہے ۔ رسالہ صدریہ کے صفحہ ۲۹۳ میں عالمگیریہ سے منقول ہے : اذا اعطیٰ السلطان لرجل خراج الأرض لا یسع لذلک الرجل ان یبیع تلک الأراضی و یھبھا و لا یصیر بعد موتہ ملکا لورثتہ لانھا لم تکن ملکا لہ فکیف یکون ملکا للورثۃ ۔ اور صفحہ ۲۹۵ میں ہے : الاراضی المعاشیۃ المعھودۃ فی الھند لیست من الترکۃ و لھذا لا تورث تلک الأراضی و لا تباع و لا تؤجر و لا ترھن و لا تملیک و لا وصیۃ فیھا فالعبرۃ فی الأراضی المعاشیۃ لحکم الأمیر و نائبہ کالصدور فلایٔ شخص جوّزوھا فھی لہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو پہلی زوجہ سے ایک لڑکا مسمیٰ عمرو ہے ، اور دوسری زوجہ سے چار لڑکے ، بکر ، خالد ، حامد ، رشید ہیں ۔ زید نے اپنی ایک ذاتی زمین اپنے بڑے لڑکے عمرو کو ہبہ کی اور سرکار میں اس کی باضابطہ رجسٹری کراکر عمرو کے قبضہ میں دے دی ، جس کا سرکاری پن ہبہ و قبضہ کے بعد سے اب تک عمرو اداء کررہا ہے ۔ عمرو چونکہ ملازمت کی وجہ سے اکثر سفر میں رہا کرتا تھا اس لئے زمین موہوبہ کی نگرانی اپنے والد اور علاتی بھائیوں کے سپرد کر رکھا تھا ۔ اب عمرو کا والد اس زمین کو عمرو سے واپس لینا چاہتا ہے ۔ کیا یہ رجوع شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

اور عمرو اپنے والد زید کی جملہ جائداد سے اپنے علاتی چاروں بھائیوں کے ساتھ کس قدر حصہ پانے کا مستحق ہے ؟

الجواب

واہب جبکہ کوئی شئے اپنے کسی ذی رحم محرم یعنی نسبی قرابت دار کو ہبہ کرے اور موہوب لہ کے قبضہ میں دے دے تو پھر اس کو اس سے رجوع کرلے اور واپس لینے کا حق نہیں ہے ۔ ہدایہ کی کتاب الھبۃ باب ما یصح رجوعہ و ما لا یصح رجوعہ میں ہے : و ان وھب ھبۃ لذی رحم محرم منہ لم یرجع فیھا لقولہ علیہ السلام " اذا کانت الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا " و لأن المقصود صلۃ الرحم و قد حصل ۔ البتہ اگر باپ مفلس و محتاج ہوجائے اور اس کو اپنی تنگ دستی دفع کرلے کے لئے بیٹے کو دی ہوئی چیز واپس لئے بغیر کوئی اور صورت نہیں ہے تو ایسی صورت میں باپ کو یہ اجازت ہے کہ وہ چیز بیٹے سے واپس لے لے ۔ فتح القدیر مصری جلد ، صفحہ ۵۰۱ میں ہے : قال فی البدائع فانہ یحل لہ اخذہ من غیر رضا الولد و لا قضاء القاضی اذا احتاج الیہ للانفاق علیٰ نفسہ اھ ۔ و قال فی الکفایۃ من شروح ھذا الکتاب فانہ یستقل بالرجوع فیما یھب لولدہ عند احتیاجہ الی ذلک للانفاق علیٰ نفسہ اھ الی غیر ذلک من المعتبرات ۔ پس صورت مسئولہ میں عمرو کا باپ اس وقت اگر مفلس و محتاج نہیں ہے اور اس کو اپنے ذاتی و ضروری اخراجات اس زمین سے پورے کرنے کی حاجت نہیں ہے تو ، ایسی حالت میں اس کے لئے موہوبہ زمین کا عمرو سے واپس لینا شرعاً جائز نہیں ہے ۔ —— =

باپ کی وفات کے بعد متروکہ سے عمرو، زمین موہوبہ کا مالک ہونے کے باوجود اپنے باپ کی باقی جملہ جائداد سے بھی چاروں علاتی بھائیوں کے ساتھ مساوی حصہ پانے کا مستحق ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید، خالد، ولید یہ تینوں آپس میں چچا زاد بھائی ہیں۔ زید اپنا ذاتی مکان چھوڑ کر فوت ہوا۔ اور خالد اس مکان کو اپنی زوجہ ہندہ کے نام ہبہ کرکے انتقال کیا۔ اب ولید یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ملکِ مُشاع کا ہبہ نا جائز ہے لہٰذا یہ ہبہ کالعدم ہے، خالد اور میں ہم دونوں زید کے چچا زاد بھائی ہیں اس لئے زید کے متروکہ سے پہلے میرا نصف حصہ دلایا جائے اور بقیہ نصف حصہ جو خالد کا ہے اس میں سے ایک ربع ہندہ زوجہ خالد کو دیکر بقیہ حصہ بوجہ عصوبت مجھکو دلایا جائے۔ کیا ولید کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب

جائداد مشترکہ جو قابل تقسیم ہے ایسی جائداد کو بحالت اشتراک بلا تقسیم و تعین ہبہ کرنا نا جائز ہے۔ ہدایہ اخیرین طبع مجتبائی کی کتاب الہبہ صفحہ ۲۱۹ میں ہے، و لا یجوز الهبة فيما يقسم إلا محوزة مقسومة۔ اسی صفحہ میں ہے: قال من وهب شقصا مشاعا فالهبة فاسدة فان قسمها و سلمها جاز لأن تمامه بالقبض و عنده لا شيوع۔ پس صورت مسئولہ میں خالد نے اگر مکان مشترکہ کو بلا تقسیم و تعیین حصص اپنی زوجہ کے نام ہبہ کیا ہے تو یہ ہبہ جائز نہیں ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو بعد عقد، زیور طلائی و نقروی زرمہر کی مقدار سے چار پانچ گنا زائد تیار کرواکے پہننے کے لئے دیا، اور دیتے وقت یہ بیان نہیں کیا کہ یہ سب بطور ہبہ بمعاوضۂ مہر یا اماناً و عاریتاً دیا گیا ہے۔ اور زر مہر بھی اداء نہیں کیا۔ اس کے بعد زید کا انتقال ہوگیا۔ پس ایسی صورت میں زیور زوجہ کی ملک ہے یا زوج کا متروکہ ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب

صورت مسئولہ میں جبکہ زوج مرحوم نے زوجہ کو زیور کا مالک نہیں بنایا ہے اور نہ دیتے وقت اس کی صراحت کی ہے، اس لئے جب تک کہ زوجہ اپنے لئے ہبہ کرنا یا بمعاوضۂ زر مہر دینا بیّنۂ شرعیہ سے ثابت نہ کرے، یہ زوج کی ملک و متروکہ ہے۔ زیور کو زوج کی زندگی میں اس کی رضامندی و اجازت سے اپنے جسم پر پہننا اور استعمال کرنا زوجہ کی ملک کی دلیل نہیں ہے۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۴ کتاب العاریۃ صفحہ ۵۲۵ میں ہے، سئل في رجل ألبس زوجته حليا مملوكا له لتتزين به و لم يملكه لها ثم توفي و الحلي باقٍ عندها

ثم توفیت هی ایضا فهل اذا ثبت بالوجه الشرعی ان الحلی ملک للزوج اُلبسه لزوجته زینة یکون ترکة عنه یقسم علیٰ جمیع ورثته للذکر مثلُ حظِّ الاُنثیَین و لیس لخصوص ورثة الزوجة الاختصاص به بدون وجه شرعی ؟ اجاب : اذا ثبت بالوجه الشرعی ان الحلی المذکور ملک للزوج و لم یثبت انتقاله لملک زوجته بطریق شرعی یقسم بین ورثة الزوج علیٰ فرائض اللّٰه تعالیٰ و لا یختص به ورثة الزوجة ۔ اور صفحہ ۵۲۹ میں ہے : اذا اعترفت الزوجة باَصل المِلک فی مصاغ المذکور لزوجها و لم تثبت انتقاله لها بناقل شرعی یکون ترکة عن الزوج و لا یکون استمتاعها به حال حیاته و رضاه بذلک دلیل علی انه ملکها ذلک کما تفهمه النساء و العوام ۔ و اللّٰه اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی عین حیات اپنے فرزند بکر کو کچھ روپیہ دیا تاکہ وہ تجارتی کاروبار کرے ، بکر نے کاروبار کیا اور مالِ تجارت میں اضافہ بھی ہوا ۔ اب زید کا انتقال ہوا ہے ۔ کیا یہ مالِ تجارت زید کا متروکہ ہوگا یا بکر کی ملک کی ہے ؟

الجواب

اگر زید نے بکر کو بطور ہبہ کے یہ روپیہ دیا تھا تو یہ مال تجارت مع اضافہ بکر کی ملک ہے ، ورنہ زید کا متروکہ ہے جو ورثہ میں حسب فرائض تقسیم ہوگا ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۵۳۵ کتاب الھبۃ فصل مسائل متفرقہ میں ہے : دفع لابنه مالا لیتصرف فیه ففعل و کثر ذلک فمات الاُب ان اعطاها هبة فالکل له و الا فالمیراث ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله و الا فالمیراث) بأن دفع الیه لیعمل للاَب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو ایک زوجہ کے بطن سے دو فرزند ہیں ، اور دوسری زوجہ کے بطن سے تین فرزند و تین دختر ہیں ۔ زید جائدادِ منقولہ و غیر منقولہ کا مالک ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی اولاد میں کسی کو کم اور کسی کو زائد عطاء کرے اور بعض کو محروم کردے ۔ کیا زید کو شرعاً ایسا حق حاصل ہے یا نہیں ؟

الجواب

بعض اولاد کو زائد دینے سے اگر زید کی غرض دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے تو ایسی عطاء درست نہیں ہے ۔ اور اگر بلا ارادہ ضرر کسی کو کم اور کسی کو زائد دیتا ہے تو دے سکتا ہے ۔ سب جائداد ایک ہی کو دیکر دوسروں کو محروم کردینا درست ہے لیکن ایسا کرنا گناہ ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ کتاب الھبۃ میں ہے : و فی الخانیة لا باس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب و کذا فی العطایا ان لم یقصد به الاِضرار و ان قصده یسوی بینهم یعطی البنت کالابن عند الثانیؒ و علیه الفتویٰ ۔

و لو وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز و اثم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو سرکار سے چند مکان " عنایت " ہوئے اور قبضہ میں بھی دیدیے گئے ۔ کیا عنایت کے لفظ سے جو چیز دی جاتی ہے وہ بھی ھبہ سمجھی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب

ھبہ شریعت میں وھبت ، اعطیت ، نحلت ، ملکت وغیرہ الفاظ تملیک بلا عوض سے ثابت ہوتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۴ صفحہ ۳۰۵ کتاب الھبہ باب اول میں ہے : وھبت ھذا الشیء لک او ملکتہ منک او جعلتہ لک او ھذا لک او اعطیتک او نحلتک ھذا فھذا کلہ ھبۃ ۔ ریاست حیدرآباد دکن میں چونکہ شاہی ھبہ کو " عنایت " و " سرفرازی " کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں زید کو جو مکان " عنایت " ہوئے ہیں یہ شرعی ھبہ ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ ہندہ کے نام کچھ جائداد ھبہ کرکے ھبہ نامہ لکھدیا ، مگر ہندہ کی زندگی تک اپنے ہی قبضہ میں رکھا ۔ اب ہندہ کا انتقال ہوگیا ہے ۔ کیا موہوبہ جائداد ہندہ کا متروکہ ہے یا نہیں ؟

الجواب

ھبہ بغیر قبضہ کے تمام نہیں ہوتا ۔ اور بالغ یا بالغہ کو چاہئے کہ یا تو خود اپنی ذات سے جائداد پر قابض ہو یا کسی کو اپنی طرف سے قبضہ کے لئے وکیل بنائے ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر ہندہ نے اپنے شوہر زید کو ھبہ کے بعد اس جائداد کے لئے وکیل مقرر کیا تھا اور وہ زوجہ کی حین حیات وکالتاً اس پر قابض تھا تو جائداد موہوبہ ہندہ کی ملک ہے جو اس کی وفات کے بعد اس کا متروکہ ہے ، ورنہ نہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ ردالمحتار جلد ۴ کتاب الھبۃ میں ہے : و تتم الھبۃ بالقبض الکامل ۔ صفحہ ۵۲۰ کتاب الھبۃ میں ہے : اما البالغۃ فالقبض لھا ۔ صفحہ ۵۲۳ میں ہے : وکل الموھوب لہ رجلین بقبض الدار فقبضاھا جاز ۔ خانیۃ ؛ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے چھوٹے لڑکے ولید کو اپنی تمام جائداد بحالت مرض موت ھبہ کرکے انتقال کیا ، حالانکہ زید کو ایک اور فرزند ہے جو ولید سے بڑا ہے اور دو لڑکیاں بھی ہیں ۔ کیا یہ ھبہ شرعاً صحیح ہے ؟ اور کیا زید کی جائداد سے ولید کے سوا باقی تمام اولاد محروم ہوگی ؟

الجواب

مریض کا مرض موت میں ھبہ کرنا قبضہ کرادینے کے بعد وصیت ہے، اور بدون قبضہ کے باطل ہے۔ پس زید اگر اپنی تمام جائداد ھبہ کرکے ولید کے قبضہ میں نہیں دیا ہے تو یہ ھبہ باطل ہے۔ اور اگر قبضہ دیا ہے تو یہ وصیت ہے جس کا نفاذ اجنبی کے لئے تو مال کے تیسرے حصہ سے کیا جاتا ہے مگر وارث کے لئے وصیت نا جائز ہے۔ پس صورت مسئولہ میں زید کا ھبہ نا جائز ہے۔ اور اس کی جملہ جائداد متروکہ ہے جو حسب فرائض اس کے دونوں لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم ہوگا۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الھبہ باب عاشر فی ھبۃ المریض میں ہے: قال فی الاصل و لا تجوز ھبۃ المریض و لا صدقتہ الا مقبوضۃ فاذا قبضت جازت من الثلث و اذا مات الواھب قبل التسلیم بطلت۔ در مختار کی کتاب الوصایا میں ہے: لا لوارثہ و قاتلہ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کو ایک عطائے سلطانی مقطعہ سے چوتھائی حصہ ملتا ہے، اور زید اس کو اپنی زوجہ کے نفقہ میں دیا کرتا ہے۔ زوجہ ایک اجنبی لڑکے کو اپنا متبنیٰ بناکر اس آمدنی کو ھبہ کرنا چاہتی ہے۔ کیا شرعاً یہ ھبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب

ھبہ کے لئے یہ شرط ہے کہ شئی موہوبہ ھبہ کرنے والے کی ملک اور قبضہ میں رہے۔ بناء بریں اس آمدنی کو اپنے قبضہ میں آنے کے بعد ھبہ کرسکتی ہے، قبل قبضہ درست نہیں ہے۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الھبۃ میں ہے: و منھا ان الموھوب مقبوضا حتی لا یثبت الملک للموھوب لہ قبل القبض۔ اسی صفحہ میں ہے: او لا یکون مالکا للموھوب لا یصح۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زندگی میں اپنے منجھلے فرزند بکر کے نام سے جس کی عمر پچیس سال کی ہے ایک زمین خریدی، اور اپنی ذاتی رقم سے اس پر مکان بناکر بکر ہی کی طرف سے کرایہ پر دیا، اور ٹیکس وغیرہ اپنی ذاتی رقم سے اداء کرتا رہا، اور اس کا کرایہ بکر کے فرزند کے نام سے ساہوکار کے پاس جمع کرتا رہا، اور ضرورت کے وقت اس مجتمعہ رقم سے خود بھی خرچ کیا کرتا تھا۔ زید نے اپنی حین حیات اس مکان و زمین کو نہ تو بکر کے قبضہ میں دیا اور نہ اس بارے میں کوئی وثیقہ تحریر کیا۔ پس ایسی حالت میں زید کے انتقال کے بعد کیا یہ مکان بکر کی ملک سمجھا جائے گا یا زید کا متروکہ؟ بینوا توجروا!

الجواب

جس شخص کو ھبہ کیا جاتا ہے جب وہ عاقل و بالغ ہو تو تکمیل ھبہ کے لئے اس شخص کو چاہئے کہ موہوبہ چیز کو اپنے قبضہ میں لے لے ۔ عالمگیریہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۲ کتاب الھبہ باب سادس میں ہے : الموهوب له ان كان من اهل القبض فحق القبض اليه ۔ و ان كان الموهوب له صغيرا او مجنونا فحق القبض الى وليه ۔ بغیر قبضہ کے ھبہ تمام نہیں ہوتا ۔ در مختار کی کتاب الھبۃ میں ہے : و تتم الهبة بالقبض الكامل ۔ پس صورت مسئولہ میں زید نے جو بکر کے نام سے زمین خرید کر مکان بنایا ہے یہ شرعی ھبہ نہیں ہے اور قبضہ نہ دینے کی وجہ سے بھی یہ معاملہ نا تمام ہے ۔ لہذا یہ زید کا متروکہ ہے جو حسب فرائض اس کے ورثاء پر تقسیم ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر کا انتقال ہوا ۔ اس کی زوجہ حمیدہ نے اپنا حصہ اپنی دختر جمیلہ کو ھبہ کردیا ۔ کیا کوئی وارث قبل از تقسیم ترکہ اپنا حصہ کسی دوسرے وارث کو ھبہ کرسکتا ہے یا نہیں ؟ حالانکہ زید کے ورثاء میں اس کا ایک بھتیجا حسن بھی وارث ہے جس کا حصہ ترکہ میں شریک ہے !

الجواب

ھبہ کی شروط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ شئے موہوبہ " فارغ " یعنی شرکت سے خالی " ممیز " یعنی غیر مشاع ہو ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ ہندہ کا حصہ تا حال ممتاز و ممیز نہیں ہوا ہے اس لئے یہ ھبہ درست نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب الھبہ میں ہے : و شرائط صحتها فى الموهوب ان يكون مفرغا غير مشاع مميزا غير مشغول ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے مرض موت میں بکر کے فرزندوں کو مکانات وغیرہ ھبہ کردیا اور قبضہ بھی دے دیا ۔ کیا یہ ھبہ شرعا جائز ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

یہ وصیت ہے ، اور ثلث مال میں نافذ ہوگی ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ باب العتق فی المرض میں ہے : (اعتاقه و محاباته و هبته و وقفه و ضمانه) كل ذلك حكمه كحكم وصية فيعتبر من الثلث ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله وهبته) اى اذا اتصل بها القبض قبل موته اما اذا مات و لم يقبض فبطل الوصية لأن هبة المريض هبة حقيقة و ان كانت وصية حكما كما صرح به قاضيخان ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

باب العطایا

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ پادشاہ کی عطاء کی ہوئی معاش و ماہوار وغیرہ میں معطیٰ لہٗ کے انتقال کے بعد میراث کے احکام نافذ ہوتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

جو عطایائے سلطانی کہ بہ بجائے تملیک عطاء نہیں ہوئی ہیں وہ معطیٰ لہ کا متروکہ نہیں ہیں ، اس میں میراث کے احکام نافذ نہیں ہوتے۔ معطیٰ لہ کے انتقال کے بعد ان کی اجرائی کے متعلق سلطان وقت کو اختیار ہے۔ الاشباہ و النظائر میں ہے : العطاء للذی جعل الامام عطاءً لہ لأنّ استحقاق العطاء باثبات الإمام ۔ رسالۂ عطایا میں ہے کہ رسالۂ صدریہ کے صفحہ ۳۹۶ میں ذخیرہ سے منقول ہے : العطاء و الوظیفۃ لا یدخل فی ترکۃ المیت و لا یترتب علیہ احکام المیراث ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عطایائے سلطانی کی بیع ، رہن ، وقف وغیرہ درست ہے یا نہیں ؟ اور کیا اس میں معطیٰ لہٗ مالکانہ تصرف کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

سلطانِ وقت اگر کسی کو زمین کا مالک بنادے تو وہ اس کی ملک ہے ، جس میں وہ مالکانہ تصرف بیع و رہن و ہبہ وغیرہ کرسکتا ہے۔ اور جو زمینات کہ بطور انعام دی جاتی ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین سرکار کی ملک ہے صرف معطیٰ لہٗ کو حین حیات اس سے فائدہ حاصل کرلے اور معیشت چلانے کا حق ہے ، تو ایسی زمین معطیٰ لہ کی ملک نہیں ہے ۔ اور معطیٰ لہ کو اس میں بیع و ہبہ و وقف وغیرہ مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ کتاب الجہاد باب العشر و الخراج مطلب فی احکام الاقطاع من بیت المال میں ہے : فھذا یدل ان للإمام ان یعطی الأراضی من بیت المال علی وجہ التملیک لرقبتھا کما یعطی المال حیث رأی المصلحۃ اذ لا فرق بین الأرض و المال فی الدفع للمستحق ۔ در مختار میں اسی جگہ ہے : و لو اقطعہ السلطان ارضا مواتا او ملکھا السلطان ثم اقطعھا لہ جاز وقفہ لھا ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ جاز وقفہ لھا) و کذا بیعہ و نحوہ لأنّہ ملکھا حقیقۃ ۔ اس عبارت

کے کچھ پہلے ہے ، و فی النھر یعلم من قول الثانی حکم الاقطاعات من اراضی بیت المال اذ حاصلها ان الرقبة لبیت المال و الخراج له و حینئذ فلا یصح بیعه و لا هبته و لا وقفه ۔ العطایا میں رسالۂ صدریہ کے صفحہ ۲۹۵ سے منقول ہے ۔ قال الاراضی المعاشیة المعهودة فی الهند لیس من الترکة و لهذا لا تورث تلک الأراضی بعد ما اعطیت له و لا تباع و لا تؤجر و لا ترهن و لا تملیک و لا وصیة فیها فالعبرة فی الارض المعاشیة لحکم الأمیر و نائبه کالصدور فلأیّ شخص جوّزوها فهی له ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو انعامات کہ سرکار سے بہ جلتے تملیک عطاء نہیں ہوتے ہیں ، مثلاً جاگیرات و مدد معاش یومیہ و وظائف وغیرہ ، معطیٰ لہ کے انتقال کے بعد جبکہ ان کی اجرائی معطیٰ لہ کی اولاد کے نام کی جائے تو اس کی اولاد کیا اس میں مساوی حصہ پائے گی ؟ یا حسب فرائض لڑکے کو دو ۲ حصے اور لڑکی کو ایک ۱ حصہ دیا جائے گا ؟

الجواب

ایسے عطیات کی تقسیم لڑکے لڑکیوں میں مساوی ہے ۔ رد المحتار جلد ۴ کتاب الھبۃ میں قاضیخان سے منقول ہے ۔ یعطی البنت کالابن و علیه الفتوی ۔ رسالہ العطایا میں رسالہ صدریہ کے صفحہ ۳۹۰ سے منقول ہے : للامام ان یعطی الوظیفة لزید و اولاده و احفاده فیقسم بینهم بالسویة و لا یفضل ذکور علی الاناث و یدخل فیهم اولاد البنات ۔ سراج طبع مصطفائی کے صفحہ ۴ میں ہے : و یشهد له ایضا انه یستوی بین الذکر و الأنثی من المسلمین فی العطیة من ذلک المال ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سرکار سے جو معاش خدمت کے معاوضہ میں دی گئی ہے اور جس کی بحالی کے لئے خدمت کی ادائی شرط ہے اس کا مستحق محض صاحب خدمت ہوگا یا دیگر حصہ دار بھی اس میں حصہ پائیں گے ؟ خصوصاً لڑکیاں جو بیاہ دی گئی ہیں ۔ اگر یہ معاش ان پر تقسیم کردی جائے گی تو پھر صاحبِ خدمت کس طرح خدمت اداء کرسکتا ہے ؟

الجواب

خدمت کے معاوضہ میں جو معاش دی جاتی ہے وہ خدمت کی اجرت ہے ، اس کا مستحق وہی شخص ہے جو خدمت اداء کرتا ہے ۔ اگر سرکار صاحبِ خدمت سے خدمت علحدہ کرکے محض بغرضِ پرورش خاندان اس معاش کو بحال کرے تو اب یہ مشروط الخدمت نہیں رہی ، بلکہ اس کی حیثیت مدد معاش کی ہے جو تمام

حصہ داروں پر بلا لحاظ ذکور و اناث مساوی تقسیم ہوگی۔ فتاویٰ قاضیخان میں ہے : و ان کان الانعام بشرط الخدمة فهو اجرة فلا یورث و لا یقسم و لا یستحق الأجرة الا من قام بالخدمة۔ فتاویٰ ابی اللیث میں ہے : و الوظیفة بشرط الخدمة لمن قام بها۔ رسالہ صدریہ میں شریعت الاسلام سے منقول ہے : للإمام ان یعطی الوظیفة لزید و اولاده و احفاده فیقسم بینهم بالسویة و لا یفضل ذکور علیٰ الإناث و یدخل فیهم اولاد البنات۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید صاحب معاش کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء نے باہم مصالحت کرکے ایک صلحنامہ تقسیم معاش کا مرتب کیا، اور سرکار میں پیش کرکے حسب معاش کی بحالی چاہی۔ سرکار نے ان کی خواہش کے موافق منظوری دی، اور معاش بحال کردی۔ اب بعض ورثاء یہ چاہتے ہیں کہ تقسیم بلحاظ حقوق فرائض ہو۔ صلحنامہ میں جو تقسیم ہوئی وہ ان کو منظور نہیں ہے۔ کیا سرکار کی منظوری کے بعد ان کو ایسی استدعاء کا حق ہے؟ خصوصا جبکہ انہوں نے خود ایک صلحنامہ مرتب کرکے اپنی رضا مندی کا اظہار کردیا ہے؟

الجواب

عطایا چونکہ متروکہ نہیں ہیں، اس لئے معطیٰ لہ کے انتقال کے بعد سرکار سے اس کی بحالی و منظوری ضروری ہے۔ سرکار سے معطیٰ لہ کے ورثاء کے نام جو معاش کی بحالی ہوئی ہے یہ منجانب سرکار عطاءِ جدید ہے جس کے متعلق سرکار کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی کے نام چاہے بحال کرے، خصوصا جبکہ سرکار نے از روئے صلح نامہ ورثاء کی خواہش کے موافق منظوری دی ہے تو اب صدورِ منظوری کے بعد اس کے خلاف کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ پس زید کے ورثاء کو وہی ملے گا جو دفترِ سرکار میں لکھا گیا ہے۔ رسالۂ صدریہ کے صفحہ ۵۹ میں ہے : فالعبرة فی الارض المعاشیة لحکم الأمیر و نائبه کالصدور فلذیٰ شخص جوّزها فهی له۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الصلح فی العطاء میں ہے : قال فالعطاء لصاحب الاسم المثبت فی الدیوان۔ الاشباہ و النظائر کے صفحہ ۵۰ میں ہے : و العطاء للذی جعل الامام عطاءا له لان استحقاق العطاء باثبات الإمام لا دخل فیه لرضاء الغیر۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو انعام کہ "نسلاً بعد نسلٍ" کے الفاظ سے شاہانِ سلف نے عطاء کیا ہے، معطیٰ لہ کے انتقال کے بعد اس کی اولاد میں لڑکے و لڑکیاں ہوں تو وہ انعام کیا صرف لڑکوں پر جاری ہوگا اور لڑکیاں محروم ہوں گی؟ بینوا توجروا!

الجواب

" نسل " کا لفظ لڑکے اور لڑکی دونوں کو شامل ہے ۔ اس لئے معطیٰ لہ کے انتقال کے بعد اس انعام میں لڑکے و لڑکیاں دونوں حصہ پائیں گے اور ان کے بعد ان کی اولاد ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۵۲ میں ہے : و " النسل " اسم للولد و ولده ابدا و لو انثیٰ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ " اولاد " کے نام سے جو انعام بحال ہوتا ہے کیا اولاد سے صرف اولاد ذکور مراد ہوں گے یا اناث بھی اس میں شریک ہوں گی ؟

الجواب

" ولد " کا لفظ لڑکے اور لڑکی دونوں کو شامل ہے ، اس لئے اولاد میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی شریک اور انعام کی حق دار ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۴۵۴ باب وصیۃ الاقارب و غیرھم میں ہے : و لولد فلان فھی للذکر و الانثیٰ سواء لأن اسم "الولد" یعم الکل ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو زمینات بطورِ انعام کے سرکار سے عطاء ہوتی ہیں کیا سرکار ان کو بلا وجہ چھین لے سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

بغیر کسی حقِ شرعی کے سرکار ان کو چھین نہیں سکتی ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ کتاب الجہاد و باب العشر و الخراج میں ہے : و لیس للامام ان یُخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الإجارة

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فقہائے متقدمین نے مؤذن و معلم قرآن و حفاظ و پیش امام وغیرہ امور دین انجام دینے والے اشخاص کے لئے اجرت لینا حرام بتلایا ہے، اور فقہائے متاخرین نے جائز رکھا ہے۔ عرض یہ ہے کہ وجوہِ جواز کتبِ فقہیہ سے مع دلائل و حوالہ جات بیان کئے جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر فرمایا جائے کہ عدم جواز اخذ اجرت کے متعلق متقدمین کے فتاویٰ منسوخ سمجھے جائیں یا کیا؟ اور مذکورہ دونوں گروہ میں سے کس کے قول پر عمل کیا جائے؟ بینوا توجروا!

الجواب

فقہائے متاخرین نے تکمیل امورِ دینیہ پر اجرت لینے کو اس وجہ سے جائز رکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں جو حضرات ان خدمات کو انجام دیا کرتے تھے ان کے لئے بیت المال کی جانب سے وظائف و انعام مقرر تھے، جس سے ان کی ضروریات معیشت میں کوئی تنگی نہیں واقع ہوتی تھی۔ بدیں وجہ وہ اجرت لینے کو مکروہ جانتے تھے، اور حسبۃً للہ ان خدمات کی انجام دہی ہوا کرتی تھی۔ صاحب عنایہ لکھتے ہیں: و قالوا انما کرہ المتقدمون ذٰلک لأنہ کان للمعلمین عطیات من بیت المال فکانوا مستغنین عما لا بد لہم من امر معاشہم و قد کان فی الناس رغبۃ فی التعلیم بطریق الحسبۃ و لم یبق ذٰلک فی زماننا۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ ان حضرات کے لئے کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے اور نہ کوئی تعلیم پانے والا بدون شرط گردانے ان کی خدمت کرتا ہے، اگر یہ لوگ حسبۃً للہ اس کام کی انجام دہی کریں تو فکر معاش کے لئے کسی اور ذریعہ کو اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر معاش ہی کی فکر کی جائے تو ان امور کی انجام دہی جو ضروریات دین سے ہیں رہ جاتی ہے۔ اس لئے ان امور کی ادائی پر اجرت لینے کو علمائے متاخرین نے جائز رکھا ہے، اور یہ بات بتائی گئی کہ اختلافِ حالات سے احکام شرع میں بھی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عورتیں مساجد میں نماز کے لئے آیا کرتی تھیں، مگر امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بمقتضائے زمانہ اس کو موقوف فرمادیا۔ بناء بریں متاخرین اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بلحاظ اس زمانہ کے بعض امور شرعیہ پر اجرت لینا ناجائز تھا، مگر موجودہ زمانہ میں بھی اگر اسی پر عمل رہے تو اکثر امور دین جیسے تعلیم قرآن وغیرہ مفقود و ناپید ہوجائیں گے۔ اس لئے امور دینیہ کی انجام دہی پر اجرت لینا جائز ہے، اور اسی

پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ کفایہ شرح ہدایہ میں ہے: و ہم ائمۃ بلخ فانہم اختاروا قول اہل المدینۃ و قالوا ان المتقدمین من اصحابنا بنوا ہذا الجواب علی ما شاہدوا فی عصرہم من رغبۃ الناس فی التعلیم بطریق الحسبۃ و مروءۃ المتعلمین فی مجازاۃ الاحسان بالاحسان من غیر شرط، و اما فی زماننا فقد انعدم المعنیان جمیعاً فنقول بجواز الاستئجار کی لا یتعطل ہذا الباب، و لا یبعد ان یختلف الحکم باختلاف الأوقات ألا تری ان النساء کنّ یخرجن الی الجماعات فی زمان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و ابی بکر حتی منعہنّ من ذلک عمر و کان ما رواہ ثوابا۔ و کذا یفتی بجواز الإجارۃ علی تعلیم الفقہ و قال الإمام خیزاخزی یجوز فی زماننا للامام و المؤذن و المعلم اخذ الاجرۃ کذا فی الروضۃ و الذخیرۃ۔ ہدایہ میں ہے: و بعض مشایخنا استحسنوا الاستئجار علی تعلیم القرآن لأنہ ظہر التوانی فی الأمور الدینیۃ ففی الامتناع تضییع حفظ القرآن و علیہ الفتویٰ۔ اور فتح عامیہ صفحہ ۳۲ میں ہے: و الفتویٰ فی زماننا علیٰ وجوب الأجرۃ و جواز الاجارۃ لظہور التوانی فی الأمور الدینیۃ و لانقطاع وظائف المعلمین من بیت المال و قلۃ المروءۃ فی الأغنیاء اما فی ذلک الزمان فانما کرہ اصحابنا ذلک لقوۃ حرصہم علی الحسبۃ و وفور عطائہم من بیت المال و کثرۃ المروءۃ فی التجار و الأغنیاء فکانوا مستغنین عن الأجرۃ۔ نصاب الاحتساب من آخر الباب الثانی۔

ان مذکورہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امور دینیہ کی انجام دہی پر اجرت لینے کو متاخرین فقہاء نے اس وجہ سے جائز رکھا ہے کہ اس زمانہ میں منجانب سلطنت و قوم، معلمین وغیرہ کے لئے کوئی معاش و آمدنی مقرر نہیں ہے۔ اور اگر اس پر اجرت نہ دی جائے گی تو امور دینیہ کی انجام دہی نہ ہوگی۔ پس جن حضرات کو کہ متقدمین کی طرح منجانب سرکار یا قوم معاش مقرر ہے یا خود وہ اپنے گھر کے آسودہ ہیں تو ایسے اشخاص کے لئے ان امور پر اجرت لینا شرعاً ناجائز ہے۔ کیونکہ ابن ماجہ میں عبادۃ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: قال علّمتُ ناساً من اہل الصفۃ القرآنَ و الکتابۃ فأہدی الیّ رجل منہم قوسا فقلت لیست بمال و ارمی بہا فی سبیل اللّٰہ فسألت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم عنہا فقال "ان سرک ان تطوّق بہا طوقا من نار فاقبلہا"۔ اور اسی باب میں ابیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: قال علّمت رجلا القرآن فأہدی الیّ قوسا فذکرت ذلک لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فقال "ان اخذتَہا اخذتَ قوسا من نار" فرددتہا۔ یعنی عبادہ ابن صامت اور ابیّ بن کعب رضی اللہ عنہما نے تعلیم قرآن کے عوض میں قوس لی تھی، جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ "یہ قوس آگ ہے، گلے میں اس سے آگ کا طوق بنا کر ڈالا جائے گا"۔ بمجرد اس ارشاد کے فوراً وہ کمان واپس کردی گئی۔ اور ظاہر ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اس کو سخت مکروہ جانتے ہیں۔ پس صورت مسئولہ میں اجرت لینا اغنیاء کے لئے مکروہ، اور غریبوں کے لئے ضرورتاً جائز ہے۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ موجودہ زمانہ میں قرآن شریف و علوم دینیہ کی تعلیم اور امامت و مؤذنی وغیرہ خدمات کے معاوضہ میں ماہوار و عوض لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائز ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۶ کتاب الاجارۃ میں ہے : و یفتی الیوم بصحتہا لتعلیم القرءان و الفقہ و الإمامۃ و الأذان ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سود کا لین دین کرنے کے لئے مکان کرایہ پر دینا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

جن دیہات میں کافر زیادہ آباد ہیں ، اگر لین دین کرنے والا بھی کافر ہی ہے تو مکان کرایہ پر دے سکتے ہیں ۔ اسلامی شہروں میں نہیں دے سکتے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : (و جاز اجارۃ بیت بسواد الکوفۃ) ای قراہا لا بغیرہا علی الأصح و اما الأمصار و قریٰ غیر الکوفۃ فلا یمکنون لظهور شعار الاسلام فیہا و خص سواد الکوفۃ لأن غالب اہلہا اہل الذمۃ (لیتخذ بیت نار او کنیسۃ او بیعۃ او یباع فیہ الخمر) ۔ عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۴۵۰ کتاب الاجارات فصل رابع میں ہے : ذمی استئجر دارا من مسلم فاتخذہا مصلی لنفسہ لم یمنع لأنہ لیس فی اتخاذہ مصلی لنفسہ احداث بیعۃ و لا اظہار شیء من شعائر دینہم فی امصار المسلمین و ان اتخذہا مصلی للجماعۃ و ضرب فیہا الناقوس فلصاحبہ منعہ و کذلک لو اراد بیع الخمر فیہا لأن ہذہ اشیاء یمنع عن اظہارہا فی بلاد المسلمین ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الحِجر و الماذُون

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر دیوانہ ہے ۔ اس کے اقرباء میں ایک حقیقی بہن ، ایک علاتی بہن ، ایک پھوپی زاد بھائی اور ایک چچی موجود ہیں ۔ دیوانہ کی ولایت ان میں سے کس کو حاصل ہے ؟

الجواب

دیوانہ کی ولایت شرعاً باپ کو یا اس کے وصی کو ہے ، اس کے بعد دادا یا اس کے وصی کو ہے ۔ ان تمام کی عدم موجودگی میں قاضی اور اس کا نائب اس کا ولی ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ میں تحت قول الولی فی النکاح لا المال تحریر ہے ، (قولہ لا المال) فان الولی فیہ الاَب و وصیہ و الجد و وصیہ و القاضی و نائبہ فقط ۔ پس صورت مسئولہ میں بکر کے مال کی ولایت شرعاً موجودہ ورثاء میں سے کسی کو نہیں ہے ۔ اس وقت قاضی (حاکم) یا نائب قاضی (حاکم کے مقرر کردہ) کو اس کی ولایت حاصل ہے ۔ اگر قاضی اپنی جانب سے موجودہ ورثاء میں سے کسی کو دیانت دار جانکر اپنا نائب مقرر کرے تو جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کم سن لڑکوں کی ولایتِ مال دادی ، ماں ، نانا ، ان تینوں میں سے کس کو حاصل ہے ؟ بینوا توجروا !

الجواب

بچہ کے مال کی ولایت باپ کو ہے ، اگر باپ نہ ہو تو باپ کے وصی کو ، پھر وصی کے وصی کو ، اس کے بعد دادا کو پھر دادا کے وصی کو ، اس کے بعد دادا کے وصی کے وصی کو ۔ اگر یہ سب نہ ہوں تو قاضی (حاکم) یا اس کے وصی کو ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۵ صفحہ ۱۱۴ کتاب الماذون میں ہے : (و ولیہ ابوہ ثم وصیہ) بعد موتہ ثم وصی وصیہ کما فی القہستانی من العمادیۃ (ثم) بعدھم (جدہ) الصحیح و ان علا (ثم وصیہ) ثم وصی وصیہ‘ قہستانی زاد القہستانی و الزیلعی ثم الوالی بالطریق الاولی (ثم القاضی او وصیہ) ایھما تصرف یصح فلذا لم یقل ثم (دون الام او

وصیہا) هذا فی المال ۔ پس صورت مسئولہ میں چاہیئے کہ حسب تفصیل مذکور عمل ہو ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لڑکا نا سمجھ ہو یا سمجھدار ۔ اگر بیع و شراء و ھبہ وغیرہ معاملات کرے تو کیا جائز ہے ؟ اسی طرح دیوانہ یا فاتر العقل شخص اگر کوئی معاملہ کرے تو شرعا جائز ہوگا یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

بچہ اور فاتر العقل ، یہ دونوں اگر بیع و شراء اور معاملہ کو سمجھتے ہیں تو ان کا وہ معاملہ جس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہے مثلاً اسلام لانا ، یا کسی کی دی ہوئی چیز لینا ، ولی کی اجازت کے بغیر صحیح ہے ۔ اور جو امور نقصان پہنچاتے ہیں مثلاً طلاق دینا ، غلام آزاد کرنا یا کسی کو کچھ ھبہ و صدقہ کے طور پر دینا ، یا قرض دینا وغیرہ اس قسم کے معاملات تمام ولی کی اجازت کے بعد بھی ناجائز و نا قابل عمل ہیں ۔ اور جو امور کہ نفع و ضرر میں مساوی ہیں یعنی کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی نفع جیسے بیچنا اور خریدنا ان کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کا نفاذ بچہ کے بالغ ہونے تک اور فاتر العقل کے صحیح و تندرست ہونے تک موقوف رہے گا ۔ دیوانہ شخص اگر کبھی بالکل تندرست ہوجاتا ہے اور کبھی دیوانہ رہتا ہے تو بحالت صحت اس کے تمام تصرف جائز ہوں گے ، اور دیوانگی کے تصرفات ناجائز رہیں گے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ ردالمحتار جلد ۵ کتاب المأذون میں ہے : تصرف الصبی و المعتوہ الذی یعقل البیع و الشراء ان کان نافعا محضا کالاسلام و الاتہاب صح بلا اذن ، و ان ضارا کالطلاق و العتاق و الصدقة و القرض لا و ان اذن به ولیهما ، و ما تردد من العقود بین ضرر و نفع کالبیع و الشراء توقف علی الاذن حتی لو بلغ فأجازه نفذ ۔ رد المحتار میں ہے : قوله کالطلاق و کذا الهبة و الصدقة و غیرهما ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الحجر میں ہے : و لا یجوز تصرف المجنون المغلوب اصلا و لو اجازه الولی ، و ان کان یجن تارة و یفیق اخری فهو فی حال افاقته کالعاقل ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مرد و عورت کے بالغ ہونے کی شریعت میں کیا حد مقرر ہے ؟ لڑکا جب پندرہ سال کی عمر کا ہوجائے تو کیا وہ شرعا بالغ سمجھا جائے گا اور اس کو بالغ مرد کی طرح تمام تصرفات کا حق حاصل ہوگا ؟

الجواب

لڑکا احتلام و نزول منی سے بلغ ہوجاتا ہے، اور لڑکی احتلام و حیض و حمل سے بالغہ ہوجاتی ہے۔ اگر یہ چیزیں لڑکے اور لڑکی میں نہیں ہیں تو ان کی عمر ولادت سے پندرہ ۱۵ سال پورے ہونے کے بعد یہ دونوں شریعت میں حکماً بلغ سمجھے جاتے ہیں۔ در مختار کتاب الحجر کے اخیر میں ہے : (بلوغ الغلام بالاحتلام و الإحبال و الإنزال) و الأصل هو الإنزال (و الجارية بالاحتلام و الحيض و الحبل فان لم يوجد فيهما) شيء (منهما فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة، به يفتي) لقصر اعمار زماننا۔ پندرہ ۱۵ سال کی عمر کے بعد چونکہ یہ حکماً بلغ سمجھے جاتے ہیں اس لئے ان کے تصرفات بھی شرعاً نافذ سمجھے جائینگے۔ در مختار میں اسی جگہ ہے : (و هما) حينئذ (كالبالغ حكما) فلا يقبل جحوده البلوغ بعد اقراره فلا تنقض قسمته و لا بيعه۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ کی ساڑھے بارہ ۱۲ سال کی عمر ہے، زید سے اس کا نکاح ہوگیا ہے۔ کیا زید کو یہ حق ہے کہ ہندہ کو بوجہ تعلق زوجیت اپنی حفاظت میں رکھے۔ ہندہ کے ولی کا بیان ہے کہ ہندہ نابالغ ہے، اس لئے شوہر کے پاس نہیں بھیجی جاتی۔ کیا ولی کا بیان شرعاً قابل لحاظ ہے ؟

الجواب

ہندہ کو اس عمر میں اگر حیض آتا ہے یا احتلام ہوتا ہے تو یہ شرعاً بالغہ ہے، شوہر کو حق ہے کہ اس کو اپنی حفاظت میں رکھے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو معتبر عورتوں کے ذریعہ سے اس کا معائنہ کرایا جائے کہ وہ مرد کی صحبت کرلے کے قابل ہے یا نہیں، اگر قابل ہے تو شوہر کو اپنے پاس رکھنے کا حق حاصل ہے۔ عالمگیریہ جلد ۱ کتاب النکاح باب الأولیاء میں ہے : و اذا نقد الزوج المهر و طلب من القاضي ان يأمر اب المرأة بتسليم المرأة فقال ابوها انها صغيرة لا تصلح للرجال و لا تطيق الجماع و قال الزوج بل هي تصلح و تطيق، ينظر ان كانت ممن تخرج اخرجها و احضرها و ينظر فيها فان صلحت للرجال امر بدفعها الى الزوج و ان لم تصلح لم يأمره، و ان كانت ممن لا تخرج امر من يثق بهن من النساء ان ينظرن اليها فان قلن انها تطيق الجماع و تحتمل الرجال امر الأب بدفعها الى الزوج و ان قلن لا تحتمل الرجال لا يؤمر بتسليمها الى الزوج كذا في المحيط۔

و الله اعلم بالصواب و اليه المرجع و المآب۔

کتاب الغصب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی اولاد میں سے ایک شخص زید کی عطائے سلطانی پر قابض ہوکر فائدہ اٹھا رہا ہے ، اور دوسرے ورثاء اس سے محروم ہیں ۔ اب قاضی تمام ورثاء پر اس کی آمدنی تقسیم کرنا چاہتا ہے ۔ کیا سنین ماضیہ کی آمدنی جس کو - واصلات - کہتے ہیں اس وارث غاصب سے دوسرے ورثاء اپنے حصہ کے موافق پاسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

اگر کوئی وارث شریک دوسرے ورثاء کا حصہ غصب کرکے اس کی آمدنی خود حاصل کرے تو یہ آمدنی و محاصل شرعاً بازگشت کے قابل ہے ۔ فتاویٰ ہندیہ مطبوعہ مصر کی جلد ۵ صفحہ ۱۲۲ کتاب الغصب میں ہے ، اما اذا استغله احد الشركاء فان لباقيهم ان يأخذوا حصتهم من ذلك كما افاده في التنقيح الحامدية - در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار مصری کی جلد ۵ صفحہ ۱۲۵ کتاب الغصب میں ہے : (و منافع الغصب استوفاها او عطلها) فانها لا تضمن (الا ان يكون وقفا او مال يتيم او معدا للاستغلال) - المغرب لغتِ فقہ مطبوعۂ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد کی جلد ۲ صفحہ ۷۷ میں ہے : (الغلة) كل ما يحصل من ريع الأرض او كرائها او اجرة غلام او نحو ذلك - پس صورت مسئولہ میں دیگر ورثاء وارثِ غاصب سے سنینِ ماضیہ کی واصلات اپنے اپنے حصہ کے موافق پانے کے مستحق ہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک بزرگ کی درگاہ کے بازو ایک مسجد واقع ہے ۔ متولیان مسجد نے درگاہ کی موقوفہ زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور ان کا ارادہ ہے کہ مغصوبہ زمین مسجد میں شامل کرلی جائے ۔ سجادہ نشینِ درگاہ نے ان کو اس فعل سے منع کیا اور قبضہ اٹھانے کے لئے فہمائش دی ، مگر اہلِ مسجد قبضہ اٹھانے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ از روئے قانونِ میعاد انگریزی ہم اس سے دست بردار نہیں ہوں گے ۔ پس از روئے شرع شریف غصب کی ہوئی زمین شریک مسجد ہوسکتی ہے یا نہیں ؟ اور اگر بلا رضا مندی مالک یہ زمین شریک مسجد کرلی جائے تو اس مسجد میں نماز درست ہوگی یا نہیں ؟ اور شرع کی رو سے قانونِ میعاد کا نفاذ ہوگا یا نہیں ؟ اور متولیانِ مسجد جو احکامِ شرع سے انحراف

کرتے ہیں ان کی تولیت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

مغصوبہ زمین میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ۔ در مختار کے مکروہات صلاۃ میں ہے : و ارض مغصوبۃ ۔ اور موقوفہ زمین کو غصب کرکے اس میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی بلکہ بعض فقہاء کے قول پر صحیح نہیں ہے ۔ رد المحتار مکروہات صلاۃ میں ہے : ثم قال و المدرسۃ السلیمانیۃ فی دمشق مبنیۃ فی ارض المرجۃ التی وقفها السلطان نور الدین الشہید علی ابناء السبیل بشہادۃ عامۃ اہل دمشق و الوقف یثبت بالشہرۃ فتلک المدرسۃ خولف فی بنائها بشرط واقف الأرض الذی ہو کنص الشارع فالصلاۃ فیها مکروہۃ تحریما فی قول و غیر صحیحۃ فی آخر کما نقلہ فی جامع الفتاویٰ ۔ پس صورت مسئولہ میں درگاہ کی موقوفہ زمین کو داخل مسجد کرنا اور اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں ، کیونکہ یہ فعل واقف کی غرض کے خلاف ہے ، اور اغراض واقف نصوص شارع کی طرح واجب التعمیل ہیں ۔

وقف کے دعویٰ کے لئے شریعت میں کوئی میعاد مقرر نہیں ہے ، بلکہ ہر وقت کبھی بھی اس کا دعویٰ ہوسکتا ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ کی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ کتاب الوقف میں ہے : لا تسمع الدعویٰ بعد مضی خمس عشرۃ سنۃ الا فی الإرث و الوقف و وجود عذر شرعی ۔ اسی صفحہ میں ہے : فلم یقیدوا دعویٰ الإرث و الوقف بمدۃ ۔ پس صورت مسئولہ میں زمین موقوفہ غاصب کے قبضہ سے چاہے کتنی ہی مدت کیوں نہ گذرے واپس لینے کے قابل ہے ۔

متولی وقف کا متدین ہونا ضروری ہے ، اگر اس سے فسق و فجور ظاہر ہو تو وہ معزولی کے قابل ہے ۔ در مختار کی کتاب الوقف میں ہے : (و ینزع لو غیر مأمون) او عاجزا او ظہر بہ فسق کشرب الخمر و نحوہ ، فتح ۔ پس صورت مسئولہ میں متولی غاصب فاسق ہے اور قابل تولیت نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الشفعۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید ایک مکان میں سالہا سال سے کرایہ یا عاریت سے رہتا ہے ۔ اگر اس کے بازو کا مکان فروخت ہو تو کیا اس کو شفعہ کا حق حاصل ہے ؟

الجواب

شفعہ کے دعوے کے لئے یہ شرط ہے کہ شفیع جس مکان کی وجہ سے دعویٰ کررہا ہے اس کا مالک ہو ۔ کرایہ دار یا عاریتاً رہنے والا چونکہ مالکِ مکان نہیں ہے اس لئے اس کو شفعہ کے دعوے کا حق حاصل نہیں ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الشفعۃ میں ہے : و منها ملك الشفيع وقت الشراء في الدار التي يأخذها بها الشفعة فلا شفعة له بدار يسكنها بالإجارة او الإعارة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے مکان کا صحن بکر کے مکان سے ملا ہوا ہے ، اور دونوں مکانوں کے دروازے ایک ہی کوچہ نافذہ میں ہیں ۔ اگر زید اپنا مکان فروخت کرنا چاہے تو کیا حق شفعہ بکر کو حاصل ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

چونکہ بکر کا مکان زید کے مکان سے لگا ہوا ہے اس لئے حق شفعہ بکر کو حاصل ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الشفعۃ میں ہے : و ان كانت السكة نافذة فبيعت دار فيها فلا شفعة الا للجار الملاصق ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے مکان سے متصل ایک جانب خالد کا مکان ہے ، اور باقی تین طرف کوچہ ہائے نافذہ ہیں ۔ کیا ایسی حالت میں خالد کو حق شفعہ ہوگا حاصل یا نہیں ؟ اور طلب مواثبہ کے کیا معنی ہیں ؟

الجواب

خالد کو حق شفعہ حاصل ہے ، کیونکہ اس کا مکان زید کے مکان سے متصل ہے ۔ در مختار کتاب الشفعہ میں ہے ؛ ثم لجار ملاصق ۔

طلب مواثبہ ۔ کے یہ معنی ہیں کہ شفعہ دار اس خبر کو سنتے ہی کہ اس کے مکان کے متصل بازو کا مکان فروخت ہوتا ہے فوراً یہ کہدے کہ ، میں اس مکان کو بر بناء حق شفعہ خریدتا ہوں ۔ در مختار کے باب طلب شفعہ میں ہے ، و یطلبها الشفیع فی مجلس علمه بالبیع بلفظ یفهم طلبها کطلبت الشفعة و نحوه و هو طلب المواثبة ۔ و الله اعلم بالصواب و الیه المرجع و المآب ۔

کتاب الصّید و الذّبائح

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بندوق سے شکار کیا ہوا جانور جبکہ اس پر بسم اللہ کہکر گولی چلائی جائے اور بغیر ذبح کے محض گولی کے مار سے مرجائے تو کیا اس کا کھانا حلال ہے یا حرام ؟

الجواب

ذبح کے لئے تیز چیز کی ضرورت ہے، اس لئے بندوق کی گولی یا غلیل یا پتھر یا لکڑی سے زخمی کیا ہوا جانور اگرچہ ان کے چلانے کے وقت بسم اللہ کہا جائے بغیر ذبح کرنے کے حرام ہے، کیونکہ ذبح میں جسم کا کٹنا اور خون کا بہنا شرط ہے۔ در مختار کی کتاب الصید میں ہے: (او بندقة ثقيلة ذات حدة) لقتلها بالثقل لا بالحد و لو كانت خفيفة بها حدة حل لقتلها بالجرح و لو لم يجرحه لا يؤكل مطلقا۔ اسی جگہ رد المحتار میں ہے: قال قاضيخان لا يحل صيد البندقة و الحجر و المعراض و العصا و ما اشبه ذلك و ان جرح لانه لا يخرق الا ان يكون شيء من ذلك قد حدوه و طوله كالسهم و امكن ان يرمى به فان كان كذلك و خرقه بحده حل اكله فاما الجرح الذي يدق في الباطن و لا يخرق الظاهر لا يحل لانه لا يحصل به انهار الدم۔ اسی جگہ ہے: و الاصل ان الموت اذا حصل بالجرح بيقين حل و ان بالثقل او شك فيه فلا يحل حتما او احتياطا۔ اھ۔ و لا يخفى ان الجرح بالرصاص انما هو بالاحراق و الثقل بواسطة اندفاعه العنيف اذ ليس له حد فلا يحل و به يفتي ابن نجيم۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورت اور کمسن لڑکے اور دیوانے کا ذبیحہ ہر حال میں جائز ہے؟ یا کسی خاص صورت میں؟ افتوا جزاکم اللہ خیر الجزاء!

الجواب

عورت اور کمسن لڑکا اور دیوانہ اگر اس بات کو جانتے ہیں کہ ذبح کے وقت بسم اللہ کہنے سے ذبیحہ حلال ہوتا، اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ذبح سے دم مسفوح یعنی حرام خون خارج کرنا مقصود ہے اور ان

کو گلے کی رگیں اچھی طرح کاٹنا بھی آتا ہے ، تو ایسی حالت میں ان کا " بسم اللہ و اللہ اکبر " کہہ کر ذبح کرنا درست ہے ۔ ہدایہ کی کتاب الذبائح صفحہ ۴۱۸ میں ہے : و یحل اذا کان یعقل التسمیة و الذبحة و یضبط و ان کان صبیا او مجنونا او امرأۃ ۔ اور اگر ان کو امور مذکورہ میں سے کسی ایک امر کا بھی علم نہیں ہے تو ان کا ذبیحہ نا درست ہے ۔ ہدایہ صفحہ ۴۱۸ میں ہے : و اما اذا کان لا یضبط و لا یعقل التسمیة و الذبحة لا تحل لأن التسمیة علی الذبیحة شرط بالنص و ذلک بالقصد و صحة القصد بما ذکرناہ ۔ ذبح کے لئے ذبح کرنے والے کا پاک ہونا شرط نہیں ہے ، حالت جنابت و حیض و نفاس میں بھی ذبح کرنا درست ہے ۔ جامع الرموز صفحہ ۴۴۹ میں ہے : و شرط لحل الذبح کون الذابح مسلما او کتابیا حربیا او تغلبیا او ذمیا و لو کان الکتابی حربیا فحل ذبیح الذمی کذبیح الأبرص بلا کراھة کخبزہ و طبخه و ان کان غیرہ اولی کما فی المنیة او کان الشخص الکتابی امرأۃ حائضة او نفساء او جنبا ، کما فی النتف ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکرے اور گائے وغیرہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے ہیں ، شرعاً ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟ اور حیدرآباد میں سید صاحب کے نام پر جو بکرے چھوڑے جاتے ہیں ان کا کھانا درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

مذبوحہ جانور کے لئے شرعاً ذبح کے وقت نیت کا لحاظ و اعتبار کیا گیا ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار کی جلد ۵ صفحہ ۲۰۴ میں ہے : و اعلم ان المدار علی القصد عند ابتداء الذبح ۔ بناء بریں اگر کوئی شخص جانور کو اس نیت سے ذبح کرے کہ میں اس کی جان فلاں بزرگ کے لئے لیتا ہوں یا اس کی جان فلاں بت پر قربان کرتا ہوں اور وہ اس بزرگ اور بت کو از روئے تعظیم اس طرح جان قربان کئے جانے کا مستحق جانتا ہے تو ایسا ذبح کیا ہوا جانور اگرچہ کہ وہ اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے شرعا حرام ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۰۳ میں ہے : (ذبح لقدوم الأمیر و نحوہ) کواحد من العظماء (یحرم) لأنه " اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ " (و لو) وصلیة (ذکر اسم اللّٰہ تعالیٰ علیه) ۔

اگر اس نیت سے ذبح کرے کہ اس جانور کی جان تو اللہ کے لئے لی جاتی ہے اور وہی جان کے نذر و قربان کئے جانے کا مستحق ہے مگر اس کا گوشت فلاں بزرگ کی نیاز و ایصال ثواب میں صرف کیا جائے گا ، یا اس سے فلاں شخص کی دعوت و ضیافت کی جائے گی ، یا اس سے ولیمہ ادا ہوگا ، یا اس کو بیچ کر نفع اٹھایا جائے گا ، اور بہ وقت ذبح اللہ کے نام کے سوا کسی کا نام بھی نہ لے تو ایسا ذبح کیا ہوا جانور شرعاً حلال ہے ۔ در مختار میں اسی جگہ ہے : (و لو) ذبح (للضیف لا) یحرم لأنه سنة الخلیل و إکرام الضیف إکرام اللّٰہ تعالیٰ و الفارق انه ان قدمھا لیاکل منھا کان الذبح للّٰہ و المنفعة للضیف او

للولیمۃ او للربح ۔ و ان لم یقدمها لیاکل منها بل یدفعها لغیرہ کان لتعظیم غیر اللّٰہ فتحرم ۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۵۲ میں ہے : و من ھٰھنا علم ان البقرۃ للاولیاء کما ھو الرسم فی زماننا حلال طیب لانہ لم یذکر اسم غیر اللّٰہ وقت الذبح و ان کانوا ینذرونہا لہ ۔

پس صورت مسئولہ میں اگر جانور حسبِ تفصیل مذکور اللہ کے لئے ذبح کیا جائے ، اور اس کے گوشت سے سید صاحب یا اور کسی بزرگ کی نیاز کی جائے اور ذبح کے قبل بھی اسی طریقہ سے سید صاحب کے نامزد رہے ، تو ایسے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت حلال ہے ۔

مشرکین ہنود کی نیت چونکہ بتوں کے نام سے ذبح کرنے کی ہوتی ہے اور وہ بتوں کو تعظیما اس کا مستحق بھی جانتے ہیں جس سے ان کو بتوں کا تقرب منظور ہوتا ہے اور ان جانوروں کی جان بتوں کے لئے لینا یعنی بحیثیت چڑھاتا اور ان کے نامزد کرنا اپنا فرض و موجب ثواب و نجات جانتے ہیں ، اس لئے ان کا نامزد کیا ہوا جانور اگرچہ مسلمان کے ہاتھ سے اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے قطعا حرام ہے ، کیونکہ اس جانور کا مالک جو ہندو ہے اس کی نیت میں اس جانور کو دیوتا کے نامزد کرنے اور ذبح کرنے سے دیوتا کی تعظیم و تقرب منظور ہے ۔ تفسیر احمدی کے صفحہ ۱۵ تفسیر ما اھل لغیر اللّٰہ میں ہے : معناہ ذبح بہ لاسم غیر اللّٰہ مثل لات و عزی و اسماء الانبیاء و غیر ذلک ۔ اور صفحہ ۳۰۳ تفسیر ما ذبح علی النصب میں ہے : ای حرم علیکم ما ذبح للاصنام او ذبح مسمی علی الاصنام و ھٰکذا ذکر فی الحسینی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص نے بکرا محبوب سبحانی شیخنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ یا اور کوئی ولی کی نیاز کے واسطے خریدا وہ حرام ہوگیا ۔ اور اس کی مثال یہ لکھا ہے کہ : کتے کو اگر بسم اللہ پڑھکر کاٹیں تو حلال نہیں ہوتا ہے ، اسی طرح اگر اللہ کے سوا کسی ولی کی نیاز کے واسطے خرید کر ذبح کریں تو حلال نہیں ہوتا ۔ یہ بات کہاں تک درست ہے ؟

الجواب

مذبوحہ جانور کے متعلق شرعا ذبح کے وقت کی نیت کا لحاظ و اعتبار کیا گیا ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار کی جلد ۵ صفحہ ۲۰۳ میں ہے : و اعلم ان المدار علی القصد عند ابتداء الذبح ۔ بناء بریں اگر کوئی شخص جانور کو اس نیت سے ذبح کرے کہ اس کی جان فلاں بزرگ کے لئے لیتا ہوں اور ان بزرگ کو از روئے تعظیم اس طرح جان قربان کئے جانے کا مستحق بھی جانتا ہے تو ایسا ذبح کیا ہوا جانور اگرچیکہ وہ اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جائے شرعا حرام ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار کی جلد ۵ صفحہ ۲۰۲ میں ہے : (ذبح لقدوم الامیر و نحوہ) کواحد من العظماء (یحرم) لانہ "اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ" (و لو) وصلیۃ (ذکر اسم اللّٰہ تعالیٰ علیہ) ۔ اور اگر کوئی اس نیت سے ذبح کرے کہ اس جانور کی جان تو اللہ کے لئے لی جاتی ہے اور وہی جان کے نذر و قربان کئے جانے کا مستحق ہے مگر اس جانور کا گوشت فلاں بزرگ کی نیاز و

ایصالِ ثواب میں صرف کیا جائے گا، یا اس سے فلاں شخص کی دعوت و ضیافت کی جائے گی، یا اس سے ولیمہ ادا ہوگا، یا اس کو بیچکر نفع اٹھایا جائے گا اور بوقت ذبح اللہ کے نام کے سوا کسی کا نام بھی نہ لے تو ایسا ذبح کیا ہوا جانور شرعاً حلال ہے۔ در مختار میں اسی جگہ ہے: (و لو) ذبح (للضیف لا) یحرم لأنه سنة الخلیل و إکرام الضیف إکرام اللّٰہ تعالی و الفارق انه ان قدمها لیاکل منها کان الذبح للّٰہ و المنفعة للضیف او للولیمة او للربیح و ان لم یقدمها لیاکل منها بل یدفعها لغیره کان لتعظیم غیر اللّٰہ فتحرم۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۵۲ میں ہے: و من هاهنا علم ان البقرة للأولیاء کما هو الرسم فی زماننا حلال طیب لأنه لم یذکر اسم غیر اللّٰہ وقت الذبح و ان کانوا ینذرونها له۔ پس صورتِ مسئولہ میں اگر جانور حسبِ تفصیلِ مذکور الصدر، اللہ کے لئے ذبح کیا جائے اور اس کے گوشت سے حضرت محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ یا اور کسی بزرگ کی نیاز کی جائے اور اسی نیت سے خریدا بھی جائے تو ایسے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت حلال ہے۔ کتابِ مذکور کی تحریر ان معتبر کتب کے مقابل قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے "بسم اللہ و اللہ اکبر" کہکر خرگوش پر گولی چلائی۔ خرگوش گولی کی زد سے مردہ ہوگیا اور ذبح نہ ہوسکا۔ کیا اس کا کھانا حلال ہے؟

الجواب

بسم اللہ و اللہ اکبر کہکر شکار پر گولی چلانے سے شکار حلال نہیں ہوتا۔ گولی کا مار کھانے کے بعد پھر اس کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الصید میں ہے: قال قاضیخان لا یحل صید البندقة و الحجر و المعراض و العصا و ما اشبه ذلک و ان جرح لأنه لا یخزق۔ اسی صفحہ میں ہے: و لا یخفی ان الجرح بالرصاص انما هو بالإحراق و الثقل بواسطة اندفاعه العنیف اذ لیس له حدّ فلا یحل و به افتی ابن نجیم۔ و اللہ اعلم بالصواب۔ (صفحہ ۲۱۸ دیکھا جائے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بحالتِ ناپاکی ذبح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

درست ہے۔ جامع الرموز کی کتاب الذبائح میں ہے: و شرط لحل الذبح کون الذابح مسلما او کتابیا حربیا او تغلبیا او ذمیا و لو کان الکتابی حربیا فحل ذبیح الذمی کذبیح الأبرص بلا کراهة کخبزه و طبخه و ان کان غیره اولیٰ کما فی المنیة۔ او کان الشخص الکتابی امرأة حائضة او

نفساء او جنبا، کما فی الملتقی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک ڈھنگر (چرواہا) مشرک نے یہ بیان کیا کہ میں نے مسلمان کے ہاتھ سے بکرا ذبح کروایا ہے، اور گوشت مسلمان قصاب کو فروخت کے لئے دیا ۔ تو کیا کافر ڈھنگر کا قول اس ضمن میں قابل اعتبار ہوگا یا نہیں ؟ اور مسلمانوں کے لئے یہ گوشت کھانا جائز ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

ایسا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے ۔ موطأ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے صفحہ ۲۸۱ باب الرجل یشتری اللحم فلا یدری میں ہے : فلن اتیٰ بذلک مجوسی و ذکر ان مسلما ذبحه او رجلا من اهل الکتاب لم یصدق و لم یؤکل بقوله ۔ حاشیہ میں ہے : و کذا الوثنی و غیرہ من الکفار غیر اهل الکتاب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ یہود و نصاریٰ کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا حلال ہے یا نہیں ؟

الجواب

یہود و نصاریٰ اگر ہمارے سامنے ذبح کریں، یا ہمارے غائبانہ ذبح کریں مگر ہم کو گمان ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح نہیں کرتے، تو ایسی حالت میں ان کے ذبیحہ کا گوشت کھانا حلال ہے ۔ اور اگر یہ معلوم ہوجائے کہ یہودی یا نصرانی نے اس کو غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا ہے، یا بغیر ذبح کئے ہوئے گردن مروڑ کر یا کسی اور طریقہ سے جانور کو مردار کیا ہے تو ایسے ذبیحہ کا گوشت کھانا حرام ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الذبائح باب اول میں ہے : انما تؤکل ذبیحة الکتابی اذا لم یشهد ذبحه و لم یسمع منه شیء او شهد و سمع منه تسمیة اللّٰه و حده، لانه اذا لم یسمع منه شیء یحمل علیٰ انه قد سمی اللّٰه تعالی، تحسینا للظن به کما بالمسلم و لو سمع منه ذکر اسم اللّٰه تعالی لکنه عنی باللّٰه عز و جل المسیح علیه السلام قالوا تؤکل الا اذا نص فقال " بسم اللّٰه الذی هو ثالث ثلاثة " فلا یحل فأما اذا سمع منه انه سمیٰ المسیح علیه السلام وحده او سمیٰ اللّٰه سبحانه و سمیٰ المسیح لا تؤکل ذبیحته ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دیہات میں جہاں سرکار سے ملا مقرر نہیں ہے، ہندو

قصاب بطور خود کسی مسلمان سے جانور ذبح کرواکے گوشت فروخت کرتے ہیں۔ کیا ان قصابوں کا اعتبار کرکے مسلمانوں کو ان کے پاس سے گوشت لیکر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

مشرک قصاب کے قول کا اعتبار کرکے اس کے پاس کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے درست نہیں ہے۔ موطأ امام محمد رحمہ اللہ طبع مصطفائی کے صفحہ ۲۲۵ باب الرجل یشتری اللحم فلا یدری میں ہے: فان اتیٰ بذلک مجوسی و ذکر ان مسلما ذبحہ او رجلا من اہل الکتاب لم یصدق و لم یؤکل بقولہ۔ حاشیہ میں ہے: و کذا الوثنی و غیرہ من الکفار غیر اہل الکتاب۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر مسلمان قصاب جو گوشت کی تجارت کرتا ہے اگر خود ذبح کرلے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جو مسلمان اللہ کا نام لے کر ذبح کرے اس کا ذبیحہ درست ہے، خواہ وہ قصاب ہو یا کوئی اور پیشہ ور ہو۔ در مختار مطبوعہ برحاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الذبائح میں ہے: و شرط کون الذابح مسلما حلالا خارج الحرم ان کان صیدا۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الذبائح میں ہے: و منہا ان یکون مسلما او کتابیا۔ اسی صفحہ میں ہے: و منہا التسمیۃ حالۃ الذکاۃ عندنا ای اسم اللّٰہ کان۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص مرغی اس طرح ذبح کرے کہ اس کا سر علحدہ ہوجائے۔ تو کیا وہ مرغی مردار ہوگئی؟ اور اس کا گوشت کھانا حرام ہے یا نہیں؟

الجواب

مرغی کو ایسا ذبح کرنا چاہیئے کہ صرف اس کے گلے کی رگیں کٹ جائیں اور خون بہہ جائے۔ اس قدر قوت سے ذبح کرنا کہ اس کا سر بھی علحدہ ہوجائے مکروہ ہے، مگر اس طرح ذبح کرنے سے مرغی مردار نہیں ہوتی اور اس کا کھانا حرام نہیں بلکہ قطعاً حلال ہے البتہ یہ فعل مکروہ ہے۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الذبائح کے صفحہ ۳۱۹ میں ہے: و یستحب الاکتفاء بقطع الاوداج و لا یبایین الرأس و لو فعل یکرہ فعلہ۔

و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب۔

کتاب الأضحیة

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر اُضحیۂ ذبح کے عوض اس کی قیمت اراذل و اَجام اور مجروحینِ ترک کے لئے بطور تبرع دی جائے تو کیا قربانی ذمہ سے ساقط ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

" اُضحیہ " شرع میں حیوانِ مخصوص کو وقتِ مخصوص میں قربۃً للہ ذبح کرنے کو کہتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۵ صفحہ ۲۰۵ کتاب الاضحیہ میں ہے : ھی ذبح حیوان مخصوص بنیة القربة فی وقت مخصوص ۔ اور مالدار مسلمان پر ایسے جانور کا خون بہانا شرعاً واجب ہے ۔ چنانچہ اسی صفحہ میں ہے : (فتجب) التضحیة ای اراقة الدم عملا و اعتقادا (علی حر مسلم مقیم مؤسر) ۔ بناء بریں اگر کوئی شخص بکرے کو بغیر ذبح کرے و خون بہائے کے زندہ خیرات کر دے یا اس کی قیمت خیرات کرے تو اس سے قربانی ادا نہیں ہوتی ، بلکہ اس کو دوسرا بکرا ذبح کرنا پڑے گا ۔ عالمگیری مطبوعہ مصر کی جلد ۵ صفحہ ۲۹۳ کتاب الاضحیہ میں ہے : حتی لو تصدق بعین الشاة او قیمتها فی الوقت لا یجزیه عن الأضحیة ۔ اور رد المحتار کی جلد ۵ صفحہ ۲۱۰ میں نہایہ سے منقول ہے : فان تصدق بعینها فی ایامها فعلیه مثلها مکانها لأن الواجب علیه الإراقة ۔ پس صورت مسئول عنہا میں اضحیہ کی قیمت اُراذل و اَجام و مجروحینِ ترک کو دینے سے شرعاً قربانی ادا نہیں ہوتی ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ داغدار جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جلد پر داغ اگر آگ سے جلانے یا کھجلی یا بال اکھڑنے سے آیا ہے ، تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے ۔ مگر کھجلی والے اونٹ کے لئے موٹا تازہ ہونا شرط ہے ۔ چنانچہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۱۴ میں ہے : تجوز التضحیة بالمجبوب العاجز عن الجماع و التی بها سعال و العاجز عن الولادة لکبر سنها و التی لها کیٌّ ۔ مغرب کے صفحہ ۱۹۳ میں ہے : کواه بالنار احرقه کیاً ۔ اور ہدایہ آخرین کے صفحہ ۴۳۲ میں ہے : و الجرباء ان کانت سمینة جاز لأن الجرب فی الجلد و لا نقصان فی اللحم ۔ اور عالمگیریہ کی جلد ۵

صفحہ ۲۹۸ میں ہے: و المولاۃ تجزی و ھی التی فی عینھا حول و کذا المجزوزۃ و ھی التی جز صوفھا کذا فی فتاوی قاضیخان۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی عذر سے ایام معینہ نحر میں قربانی نہ ہوسکے، تو اس مقررہ مدت کی عوض اور کوئی مدت ہے؟ یا اس کی قیمت صدقہ کردینے کا حکم ہے؟ اور وہ قیمت شہداء بلغار کے پسماندگان کی امداد و تیمار داری مجروحین میں صرف کی جائے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جن اشخاص نے قربانی نہیں دی ہے، اور تا حال قربانی کے لئے کوئی جانور بھی نہیں خریدا ہے، ایسے اشخاص کے لئے یہ اجازت ہے کہ ایام نحر گذر جانے کے بعد اس کی قیمت کو صدقہ کردیں۔ اور جس نے ایام نحر میں یا اس کے پہلے قربانی کے لئے جانور خرید لیا ہے اور خاص اس جانور کی قربانی کی نذر بھی کیا ہے، تو ایسے شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ اس جانور کو صدقہ کردے، چاہے وہ غنی ہو یا فقیر۔ اور اگر کوئی غنی اس جانور کو بلا نیت نذر خرید رکھا ہے تو اس کو یہ اجازت ہے کہ وہ اس جانور کی قیمت دیدے خاص اس جانور کو صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۱۰ کتاب الاضحیہ میں ہے: (و لو ترکت التضحیۃ و مضت ایامھا تصدق بھا حیۃ ناذر لمعینۃ و فقیر شراھا لھا و) تصدق (بقیمتھا غنی شراھا اولا)۔

زکاۃ و صدقہ فطر و کفارات وغیرہ تمام صدقات واجبہ کا مصرف ایک ہی ہے۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ [illegible] کتاب المصرف میں ہے: و ھو مصرف ایضا لصدقۃ الفطر و الکفارۃ و النذر و غیر ذلک من الصدقات الواجبۃ کما فی القھستانی۔ اور زکاۃ کے مصرف شرع میں فقراء، مساکین، غازی بے سامان وغیرہ ہیں۔ چنانچہ اسی جگہ رد المحتار کے حاشیہ پر در مختار میں ہے: ھو فقیر و ھو من لہ ادنیٰ شیء، و مسکین من لا شیء لہ، و عامل فیعطی بقدر عملہ، و مکاتب، و مدیون لا یملک نصابا فاضلا عن دینہ، و فی سبیل اللہ و ھو منقطع الغزاۃ۔ اور رد المحتار میں ہے: (قولہ و ھو منقطع الغزاۃ) ای الذین عجزوا عن اللحوق بجیش الاسلام لفقرھم بھلاک النفقۃ و الدابۃ وغیرھما فتحل لھم الصدقات و ان کانوا کاسبین اذ الکسب یقعدھم عن الجھاد، قھستانی۔ پس مجاہدین ترک کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں جو اپنے سرپرستوں کے شہید ہوجانے کے سبب فقیر و مسکین ہوگئے ہیں، اور مجروح غازی جو بوجہ ناداری اپنے علاج سے عاجز ہیں، اور وہ غازی جو بے سروسامانی کے سبب جہاد سے قاصر ہیں از روئے شرع اس صدقہ کے مستحق ہیں۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مالدار شخص قربانی نہ کرے اور اس کی قیمت

فقراء و مساکین پر تقسیم کرنا چاہے تو ایسا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

قربانی میں جانور ذبح کرنا لازم ہے، قیمت دینے سے واجب قربانی اداء نہیں ہوتی۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الاُضحیہ میں ہے: و منها انه لا يقوم مقامها في الوقت حتى لو تصدق بعين الشاة او قيمتها في الوقت لا يجزئه عن الأضحية۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گائے کی قربانی کی جاتی ہے اور بیل کی نہیں کی جاتی۔ کیا قربانی میں بیل ذبح کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

قربانی میں نر اور مادہ مساوی ہیں، ہر ایک کی قربانی شرعاً درست ہے۔ مگر چونکہ گائے کا گوشت بیل کے گوشت سے بہتر ہوتا ہے اس لئے جب دونوں قیمت میں برابر ہوں تو گائے کو قربانی میں ذبح کرنا بہتر ہے۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الاضحیہ باب خامس میں ہے: اما جنسه فهو ان يكون من الأجناس الثلاثة "الغنم" او "الإبل" او "البقر" و يدخل في كل جنس نوعه و الذكر و الأنثى منه و الخصي و الفحل لإطلاق اسم الجنس على ذلك۔ اور صفحہ ۲۹۹ میں ہے: و الأنثى من البقر افضل من الذكر اذ استويا لأن لحم الأنثى أطيب۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۲۱۲ کتاب الاضحیہ میں ہے: ان الأنثى من الإبل و البقر افضل اذا استويا قال في التتارخانية لأن لحمها اطيب۔ در مختار میں ہے: و الأنثى من الإبل و البقر افضل، حاوي۔ و في الوهبانية ان الأنثى افضل من الذكر اذا استويا قيمة۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قربانی کے جانوروں کے چمڑوں (کھالوں) کو قربانی کے دس پانچ روز پہلے بیع کردینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

زندہ جانوروں کا چرم یا کوئی بھی جزو ذبح کے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ عالمگیری جلد ۳ کتاب البیوع فصل تاسع میں ہے: و لو باع الجلد و الكرش قبل الذبح لا يجوز فلو ذبح بعد ذلك و نزع الجلد و الكرش و سلم لا ينقلب العقد جائزا كذا في الذخيرة۔ و الله اعلم بالصواب۔

کتاب العقیقۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ کا نسخ کس حدیث سے ثابت ہے ؟

الجواب

التعلیق الممجد علیٰ موطأ امام محمد رحمہ اللہ مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۲۸۸ میں مولانا عبد الحی صاحب لکھنوی مرحوم نے یہ حدیث نقل کی ہے : اخرجہ الدارقطنی ثم البیھقی فی سننھما عن المسیب ابن شریک عن عقبۃ بن الیقظان عن الشعبی عن مسروق عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم : " نَسخت الزکاۃُ کلَّ صدقۃ و نَسخ صومُ رمضان کلَّ صوم و نَسخ غسلُ الجنابۃ کلَّ غسل و نَسخت الأضحیٰ کلَّ ذبیح " ۔ اس حدیث سے عقیقہ کا واجب ہونا منسوخ ہے ، مگر اس کا مباح یا نفل ہونا دوسری احادیث کی بناء پر باقی ہے ۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۳۱ کتاب الاضحیہ میں ہے : ثم یعق عند الحلق عقیقۃ اباحۃ علی ما فی الجامع المحبوبی او تطوعا علی ما فی شرح الطحاوی ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ سنت ہے ؟ یا واجب ؟ یا مباح ؟ اگر سنت یا واجب ہے تو اس کی وجہ کیا ہے ؟ اگر مباح ہے تو کیوں ؟ بیان فرمایئے !

الجواب

عقیقہ مباح ہے ۔ ابتدائے اسلام میں لازمی طور پر کیا جاتا تھا ۔ مگر جب قربانی کا وجوب ہوا تو یہ منسوخ ہوگیا ۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۳۱ کتاب الاضحیہ میں ہے : ثم یعق عند الحلق عقیقۃ اباحۃ علی ما فی الجامع المحبوبی او تطوعا علی ما فی شرح الطحاوی ۔ موطأ امام محمد رحمہ اللہ مجتبائی صفحہ ۲۸۶ باب العقیقہ میں ہے : قال محمد اما العقیقۃ فبلغنا انھا کانت فی الجاھلیۃ و قد فعلت فی ابتداء الإسلام ثم نسخ الأضحیٰ کلَّ ذبح کان قبلہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ ، مذہب حنفی میں سنت مؤکدہ ہے یا مباح ؟ اور

اس کی ادائی لڑکے کی کس عمر تک ہوسکتی ہے؟ اس کا تارک گنہگار ہے یا نہیں؟

الجواب

عقیقہ مباح ہے، اور اس کا تارک گنہگار نہیں۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۳۱ کتاب الاضحیہ میں ہے: ثم یعق عند الحلق عقیقۃ اباحۃ علی ما فی الجامع المحبوبی او تطوعا علی ما فی شرح الطحاوی۔ عقیقہ ساتویں روز کرنا چاہئے، اگر اس روز نہ ہوسکے تو چودھویں روز، اگر اس روز بھی ممکن نہ ہو تو اکیسویں دن۔ خزانۃ الروایۃ قلمی کے صفحہ ۱۳۱ میں ہے: و ذلک فی الیوم السابع او فی الرابع عشر او فی احد و عشرین۔ جامع ترمذی کے باب العقیقہ میں بھی اہل علم کا یہی قول بیان کیا ہے۔ چنانچہ عینی شرح بخاری کی جلد ۹ صفحہ ۱۶ میں منقول ہے، اکیسویں دن کے بعد اس حساب سے اٹھائیسویں دن یا اس کے بعد عقیقہ کرنا چاہئے البتہ حنبلی مذہب کی ایک روایت ہے جس کی طرف شوافع کا بھی میلان ہے۔ حنفیوں کی معتبر کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ "عقیقہ" شریعت میں کیا ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب

عقیقہ مباح ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۶۲ میں ہے: العقیقۃ عن الغلام مباحۃ لا سنۃ و لا واجبۃ۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ کتاب الاضحیہ صفحہ ۲۳۱ میں ہے: ثم یعق عند الحلق عقیقۃ اباحۃ علی ما فی الجامع المحبوبی او تطوعا علی ما فی شرح الطحاوی۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ میں ہڈیوں کا توڑنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

عقیقہ میں ہڈیوں کا توڑنا یا نہ توڑنا دونوں مباح ہیں۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ صفحہ ۲۳۱ میں ہے: سواء فرق لحمها نیئاً و طبخة بحموضة او بدونها مع کسر عظمها۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عقیقہ کے لئے کوئی تاریخ معین ہے یا نہیں؟

الجواب

عقیقہ ولادت سے ساتویں روز کرنا بہتر ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۳۹۲ جلد ۵ میں ہے : العقیقة عن الغلام و عن الجارية و هي ذبح شاة في سابع الولادة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نومولود کا نام کس وقت رکھنا چاہیئے ؟ بینوا توجروا !

الجواب

یوم ولادت سے ساتویں روز نام رکھنا مستحب ہے ۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ میں ہے : یستحب لمن وُلِدَ له ولدٌ ان یسمیه یوم اسبوعه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

لڑکے یا لڑکی کی حجامت کر کے سر کے بالوں کو چاندی سے وزن کر کے فقیروں کو دینا لازمی ہے یا نہیں ؟

الجواب

عقیقہ کی حجامت کے بعد چاندی یا سونے کو بالوں سے وزن کر کے فقراء کو دینا مستحب ہے ۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ میں ہے : و یستحب ان یحلق رأسه و یتصدق عند الائمة الثلاثة بزنة شعره فضة أو ذهبا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا عقیقہ میں وہی شرائط ہیں جو قربانی میں ہوا کرتے ہیں ؟ مریض و عیب دار بکری سے عقیقہ ہوگا یا نہیں ؟ اگر کر دیا جائے تو قبول ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

جو شروط کہ قربانی میں ہیں ، وہی عقیقہ میں بھی ہیں ۔ شامی جلد ۵ صفحہ ۲۲۱ میں ہے : و هي شاة تصلح للاضحية ۔ پس اگر مریض یا عیب دار بکری سے عقیقہ کیا جائے تو قبول نہیں ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع و المآب ۔

کتاب الحظر و الإباحۃ

الاستفتاء

قرآن شریف کی اوراق گردانی، انگشت کو لب لگاکر کرنے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب

آدمی کا تھوک شرعاً پاک ہے، البتہ وہ شخص جس کے منہ میں دنبل ہوگیا ہو یا منہ سے خون و پیپ نکلتا ہو، یا منہ میں پھوڑا ہوگیا ہو، یا کوئی ایسا مرض ہو جس سے منہ میں سے سخت و ناگوار بو آتی ہو، یا کوئی شراب خوار ہو تو ایسے شخص کا تھوک نجس ہے۔ عینی شرح بخاری مطبوعۂ مصر جلد اول باب البصاق و المخاط صفحہ ۹۴۶ میں ہے: البزاق طاهر ان كان من فم طاهر و اما اذا كان من فم من يشرب الخمر فينبغي ان يكون نجسا في حالة شربه لأن سورهٔ في ذلك الوقت نجس فكذلك بصاقه و كذا اذا كان من فم من في فمه جراحة او دنبل يخرج منه دم او قيح۔ بناء بریں اگر وہ شخص جس کے منہ میں امراض مذکورہ میں سے کسی قسم کا مرض نہیں ہے اگر ضرورت کے وقت لب پر انگشت لگا کر قرآن شریف کے اوراق گردانے تو مضائقہ نہیں ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

علم منطق و حکمت جس کے اصول دین کے خلاف ہیں، اور جس کے موجدین ملحدانِ یونان ہیں اور اس کا ترجمہ عربی میں کیا گیا ہے، آیا اس علم کا عربی زبان میں پڑھنا یا مدرسین سے پڑھوانا جائز ہے یا نہیں؟ اور جس مدرسہ میں ایسے علوم پڑھائے جاتے ہیں اس کی مدد کرنا یا لوگوں کو تعاون کی نسبت رغبت دینی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو ایسے لوگوں کے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا!

الجواب

جو علوم کہ سنتِ نبوی کے مخالف ہیں، اور جن سے انسان کے ذہن میں اعتقاداتِ فاسدہ اور مذاہب باطلہ کی تائید ثابت ہوتی ہے، ایسے علوم کا پڑھنا، پڑھانا، یا لکھنا، سننا، یا اس کی تائید کرنی بالکل ناجائز و حرام ہے۔ جامع الرموز طبع کشوری کے صفحہ ۴۴۲ میں تحفۃ المسترشدین سے منقول ہے: انه لا يجوز ان يعلم و يتعلم و يستمع و يكتب كل علم ضد للسنة كالنجوم و نقض للدين كأقاويل يتفرد بها الفلاسفة او تقرير للدين الباطل و المعتقد الفاسد۔ بناء بریں فلسفہ کا وہ حصہ جس میں حکماء نے توحید و

ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلقات سے بحث کی ہے ان لوگوں کے لئے جن کو ان اقوال کے دیکھنے کے بعد ان کے عقائد اسلامی میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے قطعاً حرام ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ فلسفہ کوئی مستقل علم نہیں ہے بلکہ اس کے چار جزو ہیں جس میں ہندسہ و حساب بھی ایک جزو ہے، اور منطق دوسرا جزو ہے، یہ دونوں علم کلام میں شریک ہیں، بقدرِ ضرورت ان کا سیکھنا ان لوگوں کے لئے درست و مباح ہے جن کو انکے سیکھنے کے بعد اپنے عقائدِ دینیہ میں کسی قسم کا خلل واقع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ فتاویٰ شامی جلد ۱ صفحہ ۳۱ میں ہے:
(قوله و الفلسفة) هو لفظ يوناني و تعريبه الحكم المُمَوَّهة اى مزينة الظاهر فاسدة الباطن كالقول بقدم العالم و غيره من المكفرات و المحرمات و ذكر فى الإحياء انها ليست علما برأسها بل هي اربعة اجزاء احدها الهندسة و الحساب و هما مباحان و لا يمنع منهما الا من يخاف عليه ان يتجاوزهما الىٰ علوم مذمومة و الثاني المنطق و هو بحث عن وجه الدليل و شروطه و هما داخلان في علم الكلام۔ پس جبکہ بقدر ضرورت علومِ حکمیہ کا پڑھنا درست اور مباح ہے تو، اس کو مدرسوں کے ذریعہ تعلیم دلوانا اور اس مدرسہ کی جہاں اسی قدر تعلیم ہوتی ہے تائید کرنا بھی درست ہے۔ کیونکہ امر مباح کی تائید بھی مباح و درست ہے۔

البتہ علوم فلسفہ کو اس حد تک پڑھنا کہ جس میں پڑھنے والے کے عقائد بگڑتے اور اسلام کے منافی اصول ذہن نشین ہوجاتے ہیں حرام و کفر ہے۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۱ میں ہے: و حراما و هو علم الفلسفة و الشعبدة و التنجيم و الرمل و علوم الطبائعيين و السحر و الكهنة۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۶۸ میں ہے: و علم يجب الاجتناب عنه و هو السحر و علم الحكمة و الطلسمات۔ پس ان معتقدات کے موافق اعتقاد رکھنے والا شرعاً کافر ہے، اور جن مدارس میں ان کی اس طریقہ پر تعلیم دی جاتی ہے ان کی تائید کرنی حرام ہے اور تائید کرنے والا عند اللہ گنہگار ہے، کیونکہ کفر و حرام کی تائید بھی شرعاً کفر و حرام ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

علمائے اسلام ارشاد و رہنمائی فرمائیں کہ علم دین، معاش حاصل کرنے کے لئے سیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کون سے علم کا پڑھنا جائز ہے؟ اور کہاں تک؟ بینوا توجروا!

الجواب

علم دین اپنی دینی حاجت کے موافق پڑھنا فرض عین ہے، اور اپنی حاجت سے زیادہ مسلمانوں کو دینی نفع پہنچانے کی غرض سے پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، اور اس میں اچھی طرح ملکہ اور کمال پیدا کرنا مستحب ہے۔ در مختار بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۰ میں ہے: و اعلم ان تعلم العلم يكون فرض عين و هو بقدر ما يحتاج

الیہ فی دینہ و فرض کفایة و ھو ما زاد علیہ لنفع غیرہ و مندوبا و ھو التبحر فی الفقہ و علم القلب ۔ علوم دینیہ کو خلوص و نیک نیتی سے پڑھنا تمام نیکیوں میں افضل ہے ، اسی طرح علم کی زیادتی میں بھی کوشش کرنا سب اعمال پر فضیلت رکھتا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کی طلب میں اپنے فرائض میں نقصان نہ ڈالے بلکہ اپنے فرائض کی تکمیل بھی کرتا رہے ، اور اس میں بھی کوشاں رہے ۔

خلوص و نیک نیتی کے یہ معنیٰ ہیں کہ علم خالص اللہ تعالیٰ کے احکام کی معرفت اور آخرت کے کام آنے کے لئے پڑھے ، اور دنیا طلبی اور عز و جاہ اس سے مطلوب نہ ہو ۔ اگر کوئی شخص محض جہل سے نکلنے اور لوگوں کو نفع پہنچانے اور علم کو باقی رکھنے کی نیت سے پڑھے ، اور رضائے الٰہی و ثوابِ اخروی و معرفتِ الٰہی اس سے مقصود نہ ہو ، تو اس کو بھی بعض فقہاء نے نیک نیتی میں شمار کیا ہے ۔ عالمگیری کی جلد ۵ صفحہ ۴۲۸ میں فتاویٰ وجیز کردری سے منقول ہے : طلب العلم و الفقہ اذا صحت النیة افضل من جمیع اعمال البر و کذا الاشتغال فی زیادۃ العلم اذا صحت النیة لأنہ اعم نفعا لکن بشرط ان لا یدخل النقصان فی فرائضہ ۔ و صحة النیة ان یقصد وجہ اللہ تعالیٰ و الآخرۃ لا طلب الدنیا و الجاہ ، و لو اراد الخروج من الجھل و منفعة الخلق و احیاء العلم قیل تصح النیة ایضا کما فی الوجیز للکردری ۔

اور جو لوگ اس طریقہ سے اپنی نیت درست کرنے پر قادر نہیں ہیں کہ لوجہ اللہ علم دین حاصل کریں ، بلکہ اس سے منافع دنیوی چاہتے ہیں ، تو ان کے لئے اس فعل پر کوئی اخروی ثواب مرتب نہیں ہوتا ۔ البتہ ان کے لئے اس کو ترک کردینے سے پڑھنا افضل ہے ، شاید کہ اس کے مشغلہ سے ان کی نیت درست ہوجائے ، اور دنیا کے ساتھ حق تعالیٰ کے کرم سے آخرت کا ثواب بھی ہاتھ آجائے ۔ فتاویٰ عالمگیری کی جلد ۵ صفحہ ۴۲۸ میں فتاویٰ غرائب سے منقول ہے ، و ان لم یقدر علی تصحیح النیة فالتعلیم افضل من ترکہ کذا فی الغرائب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

زبان انگریزی جو یورپ کے اہل کتاب یعنی نصاریٰ کی زبان ہے ، اس کا سیکھنا ، سکھلانا ، یا سیکھنے سکھلانے میں کوشش کرنا بغرض حصولِ معاش جائز ہے یا نہیں ؟ حضور نبی اکرم فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے صحابہ سے کسی صحابی کو تحصیل زبان اہل کتاب کے لئے حکم فرمایا ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

مشکاۃ شریف کے صفحہ ۳۹۹ باب السلام میں جامع ترمذی سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کے لئے حکم فرمایا تھا ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کی جو تحریریں حضرت علیہ السلام کے پاس آتی تھیں وہ سریانی زبان میں ہوا کرتی تھیں ، اس لئے ان کے سمجھنے میں اور ان کا جواب دینے میں اکثر یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں زبان کی لاعلمی کے سبب کچھ کمی و زیادتی واقع ہوجائے ، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کے

متعلق حکم فرمایا ۔ چنانچہ ارشاد مبارک کے بعد نصف مہینہ بھی کامل نہیں گذرا تھا کہ زید رضی اللہ عنہ نے سریانی زبان سیکھ لی ۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو جب کبھی یہود کے پاس کچھ لکھنا ہوتا یا ان کا خط پڑھنا ہوتا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی لکھتے اور پڑھتے تھے ۔ عن زید بن ثابت قال : امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اتعلم السریانیة - و فی روایة انه امرنی ان اتعلم کتاب یهود و قال انی ما آمن یهود علی کتاب قال فما مر بی نصف شهر حتی تعلمت فکان اذا کتب الی یهود کتبت و اذا کتبوا الیه قرأت له کتابهم - رواه الترمذی ۔ پس اس حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ ضرورت کے وقت غیر زبان کا سیکھنا درست ہے ، کیونکہ زبان کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ البتہ جس زبان کے سیکھنے سے دین میں کوئی حرج و نقصان ہوتا ہے بیشک اس کا سیکھنا نا جائز ہے ۔

زبانِ غیر کا حاصل کرنا بھی ایک علم ہے ، اور حصولِ معاش اور اقوامِ دنیا کے لئے جو علوم کارآمد ہیں ان کا سیکھنا انسان پر شرعاً فرضِ کفایہ ہے ۔ بناء بریں طب ، حساب ، نحو ، لغت یعنی زبان کا علم ، کلام ، قراءت ، علم میراث ، کتابت ، معانی ، بیان ، صناعی ، پارچہ بافی ، عمارت سازی ، زراعت ، باغبانی ، جواہر تراشی ، فصادی و طب جو علوم کہ انسان کو دنیوی منفعت پہونچاتے ہیں اس کا پڑھنا اور سیکھنا انسان کے لئے ضروری ہے ۔ فتاوئ شامی جلد ۱ صفحہ ۳۰ میں فتاوئ تبیین المحارم سے منقول ہے : قال فی تبیین المحارم و اما فرض الکفایة من العلم فهو کل علم لا یستغنی عنه فی قوام امور الدنیا کالطب و الحساب و النحو و اللغة و الکلام و القراءة و اسانید الاحادیث و قسمة الوصایا و المواریث و الکتابة و المعانی و البدائع و البیان و الأصول و معرفة الناسخ و المنسوخ و العام و الخاص و النص و الظاهر و کل هذه آلة لعلم التفسیر و الحدیث و کذا علم الآثار و الأخبار و العلم بالرجال و أسامیهم و أسامی الصحابة و صفاتهم و العلم بالعدالة فی الروایة و العلم بأحوالهم لیتمیز الضعیف من القوی و العلم بأعمارهم و اصول الصناعات و الفلاحة کالحیاکة و السیاسة و الحجامة ۔

پس انگریزی زبان یا کوئی اور زبان جس کے سیکھنے سے دین میں کوئی خلل نہیں ہوتا ، مسلمان کو حصولِ معاش یا ملی ضرورت کے لئے اس کا سیکھنا جائز ہے ۔ بناء بریں مولانا عبد الحی لکھنوی علیہ الرحمۃ مجموع الفتاوئ کے صفحہ ۲۹۱ میں تحریر فرماتے ہیں : " انگریزی پڑھنا اور زبان سیکھنا جائز ہے ، بشرطیکہ منجر تخللِ دینی کی طرف نہ ہو ۔ حررہ ابو الحسنات محمد عبد الحی " ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

عربی کے سوا دوسری زبان مثلاً فارسی جو آتش پرستانِ ایران کی زبان ہے ، اور اردو جس کو ہندوستان کے ہنود بہ نسبت مسلمانوں کے کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور زبان گجراتی جو محض مشرکانِ گجرات کی زبان ہے ، اور انگریزی و مراٹھی و سنسکرت و افغانی و کنڑی و تلنگی و پنجابی و ملیلی و بنگالی و چینی و عبرانی و حبشی وغیرہ وغیرہ مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں برتی جاتی ہیں ، جو کفار و اہل اسلام کی مستعملہ زبانیں ہیں ۔ ان

مذکورہ زبانوں میں کتب دینیہ کا ترجمہ کرنا اور درس و تدریس و اشاعت اسلام کرنا اور وعظ و نصیحت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس فعل کا مرتکب گنہگار ہے یا مستحق ثواب؟ بینوا توجروا!

الجواب

عربی زبان، دنیا کی تمام زبانوں میں افضل و اعلیٰ ہے۔ جو شخص اس زبان کو سیکھتا اور سکھلاتا ہے وہ آخرت میں ثواب کا مستحق ہے۔ در مختار کے صفحہ ۸۹۱ میں ہے: للعربیۃ فضل علیٰ سائر الألسن و ھو لسان اھل الجنۃ من تعلمھا و یعلم غیرہ فھو مأجور۔ اور فتاویٰ عالمگیری کی جلد ۵ صفحہ ۳۶۸ میں بھی فتاویٰ سراجیہ سے اسی طرح منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں کہ: عرب کو تین وجہ سے دوست رکھو ایک تو یہ کہ میں عربی ہوں، اور دوسرا یہ کہ قرآن عربی ہے، اور تیسرا یہ کہ اہل جنت کی زبان جنت میں عربی ہے۔ در مختار کے صفحہ ۸۹۱ میں ہے: و فی الحدیث " احبوا العرب لثلاث لأنی عربی و القرآن عربی و لسان اھل الجنۃ فی الجنۃ عربی "۔ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو قرآن اور اہل جنت کی زبان عربی ہونے کی وجہ سے عربی زبان نہایت ہی مرغوب ہے، بدیں وجہ عربی زبان دنیا کی تمام زبانوں پر افضل سمجھی گئی ہے۔ اور جبکہ اس کا سیکھنے اور سکھانے والا مستحق ثواب ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ علوم دینیہ کی تعلیم و تعلّم اسی زبان میں رکھیں۔ چنانچہ متقدمین علماء باوجودیکہ اکثر عجمی تھے مگر انہوں نے اپنی تصانیف و تالیفات کو عربی زبان ہی میں رواج دیا ہے۔ اگر علمائے سلف اس زبان کی اس طریقہ سے حفاظت نہ کرتے تو اس وقت قرآن شریف جو اصل ایمان ہے اس عظمت و شان کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ رہتا۔ اگرچہ متقدمین علماء کو بھی ہر ہر زمانہ میں عامۃ الناس کی تلقین و تعلیم کے لئے غیر زبان میں احکام دین سمجھانے کی ضرورت تھی مگر ان حضرات رحمہم اللہ نے علوم دین حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کا سلسلہ اکثر عربی ہی میں رکھا۔ پس موجودہ زمانہ میں بھی عربی زبان کا رواج کم کرنا اور عام طریقہ سے علوم دینیہ کا غیر زبان میں ترجمہ کرنا اور رواج دینا درست نہیں۔ عربی کے بعد فارسی زبان بھی شریعت میں با وقعت سمجھی گئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے اس کو بھی اہل جنت کی زبان فرمایا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ الدر المختار جلد ۱ صفحہ ۳۲۹ میں اس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے: و خصہ البردعی بالفارسیۃ لمزیتھا بحدیث لسان اھل الجنۃ العربیۃ و الفارسیۃ الدریۃ۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی نماز میں فارسی زبان میں تکبیر کہنے کو جائز رکھا۔ اور بعض علمائے سلف نے علوم دینیہ کا بھی اس زبان میں رواج دیا۔ پس ان دو زبانوں کے سوا کسی اور زبان کی شریعت میں فضیلت نہیں آئی۔

بوقت ضرورت جبکہ بعض دیہاتی مسلمانوں کو مسائل دین اُن کی زبان میں سکھلانا پڑے اور ضروری مسائل اُن کی زبان میں سمجھائے جائیں، اور خالص اُن کے لئے بطور رسالہ کے کچھ مسائل لکھ بھی دیئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اِس کے ساتھ اُن میں سے بعض افراد کو عربی سیکھنے کی طرف بھی ضرور آمادہ اور مجبور کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (صفحہ ۲۵۲ اور ۲۵۳ بھی ملاحظہ ہو)

الاستفتاء

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم مبعوث الیٰ کافۃ الناس تھے یا نہیں ؟ اور اگر تھے تو غیر مذہب لوگوں کی زبان حاصل کرکے اسی زبان میں تبلیغ کرنا علماء پر جو اپنے آپ کو وارث انبیاء کہتے ہیں ضروری ہے یا نہیں ؟ رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی زبانوں کا علم عطاء کیا گیا یا نہیں؟ اور آپ نے بطور اعجاز کافروں کی زبان میں کلام کیا تھا یا نہیں ؟

الجواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم بیشک کافۃ الناس کی طرف مبعوث ہیں ۔ چنانچہ قرآن شریف اور حدیث صحیح "بُعِثْتُ الیٰ کافۃ الناس" سے ثابت ہے ۔ بہ بتلائے حدیث صحیح "العلماء ورثۃ الأنبیاء" علماء کا انبیاء کے وارث ہونا ثابت ہے ۔ اور ان کو وراثت اسی تبلیغ احکام کے متعلق ملی ہے ۔ چنانچہ بمقتضائے حدیث صحیح "فلیبلغ الشاهدُ الغائبَ" ہر ایک جاننے والے پر لا علم کو تبلیغ کرنا واجب گردانا گیا ہے ۔ چونکہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اتعلم السریانیة و فی روایة انه امرنی ان اتعلم کتاب یهود و قال انی ما آمن یهود علی کتاب فما مر بی نصف شهر حتی تعلمت فکان اذا کتب الی یهود کتبت و اذا کتبوا الیه قرأت له کتابهم رواه الترمذی سے بہ وقت ضرورت زبان غیر کا سیکھنا شرعاً جائز گردانا گیا ہے ۔ اس لئے علماء اگر بغرض تعلیم ناس زبان غیر کو اس طریقہ سے کہ مُنجر بہ خللِ دین نہ ہو سیکھیں ، اور حسب ضرورت لوگوں کو اس زبان میں احکام شرعیہ کی تلقین کریں تو مناسب ہے ۔

حدیث شریف میں اس قدر بتلایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے ۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں "اُوتیتُ علمَ الأولین و الآخرین" اس میں زبانوں کے علم کے متعلق کوئی خاص لفظ نہیں ہے ۔ حدیث صحیح سے یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے حبشیوں (ایتھوپیا) کی زبان کے چند الفاظ زبان مبارک سے ادا فرمائے تھے اور حبشی اس زمانہ میں کافر تھے ۔ واللہ اعلم ۔

الاستفتاء

نومسلم یورپین مولوی شیخ عبد اللہ کوئیلم جن کو سلطان ترکی نے "شیخ الاسلام" کا خطاب عنایت فرمایا ہے وہ قوم کے انگریز ہیں ، زبان انگریزی میں تبلیغ اسلام فرماتے ہیں ، اور متعدد رسائل در بارۂ تبلیغ اسلام انگریزی میں شائع کئے ہیں ، اور وعظ بھی اُسی زبان میں فرماتے ہیں ۔ آیا یہ فعل اُن کا موجب ثواب ہے یا نہیں ؟

الجواب

مولوی صاحب موصوف کی زبان مادری چونکہ انگریزی ہے اس لئے اُن کو تبلیغ احکام اسی زبان میں کرنی بہ نسبت عربی کے آسان ہے ، اور خصوصاً جبکہ یوروپ کے عوام عربی نہیں جانتے پس اُن کے لئے انگریزی

ہی میں تبلیغ کرنی چاہئیے۔ کیونکہ ضرورتاً شرع میں غیر زبان سے کام لینا جائز ہے، جیسا کہ زید بن ثابت کی حدیث سے ثابت ہے۔ مگر مولوی صاحب پر اس کے ساتھ زبانِ عربی کا سیکھنا اور رواج دینا جو قرآنی زبان ہے اور تمام زبانوں پر افضل ہے لازم ہے، تاکہ مسلمانانِ یوروپ قرآن شریف کی تلاوت اور اُس کے لفظی تاثرات سے فیضیاب ہوں، اور اس کے سیکھنے اور سکھلانے کا اجر بھی انھیں حاصل ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

جو حضرات علم انگریزی پڑھنے یا پڑھانے کے مانع ہیں، اور زبان مذکور کو بہت بری سمجھتے ہیں، اور خود ماہرانِ انگریزی سے خلا ملا رکھتے ہیں، اور ان کے ساتھ کھانا پینا بھی روا رکھتے ہیں۔ ان کے تعلق سے کیا حکم ہے؟

الجواب

انگریزی داں اگر شراب و خنزیر وغیرہ محرمات شرعیہ استعمال کرتے ہیں، یا ان کے عقائد مسلمانوں کے عقیدہ کے خلاف ہیں، تو ایسے لوگوں سے ان کے ہم خیال ہوکر میل جول رکھنا شرعاً ممنوع ہے۔ کیونکہ ان کی صحبت سے ملنے جلنے والے پر ضرور برا اثر پڑتا ہے، اور جو شخص ان سے اتحاد و خلوص رکھے وہ گنہگار ہے۔ لیکن جو انگریزی داں محرّمات شرعیہ کے مرتکب نہیں ہیں، اور ان کے عقائد و خیالات بھی مسلمانوں کے موافق ہیں تو ایسے لوگوں سے ملاقات رکھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

سراج الملۃ و الدّین بادشاہ حبیب اللہ خان والیِ ملک افغانستان خلد اللہ ملکہٗ، جو زبان انگریزی جانتے ہیں، اور جنھوں نے علیگڑھ کالج اور انجمن حمایت الاسلام کالج کو جس میں انگریزی تعلیم ہوتی ہے، امداد فرماکر معقول رقمیں عنایت فرمائی ہیں، انھیں علمائے دین اور حامیانِ شرع متین کیا سمجھتے ہیں؟

الجواب

سنا جاتا ہے کہ آج کل علیگڑھ کالج کے مدرسین و طلباء وغیرہ کے خیالات سابق کی طرح عقائد اسلامی کے خلاف نہیں ہیں، اور نہ اس قسم کی کوئی تعلیم وہاں اب دی جاتی ہے۔ اس بات کے سچ ہونے کی صورت میں بیشک علیگڑھ کالج علم معاش (جو انسان پر فرض کفایہ ہے) سکھلانے کے لئے مفید عام مدرسہ ہے۔ پس سراج الملۃ و الدّین والیِ افغانستان کا اس کی تائید کرنا قابل اجر فعل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کوئی شخص تبدیلیِ مذہب کرسکتا ہے یا نہیں؟ جیسے شافعی

سے حنفی یا اس کے برعکس ؟ بینوا توجروا !

الجواب

اگر کسی حنفی یا شافعی نے دنیوی نفع کے لئے یا بدون کسی دلیل کے بے سوچے سمجھے کسی کے کہنے پر تبدیل مذہب کرلیا ہے، تو اس شخص نے چونکہ اپنے پہلے مذہب کی توہین کی ہے اور اس کو خفیف جانا ہے اس لئے آخرت میں گنہگار و مستحق عذاب ہے، اور دنیا میں اس پر تعزیر لگائی جائے گی ۔ اور اگر اس کا مبلغ علم دین میں پایۂ اجتہاد کو پہونچا ہوا ہے اور اپنے اجتہاد میں مذہب کے بدلنے سے شریعت کی کوئی بھلائی جانتا ہے تو ایسے شخص کے لئے تبدیل مذہب جائز ہے ۔ در مختار جلد ۳ صفحہ ۱۹۹ میں ہے : ارتحل الیٰ مذهب الشافعی یعزر، سراجیة ۔ اور اسی جگہ رد محتار میں ہے : ای اذا کان ارتحاله لا لغرض محمود شرعا ۔ اور اسی صفحہ میں تاتارخانیہ سے منقول ہے : و لو ان رجلا برئ من مذهبه باجتهاد وضح له کان محمودا مأجورا اما انتقال غيره من غير دليل بل لما يرغب من غرض الدنيا و شهوتها فهو المذموم الآثم المستوجب للتاديب و التعزير لارتكابه المنكر فی الدين و استخفافه بدينه و مذهبه ۔ و الله اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۳۸۳ بھی دیکھئے)

الاستفتاء

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ پچھا بنؤ یعنی گودنا ، جو بھلاویں کے تیل سے منقش کرکے سوئیوں کے کونچے سے مضروب کرتے ہیں ، جو درست ہونے کے بعد سبز رنگ کا نقش پختہ ہوجاتا ہے ، اور یہ فعل ہندوستان میں اکثر ہنود کا ہے ۔ مسلمان کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت جائز ہے یا نہیں ؟ سنا جاتا ہے عرب و مصر و مراکش وغیرہ کے مسلمان بکثرت یہ فعل کرتے ہیں ! اس کا جواب بحوالۂ کتب مستندہ سے عطاء کیا جائے ۔ بینوا توجروا !

الجواب

پچھا بنؤ جس کو عربی میں " وشم " کہتے ہیں اور جس کی تفصیل مستفتی نے بیان کی ہے ، یہ فعل شرعاً فاعل اور مفعول بہ یعنی پچھا لگانے والے اور جس کو لگایا جاتا ہے دونوں کے لئے حرام ہے ، دونوں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے ۔ اور جس مقام پر یہ لگایا جاتا ہے وہ مقام نجس ہوجاتا ہے ۔ اگر اس کا ازالہ علاج سے ممکن ہے تو انسان پر اس کا دور کرنا واجب ہے ۔ اور اگر بغیر جراحی کرنے کے ممکن نہیں ہے تو اس وقت یہ دیکھا جائے کہ جراحی سے جان یا عضو کے تلف ہونے یا عضو کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے یا نہیں ؟ اگر اندیشہ ہے تو اس کا دفع کرنا واجب نہیں ، اور اگر اندیشہ نہیں ہے تو دفع کرنا واجب ہے ۔ اندیشہ کی صورت میں اگر توبۂ واثق کرلی جائے تو پھر اس کے باقی رہنے سے کوئی حرج نہیں ہے ،

اور اندیشہ نہ ہونے کی صورت میں تاخیر کرنا موجب عصیان ہے ۔ جامع ترمذی مجتبائی صفحہ ۱۰۲ کے حاشیہ پر طیبی سے منقول ہے :" لعن اللّٰہ الواشمات " الوشم ھو ان یغرز بابرۃ و نحوھا فی البدن حتیٰ یسیل الدم ثم یحشی بالکحل و النورۃ فیخضرّ ، و " المستوشمۃ " من طلبت فعل ذٰلک و ھو حرام علی الفاعلۃ و المفعول بھا و الموضع الذی وشم یصیر نجسا فان امکن ازالتہ بالعلاج وجبت و ان لم یمکن الا بالجرح فان خاف منہ التلف او فوات عضو او منفعۃ او شینا فاحشا فی عضو ظاھر لم یجب ازالتہ و اذا تاب لم یبق علیہ اثم و ان لم یخف شیئاً من ذٰلک لزمہ ازالتہ و یعصی بتأخیرہ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانہ میں چونکہ عورتیں اکثر اس فعل کی مرتکب تھیں، اس لئے ایسا حکم انہیں کے متعلق دیاگیا ۔ اور اس وقت اگر کوئی مرد اس کا مرتکب ہو تو اُس کے لئے بھی یہی حکم ہوگا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جانوروں کو خصی کرنا شرعا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

خصی کرنے سے اگر کوئی منفعت ہو تو جائز ، ورنہ حرام ہے ۔ فتاویٰ عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۲۵۰ میں ہے :
خصاء بنی آدم حرام بالاتفاق ۔ و اما خصاء الفرس فقد ذکر شمس الأئمۃ الحلوانی فی شرحہ انہ لا بأس بہ عند اصحابنا و اما فی غیرہ من البھائم فلا بأس بہ اذا کان فیہ منفعۃ و اذا لم تکن فیہ منفعۃ او دفع ضرر فھو حرام کذا فی الذخیرۃ ۔ در مختار جلد ۵ صفحہ ۲۵۰ میں ہے : (و) جاز (خصاء البھائم حتی الھرۃ اما خصاء الآدمی فحرام قیل و الفرس و قیدوہ بالمنفعۃ و إلا فحرام ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہر ایک مسلمان کو کس قدر لمبی داڑھی رکھنی چاہئے ؟ اور اس بارے میں ائمہ کا کیا اختلاف ہے ؟ بدلائل کتب معتبرہ ایماء فرما کر ثواب دارین حاصل فرمایا جائے !

الجواب

داڑھی اگر مشت سے زیادہ ہوجائے تو اس کو کترنا مسنون ہے ، اور اس سے کم ہونے کی صورت میں کترنا جائز نہیں ۔ علمائے احناف کا یہی قول ہے جیسا کہ دُر مختار مطبوعہ مصر بر حاشیۂ ردّ المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۶۹ میں ہے : و لا بأس بنتف الشیب و اخذ اطراف اللحیۃ و السنۃ فیھا القبضۃ ۔ اور رد المحتار میں ہے : و ھو ان یقبض الرجل لحیتہ فما زاد منھا علی قبضۃ قطعہ کذا ذکر محمد فی کتاب الآثار عن الإمام و

قال به نأخذ ۔ محیط ۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیری کی جلد ۵ صفحہ ۳۵۸ میں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حرام چیزوں کو بطورِ دواء استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

حرام چیزوں سے علاج کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ مریض کو یا تو بطورِ خود اس بات کا یقین ہو کہ اس کے استعمال سے شفاء ہوگی یا کوئی مسلمان طبیب اس کو یہ بات کہے اور حرام شئے کے سوا اس بیماری کے لئے کوئی اور جائز دواء بھی نہ ہو ۔ ورنہ شئے حرام سے علاج کرنا نا جائز ہے ۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۲۲۳ میں ہے : صاحب الخانیة و النهایة اختارا جوازه ان علم ان فیه شفاء و لم یجد دواء غیره قال فی النهایة و فی التهذیب یجوز للعلیل شرب البول و الدم و المیتة للتداوی اذا اخبره طبیب مسلم ان فیه شفاءه و لم یجد من المباح ما یقوم مقامه ۔ اور اگر کوئی طبیب جائز چیز دواء ہونے کے باوجود یہ کہے کہ اس حرام چیز سے جلد نفع ہوگا ، تو ایسی حالت میں حرام چیز استعمال کرنے کو بعضوں نے جائز رکھا ہے اور بعض علماء نے نا جائز ۔ رد المحتار کے اسی صفحہ ۲۲۳ میں ہے : و ان قال الطبیب یتعجل شفاؤک به فیه وجهان ۔ ایسا ہی اگر بیمار باوجود دوسری دواء ہونے کے شراب کو بطورِ دواء کے استعمال کرے تو اس میں بھی علماء کے دو قول ہیں ، چنانچہ اسی جگہ ہے : و هل یجوز شرب العلیل من الخمر للتداوی فیه وجهان کذا ذکره الامام التمرتاشی کذا فی الذخیرة ۔ چونکہ خاص ان دونوں مسئلوں میں علماء کا اختلاف ہے اس لئے احتیاطاً بیمار کا جلد صحت حاصل کرنے کے لئے حرام چیز سے علاج کرنا اور دوسری دواء کے ہوتے ہوئے شراب کا بطورِ دواء کے استعمال کرنا نا جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

بچوں کو بغرضِ تعلیم صلوٰۃ و دیگر علوم شرعیہ کس حد تک تنبیہ کرنے اور مارنے کی اجازت ہے ؟

الجواب

نماز کے لئے بچوں کو تین ۳ بار نرمی کے ساتھ ان کی طاقت کی موافق ہاتھ سے مارنا چاہئے ، اس سے زیادہ یا لکڑی سے مارنا نا جائز ہے ۔ اور یہ بھی اسی وقت چاہئے جبکہ بچہ دس (۱۰) سال کے سن کو پہنچے ۔ کم عمری کے زمانہ میں مارنا نا جائز ہے ، محض دھمکی کافی ہے ۔ فتاویٰ امداد الفتاح مشہور بہ فتاویٰ شرنبلالیہ کے صفحہ ۱۵۹ میں ہے : و تضرب علیها لعشر لما روینا و ذلک بید لا بخشبة ای لا بالعصا رفقاً به و زجراً بحسب

طاقتہ و لا یزید علی ثلاث ضربات بیدہ۔ جامع الرموز صفحہ ۵۳۱ میں ہے: و علیہ ان یضربہ اذا بلغ عشر سنین للصلاۃ بالید لا بالخشب، الکل فی الملتقط۔

تعلیم کے لئے بھی استاد کو تین بار سے زیادہ مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ شرح وھبانیہ صفحہ ۲۰۶ میں ہے: و المعلم یضربہ بحکم الملک بتملیک عن الأب لمصلحۃ التعلم و لا یزید علی ثلاث ضربات بغیر آلۃ جارحۃ قالہ الطرطوسی۔ اور اگر اس سے زیادہ مارے جس میں بچہ ہلاک یا زخمی ہوجائے تو استاد اس کے خون کا ضامن ہوگا اور اس پر تعزیر لگائی جائے گی۔ منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق صفحہ ۵۳ جلد ۵ میں ہے: لکن فی التنویر و شرحہ عن الشمنی لو ضرب المعلمُ الصبیَ ضرباً فاحشاً فانہ یُعزَّر و یضمنہ لو مات۔ مگر جس صورت میں کہ لڑکے کے باپ نے استاد کو تین بار مارنے یا اس سے کم مارنے کی اجازت دی تھی اور استاد نے اسی قدر حسبِ اجازت لڑکے کو مارا جس سے لڑکا مرگیا تو ایسی صورت میں استاد ضامن نہیں ہے۔ جامع الرموز صفحہ ۵۳۱ میں ہے: و ان المعلم لو ضرب الصبی لم یھدر دمہ الا ان یأذنہ الأب ان یضرب ثلاثا او اقل۔

استاد کو چاہیے کہ لکڑی سے نہ مارے اگرچیکہ بچے کے باپ نے لکڑی سے مارنے کی اجازت دی ہو، کیونکہ اس میں لڑکے کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ جامع الرموز صفحہ ۵۳۱ میں ہے: لا یضرب بالخشبۃ و ان اذنہ الأب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے والد یعنی مسعودؓ صحابی تھے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے والد مسعود بن غافل ہیں۔ استیعاب میں صحابہ کا ذکر دیکھا گیا، اور الإصابۃ فی احوال الصحابۃ، تقریب التھذیب، تھذیب التھذیب یہ تمام کتابیں دیکھی گئیں مگر کسی جگہ مسعود بن غافل صحابی نہیں بیان کئے گئے۔ استیعاب میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اجداد کا جو ذکر کیا گیا ہے بعینہٖ عبارت درج ذیل ہے جس سے بعد تحقیق معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حضرت عبد اللہ کے والد جن کے یہ اجداد ہیں صحابی نہیں ہیں: عبد اللہ بن مسعود بن الغافل بالغین المنقوطۃ و الفاء ابن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم ابن صاھلۃ بن کاھل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن ھذیل بن خزیمۃ بن مدرکۃ بن الیاس بن مضر، ابو عبد الرحمن الھذلی، حلیف بنی زھرۃ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مرد اپنی عورت کو کہے کہ " حضرت رسول اکرم

صلی اللہ علیہ و سلم ایسا فرماتے ہیں " تو عورت یہ سن کر کہے کہ " غلط ہے" یا جھوٹ ہے "۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے قول مبارک کو جھوٹ کہنے سے وہ عورت کافرہ ہوگئی یا نہیں ؟ اگر کافرہ ہوجائے گی تو پھر مرد کو اس کے ساتھ وطی کرنا بلا تکرار عقد جائز ہے یا نہیں ؟ اگر تکرار عقد کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں عقد جدید کے ساتھ مہر جدید ہوگا یا عقد اول سے جو مہر مقرر تھا اسی پر عقد کرنا ضروری ہوگا ؟ یا مرد کو اختیار ہوگا ؟

۲ ۔ اور شہود میں بجائے دو مردوں کے چار عورتیں کافی ہوسکتی ہیں یا نہیں ؟ یا ایک مرد کا رہنا ضروری ہے ؟

الجواب

تکفیر و عدم تکفیر کے متعلق فتویٰ دینے کے لئے شرعاً حکم یہ ہے کہ اولاً کلمات کفر پر غور کیا جائے ، اگر ان میں متعدد وجوہ ہیں تو حتیٰ الوسع مفتی پر لازم ہے کہ جو پہلو عدم کفر کا ہے اس پر قائل کے قول کو محمول کرے ۔ چونکہ ہر وقت مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھنے کی ضرورت ہے ، اس لئے اگر قائل نے ان الفاظ سے دوسرے معنیٰ لینے کے متعلق اپنی نیت و ارادہ ظاہر کیا ہے تو اسی کا لحاظ ہوگا ۔ اور اگر کفر کے معنیٰ کی نیت ہے تو اس کو توبہ و تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا ۔ جامع الفصولین جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ میں ہے : ثم اعلم انہ لو کان فی المسألۃ وجوہ توجب الکفر و وجہ واحد یمنع التکفیر فعلیٰ المفتی ان یمیل الی الوجہ الذی یمنع التکفیر تحسیناً للظن لمسلم ثم لو کانت نیۃ القائل ذلک فھو مسلم ۔ و لو کانت نیتہ الوجہ الذی یوجب الکفر لا ینفعہ حمل المفتی کلامہ فیؤمر بالتوبۃ و تجدید النکاح ۔

پس صورت مسئولہ میں زوجہ نے خاوند سے حدیث سنکر " غلط ہے " یا " جھوٹ ہے " جو کہا ہے اس جملہ میں دو احتمال ہیں ۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ زوجہ کا اس قول سے حدیث کی تکذیب منظور نہیں ہے ، بلکہ اس کی غرض یہ ہوگی کہ زوج اس کلام کو جو حدیث کہہ رہا ہے زوج کا اس کو حدیث کہنا غلط ہے ۔ عورتوں کی اکثر عادت ہوتی ہے کہ مردوں کے تعلق سے یہ خیال رکھتی ہیں کہ مرد خودغرض ہیں ، اور اپنی غرض کو کسی طرح یہ کہکر کہ یہ قول خدا کا ہے اور یہ قول رسول کا ہے اپنا کام نکال لیتے ہیں ۔ اور یہ بھی خیال کرتی ہیں کہ مردوں کے لئے عورتوں کے ساتھ جھوٹی باتیں کرکے ان کو راضی کرلینا اور سمجھا منا لینا جائز ہے ۔ بناء بریں اکثر عورتیں گفتگو کے وقت مردوں کی بات کو غلط اور جھوٹ کہہ دیا کرتی ہیں ۔ ایسے موقعوں پر ان کو خدا و رسول کے فرمان کی نسبت بھی یہی خیال گذرتا ہے کہ یہ فی الحقیقت نہ قول خدا ہے اور نہ قول رسول ، بلکہ مرد محض منانے اور سمجھانے کے لئے اپنی بات کو خدا و رسول کا قول کہہ رہا ہے اس لئے اس کا اس قول کو خدا و رسول کی طرف منسوب کرنا اور حدیث ہے کہنا غلط ہے ۔

پس صورتِ مسئولہ میں عورت سے تفصیلاً دریافت کیا جائے ، اگر عورت نے سابق الذکر خیال سے صرف زوج کو جھٹلانے کے لئے یہ قول کہا ہے تو ایسی صورت میں عورت کافرہ نہیں ہوتی ، کیونکہ اس کی غرض اس وقت نفس حدیث کی تکذیب نہیں ہے ، بلکہ زوج کو اس قول میں یعنی اس کو اس کے حدیث ہے

کہنے میں جھوٹا کہنا مقصود ہے۔ ایسے وقت میں اس کے اس قول " جھوٹ ہے، یا غلط ہے " کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ زوج کا اس کلام کو حدیث ہے کہنا جھوٹ ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ عورت اس کلام کو حدیث جان کر یہ کہے کہ جھوٹ ہے، پس اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ کلام جس کو تم حدیث کہتے ہو یہ کلام خود جھوٹا اور غلط ہے، یعنی یہ کلام لغو اور نا قابل اعتبار ہے اس کے معنیٰ کے موافق عمل نہ کرنا چاہئے اور نہ اعتقاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ پس ایسی صورت میں نفس حدیث کی تکذیب لازم آتی ہے جو تکذیبِ قولِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول کی تکذیب کی جاتی ہے، اگر وہ قول احکامِ شرعی اور امورِ دین کے متعلق ہے تو ایسے قول کی تکذیب کرلے سے مکذب و منکر شرعاً کافر و مرتد ہوجاتا ہے۔ فتاویٰ در مختار باب المرتد میں ہے: و الکفر لغة الستر و شرعا تکذیبه صلی اللّٰه علیه و سلم فی شیء مما جاء به من الدین ضرورة۔ شرح عقائد طبع مجتبائی صفحہ ۱۲ میں ہے: و رد النصوص بأن ینکر الأحکام التی دلت علیها النصوص القطعیة من الکتاب و السنة کحشر الأجساد مثلا کفر لکونه تکذیبا صریحا للّٰه تعالیٰ و رسوله صلی اللّٰه علیه و آله و سلم۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ قول بطریق تواتر قطعی الدلالۃ ثابت ہو۔ اگر متواتر قطعی الدلالۃ نہیں ہے تو اس کے انکار سے منکر کافر نہیں ہوتا، بلکہ ضال یعنی گمراہ ہوتا ہے۔ جامع الفصولین جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ میں ہے: روی حدیثا عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فرد آخر قال بعضهم کفر و من المتأخرین من قال کفر لو متواترا۔ شرح عقائد کے حاشیہ میں ابو ورد سے منقول ہے: قوله و السنة ای المتواترة مثل المحکم و المفسر منها و اما الظواهر و النصوص فیضلل منکرهما و لا یکفر۔ فتاویٰ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۲۹۳ میں ہے: ثم نقل فی نور العین عن رسالة الفاضل الشهیر حسام چلپی من عظماء علماء السلطان سلیم بن با یزید خان ما نصه اذا لم یکن الآیة او الخبر المتواتر قطعی الدلالة او لم یکن الخبر متواترا او کان قطعیا لکن فیه شبهة او لم یکن اجماع الجمیع او کان و لم یکن اجماع الصحابة او کان و لم یکن اجماع جمیع الصحابة او کان اجماع جمیع الصحابة و لم یکن قطعیا بأن لم یثبت بطریق التواتر او کان قطعیا لکن کان اجماعا سکوتیا ففی کل من هذه الصور لا یکون الجحود کفرا۔

اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول احکام شرعی اور امور دین کے متعلق نہیں ہے تو اس کا منکر شرعاً کافر نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم باب احکام المرتدین ما یتعلق بالانبیاء علیہم السلام میں ہے: قال رضی اللّٰه تعالیٰ عنه سألت صدر الاسلام جمال الدین عمن قرأ حدیثا من احادیث النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فقال رجل " ہمہ روز غلشہا خوانند " قال ان اضاف ذلک الی القاریٔ لا الی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم ینظر ان کان حدیثا یتعلق بالدین و احکام الشرع یکفر و ان کان حدیثا لا یتعلق به لا یکفر و تحمل مقالته علی ان ارادته قراءة غیره اولیٰ۔

پس صورتِ مسئولہ میں عورت نے اگر نفس حدیث کی تکذیب کی ہے اور وہ حدیث احکام شرعیہ اور

امورِ دین کے متعلق متواتر و قطعیُ الدلالہ ہے تو یقیناً کافرہ ہے، اس پر توبہ کرنا اور نکاح کی تجدید کرنا لازم ہے جیسا کہ جامع الفصولین کی عبارۃ ماسبق الذکر فیؤمر بالتوبة و تجدید النکاح سے ثابت ہے۔ اور اگر متواتر نہیں ہے یا احکامِ دین اور امور شرعیہ کے متعلق نہیں ہے تو عورت کافرہ نہیں ہے۔

عورت کے کافرہ ہونے کی صورت میں جبکہ زوج بعد توبہ و رجوع باسلام نکاح کی تجدید کرنا چاہتا ہے تو زوج پر مہر کی زیادتی لازم نہیں ہے، بلکہ مہر سابق ہی پر نکاح کرنا چاہیے۔ اور اگر زوج خود زیادتی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس پر لازم ہوجائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۳۱۳ میں خلاصہ سے منقول ہے: و فتوی القاضی الإمام علی انه لا یجب بالعقد الثانی شیء الا اذا عنی به الزیادة فی المهر فحینئذ یجب المهر الثانی کذا فی الخلاصة۔ فتاویٰ شامی جلد ۲ صفحہ ۳۳۶ میں ہے: فی القنیة جدّد للحلال نکاحا بمهر یلزم ان جدّده لأجل الزیادة لا احتیاطا ای لو جدّده لأجل الاحتیاط لا تلزمه الزیادة بلا نزاع کما فی البزازیة۔ پس صورتِ مسئولہ میں بدون زیادتی مہر کے نکاح کرنے کی صورت یہ ہے کہ تجدید نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ کیا جائے، اور اگر کیا جائے تو اسی سابق مہر کا ذکر کیا جائے۔ خزانۃ الروایۃ صفحہ ۳۵ میں ہے: ثم اراد الزوج ان لا یلزمه مهر آخر بلا خلاف ینبغی ان یجدد النکاح و لم یذکر المهر او یجدد النکاح بذلک المهر فلا یجب علیه مهر آخر۔

۲۔ عورتوں کی شہادت، بدون شرکتِ مرد کے شرعاً مقبول و معتبر نہیں ہے۔ البتہ دایہ کی شہادت ولادت پر حق نسب میں قبول کی جاتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری جلد سوم صفحہ ۳۱۵ میں ہے: و لا تقبل شهادة النساء وحدهن الا شهادة القابلة علی الولادة فی حق النسب دون المیراث هکذا فی فتاویٰ قاضیخان۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے خواب میں ایک نوجوان لڑکے کو تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھکر حاضرین سے استفسار کیا کہ یہ کون ہے؟ حاضرین نے جواب دیا کہ یہ خداوند عالم ہے۔ کیا از روئے شریعت اس کا بیان درست ہے، اور خداوندِ عالم کی رؤیت خواب میں اس طرح ہوسکتی ہے؟

الجواب

خداوند عالم کو خواب میں دیکھنا ایک قسم کا مشاہدہ ہے جو بزرگان دین و اولیاء متقین کو بذریعۂ قلب ہوا کرتا ہے۔ شرح عقائد نسفی کے بیان رؤیت میں ہے: و اما الرؤیة فی المنام فقد حکیت عن کثیر من السلف و لا خفاء فی انها نوع مشاهدة یکون بالقلب دون العین۔ شرحِ فقہ اکبر کے بیان رؤیت میں ہے: و قد رُوِیَ عن کثیر من السلف فی هذا المقام و هو نوع مشاهدة یکون بالقلب للکرام فلا وجه للمنع عن هذا المرام مع انه لیس باختیار احد من الأنام۔ تفسیر روح البیان جلد ۲ صفحہ ۱۹۳ میں ہے: و لا خفاء فی ان الرؤیة فی المنام نوع مشاهدة یکون بالقلب دون العین۔ شرح مقاصد کے

بیان رؤیت میں ہے: و اما الرؤیة فی المنام فقد حکی القول بها عن کثیر من السلف۔
رؤیت باری کے متعلق اکثر علماء متقدمین کا یہ قول ہے کہ بلا کیفیت و بلا جہت و بلا ہیئت و بلا مقابلہ و بلا خیال و بلا مثال اس مشاہدہ و رؤیت کا عالم خواب میں ہونا جائز ہے، اور حدیث رأیت ربی فی المنام البارحة اور روایات سلف صالحین یعنی امام اعظم و امام احمد و با یزید بسطامی و احمد بن خضرویہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اس کی دلیل ہے۔ شرح فقہ اکبر کے بیان رؤیت میں ہے: فالأکثرون علی جوازها من غیر کیفیة و جهة و هیئة ایضا فی هذا المرام فقد نقل ان الإمام ابا حنیفة رحمه الله تعالیٰ قال رأیت رب العزة فی المنام تسعا و تسعین مرة ثم رءاه مرة اخری تمام المائة۔ و قصتها طویلة لا یسعها هذا المقام و نقل عن الإمام احمد رحمه الله انه قال رأیت رب العزة فی المنام فقلت یا رب بم یتقرب المتقربون الیک قال بکلامی یا احمد قلت یا رب بفهم او بغیر فهم قال بفهم او بغیر فهم۔ و قد ورد عنه علیه السلام انه قال رأیت ربی فی المنام۔ فتح العلی امالک طبع مصر کے صفحہ ۳۰ میں ہے: قال الشیخ ابراهیم اللقانی فی شرحه الکبیر علی جوهرته اختلف فی رؤیة الله تعالیٰ فی المنام و معظم المثبتین للرؤیة فی الدنیا علی جوازها من غیر کیفیة و جهة۔ اتحاف السادۃ شرح احیاء العلوم کی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ میں ہے: و جوّزها بعض اصحابنا بلا کیفیة و جهة و مقابلة و خیال و مثال کما عرفناه فی الیقظة تمسکا بما روی عن النبی صلی الله علیه و سلم رأیت ربی فی المنام البارحة، و تشبثا بالمحکی عن السلف فانه روی عن ابی یزید انه قال رأیت ربی فی المنام فقلت کیف الطریق الیک فقال اترک نفسک و تعال۔ و رأی احمد بن خضرویه ربه فی المنام فقال یا احمد کل الناس یطلبون منی الا ابا زید فانه یطلبنی۔ و روی عن احمد الزیات و ابی الفوارس شاه بن شجاع الکرمانی و محمد بن علی الترمذی و العلامة شمس الأئمة الکردری رحمهم الله تعالی انهم رأوه فی المنام۔

حالتِ خواب میں خداوندِ عالم کو کسی مجسم چیز کی شکل میں دیکھنا فی الحقیقت خداوند عالم کی رؤیت نہیں ہے، کیونکہ خداوندِ عالم صفات اجسام و اختلاف احوال سے منزہ ہے۔ فتح العلی امالک کے صفحہ ۳۰ میں ہے: و نقل القاضی عیاض ان العلماء اتفقوا علی جواز رؤیة الله تعالیٰ فی المنام و صحتها و ان رءاه الإنسان علی صفة لا تلیق بجلاله من صفات الأجسام کان ذلک المرئی غیر ذات الله تعالیٰ اذ لا یجوز علیه سبحانه و تعالی التجسم و لا اختلاف الأحوال۔

اور جن احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا اللہ تعالیٰ کو جوان کی صورت میں دیکھنا یا اچھی صورت میں دیکھنا مذکور ہے ان میں سے بصورت جوان دیکھنے کی حدیث تو چونکہ صحاح میں مذکور نہیں ہے اس لئے اس کی صحت میں کلام کیا گیا ہے، اور بر تقدیر صحت اس کی تاویل اس طرح کی گئی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اس رؤیت کے وقت جوان کی صورت میں تھے۔ فتح العلی المالک کے صفحہ ۳۹ میں ہے: و الحدیث المذکور ان صح یؤوّل بتقدیر مضاف ای مَلَک ربی او جعل فی صورة شاب

حالانکہ من تاہ رأیتُ ای حال کونی فی صورۃ شاب ۔ اور اچھی صورت میں دیکھنے کی حدیث حسن صحیح ہے جس کی امام ترمذی و امام احمد نے روایت کی ہے ، چنانچہ مشکاۃ شریف کتاب الصلاۃ باب المساجد و مواضع الصلاۃ کی مطول حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اس طرح فرمایا ہے " انی قمتُ من اللیل فتوضأتُ و صلیتُ ما قدر لی فنعستُ فی صلاتی حتی استثقلت فاذا انا بربی تبارک و تعالیٰ فی احسن صورۃ " اس حدیث شریف کی تاویل بھی اگر اسی طرح کی جائے یا " صورت " صفت کے معنی میں لی جائے تو ممکن ہے ۔ قطع نظر اس تاویل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا خداوند عالم کو کسی مخلوق کی صورت میں دیکھنا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی خصوصیات سے ہوسکتا ہے جس میں آپ کے سوا کسی اور کی مداخلت نہیں ہوسکتی ۔ شرح فقہ اکبر کے بیان رؤیت میں ہے ؛ و قد ورد عنہ علیہ السلام انہ قال " رأیت ربی فی احسن صورۃ ۔ و فی روایۃ : فی صورۃ شاب " فقال الإمام الرازی فی تأسیس التقدیس لیس یجوز ان یریٰ النبیُ ربّہ فی المنام فی صورۃ مخصوصۃ من الأنام ۔

حاصل یہ کہ حالت خواب میں خداوند عالم کو متقین اولیاء کرام ہی دیکھا کرتے ہیں اور وہ رؤیت بھی بلا کیفیت و جہت ہوا کرتی ہے ۔ ان کے سوا اگر کوئی گنہگار غیر متشرع اس رؤیت کا دعویٰ کرے تو محض لغو و جھوٹ ہے ۔ اور اگر کوئی شخص خواب میں کسی انسان کو دیکھے اور معلوم ہو کہ یہ خداوند عالم ہے تو فی الحقیقت یہ رؤیت الٰہی نہیں ہے بلکہ یہ اور خوابوں کی طرح گذشتہ یا آئندہ واقعات کے متعلق خداوند عالم کی جانب سے آئی ہوئی کوئی خبر ہے ۔ ایسے خواب دیکھنے والے کو چاہئے کہ علمائے تعبیر سے اس کی تعبیر دریافت کرے ۔ فتح العلی المالک کے صفحہ ۳۰ میں ہے ؛ ھذا ان ادعاہ من ھو من اھلھا کولیّ یوثق بہ و یکون ذلک مخصّصاً للعمومات مثل قولہ تعالیٰ " لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ " و اذا قبل خبر الولی فی الکرامۃ الخارقۃ للعادۃ المخصصۃ للعمومات القطعیۃ فأولی فی تخصیص العموم الظنی و اما ان ادعاہ من لیس من اھلھا کالعاصی و المقصر فانہ یکذب ۔ ھذا کلہ اذا رءاہ تعالیٰ علیٰ ما یلیق بجلالہ و کمالہ کما یریٰ فی الآخرۃ و اما رؤیتہ تعالیٰ علیٰ ما یستحیل علیہ تعالیٰ کرؤیتہ علیٰ صورۃ رجل یتقاضی من الرائی امراً او یأمرہ بأمر او ینھاہ عن شر و یقول " اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِی " فھو ایضا جائز و تکون رؤیا تأویل فتدل علی ما کان و سیکون کثیرھا من الرؤیات فیسأل عن تعبیرھا و یجب ان یعلم الرائی ان مرئیہ امر وارد من اللّٰہ تعالیٰ و خلق من خلقہ علیٰ امر من الأمور ۔ و اِطلاق اسم اللّٰہ علیٰ مرئیہ مجاز کاطلاقہ فی حدیث " یَنزِلُ ربُّنا الیٰ السماء الدنیا " علی ملک حامل امرہ او رحمتہ تعالیٰ ۔ انتھیٰ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک ہندو کسی خوشی یا غمی کے کام میں مسلمانوں کے ہاتھوں کھانا پکواکر مسلمانوں کی دعوت کرتا ہے ۔ کیا اس کی دعوت کا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

مشرکین کے پاس کی ضیافت میں جانا اور ان کے پاس کھانا کھانا درست ہے۔ البتہ ان کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ عالمگیریہ جلد ۲ کتاب الکراھۃ باب رابع عشر میں ہے: لا بأس بطعام المجوس کله الا الذبیحة فان ذبیحتهم حرام۔ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ کتاب النکاح باب نکاح الکافر میں ہے: و المراد بالمجوسی من لا له کتاب سماوی فیشمل الوثنی و الدھری۔ و لا بأس بالذھاب الی ضیافة اھل الذمة ھکذا ذکر محمد رحمه اللہ تعالیٰ۔ پس جبکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے پکواکر کھلایا جاتا ہے تو اس کے کھانے میں کوئی کلام نہیں۔ اگر مشرک کی آمدنی سود یا اشیاء حرام کی تجارت سے ہے تو بر بنائے احتیاط و تقویٰ اس سے اجتناب اولیٰ ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک بزرگ پیر طریقت کی مزار کی آمد و رفت کے راستہ میں حضرت پیرانِ پیر کا جھنڈا واقع ہے۔ راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے جھنڈے کو ہٹاکر اور بازو نصب کرکے زیارت کے لئے آمد و رفت کا راستہ وسیع کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جھنڈا چونکہ منتقل ہونے والی چیز ہے، اس لئے اس کو ہٹاکر بازو نصب کرکے خلائق عامہ سے آمد و رفت کی تکلیف رفع کرنا درست ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ انبیاء و اولیاء سے ان کی حین حیات اور بعد ممات توسل و استغاثہ، یعنی کسی کام کے پورا کرنے میں ان سے مدد طلب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

"عبد القادر شیء للہ" کہنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ ہم نے مشائخین کو ذکر میں لا الٰہ الا اللہ عبد القادر شیئاً للہ کہتے سنا ہے۔ آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب

انبیاء و اولیائے عظام سے ان کی حین حیات و بعد ممات توسل و استعانت و استغاثہ جائز ہے، اور کرامت بعد الموت کا منکر فاسد الاعتقاد بلکہ اس کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ "عبد القادر شیئاً للہ" اگر اس معنیٰ سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہے اور اس کے لئے عبد القادر سے کوئی چیز طلب کی جارہی ہے تو بیشک اس کے کلمۂ کفر ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ مگر اس سے عوام الناس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ

حُسنِ اعتقاد سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ توسل اور استمداد کیا جائے جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ یا عبد القادر اَعطنی شیئاً للّٰہ یعنی اے عبد القادر! اللہ کے لئے مجھے کچھ دیجئے۔ پس اس معنی کے لحاظ سے "عبد القادر شیئاً للّٰہ" کہنا نہ کفر ہے نہ حرام۔

لا الٰہ الا اللّٰہ۔ عبد القادر شیئاً للّٰہ یہ دو جملے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے صحیح معنیٰ پر دلالت کرتا ہے یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ توحید پر اور عبد القادر شیئاً للّٰہ توسل و استغاثہ پر۔ اس لئے یہ کہنا بھی نہ کفر ہے نہ حرام۔ مگر اس ترکیب سے چونکہ یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ "عبد القادر شیئاً للّٰہ" بجائے "محمد رسول اللّٰہ" کے کہا گیا ہے اس لئے ایسے الفاظ منہ سے نکالنے میں احتیاط کرنا بہتر ہے۔

تنبیہ

توسّل میں کمالِ ادب کا لحاظ رہے، اور ہرگز ایسے الفاظ کا استعمال نہ کریں جن سے کفر و شرک کا وہم ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ یا عبد القادر مجھے اولاد دو۔ یا خواجہ مجھے نوکری دو۔ اگرچہ ایسا کہنا کفر نہیں ہے اور نہ حرام ہے کیونکہ ہر ایک مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقۃً کوئی شخص نفع یا ضرر نہیں پہونچا سکتا، اور اسلام کے قرینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دینے کی نسبت جو غیر خدا کی طرف کررہا ہے وہ مجازی ہے اور حقیقۃً ہر شئے کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، تاہم ایسا طلب کرنا آدابِ توحید کے خلاف ہے۔ اور خصوصاً عوام الناس کے لئے ایسے طریقہ سے باز رہنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ توسّل کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے "اے پروردگار بطفیل فلاں بزرگ کے میرا یہ کام پورا کردے"۔ علامہ رملی اپنے فتاویٰ کے صفحہ ۳۸۲ میں اور علامہ شوبری شرح المنہج کے صفحہ ۵۱۶ میں لکھتے ہیں: و یجوز التوسل الی اللّٰہ تعالیٰ و الاستغاثة بالأنبیاء و المرسلین و العلماء و الصالحین فی حیاتهم و بعد مماتهم لأن معجزات الانبیاء و کرامات الأولیاء لا تنقطع بموتهم۔ اما الأنبیاء فلأنهم أحیاء فی قبورهم و یصلون و یحجون کما وردت الأخبار و تکون الإغاثة منهم معجزات لهم۔ و الشهداء أحیاء عند ربهم شُوهِدوا نهارا یقاتلون الکفار۔ و اما الأولیاء فهی کرامة لهم و یقع من الأولیاء بقصد و بغیر قصد فی حیاتهم و بعد مماتهم امور خارقة للعادة یجریها اللّٰہ بسببهم و الدلیل علی جوازها انها امور ممکنة لا یلزم من جوازها و وقوعها محال، و بالجملة ما جاز ان یکون معجزة لنبیٍّ جاز ان یکون کرامة لولیٍّ و لا فارق بینهما إلا التحدی۔ انتهی۔ علاوہ رملی لکھتے ہیں: و کرامات الأولیاء مشاهدة لا ننکرها و الذی نعتقده و ندین به ثبوتها فی حیاتهم و بعد مماتهم و لا تنقطع بموتهم و منکرها یخشیٰ علیه من سوء الخاتمة۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں: و لا ینکر الکرامة بعد الموت الا فاسد الاعتقاد، انتهی۔ امام تقی الدین سبکی شفاء السقام کے صفحہ ۲۰ میں لکھتے ہیں: نحسن التوسل و الاستغاثة بالنبی صلی اللّٰہ علیه و سلم الی ربه و ایضا یجوز التوسل بسائر عباد اللّٰہ الصالحین و القول بالخصوص بالنبی قول بلا دلیل۔ اور مکہ معظمہ کے مفتی شافعیہ علامہ سید احمد زینی

دحلان اپنی کتاب دُرر سنیہ کے صفحہ ۲۳ میں لکھتے ہیں: و السلف و الخلف من اهل المذاهب الاربعة استحبوا للزائر ان يقول تجاه القبر الشريف: يا رسول الله انى جئتك مستغفراً من ذنبى مستشفعاً بك الیٰ ربی۔ اسی صفحہ میں ہے: و ذكر الفقهاء فى آداب السفر ان المسافر اذا انفلتت دابته بارض ليس بها انيس فليقل: يا عباد الله احبسوا۔ و اذا ضل شيئا و اراد عونا فليقل: يا عباد الله اعينونى او اغيثونى، فان لله عباداً لا نراهم۔ رد المحتار کے صفحہ ۳۱۶ جزء ثالث میں ہے: و فى شرح الوهبانية بدرويش درويشان كفر بعضهم و صحح ان لا كفر و هو المحرر كذا قول " شىء لله " قيل بكفره و " يا حاضر و يا ناظر " ليس بكفر (قيل بكفره) لعل وجهه انه طلب شيئا لله تعالىٰ غنى من كل شىء و الكل مفتقر و محتاج اليه و ينبغى ان يرجح عدم التكفير فانه يمكن ان يقول اردت اطلب شيئا اكراما لله تعالىٰ، انتهى۔ علامہ شیخ داود صلح الاخوان کے صفحہ ۹۰ میں لکھتے ہیں: و قال الشيخ خير الدين الرملى الحنفى فى الفتاوىٰ و اما قولهم " يا شيخ عبد القادر " فهو نداء و اذا اضيف اليه " شىء لله " فهو طلب شىء اكراما لله فما الموجب لحرمته؟ اور اسی کتاب میں ہے: و معنىٰ " شىء لله " علىٰ ما سمعت من يقولها من العوام ايها المنادىٰ اعطنى شيئاً لله اى لأجل الله كما يقول السائل لمن يسأله اعطنى درهماً لله اى كرامة لله۔ بغیۃ المسترشدین صفحہ ۲۳۰ باب الرد علی اہل البدع میں ہے: سئل السيد عمر البصرى عن قول الشيخ يا فلان الخ؟ فأجاب: قول العامة يا فلان شىء لله غير عربية لكنها من مولدات اهل العرف و لم يحفظ لأحد من الأئمة نص فى النهى عنها و ليس المراد بها فى اطلاقهم شيئا يستدعى مفسرة الحرام او المكروه لانهم انما يذكرونها استمدادا و تعظيما لمن يحسنون فيه الظن، انتهى۔ اسی صفحہ میں ہے: ينبغى تنبيه العوام علىٰ ألفاظ تصدر منهم تدل على القلاح فى توحيدهم فيجب ارشادهم و اعلامهم بأن لا نافع و لا ضارّ الا الله تعالىٰ لا يملك غيره لنفسه ضرا و لا نفعا الا بارادة الله تعالىٰ، انتهى۔ دُرر سنیہ کے صفحہ ۱۵ میں ہے: ينبغى ان يكون التوسل بالأدب و بالألفاظ التى ليس فيها ايهام كأن يقول المتوسل: اللّٰهم انى أسألك و أتوسل اليك بنبيك محمد صلىٰ الله عليه و سلم و بالأنبياء قبله و بعبادك الصالحين ان تفعل بى كذا و كذا۔ مع ان تلك الألفاظ الموهمة لتأثير غير الله تعالىٰ يمكن حملها على المجاز من غير احتياج الى التكفير للمسلمين و ذلك المجاز مجاز عقلى شائع معروف عند اهل العلم و مستعمل على ألسنة جميع المسلمين وارد فى الكتاب و السُّنة فالمسلم الموحد متىٰ صدر منه إسناد لغير من هو له يجب حمله على المجاز العقلى و الاسلام و التوحيد قرينة على ذلك المجاز كما نص علىٰ ذلك علماء المعانى فى كتبهم و أجمعوا عليه و لا وجه لكونه شركاً و لا لكونه محرّماً۔
و اللہ اعلم بالصواب۔ (صفحہ ۳۶۰ بھی دیکھئے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشرکین ہنود یازدہم شریف کی نیاز اداء کرکے اگر مسلمانوں سے اپنے مکان میں قرآن شریف کا ختم کرنے یا مولود خوانی کے لئے درخواست کریں، تو کیا ان کی ایسی درخواست قابلِ لحاظ و عمل ہے؟

الجواب

قرآن شریف و دیگر اذکار کے لئے یہ شرط ہے کہ نجس مقامات میں نہ پڑھے جائیں، بلکہ پاک و صاف مقام میں جو خوشبو سے معطر کیا گیا ہو، اور پڑھنے والے بھی با وضوء و پاک و صاف لباس پہنے ہوئے ہوں تو درست ہے۔ عالمگیریہ کی جلد ۵ کتاب الکراهة باب رابع میں ہے: و یکره ان یقرأ القرآن في الحمام و موضع النجاسات و لا یقرأ في بیت الخلاء کذا في فتاوي قاضیخان۔ بناء بریں مشرکین ہنود اگر مکان اچھی طرح پاک و صاف اور آراستہ و پیراستہ کردیں اور کسی قسم کی نجاست و قبیح شئے وہاں نہو تو مسلمانوں کے وہاں قرآن و مولود پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس نصرانیوں کو قرآن شریف اور فقہ کی تعلیم دینا جائز ہے، کہ شاید وہ اس سے ہدایت پر آجائیں، اور اپنے مذہب کو ترک کرکے مشرف باسلام ہوجائیں۔ اسی بنیاد پر نصرانی کا نہا دھوکر قرآن کو ہاتھ لگانا بھی امام صاحب کے پاس جائز ہے۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الکراهة باب خامس میں ہے: قال ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ یعلّم النصراني الفقه و القرآن لعله یهتدي و لا یمس المصحف و ان اغتسل ثم مس لا بأس به کذا في الملتقط۔ پس صورت مسئولہ میں مشرکین کی یہ درخواست اگر مسلمان اس نیت سے منظور کریں کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے سننے سے مشرکین کو اسلام کی توفیق و ہدایت دے تو درست ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانۂ مبارک میں اسلام اخلاق کی وجہ سے زیادہ پھیلا؟ یا معجزات اور جہاد کی وجہ سے؟

الجواب

"معجزہ" شریعت میں ایسے خلافِ عادت و غیر معمولی کام کا نام ہے جو انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے ثبوت میں منکرین کو عاجز اور قائل کرنے کے لئے، یا مؤمنین پر فضل و کرم کی خاطر انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتا ہے، اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ شرح مقاصد جلد ثانی صفحہ ۱۳ میں ہے: و المعجزة في العرف امر خارق للعادة مقرون بالتحدي مع عدم المعارضة۔ قرآن شریف اور اِخبار عن الغیب کے سوا

معجزات کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم سے ظہور میں آئے ان میں سے بعض تو " ارہاصیہ " تھے جو آپ کے دعوائے نبوت کے پہلے ظاہر ہوئے ، اور بعض " تصدیقیہ " تھے جو بعد نبوۃ تصدیق کے لئے ظاہر ہوئے ۔ یہ جملہ معجزات تین قسم کے تھے ۔ ایک تو وہ جو آپ کی ذات مبارک میں ثابت تھے ۔ دوسرے وہ جو آپ کی صفات سے متعلق تھے ۔ تیسرے وہ جو ذات و صفات سے خارج تھے ، آپ کے نور کا آپ کے آباء و اجداد میں منتقل ہوتے ہوئے آنا ، اور آپ کا با ختنہ ناف کٹی ہوئی پیدا ہونا ، اور طویل القامت اشخاص کے مقابل آپ کے قد کا طویل ہوجانا اور متوسط القامت اشخاص کے مقابل متوسط ہوجانا ، اور مُہر نبوت کا آپ کی پشتِ مبارک کے اوپری حصہ پر ہونا ، یہ سارے معجزات آپ کی ذات سے متعلق تھے ۔ اور آپ کا صدق ، امانت ، عفت ، شجاعت ، فصاحت ، سماحت ، زہد ، تواضع ، شفقت و صبر وغیرہ مکارم اخلاق میں اعلیٰ درجہ پر ہونا یہ معجزات آپ کی صفات سے متعلق تھے ۔ اور کسریٰ کے ایوان کے کنگروں کا گرنا ، اور ابر کا آپ پر سایہ فگن ہونا ، اور چاند کا انگشت مبارک کے اشارے سے دو ٹکڑے ہوجانا ، اور ستون حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا ، انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا وغیرہ بے شمار و بے حساب معجزات یہ تمام آپ کی ذات و صفات سے خارج تھے ۔ شرح مقاصد جلد ثانی کے صفحہ ۱۲۸ میں ہے : من انواع المعجزات افعال ظهرت منه عليه السلام على خلاف العادة تربى على ألف قد فصلت في دلائل النبوة بعضها ارهاصية ظهرت قبل دعوى النبوة و بعضها تصديقية ظهرت بعدها . و تنقسم الى امور ثابتة في ذاته و امور متعلقة لصفاته و امور خارجة عنهما فالأول كالنور الذي كان يتقلب في آبائه الى ان ولد و كولادته مختونا مسرورا واضعا إحدى يديه على عينيه و الأخرى على سوءته و ما كان من خاتم النبوة بين كتفيه و طول قامته عند الطويل و وساطته عند الوسيط و رؤية من خلفه كما كان يرى من قدامه ، و الثاني كاستجماعه الغاية القصوى من الصدق و الأمانة و العفاف و الشجاعة و الفصاحة و السماحة و الزهد و التواضع لأهل المسكنة و الشفقة على الأمة و المصابرة على متاعب النبوة و المواظبة على مكارم الأخلاق و كبلوغه النهاية في العلوم و المعارف الإلٰهية و تمهيد المصالح الدينية و الدنيوية و ككونه مجاب الدعوة على ما دعا لابن عباس رضي الله تعالى عنهما بقوله " اللّٰهم فقّهه في الدّين " فصار إمام المفسرين و دعا على عتبة بن ابي لهب بقوله " اللّٰهم سلّط عليه كلباً من كلابك " فافترسه الأسد و على مضر بقوله " اللّٰهم اشدد وطأتك على مُضر و اجعل عليهم سنين كسني يوسف " فمنع الله المطر منهم سنين و على من لحقه من الكفار حين خرج من الغار بقوله " يا ارض خذيه " فساخت قوائم فرسه ، و الثالث كخرور الأوثان سُجّداً ليلة ولادته و سقوط شرف قصور الأكاسرة و إظلال السحاب عليه و كانشقاق القمر و انقلاع الشجر و تسليم الحجر و نبوع الماء بين اصابعه الى ان رويت الجنود و دوابهم و شبع الخلق الكثير من طعامه اليسير و حَنين الجذع في مسجد المدينة حين انتقل منه الى المنبر و شكاية النوق عن اصحابها و شهادة الشاة المشوية يوم خيبر بأنها مسمومة و دُرور

الضرع من الشاة اليابسة الجرباء لام معبد حين مسح يده عليها و خطاب الذئب وهبان ابن اوس بقوله أ تعجب من اخذي شاةً! هذا محمد يدعو إلى الحق فلا تجيبونه و تسبيح الحصى و غير ذلك مما لا يعد و لا يحصى۔ تاریخ خمیس کی جلد اول صفحہ ۲۵۱ میں ہے: و من معجزاته إحياء الموتى باذن الله و إسماع الأصم و رد الشمس و قلب الأعيان و الاطلاع على الغيب و ظل الغمام و إبراء الآلام كذا ذكره المغلطائي في السيرة۔ و معجزاته صلى الله عليه و سلم أكثر من ان يحصرها كاتب او يجمعها ديوان كما ذكره اليعمري في السيرة۔ پس جبکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے اخلاق کریمہ بھی منجملہ معجزات کے ایک معجزہ ہیں، اور آپ کے معجزات اس قدر بے گنتی ہیں کہ جس کو نہ کوئی یاد رکھ سکتا ہے اور نہ قلمبند ہوسکتے ہیں۔ اور معجزہ شریعت میں ایسے خلاف عادت کام کا نام ہے جو لوگوں کو قائل کرنے اور نبوت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے، تو محض ایک معجزۂ اخلاق کو باقی تمام معجزات کے مقابل اسلام کے پھیلانے اور شائع کرنے میں کسی طرح فضیلت و ترجیح نہیں ہوسکتی۔

کفار کے ایمان قبول کرنے کے لئے اخلاق نبویہ بمقولۂ آیت کریمہ " اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ " نزول آیت جہاد تک زیادہ برتے گئے۔ اس کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو پھر تلوار سے کام لیا گیا، اور جو نرمی و مروت ضرورت سے زیادہ کفار کے ساتھ برتی جاتی تھی وہ ان کی کج فہمی اور شرارت کے سبب آیت جہاد سے ختم کردی گئی۔ اور جبکہ جہاد کی بدولت آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی عین حیات تمام عرب مشرف باسلام ہوگئے تھے اور آپ کے بعد بھی جہاد ہی بے شمار فتوحات اور شرق سے غرب تک اسلام پھیلانے کا باعث رہا، تو پھر یہ کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ محض اخلاق ازدیاد اسلام کا باعث ہیں ان کے مقابل دیگر معجزات و جہاد اسلام کے شائع کرنے میں زیادہ کارگر نہیں ہوتے!!۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی عین حیات جب تک کہ آیت جہاد کا نزول نہیں ہوا دلائل واضحہ و معجزات سے اگرچہ لوگ مشرف باسلام ہوتے رہے، مگر اکثر ساکنانِ ملکِ عرب کو یہ انتظار تھا کہ آپ کو قبیلۂ قریش پر اگر فتحمندی حاصل ہو اور شہر مکہ آپ کے زیر فرمان ہوجائے تو پھر سب مسلمان ہوجائیں گے۔ چنانچہ جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور جہاد سے حرم کعبہ کے کفار پر آپ کو فتح نصیب ہوئی اور تمام عرب کے کفار فوج در فوج اسلام قبول کرنے لگے، تب چار دانگِ عالم پر یہ ثابت کرادیا گیا کہ خانۂ کعبہ پر سوائے للّٰہی فوج کے کوئی مدعیِ کاذب و دنیا دار حاکم مسلط نہیں ہوسکتا۔ مشکاۃ شریف کی کتاب الصلاۃ باب الامامۃ میں بخاری شریف سے منقول ہے: عن عمرو بن سلمة قال كنا بماء ممر الناس يمر بنا الركبان نسألهم ما للناس و ما لهذا الرجل؟ فيقولون يزعم ان الله أرسله و أوحىٰ اليه كذا۔ فكنتُ أحفظ ذٰلك الكلام فكأنما يغرى في صدري و كانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه و قومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة الفتح بادر كل قوم باسلامهم و بادر ابي قومي باسلامهم۔ تفسیر کبیر میں سورہ اذا جاء نصر اللہ کی تفسیر میں ہے: عن الحسن انه قال لما فتح رسول الله

صلی اللّٰہ علیہ و سلم مکۃ اقبلت العرب بعضها علیٰ بعض فقالوا اذا ظفر باھل الحرم وجب ان یکون علی الحق و قد کان اللّٰہ اجارھم من اصحاب الفیل و کل من ارادھم بسوء ثم اخذوا یدخلون فی الاسلام افواجاً من غیر قتال ۔ پس صورت مسئولہ میں اخلاق کے سواء دیگر معجزات اور جہاد کو اسلام کی اشاعت میں زیادہ دخل ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فقراء و مشائخین کے لئے پائجامہ پہننا درست ہے یا نہیں ؟ اور فقراء کو اس سے احتراز کرنا لازم ہے یا کیا ؟

الجواب

پائجامہ پہننا چونکہ سنت ہے ، اس لئے اس سے پرہیز کرنا یا اس کے پہننے کو مکروہ جاننا سنت سے احتراز کرنا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں ۔ من رغب عن سنتی فلیس منی ۔ یعنی جو کوئی میری سنت سے انکار کرے وہ میری امت سے خارج ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۲ کتاب الکراہۃ فصل تاسع فی اللبس میں ہے : لبس السراویل سنۃ و ھو من استر الثیاب للرجال و النساء کذا فی الغرائب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے ماہ رمضان المبارک میں چار پانچ قرآن شریف ختم کئے اور ان کا ثواب اپنے بزرگوں کے نام جن کی تعداد پچاس ہے بخش دیا ۔ کیا یہ ثواب تقسیم ہوکر ہر ایک کو تھوڑا تھوڑا ملے گا یا ہر شخص کو پورا پورا ثواب ملے گا ؟

اگر کوئی شخص تراویح میں حافظ قرآن کے ساتھ ابتداء سے ختم تک نماز میں شریک رہے اور بعد ختم اس ختم کے سننے کا ثواب اپنے بزرگوں کے نام بخش دے تو درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

انسان ہر ایک عبادت کا ثواب بزرگوں کو ایصال کرسکتا ہے ۔ اور جس طرح مُردوں کو ایصال کرسکتا ہے اسی طرح زندوں کو بھی ایصال کرسکتا ہے ، اور چونکہ خداوند عالم کا فضل اور اس کی رحمت وسیع ہے اس لئے انسان کا بخشا ہوا ثواب ہر ایک کو پورا پورا ملتا ہے اور خود اس کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوتی ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۳۱ میں ہے : صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلاۃ او صوما او صدقۃ او غیرھا کذا فی الھدایۃ بل فی زکاۃ التاتارخانیۃ عن المحیط الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین و المؤمنات لانها تصل الیھم

و لا ینقص من اجرہ شیء ۔ اسی صفحہ میں ہے : و فی البحر من صام او صلی او تصدق و جعل ثوابہ لغیرہ من الأموات و الأحیاء جاز و یصل ثوابہا إلیہم عند اھل السنۃ و الجماعۃ کذا فی البدائع ۔ ثم قال و بھذا علم انہ لا فرق بین ان یکون المجعول لہ میتا او حیا و الظاھر انہ لا فرق بین ان ینوی بہ عند الفعل للغیر او یفعلہ لنفسہ ثم بعد ذلک یجعل ثوابہ لغیرہ لإطلاق کلامھم و انہ لا فرق بین الفرض و النفل ۔ صفحہ ۲۳۲ میں ہے : سئل ابن حجر المکی عما لو قرا لأھل المقبرۃ الفاتحۃ ھل یقسم الثواب بینھم او یصل لکل منھم مثل ثواب ذلک کاملا فأجاب بأنہ افتی جمع بالثانی و ھو اللائق بسعۃ الفضل ۔ الدر المختار بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۳۳ کتاب الحج باب الحج عن الغیر میں ہے : الأصل ان کل من أتیٰ بعبادۃٍ مَا لہٗ جعلُ ثوابِہا لغیرہ و ان نواھا عند الفعل لنفسہ لظاھر الأدلۃ ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ بعبادۃٍ مَا) ای سواء کانت صلاۃ او صوما او صدقۃ او قراءۃ او ذکرا او طوافا او حجا او عمرۃ او غیر ذلک من زیارۃ قبور الأنبیاء علیھم السلام و الشھداء و الأولیاء و الصالحین و تکفین الموتیٰ و جمیع انواع البر کذا فی الھندیۃ ۔ و قدمنا فی الزکاۃ عن التاتارخانیۃ عن المحیط : الأفضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین و المؤمنات لأنھا تصل إلیھم و لا ینقص من اجرہ شیء اھ و فی البحر بحثا ان اطلاقھم شامل للفریضۃ لکن لا یعود الفرض فی ذمتہ لأن عدم الثواب لا یستلزم عدم السقوط عن ذمتہ اھ علیٰ ان الثواب لا ینعدم کما عملت و سنذکر فیما لو اھل بحج عن ابویہ انہ قیل انہ یجزیہ عن حج الفرض و ھذا یؤید ما بحثہ فی البحر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۳۹۹، ۳۶۰، ۳۸۲، ۵۰۲ بھی دیکھئے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف بخطِ عربی ایک کالم میں اور وہی " نظم " پاک بخط مرہٹی دوسرے کالم میں ۔ یا قرآن شریف بخطِ عربی نہ لکھا جاکر صرف مرہٹی خط میں لکھا جائے اور اس کے محاذی ترجمہ بزبان مرہٹی ، اور اس کے ذیل میں تفسیر وغیرہ طبع ہوکر ان مسلمانوں کے لئے جو زبان اردو نہیں جانتے اور غیر مسلم مرہٹی قوم برھمن وغیرہ اقوام ہنود کی ہدایت کے لئے بغرضِ اشاعتِ اسلام شائع کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

قرآن شریف کو بہتر اور واضح خط میں عمدہ اور سفید کاغذ پر جلی قلم اور چمکدار سیاہی سے کشادہ سطروں میں شاندار حروف سے لکھنے کا حکم ہے ۔ اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ غیر قرآن کوئی چیز " نظم قرآن " کے سوا قرآن میں ملا کر نہ لکھی جائے ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الکراھۃ باب خامس میں ہے : و ینبغی لمن اراد کتابۃ القرآن ان یکتبہ بأحسن خطٍ و أبینہ علیٰ أحسن ورقۃٍ و أبیض قرطاسٍ بأفخم قلمٍ و

ابرق مدادٍ یفرج السطور و یفخّم الحروف و یضخّم المصحف و یجرّده عما سواه من التعاشیر و ذکر الآیِ و علامات الوقف صوناً لنظم الکلمات کما ھو مصحف الإمام عثمٰن ابن عفان امیر المؤمنین رضی اللّٰہ عنہ کذا فی القنیۃ ۔ اسی صفحہ میں ہے : عن الحسن عن ابی حنیفۃ رحمہ اللّٰہ تعالی انہ یکرہ ان یصغّر المصحف و ان یکتب بقلمٍ دقیقٍ و ھو قول ابی یوسف رحمہ اللّٰہ ۔ قال الحسن و بہ نأخذ ۔

قرآن شریف کی عظمت شریعت میں چونکہ اس درجہ رکھی گئی ہے ، اور اس کی کتابت میں امورِ مندرجۂ بالا قابل لحاظ سمجھے گئے ہیں ، اس لئے تا حال قرآن شریف عربی حروف کے سوا غیر عربی میں نہیں لکھا گیا اور نہ سلف صالحین میں سے کسی نے اس پر جرأت کی ۔ اگرچہ بین السطور اردو ترجمہ بغرض تفہیم شائع کیا گیا ، مگر چونکہ اردو عموماً عربی و فارسی سے ماخوذ ہے جس میں عربی تو قرآنی زبان ہے اور فارسی بھی بفحوائے لسان اھل الجنۃ العربیۃ و الفارسیۃ الدریۃ اسلامی زبان تسلیم کی گئی ہے اس لئے اردو ترجمہ کے قرآن کے ساتھ طبع ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ اس کے سوا کسی اور غیر اسلامی زبان کے الفاظ کی صورت میں " نظم قرآن " کا لکھا جانا اور طبع ہونا یا اس کے ساتھ غیر زبان کا ترجمہ شائع ہونا قرآن شریف کے انکسارِ شان کا باعث ہے ۔ قطع نظر اس کے مرہٹی زبان میں (ح ہ) (ذ ض ز ظ) (ص س ث) (خ ق ک) (پ ف) (ج ز) ان بین التوسین حروف کے مخارج میں کوئی فرق و تمیز نہیں ۔ پس جب قرآن پاک اس زبان کے حروف و صورت میں لکھا جائے گا تو ضرور بہ وقت قراءۃ ہر ایک لفظ کا مخرج دوسرے سے متبدّل ہوگا اور کتابت میں بھی کوئی فرق نہیں رہے گا جس سے " نظم قرآن " میں ضرور تبدّل و تغیّر پیدا ہوگا اور بعض تلفظ موجبِ کفر ہوگا ، خاص کر مرہٹی دان مسلمانوں کے ذہنوں میں ان تبدیل حروف کا حروف قرآنی رائج ہوجانا باعثِ سوءِ اعتقاد ہے ۔

اور جبکہ " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم " کے تحت ہر ایک مؤمن ناخواندہ پر قرآن پاک اور اس کے علوم سیکھنا فرض کیا گیا ہے تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ صرف ان کی سہولت کے لئے قرآن خود ان کی زبان کی صورت میں طبع کرایا جائے اور وہ قرآن منزّل بزبانِ عربی کے اصلی نقوش و اَشکال (جو سلف سے خلف تک بدون تغیّر و تبدّل چلے آرہے ہیں) سیکھنے کی طرف مائل نہ کئے جائیں ؟! خصوصاً عربی سے نا واقف اشخاص جبکہ کلام پاک کے معنیٰ نہیں جانتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں تو ان کے لئے کلام پاک کو بشکلِ مرہٹی لکھنا بھی بیکار ہے ۔ اور جب عربی سیکھ لیں تو پھر عربی اَشکال سے کون سی شکل اس کے لئے بہتر و مفضّل ہوسکتی ہے ! اور اِس زمانہ میں جبکہ کثرت طبع کے سبب سے قرآن پاک کے اوراق مسلمانوں کے ہاتھوں سے گرے کوڑے میں پڑجاتے ہیں جن کے دیکھتے دل کانپ جاتا ہے تو بھلا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ مرہٹی اشکال میں لکھے ہوئے کلام پاک کے اوراق کی تعظیم غیر مرہٹی دان مسلمانوں کے ہاتھ میں باقی رہے گی ؟ ! ۔ اور جب موجودہ رفتار زمانہ نے خود مسلمانوں کو اس درجہ تعظیم و تکریم سے بے پروا کردیا ہے ، تو غیر مسلم اقوام

سے کلامِ الٰہی کی تعظیم کی کس طرح امید رکھی جاسکتی ہے ۔ بلکہ اس میں تو دشمنانِ اسلام کو توہین کا قوی ذریعہ ہاتھ آئے گا ۔ قال اللّٰہ تعالیٰ " وَ لَا تَتَّخِذُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا " ۔

نظر بریں وجوہ ، قرآن پاک کے الفاظ کا مرہٹی یا کسی اور غیر عربی شکل میں لکھا جانا ، یا عربی میں لکھا جاکر مرہٹی وغیرہ میں ترجمہ کی اس کے ساتھ آمیزش کرنا نا درست و نا مناسب ہے ۔ البتہ محض ترجمہ بدون کلام پاک شائع کیا جائے اور کلام پاک کی ہر ایک آیت کا ترجمہ بدون الفاظ قرآنی کے ابتداء صفحہ میں جلی قلم سے بجائے کلام پاک کے مرہٹی وغیرہ زبانوں میں لکھا جائے اور اس کے تحت اس کی تفسیر ان زبانوں میں کی جائے تو مناسب ہے ۔ ہدایت و اشاعت جبکہ بحوائے اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحراً زبان سے نہایت مفید و مؤثر طریقہ سے ہوسکتی ہے تو " امر بالمعروف و نہی عن المنکر " کے لئے زبانی وعظ و نصیحت اس اشاعتِ تحریری سے بہتر ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۴۴۴ اور ۴۸۴ بھی ملاحظہ ہو)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو حضرات طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کرتے ہیں اُن کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کہ خلیفۂ اوّل ہیں ویسے ہی ان کی فضیلت بھی دیگر تمام صحابہ بشمول خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر ثابت ہے ۔ جو حضرات کہ طریقۂ قادریہ یا چشتیہ میں بیعت رکھتے ہیں اُن کا بیان ہے کہ ہر چہار صحابہ کبار رضی اللہ عنہم فضیلت میں برابر ہیں ، اصحاب اربعہ میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ، کیونکہ ہر چہار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثل آفتاب کے ہیں ، البتہ خلافت علی الترتیب ہے ۔ لہذا استدعاء ہے کہ احادیث و روایات سے کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت بسبب خلیفۂ اوّل ہونے کے ہر سہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر ثابت ہے ؟ یا چاروں صحابہ خلفائے راشدین فضیلت میں برابر ہیں ؟

الجواب

اہلِ سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ، آپ کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ ، اُن کے بعد حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ ، اُن کے بعد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۔ یہی عقیدہ ہمارے تمام اسلاف کا چلا آرہا ہے ۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ عالم اور عقائد اسلامیہ سے واقف تھے ان کا اس طرح کا عقیدہ رکھنا ہرگز بلا دلیل نہیں ہوسکتا ۔ علامہ تفتازانی کی شرح عقائدِ امام نسفی مطبوعۂ یوسفی کے صفحہ ۱۰۰ میں ہے : (و افضل البشر بعد نبینا ابو بکر الصدیق) الذی صدّق النبیّ علیه السلام فی النبوة من غیر تلعثم و فی المعراج بلا تردد (ثم عمر الفاروق) الذی فرّق بین الحق و الباطل فی القضایا و الخصومات (ثم عثمان ذو النورین) لأن النبی علیه السلام زوّجه رقیّةَ و لما ماتت

رقیة زوّجه اُم کلثوم و لما ماتت قال لو کانت عندي ثالثة لزوّجتکها (ثم عَلِیٌ المرتضیٰ) من عباد اللّٰه و خلص اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم ۔ علیٰ هذا وجدنا السلف و الظاهر انه لو لم یکن لهم دلیل علی ذٰلک لما حکموا بذٰلک ۔ پس از روئے فتویٰ تمام اہل سنت و جماعت پر سلف کے عقیدہ کی طرح اپنا عقیدہ رکھنا لازم ہے ۔

حضرات قادریہ و چشتیہ کا فضیلت میں سب کو برابر سمجھنا یہ محض سائل کا بیان ہے ۔ اس دعویٰ کو کسی معتبر حوالہ اور دلیل سے ثابت کرنا مدعی کے ذمہ ہے ۔ البتہ بعض حضرات صوفیہ کرام کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے امام الاولیاء ہونے کی وجہ سے ایک خاص محبت ہوتی ہے ، چونکہ اہلِ طریقت کو اکثر اُن کے ذوق و کشفِ خاص سے ایسی بات حاصل ہوتی ہے ، اس لئے عام مسلمانوں کے لئے جو ان کے ہم مشرب نہیں ہیں جب تک کہ ان لوگوں کو ایسا ذوق و کشف حاصل نہو ، ہر بات میں اُن بزرگواروں کی برابری کرنا بہتر نہیں ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ داڑھی مونڈھنا اور کترنا جائز ہے یا نا جائز ؟ اور کس قدر داڑھی رکھنا سنت ہے ؟

الجواب

داڑھی کل مونڈھنا ہندوستان کے یہودی اور عجم کے مجوسیوں کا فعل ہے ، شرعاً یہ فعل اصلاً نا جائز ہے ۔ اور داڑھی کترنا بعض اہل مغرب اور مخنثوں کا فعل ہے ، شرعاً یہ بھی قطعاً نا جائز ہے ۔ در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ میں ہے : و اما الأخذ منها و هي دون القبضة کما یفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال فلم یبحه احد و اخذ کلها فعل یهود الهند و مجوس الأعاجم ۔ فتح ۔ ایک مٹھی داڑھی رکھنا سنت ہے ، ایک مٹھی سے زیادہ ہونے کی صورت میں کترنا شرعاً جائز ہے ۔ در مختار میں اسی صفحہ میں ہے : تطویل اللحیة اذا کانت بقدر المسنون و هو القبضة ۔ اسی صفحہ میں رد المحتار میں ہے : لا بأس بأن یقبض علیٰ لحیته فاذا زاد علیٰ القبضة شيء جزا کما في المنیة ، و هو سنة کما في المنتقیٰ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جس جگہ مرض طاعون پھیلا ہوا ہو ، وہاں سے مسلمانوں کو تبدیلِ مقام کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ اگر نا جائز ہے تو نقلِ مقام کرنے والا مرتکبِ کبیرہ ہے یا اس کے ذمہ کفر عائد ہوتا ہے ؟ اور اس کی امامت درست ہے یا نہیں ؟

خلیفۂ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ملکِ شام میں جب فوجِ اسلام میں مرضِ طاعون پھیلا تھا تو آپ نے فوج کو وہاں سے منتقل ہونے کا حکم دیا تھا یا نہیں؟ اگر اس زمانہ میں جہاں کہیں مرض طاعون شائع ہو وہاں سے نقل مقام کرنا بموجبِ حکم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

طاعون کے زمانے میں کسی ضرورت کے لئے طاعون زدہ مقام سے باہر جانے کے جواز پر تمام اہل مذاہب کا اتفاق ہے۔ نووی شرح صحیح مسلم جلد ثانی صفحہ ۲۲۹ باب الطیرۃ و الطاعون میں ہے: و اتفقوا علی جواز الخروج بشغل و غرض غیر الفرار۔ اور فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۹ میں ہے: و من خرج لحاجۃ متمحضۃ لا لقصد الفرار اصلا و یتصور ذلک فیمن تھیأ للرحیل من بلد کان بھا الی بلد اقامتہ مثلا و لم یکن الطاعون وقع فاتفق وقوعہ فی اثناء تجھیزہ فھذا لم یقصد الفرار اصلا فلا یدخل فی النھی۔ اگر کوئی طاعون زدہ مقام سے بغرضِ تبدیلِ آب و ہوا یہ خیال کرکے نکلے کہ اس مقام سے نکل جانا بھی اس مرض کی ایک دواء ہے تو یہ جائز ہے۔ عینی شرح بخاری جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۷ باب الطاعون میں اور شمس التواریخ مؤلفہ محمد سعادت اللہ کی جلد خلافت عمر میں ہے کہ ربیع الآخر ۱۸ھ میں جبکہ ملک شام کے ایک قریہ عمواس میں طاعون پھیل گیا تھا اور تین ہزار مسلمان اس میں فوت ہوگئے تھے، اس کے انتظام کے لئے خود خلیفۂ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہورہے تھے، راستہ میں لشکروں کے افسر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے ملاقات ہوئی، ان حضرات نے مرض کی شدت بیان کی، تب امیر المؤمنین نے حسبِ مشورۂ صحابۂ کبار و حدیثِ صحیح اذا سمعتم بہ بأرض فلا تقدموا علیہ مقام سرغ سے واپس ہوئے، اور مدینۂ منورہ پہونچنے کے بعد آپ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو کہ لشکر کے ساتھ مقام طاعون ہی میں تشریف رکھتے تھے یہ تحریر فرمایا کہ: لشکر کو بغرضِ تبدیلِ آب و ہوا طاعون زدہ مقام سے نکال کر دوسری جگہ رکھیں! حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح عمل کیا اور بفضلِ خدا مقام بدلنے سے طاعون دفع ہوگیا۔ فتح الباری کی جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۹ میں بھی ایسا ہی ہے: و من اجاز نظر الیٰ انہ مستثنی من عموم الخروج فراراً لأنہ لم یتمحض للفرار و انما ھو لقصد التداوی و علی ذلک یحمل ما وقع فی اثر ابی موسیٰ المذکور ان عمر کتب إلیٰ ابی عبیدۃ ان لی إلیک حاجۃ فلا تضع کتابی من یدک حتی تقبل إلیَّ فکتب الیہ انی قد عرفت حاجتک و انی فی جند من المسلمین لا اجد بنفسی رغبۃ عنھم فکتب الیہ اما بعد فانک نزلتَ بالمسلمین ارضا غمیقۃ فارفعھم الی ارض نزھۃ فدعا ابو عبیدۃ ابا موسیٰ فقال اخرج فارتد للمسلمین منزلا حتی انتقل بھم فذکر القصۃ فی اشتغال ابی موسیٰ بأھلہ و وقوع الطاعون لأبی عبیدۃ لما وضع رجلہ فی الرکاب متوجھا و انہ نزل بالناس فی مکان آخر فارتفع الطاعون۔ و قولہ غمیقۃ بغین معجمۃ و قاف بوزن عظیمۃ ای قرینۃ من المیاہ و النزور و ذلک مما یفسد غالباً بہ الھواء لفساد المیاہ، و

النزهة الفسحة البعيدة عن الرخم. فهذا يدل على ان عمر رأى ان النهى عن الخروج انما هو لمن قصد الفرار متمحضا و لعله كانت له حاجة بأبى عبيدة فى نفس الأمر فلذلك استدعاه و ظن ابو عبيدة انه انما طلبه ليسلم من وقوع الطاعون به فاعتذر عن اجابته لذلك و قد كان امر عمر لأبى عبيدة بذلك بعد سماعهما للحديث المذكور من عبد الرحمن بن عوف فتأوّل عمر فيه ما تأوّل و استمر ابو عبيدة على الأخذ بظاهره. و ايّد الطحاوى صنع عمر بقصة العرنيين فان خروجهم من المدينة كان للعلاج لا للفرار و هو واضح من قصتهم۔

اور عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے بھی اس موقعہ پر جبکہ آپ حضرت ابو عبیدہ و معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہما کے اس مرض سے شہید ہونے کے بعد امیر لشکر ہوئے، اس مرض سے بغرض تبدیلی آب و ہوا و علاج پہاڑوں کی چوٹیوں اور جنگل کی طرف بھاگ کر نکل جانے کا لشکر کو حکم دیا تھا۔ چنانچہ شمس التواریخ مؤلفہ مولانا محمد سعادت اللہ مطبوعہ مطبع منبع النور آگرہ حصہ خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے صفحہ ۳۲۸ میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ اور امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم جلد ثانی مطبوعہ انصاری کے صفحہ ۲۲۸ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: و قال عمرو بن العاص: فروا عن هذا الرجز فى الشعاب و الأودية و رؤوس الجبال۔ اور اس قسم کی اجازت اکابر دین کی ایک جماعت سے بھی ثابت ہے جن میں ابو موسیٰ اشعری و مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ، اور تابعین میں سے اسود بن ہلال و مسروق رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے کاملین شریک ہیں۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری مطبوعہ مصر کی جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۸ میں ہے: و نقل عیاض و غیرہ جواز الخروج من الأرض التى يقع فيها الطاعون عن جماعة من الصحابة منهم ابو موسى الأشعرى و المُغيرة بن شعبة و من التابعين منهم الأسوَد بن هلال و مسروق رحمهما الله تعالى۔

موسم وباء و طاعون میں تبدیلیِ آب و ہواء کے ذریعہ اس مرض کی دواء کرنے کے لئے طاعون و وبا زدہ مقام سے دور ہوجانے کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۹ میں ابو داود سے بروایت فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ یہ حدیث نقل کی ہے، لکھتے ہیں: و يدخل فيه ما اخرجه ابو داود من حديث فروة بن مسيك بمهملة و كاف مصغر قال قلت يا رسول الله ان عندنا ارضا يقال لها "ابين" هى ارض ريفنا و ميرتنا و هى وَبِئَة؟ فقال: دعها عنك فان من القرف التلف۔ قال ابن قتيبة القرف القرب من الوباء۔ و قال الخطابى ليس فى هذا اثبات العدوى و انما هو من باب التداوى فان استصلاح الأهوية من اَنفع الأشياء فى تصحيح البدن و بالعكس۔ یعنی فروہ بن مسیک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ ہمارے کھیتوں اور غلہ اندازی کی ایک زراعتی زمین ہے جس کو ابین کہتے ہیں، وہاں وباء آگئی ہے اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا کہ اس علاقہ سے ہٹ جاؤ کیونکہ اس کی نزدیکی سے ہلاکی ہے۔ خطابی کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک علاجی تدبیر ہے کیونکہ تبدیلی ہواء بدن کی صحت کے لئے نہایت نافع ہے۔ اسی طرح وباء زدہ علاقہ میں جانا بدن کے لئے مضر ہے۔

طاعون زدہ مقام سے یہ خیال کرکے بھاگ جانا کہ اگر ہم یہاں رہیں گے تو ضرور مر جائیں گے اور اگر بھاگ جائیں گے تو موت سے بچیں گے، یعنی یہاں رہنے سے موت ضرور آتی ہے اور بھاگنے سے نہیں آتی، اور جو لوگ بھاگ گئے ہیں وہ موت سے بچ گئے اور جو باقی ہیں وہ نہ جانے سے مررہے ہیں، اس قسم کے ارادے و نیت سے بھاگنا شرعاً ممنوع ہے۔ اور یہ عقیدہ بالکل خلاف شریعت ہے کیونکہ بحوائے آیت کریمہ " اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ " اور آیت کریمہ " اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ " اھ " وَ لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا " موت انسان کو سخت مستحکم برجوں میں بھی نہیں چھوڑتی اور آیا وقت ٹلتا نہیں، پھر اس شخص کو اس طرح اپنے کو بچانا بالکل بےسود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں بھی طاعون سے بھاگ جانے کی ممانعت کی گئی اور بھاگنے والا گناہ میں جہاد سے بھاگنے والے کے برابر ٹھہرایا گیا۔ یعنی جہاد سے بھاگنے والا جس طرح موت کے ڈر سے بھاگتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں جنگ میں شریک رہوں گا تو ضرور مارا جاؤں گا اور بھاگ جانے سے ضرور میری نجات ہے، اور اس کا یہ اعتقاد موت کے متعلق ہر دو آیت کریمہ کے بالکل خلاف ہے، اسی طرح اس کا بھی حال ہے۔

بخاری شریف کے باب الطاعون میں عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال اذا سمعتم بہ بارض فلا تقدموا علیہ و اذا وقع بارض و انتم بھا فلا تخرجوا فرارا منہ۔ اور جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: الفارُّ من الطاعون کالفارّ من الزحف و الصابر فیہ کالصابر فی الزحف۔ اور یہی مذکورہ بد اعتقادی ان احادیث صحیحہ میں بھاگنے کی ممانعت کا سبب بتلائی گئی ہے، چنانچہ فتح الباری کی جلد ۱۰ کے صفحہ ۱۵۸ میں ہے: و نھی من وقع و ھو بھا ان یخرج من الأرض التی نزل بھا لِئَلَّا یسلم فیقول مثلاً لو اقمت فی تلک الأرض اصابنی ما اصاب اھلھا و لعلہ لو کان اقام بھا ما اصابہ من ذلک شیء اھ و یؤیدہ ما أخرجہ الھیثم بن کلیب و الطحاوی و البیھقی بسند حسن عن ابی موسیٰ انہ قال ان ھذا الطاعون قد وقع فمن اراد ان یتنزہ عنہ فلیفعل و احذروا ثنتین ان یقول قائل خرج خارج فسلم و جلس جالس فأصیب فلو کنت خرجتُ لسلمتُ کما سلم فلان او لو کنتُ جلست أُصیبت کما أُصیب فلان۔ لکن ابو موسیٰ حمل النھی علی من قصد الفرار محضا و لا شک ان الصور ثلاث من خرج لقصد الفرار محضا فھذا یتناولہ النھی لا محالۃ۔ بلکہ بعض علماء نے اسی بد اعتقادی کے اندیشہ سے بہ بنائے ظاہر احادیث بھاگنے کو حرام لکھا ہے۔ چنانچہ فتح الباری میں اسی جگہ ہے: و خالفھم جماعۃ فقالوا یحرم الخروج منھا بظاھر النھی الثابت فی الأحادیث الماضیۃ و ھذا ھو الراجح عند الشافعیۃ۔ اور ایسے لوگوں کو ایام سابقہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا بھی دی گئی ہے جیسا کہ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۱۹۹ میں آیت کریمہ " اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا " کی تفسیر میں ہے: قولہ تعالیٰ " اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ

وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ" ۔ اعلم ان الآيات في عدم الفرار من الموت كثيرة و هذا اوّلها و قصتها على ما في الحسيني على رواية انه لما نشأت الوباء في قرية وَان قيل وَاسط خرج بعضهم من حواليهم و سلموا جميعا و استقر بعضهم في بيوتهم فهلكوا فتيقنوا ان الخروج عن الوباء سبب النجاة فمضى عليه الزمان ثم و ثم إلىٰ ان نشأت الوباء مرةً أخرىٰ فخرجوا من ديارهم جميعاً و هم أُلُوفٌ كثيرة ثمانية آلاف او اربعون او سبعون ألف رجل و انما خرجوا جميعاً حذرا عن الموت و خشية فقال لهم الله موتوا او قال لهم مَلَكان مَلَكٌ من أعلىٰ الوادي و ملَكٌ ما اسفلها فماتوا جميعا الخ ۔ یعنی بنی اسرائیل کے زمانہ میں جب قریہ وان یا واسط میں وباء آئی تھی جب وہاں کے بعض لوگ گھر چھوڑ کر چلدئے اور بچ بھی گئے اور بعض گھروں میں بھی رہے اور مرگئے ۔ پس اس واقعہ سے ان لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ بھاگ جانے سے انسان موت سے بچتا ہے اور رہنے سے نہیں بچتا ۔ چنانچہ جب ایک زمانہ کے بعد وہاں دوبارہ وباء نازل ہوئی جب وہ سب کے سب جن کی تعداد علی اختلاف روایات ستر ہزار تھی گھر چھوڑکر بھاگ گئے اور یہ خیال کرلیا کہ اب ہم موت سے بچ گئے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نا شائستہ عقیدہ کی یہ سزاء دی کہ بحکم خداوندی وہ سب کے سب یک لخت مرگئے ۔ اس کے ایک عرصہ کے بعد جب حزقیل بن بوذیا علیہ السلام کا وہاں سے گذر ہوا جب آپ نے دعاء فرمائی اور وہ زندہ ہوگئے ۔ پھر ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ موت سے کوئی بھاگ نہیں سکتا اور ہمارا خیال بالکل غلط تھا ۔ مصنف تفسیر احمدی نے اس کے بعد والے صفحہ میں اس بد عقیدگی کے زیر اثر طاعون زدہ مقام سے بھاگنے اور باہر سے وہاں آنے دونوں کو حرام لکھا ہے ۔ چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے : و المآل من هذه الآية انه قد تقرر اذا وقع في بلد وباء و طاعون حرم الفرار منه و كذا حرم الدخول فيه ۔

پس صورت مسئولہ میں ضرورت مند اشخاص کو اور ان ضعیف القلب مسلمانوں کو جو اس ہنگامہ کی دہشت سے گھبرا کر پریشان و مختلف زدہ ہوجاتے ہیں اور بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کو جو عموماً ضعیفُ القلب ہوتے ہیں طاعون و وباء زدہ مقام سے کسی ضرورت کے تحت منتقل ہونا یا بغرض علاج تبدیل آب و ہواء کی نیت سے نقل مقام کرنا جائز ہے ۔ اور موت سے ڈرکر بھاگنا نا جائز ہے ۔ قوی دل اشخاص کو جو کہ مستقل مزاج ہیں اور ان کو اس ہنگامہ سے کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوتی ، چاہئے کہ ایسے مقام میں رہکر شہادت کا ثواب حاصل کریں ۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ طاعون سے مرنے والا شہید ہے ۔ اسی طرح وہ شخص جو کہ طاعون زدہ مقام میں رہ کر استقلال سے قضاءِ الٰہی پر صبر کرتا ہے اگر زندہ رہے تو بھی اس کو شہادت کا ثواب ملتا ہے ۔ اور اگر وہ کسی دوسری بیماری سے مرے جب بھی اس کو شہادت کا ثواب ملتا ہے ۔

اور یہ مرض مسلمانوں کے رحمت ہے ۔ بخاری شریف کے باب الطاعون میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : قال رسول الله صلى الله عليه و سلم " الطاعون شهادة لكل مسلم " اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے " و من صبر كان له اجر الشهيد " اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت

ہے : انها سألت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم عن الطاعون فأخبرها نبی اللّٰه تعالیٰ انه کان عذابا یبعثه اللّٰه تعالیٰ علیٰ من یشاء فیجعله اللّٰه رحمة للمؤمنین فلیس من عبد یقع الطاعون فیمکث فی بلده صابرا یعلم انه لن یصیبه الا ما کتب اللّٰه له الا کان له مثل اجر الشهید ۔ اور رد المحتار مطبوعہ مصر کی جلد ۱ صفحہ ۶۲۸ باب الشہید میں ہے : (قوله و المطعون) و کذا من مات فی زمن الطاعون بغیره اذا اقام فی بلده صابرا محتسبا فان له اجر الشهید کما فی حدیث البخاری ۔

صورت مسئولہ میں جو مسلمان کہ طاعون زدہ مقام سے نکل گئے ہیں اگر ان کی نیت تبدیل آب و ہواء کی تھی یا اپنی کسی ضرورت کے تحت باہر گئے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ اور اگر موت سے بھاگ کر گئے ہیں تو انہوں نے نا جائز فعل کا ارتکاب کیا ہے بلکہ بعض علماء کے قول پر حرام کے مرتکب ہوئے ، اور مرتکب حرام شرعاً فاسق ہے جس کی امامت مکروہ ہے ، کافر نہیں ہے ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

۱ کیا فرماتے علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مشرکین اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے بلا سود قرض لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

۲ ۔ کیا ایسے مسلمان سے جس کا مال مکتسبہ تمام یا اکثر ناپاک و حرام ہے یا حلال و حرام مختلط ہے ، دوسرے مسلمان کو قرض لینا مباح ہے ؟ اور وہ نا پاک زر قرض کیا مدیون کے پاس آکر پاک و حلال ہوجائے گا ؟ اگر مباح ہے اور پاک ہوجاتا ہے ، تو جب مدیون کی طرف سے جس کا مال مکسوبہ تمام وجہ حلال سے ہے قرض خواہ کو اداء کیا جائے تو کیا یہ زر قرضہ قرض خواہ کے پاس بھی جاکر پاک و حلال رہے گا ؟

الجواب

کسی مسلمان کا اگر ذمی یعنی مشرک یا اہل کتاب پر قرض ہو ، اور وہ ذمی اس قرض کو مال حرام سے مثلاً شراب بیچ کر اس کی قیمت اداء کرے ، تو چونکہ ذمی کے پاس یہ حرام نہیں ہے اس لئے مسلمان کا اپنے قرضہ میں اس رقم کو لینا شرعاً جائز ہے ۔ اور اگر مسلمان کا کسی مسلمان پر قرض ہو اور وہ اس کو مال حرام یعنی شراب کی رقم سے اداء کرے تو چونکہ مسلمانوں کے پاس یہ رقم حرام ہے اس لئے مسلمان کا اس کو قرض میں لینا شرعاً نا جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار مصری جلد ۵ صفحہ ۲۵۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے :

(و جاز اخذ دین علیٰ کافر من ثمن خمر) لصحة بیعه (بخلاف) دین علیٰ (المسلم) لبطلانه الا اذا وکل ذمیا ببیعه فیجوز عنده خلافا لهما ۔ اور رد المحتار میں ہے : (قوله من ثمن خمر) بان باع الکافر خمرا و اخذ ثمنها و قضی به الدین (قوله لصحة بیعه) ای بیع الکافر الخمر لأنها مال متقوم فی حقه فملک الثمن فیحل الأخذ منه بخلاف المسلم لعدم تقومها فی حقه فبقی الثمن علی ملک المشتری ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ مشرکین اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس سود و

شراب وغیرہ کی رقم جائز سمجھی گئی ہے اس لئے مسلمان کو ان سے بلا سود قرض لینا بھی جائز ہے ، اور وہ زرِ قرض مدیون کے پاس آنے کے بعد پاک ہے ۔ مسلمان کے پاس نا جائز طریقہ سے جو رقم آتی ہے چونکہ وہ تا حال اصل مالک کی ملک سے نکل کر شخص قابض کی ملک میں داخل نہیں ہوتی اس لئے شرعاً حرام ہے ۔ اس لئے دوسرے مسلمان کا اس سے ایسی رقم قرض لینا جائز نہیں ۔ اور در صورت لے لینے کے اس کی اداء کی ہوئی رقم اگرچہ وہ کسب حلال سے ہے مگر چونکہ قرض والے کے پاس جانے کے بعد مال حرام کے قائم مقام و بدل بن گئی ہے اس لئے حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اگر زید اپنی زیر تولیت اراضی قبرستان کے منجملہ ایک جزء قطعہ زمین کا بغرضِ سیندھی یا تاڑی فروشی کسی کو دیا ہو تو ایسا معاہدہ کیا صحیح ہوگا ؟ اور زید کا معاہدہ اس کے قائم مقاموں کی پابندی کے لائق خیال کیا جائے گا ؟ اور اس معاہدہ میں احد العاقدین کا اگر نقصان یا صرفہ ہوا ہو تو احد العاقدین ایک دوسرے سے پا سکتے ہیں ؟ اور زمینِ قبرستان جو وقف ہے اس کی نسبت کوئی شخص ایسا معاہدہ کرسکتا ہے ؟

الجواب

اوقاف میں وقف کرنے والے کی غرض کا لحاظ واجب ہے ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۳۶ کتاب الوقف میں ہے : انهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة ۔ لہذا متولی کا قبرستان کے لئے وقف کی ہوئی زمین کو سیندھی یا تاڑی فروشی کے لئے دینا وقف کرنے والے کی غرض کے بالکل خلاف ہے ۔

قبروں پر بول و براز کرنا شریعت میں مکروہ تحریمی یعنی حرام ہے ، اور قبروں پر بیٹھنا اور سونا یا روندنا مکروہ ہے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۶۶ کتاب الجنائز میں ہے : و يكره ان يبنى على القبر او يقعد او ينام عليه او يوطأ او يقضي حاجة الإنسان من بول او غائط ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۲۳ باب الجنائز میں ہے : ما عزاه الإمام الطحاوي الى أئمتنا الثلاثة في حمل النهي على الجلوس لقضاء الحاجة يراد به نهي التحريم ۔ پس صورت مسئولہ میں متولی کا زمین قبرستان کو سیندھی فروشی کے لئے دینا جو زمین قبرستان میں سیندھی جیسی نجس العین شئے کے گرنے اور سیندھ خواروں کے بحالتِ مستی بول و براز کرنے کا باعث ہے اور سراسر بے حرمتی قبرستان و باعث ایذاء ارواح مسلمانان ہے ، جو شرعاً نا جائز ہے ۔ لہذا متولی کا سیندھی فروش سے اس زمین کے اجارہ کے متعلق معاہدہ قابل فسخ ہے ۔ اور اس فسخ سے جو نقصان طرف ثانی کو ہوگا اس کا ضمان متولی سابق (یعنی حرام فروشی پر زمین دینے والے) کی ذاتی جائداد پر ہوگا ۔ قائم مقامان متولیِ سابق کو چاہیئے کہ فی الفور زمین وقف کو سیندھی فروشی سے خالی کروادیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ غلاموں کی بیع و شراء جائز ہے یا نہیں ؟ اگر جائز ہے تو غلاموں سے کیا وہ مراد ہیں جو مسلمانوں کی فتح میں قید ہوکر آتے ہیں، یا ان کی نسل سے ہیں ؟ یا ان کے لئے کوئی خاص قطعہ زمین مقرر ہے جیسے سواحل زنجبار وغیرہ کہ جو شخص وہاں سے گرفتار ہوکر آتے یا خریدا جائے اس کا غلاموں میں شمار ہوگا ۔ ہندوستان و دکن میں کافروں کے بچے جو قحط میں فروخت کئے جاتے ہیں کیا ان کو غلام بنا سکتے ہیں یا نہیں ؟ بینوا توجروا !

الجواب

دار الحرب کے کافر اگر مسلمانوں کے غالب اور فتح یاب ہونے سے پہلے مسلمان ہوجائیں تو وہ مسلمانوں کی طرح حر اور آزاد رہیں گے ۔ ان کے جان و مال اور اولاد و عورتیں سب محفوظ رکھے جائیں گے ۔ اور ان کی زمینوں پر عشر لگایا جائے گا ۔ اور اگر بغیر اسلام قبول کرنے کے بلا جنگ و جدال مسلمانوں کی اطاعت قبول کرکے ذمی بن جائیں تب بھی وہ اور ان کے اہل و عیال حر یعنی آزاد ہوں گے، مگر اُن کی زمینوں پر خراج اور اُن کی جانوں پر جزیہ لگایا جائے گا ۔ اور اگر مسلمانوں کے فتح یاب و غالب ہونے کے بعد اسلام قبول کریں تو امام وقت کو اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ ان کو غلام بناکر ان کے جان و مال کو مجاہدین میں تقسیم کردے ۔ یا احسان کرکے مسلمانوں کی طرح ان کو بھی حقوق عطاء کرے ۔ اگر اسلام نہ قبول کریں تو اس وقت امام مختار ہے کہ ان کو غلام بناکر ان کے جان و مال مجاہدین میں تقسیم کردے یا مردوں کو قتل کرکے انکے اہل و عیال و اموال مجاہدین میں تقسیم کردے ۔ یا ان تمام پر احسان کرکے آزاد رکھے اور محض جانوں کا جزیہ اور زمین کا خراج لیا کرے ۔ عالمگیریہ مصری جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ باب الغنائم میں ہے : قال محمد رحمہ اللّٰہ تعالیٰ و اذا اسلم اھل مدینۃ من مدائن اھل الحرب قبل ظھور المسلمین علیھم کانوا احراراً لا سبیل علیھم و لا علیٰ اولادھم و نسائھم و لا علی اموالھم و یوضع علیٰ اَراضیھم العُشر دون الخراج ۔ و کذٰلک اذا صاروا ذمیا قبل الظھور علیھم اِلا ان ھاھنا علی اَراضیھم الخراج و یوضع علی رؤوسھم الجزیۃ ایضا ۔ و ان ظھر المسلمون علیھم ثم اَسلموا فالاِمام فیھم بالخیار ان شاء قسم رقابھم و اموالھم بین الغانمین و یضع علیٰ الأَراضی العشر و ان شاء منّ علیھم و یسلم لھم رقابھم و ذراریھم و اموالھم و یضع علی اراضیھم العُشر و ان شاء وظف الخراج ۔ و ان ظھر المسلمون علیھم فلم یسلموا فالاِمام بالخیار ان شاء استرقھم و قسمھم و اموالھم بین الغانمین و یضع علی الأَراضی العُشر و ان شاء قتل الرجال و قسم النساء و الأَموال و الذراری بین الغانمین و ان شاء منّ علیھم برقابھم و نسائھم و ذراریھم و اموالھم و وضع علی رؤوسھم الجزیۃ و علیٰ اراضیھم الخراج، کذا فی المحیط ۔ پس جبکہ شریعت میں کافروں کا یا ان کی اولاد کا بر بناء جہاد " عبد " یعنی غلام ہونا ثابت ہے تو سواحل زنجبار کے حبشی اگر کافر ہیں اور جہاد کے ذریعہ سے حسب تفصیلِ مذکور

عبد بنائے گئے ہیں تو ان کی بیع و شراء جائز ہے۔ ورنہ یہ احرار یعنی آزاد ہیں جن کا بیچنا خریدنا حرام ہے۔

ایام قحط یا دیگر ایام میں مشرکین یا مسلمانوں کے بچے جن کو وہ خود یا ان کے ماں باپ یا عزیز و اقارب فاقہ کی تکلیف سے بیچ ڈالتے ہیں یا مفت دیدیتے ہیں، چونکہ یہ ” حر “ یعنی آزاد ہیں اس لئے ان کا بیچنا یا کسی کو دے دینا شرعاً باطل و ناجائز ہے۔ اس بیع و ھبہ سے موہوب لہٗ اور خریدار کی ملک ان پر اصلا ثابت نہیں ہوتی۔ اور ان کے ساتھ بلا نکاح صحبت کرنا زنا ہے، اور اس صحبت سے اولاد اولادِ زنا ہے جس کا نسب زانی سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے وقت میں مالدار اشخاص کو چاہیئے کہ تا اختتام زمانۂ قحط ان کی خبرگیری کرکے جان بچائیں، اور قحط گذرجانے کے بعد ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں کہ حسب سابق وہ اپنی معیشت کی فکر کرلیں، اور اگر بطیب خاطر رہنا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ احرار یعنی آزاد اشخاص کا برتاؤ رکھیں۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ۵ صفحہ ۳۰۲ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے، سئل ما حکم بیع الحرائر اللاتی باعھن احد من اقاربھن او بعن او وھبن انفسھن فی ایام القحط لخوف الموت من الجوع او حصل ذلک فی غیر ایام القحط فھل ھذا البیع صحیح او لا ؟ و ھل وطؤھن بھذا السبب حرام او حلال ؟ و ھل یثبت نسب اولادھن من ھذا الواطئ او ھو زنا لا یثبت معہ النسب ؟ اجاب : حکم بیعھن و ھبتھن للغیر سواء کان البیع او الھبۃ صادرا من غیرھن او منھن انہ باطل فلا یملکن بحال من الأحوال لأنھن لسن بمال اصلا فلا یدخلن فی ملک احد و ان کن رضین بذلک لأن الحریۃ من حقوق اللہ تعالی اذ یتعلق بھا وجوب نحو الحج و الزکاۃ فلا یتمکن الشخص من إسقاطھا و جعل نفسھا مملوکا للغیر لأنہ غیر قابل للمملوکیۃ۔ قال فی تنویر الأبصار و بطل بیع ما لیس بمال کالدم و المیتۃ و الحر و البیع بہ ذکر ذلک فی باب البیع الفاسد و ذکر فیہ ایضا ان الباطل لا یملک بالقبض بخلاف الفاسد اھ۔ و الھبۃ مثل البیع لأنھا تملیک بغیر عوض مشروط فلا تکون الا فیما ھو مال۔ ففی الھندیۃ فی ذکر شروط الھبۃ الراجعۃ الی الموھوب ان یکون مالا متقوما فلا تجوز ھبۃ ما لیس بمال اصلا کالحر و المیتۃ و الدم و صید الحرم و الخنزیر و غیر ذلک و لا ھبۃ ما لیس بمال مطلق کام الولد و المدبر المطلق و المکاتب و لا ھبۃ ما لیس بمال متقوم کالخمر کذا فی البدائع اھ۔ بل اللازم علی من علم حال من اشتھرت بہ المجاعۃ لعدم شیء یجدہ و لا یقدر ایضا علی تحصیلہ ان یحیی مھجتہ بما قدر۔ ففی الھندیۃ من الباب الحادی عشر فی الکراھۃ فی الاکل و ما یتصل بہ قال محمد رحمہ اللہ تعالی فی کتاب الکسب و یفرض علی الناس إطعام المحتاج فی الوقت یعجز عن الخروج و الطلب اھ و حکم وطئھن بعد الھبۃ او البیع المذکور انہ زنا محض لا یثبت معہ نسب الاولاد لانہ لم یوجد فی ملک یمین و لا شبھتہ و لا فی ملک نکاح و لا شبھتہ۔ اما الأول فلما علمت من بطلان البیع و الھبۃ۔ و اما الثانی فلأنہ لم یوجد فیہ ما تتحقق بہ تلک الشبھۃ و ذلک بأن یطأ أمۃ ابنہ مثلا۔ و اما الثالث فلعدم رکنہ من الإیجاب و القبول اللذین ینعقد بھما النکاح لعدم ارادتہ فیما ذکر۔ اما الرابع فلعدم ما تتحقق بہ

تلک الشبهة و ذلک بأن یطأ معتدته مثلا فصار وطؤهن علیٰ هذا الوجه حراما لقوله تعالیٰ: " وَالَّذِیْنَ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلیٰ اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ " الآیة، بل لو کانت المرأة من هاته النساء فراشا لرجل آخر بنکاح یثبت نسب ولدها من زوجها لا من هذا الزانی لما ورد عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم " الولد للفراش و للعاهر الحجر " رواه الجماعة الا ابو داود، و فی لفظ للبخاری :" لصاحب الفراش "۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ از روئے مذہب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ داڑھی مونڈھنا حرام ہے یا جائز ؟

الجواب

از روئے مذہب امام ابوحنیفہ داڑھی مونڈھنا حرام ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۴۹ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے: یحرم علی الرجل قطع لحیته۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ استاد کے حقوق شاگردوں پر از روئے مذہب اسلام کیا ہیں ؟ اور منکرین حقوق استاد کے لئے کیا وعید ہے ؟ بینوا توجروا!

الجواب

شاگرد پر لازم ہے کہ علم کو ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ اور استاد پر اپنے کو حاکم و امیر نہ بنائے اور اس کی اطاعت میں سرِ مو کوتاہی نہ کرے۔ استاد پر ایسا اعتقاد رکھے جیسے جاہل بیمار طبیب حاذق کی نصیحت پر یقین رکھتا ہے۔ استاد کے ساتھ نہایت عجز و انکساری سے پیش آئے۔ اور اس کی خدمت گذاری سے شرف و ثواب حاصل کرتا رہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے چچا زاد بھائی ہونے کے باوجود زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے خچر پر سوار ہونے کے وقت رکاب تھام لی تھی، اور زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے اصرار پر بھی آپ نے رکاب نہیں چھوڑی، اور یہ فرمایا کہ: ہم کو علماء اور بزرگوں کی اسی طرح تعظیم و تکریم کرنے کا حکم دیا گیا ہے! تب حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کی فضیلت کے لحاظ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

علم سیکھنے کے لئے استاد کی جہاں تک ممکن ہو خوشامد و چاپلوسی کرے۔ اور کبھی استاد پر اپنا غرور و تکبر ظاہر نہ کرے۔ مشہور و معروف علماء سے پڑھنے کی خواہش رکھنا اور چھوٹے عالموں سے نہ پڑھنا یہ بھی غرور

و عین حماقت ہے ، کیونکہ علم نیک بختی و نجات کا ذریعہ ہے اور جہالت و گمراہی کے پھاڑ کھانے والے درندہ سے بچانے والا ہے ۔ جو شخص کسی خوف یا خدشہ میں مبتلاء ہوجاتا ہے وہ کسی بڑے بہادر بچانے والے کو نہیں ڈھونڈتا بلکہ وقت پر جو کوئی بھی مل جائے اس سے مدد چاہتا ہے اور اپنا کام نکالتا ہے ۔ اسی طرح طالب علم کو چاہئے کہ جو کوئی بھی اپنے سے کچھ بھی زیادہ معلومات رکھتا ہے ان معلومات کو بے تامل اس سے حاصل کرے اور شاگرد بن جائے ۔ استاد جو کچھ کہتا ہے اس کو نہایت عجز و انکساری کے ساتھ سماع قبول سے یعنی استاد کا احسان مان کر فرحان و شاداں شکریہ اداء کرتے ہوئے توجہ کرے ، اور اپنی رائے کو چھوڑ دے ، ہر بات کو چپ چاپ سنتا جائے اور شور نہ مچائے اور بے ہودہ سؤال نہ کرے ، اور جس سؤال کا استاد جواب نہ دے تو اس کو تنگ نہ کرے ۔ اور جو بات اپنے سمجھنے کی اور اپنے درجہ کی نہیں ہے اگر اس کے بتانے میں استاد عذر کرے تو استاد پر اصرار و جبر نہ کرے ۔ اگر کسی سؤال کا استاد جواب نہ دے سکے تو اس کی تذلیل و توہین نہ کرے ۔ اور استاد کے بھیدوں اور خانگی باتوں کو کسی پر ظاہر نہ کرے اور اس کی برائی کو پوشیدہ رکھے ۔ استاد کے روبرو کسی کی غیبت نہ کرے ۔ اور استاد کی ذلت کے درپے نہ ہو ۔ اگر استاد سے کسی بات میں لغزش اور غلطی ہوجائے تو اس سے درگذر کرے اور اللہ کے واسطے اس کی تعظیم و توقیر کرے ۔ مجلس میں استاد کے آگے بڑھکر نہ بیٹھے ۔ اور جب کبھی استاد کو دینی یا دنیوی کوئی ضرورت لاحق ہو تو سب سے پہلے خود اس کی حاجت پوری کرے ۔ احیاء العلوم مصری مطبوع بر حاشیہ شرح احیاء العلوم جلد ۱ صفحہ ۲۱۱ میں ہے : الوظیفة الثالثة ان لا یتکبر علی العلم و لا یتأمر علی المعلم بل یلقی الیہ زمام امرہ بالکلیة فی کل تفصیل و یذعن لنصیحتہ إذعان المریض الجاهل للطبیب المشفق الحاذق و ینبغی ان یتواضع لمعلمہ و یطلب الثواب و الشرف بخدمتہ ۔ قال الشعبی صلی زید بن ثابت علی جنازة فقربت الیہ بغلتہ لیرکبها فجاء ابن عباس فأخذ برکابہ فقال زید خلّ عنہ یا ابن عم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فقال ابن عباس ھکذا امرنا ان نفعل بالعلماء و الکبراء فقبّل زید بن الثابت یدہ و قال ھکذا امرنا ان نفعل بأھل بیت نبینا صلی اللّٰہ علیہ و سلم ۔ و قال صلی اللّٰہ علیہ و سلم " لیس من إخلاق المؤمن التملق الا فی طلب العلم " فلا ینبغی لطالب العلم ان یتکبر علی المعلم و من تکبرہ علیٰ المعلم ان یستنکف عن الاستفادة الا من المرموقین المشھورین و ھو عین الحماقة فان العلم سبب النجاة و السعادة و من یطلب مھربا من سبع ضار یفترسہ لم یفرق بین ان یرشدہ الی الھرب مشھور او خامل و ضراوة سباع النار بالجھال باللّٰہ تعالی اشد من ضراوة کل سبع فالحکمة ضالة المؤمن یغتنمھا حیث یظفر بھا و یتقلد المنة لمن ساقھا الیہ کائنا من کان فلذلک قیل :

العلم خرب للمفتی المتعالی ☆ کالسیل خرب للمکان العالی

فلا ینال العلم الا بالتواضع و إلقاء السمع ۔ قال اللّٰہ تعالی " إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَی السَّمْعَ وَ ھُوَ شَھِیْدٌ " و معنیٰ کونہ ذا قلب ان یکون قابلا للعلم فھما لا تعنیہ القدرة علیٰ

الفهم حتى يلقى السمع و هو شهيد حاضر القلب ليستقبل كل ما القى اليه بحسن الإصغاء و الضراعة و الشكر و الفرح و قبول المنة ۔ فليكن المتعلم لمعلمه كأرض رمثة نالت مطرا غزيرا فتشربت جميع اجزائها و اذعنت بالكلية لقبوله و مهما اشار عليه المعلم بطريق فى التعلم فليقلده و ليدع رأيه ۔ و بالجملة كل متعلم استبقى رأيا و اختيارا دون اختيار المعلم فاحكم عليه بالإخفاق و الخسران۔ فان قلت: فقد قال الله تعالى " فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ " فالسؤال مأمور به ؟ فاعلم انه كذلك و لكن فيما يأذن المعلم فى السؤال عنه فان السؤال عما لم تبلغ مرتبتك الى فهمه مذموم و لذلك منع الخضر موسى عليهما السلام من السؤال اى دع السؤال قبل أوانه فالمعلم اعلم بما انت اهل له و باوان الكشف و ما لم يدخل اوان الكشف فى كل درجة من مراقى الدرجات لا يدخل اوان السؤال عنه و قد قال على رضى الله عنه ، ان من حق العالم ان لا تكثره عليه بالسؤال و لا تعنته فى الجواب و لا تلح عليه اذا كسل و لا تأخذ ثوبه اذا نهض و لا تفش له سرا و لا تغتابن احدا عنده و لا تطلبن عثرته و ان زل قبلت معذرته و عليك ان توقره و تعظمه لله تعالى و لا تجلس امامه و ان كانت له حاجة سبقت القوم الى خدمته ۔

پس جو اشخاص اس کے خلاف عمل کرتے ہیں وہ دنیا میں ذلیل و خوار اور علم سے محروم رہیں گے ، اور آخرت میں اپنے تکبر اور تعدی و ایذاء رسانی کی سزاء پائیں گے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بزرگانِ دین کی قبروں پر لوگ عرضیاں باندھتے ہیں ، اور اس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ " اگر آپ میری مراد پوری کریں تو میں آپ کی نیاز اداء کروں گا "۔ اور بعض یوں لکھتے ہیں کہ " میری مراد برآنے کے لئے دعاء فرمایئے "۔ یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز ہیں یا نہیں ؟

الجواب

" نذر " شریعت میں عبادتِ مقصودہ کا نام ہے ، جو کسی کام کے حاصل ہونے کے لئے بغرضِ تقربِ الٰہی مانی جاتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۶۸ کتاب الایمان میں ہے : و هو عبادة مقصودة ۔ اور رد المحتار میں ہے : و فى البدائع و من شروطه ان يكون قربة مقصودة ۔ پس حاجت براری کے لئے بزرگان دین کی نذریں و منتیں جو مانی جاتی ہیں اگر نذر ماننے والے کی یہ نیت ہے کہ اس نذر سے بزرگ کا تقرب حاصل کیا جائے ، اور کام نکلنے پر کھانا یا کپڑا یا سونا چاندی وغیرہ حسبِ قرارداد ان کی نذر پیش کی جائے ، اور وہ اس بزرگ کو کام کے نکلنے میں بدون ارادۃ اللہ تعالیٰ مستقل جانتا ہے اس لئے ان کو قابلِ تعظیم جان کر یہ نذر کر رہا ہے ، اور یہ خیال کرتا ہے کہ میں جس چیز کو پیش کروں گا وہ بزرگ کی ملک ہے اور انھیں کے لئے یہ چیز پیش کی جا رہی ہے ، تو ایسی نذر و منت شرع میں بالاجماع حرام و باطل ہے ۔

اور اس کا مرتکب مرتکبِ گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ اس میں مخلوق کے لئے نذر کی گئی ہے حالانکہ نذر تو عبادت ہے جو اللہ کے سوا کسی مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی۔ اور نذر کو جو میّت کی ملک میں داخل کرنا ہے وہ بھی شرعاً ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اعتقاد یہ بھی ہے کہ بزرگ بلا ارادہ و مشیت اللہ تعالیٰ کے خود مستقل طور سے میرا کام نکال سکتے ہیں، اور ایسا اعتقاد شریعت میں کفر ہے۔ پس ایسی نذر کی ادائی اس کے ذمہ لازم نہیں ہے، اور اس کا کسی کو کھلانا اور دینا بھی درست نہیں۔

اور اگر نذر اس طریقہ سے کی جائے کہ "یا اللہ میں تیرے لئے یہ نذر کرتا ہوں کہ اگر میرا کام نکل آئے تو میں فلاں بزرگ کی درگاہ کے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا، یا کپڑے پہناؤں گا، یا سونا چاندی تقسیم کروں گا، یا درگاہ کی مسجد کے لئے بوریا وغیرہ بنوا دوں گا" تو چونکہ اس میں نذر خالص اللہ کے لئے ہوتی ہے اور اس بزرگ کی درگاہ کے فقراء اور مسجد کا کام نکلتا ہے اس لئے یہ شرعاً جائز ہے، اور ایسی نذر کے پیسے وغیرہ فقیروں ہی کو دینا چاہئے۔ مالداروں کا اس کو لینا درست نہیں۔ اور درگاہ کے خادم اگر مالدار ہیں تو ان کے لئے بھی یہ نذر درست نہیں، اگر فقیر ہیں تو لے سکتے ہیں۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۱۸۱ کتاب الصوم میں ہے: و اعلم ان النذر الذی یقع للأموات من اکثر العوام و ما یؤخذ من الدراہم و الشمع و الزیت و نحوہا الی ضرائح الأولیاء الکرام تقرباً الیہم فہو بالإجماع باطل و حرام ما لم یقصدوا صرفہا لفقراء الأنام و قد ابتلی الناس بذلک و لا سیما فی ہذہ الأعصار۔ رد المحتار میں ہے: (قولہ تقربا الیہم) کان یقول "یا سیدی فلان ان رد غائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذہب او الفضۃ او من الطعام او الشمع او الزیت" کذا بحر۔ (قولہ باطل و حرام) لوجوہ منہا انہ نذر لمخلوق و النذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ و العبادۃ لا تکون لمخلوق۔ و منہا ان المنذور لہ میت و المیت لا یملک۔ و منہا انہ ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالی و اعتقادہ ذلک کفر۔ اللہم الا ان قال "یا اللہ انی نذرت لک ان شفیتَ مریضی او رددتَ غائبی او قضیتَ حاجتی ان اُطعم الفقراء الذین بباب السیدۃ نفیسۃ او الإمام الشافعی او الإمام اللیث او اشتری حصیرا لمساجدہم او زیتا لوقودہا او دراہم لمن یقوم بشعائرہا" الی غیر ذلک مما یکون فیہ نفع للفقراء و النذر للہ عز و جل۔ و ذکر الشیخ انما ہو محل لصرف النذر لمستحقیہ القاطنین برباطہ او مسجدہ فیجوز بہذا الاعتبار۔ و لا یجوز ان یصرف ذلک لغنی و لا لشریف منصب او ذی نسب او علم ما لم یکن فقیرا و لم یثبت فی الشرع جواز الصرف للأغنیاء للإجماع علی حرمۃ النذر للمخلوق و لا ینعقد و لا تشتغل الذمۃ بہ و لأنہ حرام بل سحت و لا یجوز لخادم الشیخ اخذہ الا ان یکون فقیرا او لہ عیال فقراء عاجزون فیأخذونہ علی سبیل الصدقۃ المبتدأۃ و اخذہ ایضا مکروہ ما لم یقصد الناذر التقرب الی اللہ تعالی و صرفہ الی الفقراء و یقطع النظر عن نذر الشیخ، بحر ملخصا عن شرح العلامۃ قاسم۔ (قولہ ما لم یقصدوا الخ) ای بأن تکون صیغۃ النذر "للہ تعالیٰ" للتقرب الیہ و یکون ذکر

الشیخ مرادا به فقراء کما مر ـ و لا یخفی ان له الصرف الی غیرهم کما مر سابقا ـ و لا بد ان یکون المنذور مما یصح به النذر کالصدقة بالدراهم و نحوها اما لو نذر زیتا لإیقاد قندیل فوق ضریح الشیخ او فی المنارة کما یفعل النساء من نذر الزیت لسیدی عبد القادر رحمه الله و یوقد فی المنارة جهة المشرق فهو باطل ـ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۲۱۰ متفرقات کتاب الصوم میں بھی یہی مضمون ہے ـ

پس مسلمانوں کو چاہیے کہ غیر خدا کسی کی نذر و منت نہ مانیں ، اور اللہ کے لئے نذر و منت مان کر فقراء و مساکین درگاہ بزرگان پر اس کو تقسیم کرنے کی نیت کریں ـ البتہ بدون نذر و منت کے ایصال ثواب کے لئے کوئی چیز پکا کر لوگوں کو کھلانا جس کو اموات کی " فاتحہ " اور بزرگان دین کی " نیاز " کہا جاتا ہے ، یا سونا چاندی وغیرہ صدقہ دینا ، یا نماز ، روزہ و قراءۃ قرآن وغیرہ عبادات بدنیہ کا ثواب بخشنا یہ تمام امور شرعاً درست ہیں ـ

اور ہر ایک شخص کو چاہیے کہ ایسے ایصال ثواب میں مخصوص ارواح کے ساتھ زندہ و مُردہ تمام مؤمنین و مؤمنات کی ارواح کو بھی شریک کرلے ، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر ایک کو اسی قدر پورا پورا ثواب عطاء فرماتا ہے ـ رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۴۳۱ کتاب الجنائز میں ہدایہ سے منقول ہے : صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغیر بأنّ للإنسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلاة او صوما او صدقة او غیرها کذا فی الهدایة ـ تاتارخانیہ سے منقول ہے : بل فی زکاة التاتارخانیة عن المحیط الأفضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین و المؤمنات لأنها تصل إلیهم و لا ینقص من اجره شیء اه ، هو مذهب أهل السنّة و الجماعة ـ اور البحر الرائق سے منقول ہے : و فی البحر من صام او صلی او تصدق و جعل ثوابه لغیره من الأموات و الأحیاء جاز و یصل ثوابه إلیهم عند أهل السنة و الجماعة کذا فی البدائع ـ اسی جگہ در مختار میں ہے : و یقرأ سورة یٰسٓ ـ و فی الحدیث " من قرأ الاخلاص احدی عشرة مرة ثم وهب اجرها للاموات أُعطی من الأجر بعدد الأموات " ـ رد المحتار میں ہے : (قوله و یقرأ یٰسٓ) لما ورد " من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسٓ خفف الله عنهم یومئذ و کان له بعدد من فیها حسنات " بحر ـ و فی شرح اللباب : و یقرأ من القرآن ما تیسر له من الفاتحة و اول البقرة الی المفلحون و آیة الکرسی و آمن الرسول و سورة یٰسٓ و تبارک المُلک و سورة التکاثر و الإخلاص اثنتی عشرة مرة او احدی عشرة او سبعا او ثلاثا ثم یقول : اللّٰهم أوصِل ثواب ما قرأناه الی فلان او أوصل إلیهم ـ اور صفحہ ۴۳۲ میں ہے : سئل ابن حجر المکی عما لو قرأ لأهل المقبرة الفاتحة هل یقسم الثواب بینهم او یصل لکل منهم مثل ثواب ذلک کاملا فاجاب بانه أفتی جمع بالثانی و هو اللائق بسعة الفضل ـ

پیران طریقت و اساتذہ و سلاطین و امراء کی خدمت میں کسی چیز کے پیش کرنے کو اصطلاح میں " نذر " کہا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ نذر شرعی نہیں ہے بلکہ عوام نے بلحاظ ادب ان مکرم و معظم ہستیوں کے

پاس ہدایا و تحائف پیش کو بھی ضرورتاً " نذر " کا نام دے رکھا ہے، اس سے عبادت مقصود نہیں ہوتی اور نہ پہلے سے بغرض تقرب اپنے پر لازم کرلی جاتی ہے، محض پیش کرنے کے وقت اس کو نذر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر میت بزرگان دین کی ارواح پر ایصال ثواب کرنے کی غرض سے کوئی چیز پکا کر فقراء کو تقسیم کی جائے، یا روپیہ سونا وغیرہ صدقہ کیا جائے اور تقسیم کرنے کے وقت اس کا نام " نذر " رکھا جائے اور قبل تقسیم مذکور الصدر " نذرِ الٰہی " کے طریقہ پر یہ اپنے ذمہ لازم نہ کرلیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ سلاطین و امراء کے پاس پیش ہونے والی اشیاء کا نام " نذر " رکھا جاسکتا ہے تو ان خاصانِ بارگاہِ خداوندی کی ارواح پر پیش ہونے والی چیز تو بدرجۂ اولیٰ " نذر " نام رکھے جانے کی مستحق ہے۔

کسی کام میں جو کسی سے مدد اور توجہ چاہی جاتی ہے، یا کسی کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، اس کو عربی میں اِستِغاثہ، اِستِنصار، اِستِعانت، اِستِمداد، تشفع، توسّل وغیرہ الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی تفصیل یہ ہے کہ :- استغاثہ " عربی میں غوث طلب کرنے کو کہتے ہیں، " غوث " کے معنی اِزالۂ شدت و تکلیف اور سختی کو دور کرنا ہے۔ معیشت دنیا میں جو تکالیف کہ ایک دوسرے کو لاحق ہوتی ہیں اس کے دفعیہ کی ہر ایک دوسرے سے درخواست کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص کے دوسرے رکوع میں آیت کریمہ " فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ " سے ثابت ہے کہ ایک مخلوق دوسری مخلوق کی شدت و تکلیف کو دفع کرسکتی ہے اور مصیبت میں مدد دے سکتی ہے۔

اسی طرح " استنصار " طلب نصر یعنی غیر سے مدد طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ اور سورۂ انفال کے آٹھویں رکوع میں آیت کریمہ " وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ " الآیۃ سے ثابت ہے کہ ایک بندۂ خدا دوسرے بندۂ خدا کو مدد دے سکتا ہے۔ " استمداد " استنصار کا ہم معنی ہے۔

اور " استعانت " بھی طلب عون یعنی مدد چاہنے کو کہتے ہیں۔ کلام الٰہی میں تین جگہ یعنی سورۂ بقرہ کے سولھویں اور پانچویں رکوع میں اور سورہ اعراف کے تیرھویں رکوع میں آیت کریمہ " اِسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ " سے ثابت ہے کہ انسان کو صبر و صلاۃ سے طلب عون یعنی مدد لینا چاہئے۔ پس ان آیاتِ بیّنات سے ظاہر ہے کہ انسان کو خداوندِ عالم کے سوا دیگر اشیاء سے بھی مدد لینے کی شریعت میں اجازت ہے۔

" تشفع " کے معنی شفاعت یعنی سفارش لے جانے کے ہیں۔ مخلوق کا آپس میں ایک دوسرے کی سفارش کرنا، اور خداوندِ عالم کے پاس کسی مخلوق کی سفارش کرنا سورۂ نساء کے نویں رکوع میں آیت کریمہ " مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا " اور سورۂ بقرہ کے چھبیسویں رکوع میں " مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ " سے ثابت ہے۔ احادیث سے بھی اس کے فضائل ثابت ہیں۔ اور بروز قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے تمام گنہگاروں کے لئے خداوند عالم سے شفاعت یعنی سفارش کرنے کے ثبوت میں تو کسی کو کلام نہیں۔

" توسل " کے معنی لغت میں نیک کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے پاس قربت حاصل کرنے کے ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں آیت کریمہ " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ "

میں مسلمانوں کو خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ : اے مسلمانو ! اللہ سے ڈرو اور نیک کاموں کے ذریعہ اس کا وسیلہ یعنی تقرب چاہو ۔ تفسیر کبیر کی جلد ۳ صفحہ ۳۱۰ میں ہے : فکان المراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ و ذٰلک بالعبادات و الطاعات ۔ اعمال صالحہ کے سواء انبیاء کرام علیہم السلام و اولیاء کرام کو بھی اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی رضا کے حصول کی خاطر وسیلہ و ذریعہ بنانا ثابت ہے ۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے نویں رکوع میں آیت کریمہ " وَ کَانُوا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا " الآیۃ سے ثابت ہے کہ چونکہ یہودیوں کو توراۃ میں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کی بشارت دی گئی تھی اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی ولادت سے قبل جب کبھی عرب کے مشرکین سے ان کی لڑائی ہوتی تو حضرتؐ کے وسیلہ سے فتح کی دعاء مانگا کرتے تھے ۔ تفسیر کبیر کی جلد ۱ صفحہ ۳۲۸ میں ہے : ان الیہود من قبل مبعث محمد علیہ السلام و نزول القرآن کانوا یستفتحون ای یسألون الفتح و النصرۃ و کانوا یقولون اللّٰھم افتح علینا و انصرنا بالنبی الاُمی ۔ تفسیر در منثور کی جلد ۱ صفحہ ۸۸ میں بھی یہی لکھا ہے ۔ سنن نسائی و ابن ماجہ و جامع ترمذی میں ایک حدیث شریف کی تخریج کی گئی ہے جس کو امام ترمذی اور ابو اسحاق نے صحیح کہا ہے ، حدیث یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک نابینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اندھا ہوگیا ہوں ، آپ میرے لئے دعاء فرمائیں ! حضرت علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا کہ وضوء کرکے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد یہ دعاء مانگا کر : " اے اللہ ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اور تیرے نبی محمد نبی رحمت کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں ، اے محمد میں آپ کے واسطے سے میرے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری حاجت پوری کرے ، اے اللہ تو محمد کو میرا شفیع بنا " ۔ امام بیہقی نے بھی سنن کبریٰ میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور اس میں یہ اضافہ کیا کہ : ان نابینا صحابی نے اس طرح وسیلہ سے دعاء مانگی اور بینا ہوگئے ۔ سنن ابن ماجہ مطبوعہ فاروقی کے صفحہ ۱۰۰ باب ما جاء فی صلاۃ الحاجۃ میں عثمان ابن حنیف ؓ سے مروی ہے : ان رجلا ضریر البصر اتی النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم فقال ادع اللّٰہ تعالیٰ لی ان یعافینی ! فقال ان شئتَ اَخّرتُ لک و ھو خیر و ان شئتَ دعوتُ فقال ادعہ فامرہ ان یتوضأ فیحسن وضوءہ و یصلی رکعتین و یدعو بھذا الدعاء " اللّٰھم اِنی اَسألک و اَتوجہ اِلیک بمحمدٍ نبیِّ الرَّحمۃِ یا محمد اِنی قد توجھتُ بک اِلیٰ ربّی فی حاجتی ھٰذہ لتقضی اللّٰھم فشفّعہ فیَّ " ۔ قال ابو اسحاق ھذا حدیث صحیح ۔ انجاح الحاجۃ حاشیۂ ابن ماجہ میں اسی جگہ ہے : ھذا الحدیث اخرج النسائی و الترمذی فی الدعوات مع اختلاف یسیر و قال الترمذی حسن صحیح و صححہ البیہقی و زاد : فقام و قد اَبصر و فی روایۃ ففعل الرجل فبرئَ ۔

آیتِ کریمہ " وَ کَانُوا یَسْتَفْتِحُوْنَ " الآیۃ سے قبلِ ولادت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کو وسیلہ بنانا ثابت ہے ، اور اِس حدیث سے آپ کا زندگی میں وسیلہ بننا ثابت ہے ۔ اور بعد وفات آپ سے مدد چاہنے کے متعلق انجاح الحاجہ میں اسی جگہ ایک حدیث شیخ عابد سندھی کے رسالہ سے نقل کی ہے جس کی امام بیہقی و ابن ابی شیبہ نے مالک دار سے تخریج کی ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ

خلافت میں ایک دفعہ قحط آیا ، تب ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے مزار مبارک پر حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و سلم) اپنی امت کے لئے اللہ تعالی سے پانی مانگئے ، کیونکہ امت ہلاک ہونے کے قریب ہے ! حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم اس کے خواب میں تشریف فرما ہوئے اور یہ فرمایا کہ :" عمر کو میری طرف سے سلام پہونچانے کے بعد یہ کہنا "۔ صاحب حاشیہ نے اسی قدر قصہ لکھکر ابن عبد البر کی کتاب استیعاب میں اس کی تفصیل دیکھنے کے لئے لکھا ہے (اور حافظ ابن عبد البر نے الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ طبع حیدرآباد میں اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے الفاظ مبارک بھی روایت کئے ہیں)۔ انجاح الحاجہ کی عبارت یہ ہے : و ذکر فیھا حدیث البیھقی و ابن ابی شیبۃ عن مالک الدار قال أصاب الناسَ قحطٌ فی زمان عمر ابن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ فجاء رجل الیٰ قبر النبی علیہ السلام و قال : یا رسول اللّٰہ علیہ السلام استسق اللّٰہَ لأمّتک فانھم قد ھلکوا ! فأتاہ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی منامہ فقال " ائتِ عمرَ فأقرئہ السلامَ و أخبِرہ "۔ و القصۃ مذکورۃ فی الاستیعاب لابن عبد البر (ففیہ جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ : رایتَ عمرَ فمُرہُ أن یَستسقِیَ للناسِ فانھم میُسقَون و قل لہ : علیک الکیس الکیس ! فأتیٰ الرجلُ عمرَ فأخبَرہُ ، فبکیٰ عمرُ و قال : یا ربِّ ما آلو اِلا ما عجزتُ ! یا ربِّ ما آلو اِلا ما عجزتُ !) ۔ اسی مقام میں صاحب انجاح الحاجہ نے طبرانی کبیر کی ایک اور حدیث نقل کی ہے جو عثمان ابن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس روزانہ اپنی کچھ ضرورت لے جایا کرتا تھا ، مگر آپ رضی اللہ عنہ اس کی طرف توجہ نہیں فرماتے تھے ۔ تب عثمان ابن حنیف رضی اللہ عنہ نے اس کو وہی حدیثِ توسل سکھائی اور دعاء کا طریقہ بھی حسب روایت سابق بتلادیا ، جیسا ہی ایک دفعہ پڑھکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا ہے آپؓ نے اسکی حاجت نہایت توجہ سے سن کر پوری فرمائی ۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اولیائے کرام سے بھی ان کی عین حیات توسل و امداد لینا اور ان کی دعاء سے لوگوں کا کام نکالنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے ۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ تعالی سے امت کی مغفرت کے لئے دعاء چاہنے کے متعلق حکم فرمایا تھا ۔ اور صحیح بخاری شریف کی کتاب الجہاد باب من استعان بالضعفاء و الصالحین فی الحرب میں مصعب بن سعد سے مروی ہے : قال رأیٰ سعد ان لہ فضلا علیٰ من دونہ فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم ھل تُنصَرون و تُرزَقون اِلا بضعفائکم ۔ یعنی سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے کو دوسروں پر مکرم سمجھا ، تب آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہوا کہ تم کو جو رزق و مدد دی جاتی ہے وہ بے مایہ ضعیفوں کی برکت سے ہے ۔ اس حدیث کی شرح میں عینی جلد ۲ صفحہ ۴۳۰ میں لکھتے ہیں : و اخبر صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان بدعائھم یُنصَرون و یُرزَقون لأنّ عبادتھم و دعاءھم اشدّ اخلاصاً و أکثر خشوعا لخلو قلوبھم من التعلق بزخرف الدنیا و زینتھا و صفاء ضمائرھم عما یقطعھم عن اللّٰہ تعالیٰ فجعلوا ھمّھم واحدا فزکت اعمالُھم و اُجیب دعاؤھم ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا یہ

فرمان مبارک اس لئے ہے کہ اولیاء اللہ نے چونکہ دنیا میں عیش و عشرت کو چھوڑ کر ریاضت و مجاہدہ سے اپنے کو اللہ کے لئے وقف کردیا ہے اور جو عبادات و مجاہدے یہ کرتے ہیں وہ خلوص دل سے خاص خداوند عالم کے لئے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ہوا کرتی ہیں، اس لئے ان کے اعمال پاک و صاف ہوتے ہیں اور اللہ پاک ان کی دعاء قبول فرماتا ہے۔ اگرچیکہ یہ لوگ بظاہر ضعیف و منکسر الحال معلوم ہوتے ہیں مگر خداوند عالم انھیں کے برکت و دعاء سے اہل عالم کو رزق عطاء فرماتا ہے اور سارے کام بناتا ہے۔ اس حدیث کے بعد بخاری شریف میں ایک دوسری حدیث ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں، ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب لوگ جہاد کریں گے تو پوچھا جائے گا کہ کیا تم میں صحابہ ہیں؟ جب اُن میں صحابہ ہوں گے تو انہیں کی برکت سے فتح نصیب ہوگی۔ پھر اس کے بعد ایک زمانہ آئے گا کہ جس میں تابعین پوچھے جائیں گے اور اُنھیں کی برکت سے فتح ہوگی، اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں تبع تابعین پوچھے جائیں گے اور اُنھیں کی بدولت مسلمانوں کو فتح ہوگی۔ حدیث شریف یہ ہے:

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال: یأتی زمانٌ یغزو فئام من الناس فیقال فیکم من صحب النبی صلی اللہ علیہ و سلم فیقال نعم فیفتح لھم ثم یأتی زمان فیقال فیکم من صحب اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و سلم فیقال نعم فیفتح ثم یأتی زمان فیقال فیکم من صحب اصحاب اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و سلم فیقال نعم فیفتح۔ صحیح بخاری شریف کے باب الاستسقاء میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کان اذا قحطوا استسقی بالعباس بن عبد المطلب قال اللّٰھم انا کنّا نتوسل الیک بنبینا فتسقینا و اِنا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیُسقَون۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ قحط کے زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے بارش کے لئے دعاء کرتے تھے کہ: اے خداوند تعالیٰ ہم تیرے پاس اپنے نبی کریم علیہ السلام کے توسُّل سے پانی مانگا کرتے تھے اور تو پانی برسایا کرتا تھا، اب ہم تیرے پاس اپنے نبی کے چچا کے وسیلہ سے پانی مانگتے ہیں تو ہم پر پانی برسا! راوی کہتے ہیں کہ آپ کی اس دعاء سے پانی برسنے لگا۔ اور عینی شرح بخاری کی جلد ۳ صفحہ ۴۳۰ میں اس حدیث کی شرح میں ہے، وقال فارخت السماء شٰابیب مثلَ الجبال حتیٰ اخصبت الأرض و عاش الناس۔ یعنی اس دعاء سے پہاڑوں کی طرح ابر آیا اور اس کثرت سے بارش ہوئی اور اتنی سرسبزی ہوگئی کہ اچھی ارزانی ہوگئی۔

پس ان آیات قرآنی و احادیث صحیحہ سے یہ بات بخوبی ثابت ہوجاتی ہے کہ مخلوقِ الٰہی میں سے انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام سے اپنی ضروریات میں مدد چاہنا، اللہ کے پاس ان کا وسیلہ لینا، ان سے دعاء کی درخواست کرنا ان کی عین حیات اور بعد ممات بلکہ انبیاء علیہم السلام سے تو ان کی قبل ولادت بھی شرعاً درست ہے۔ چنانچہ عقائد اہل سنت و جماعت میں کرامات اولیاء کی حقانیت کی تفصیل میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اولیاء کرام کی توجہ سے انسان کو مصیبت سے نجات ملتی ہے، اور دشمنوں پر کامیابی حاصل ہوتی ہے، ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور مشکلیں آسان ہوجاتی ہے۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ انوار محمدی کے صفحہ ۲۲۰ میں

ہے : و کرامات الأولياء حق فظهر الكرامة على طريق نقض العادة للولي من قطع المسافة البعيدة في المدة القليلة و ظهور الطعام و الشراب عند الحاجة و المشي على الماء و الطيران في الهواء و كلام الجماد و العجماء و اندفاع المتوجه من البلاء و كفاية المهم عن الأعداء و غير ذلك من الأشياء ۔ پس صورت مسئولہ میں بزرگانِ دین سے دعاء کی درخواست کرنا شرعاً جائز ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۴۴۶ بھی دیکھئے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بلا شرط بطورِ دل بہلائی کے گنجفہ کھیلنا جائز ہے یا نہیں ؟ اگر نہیں ہے تو اس کی دلیل کیا ہے ؟ اور اس کا مرتکب کس درجہ کا گنہگار ہے ؟

الجواب

گھوڑے کی سواری ، تیر اندازی وغیرہ فنون حرب ، اور اپنی زوجہ سے خوش طبعی کرنے کے سوا باقی تمام کھیل شرعاً مکروہ تحریمی یعنی حرام ہیں ۔ در مختار کتاب الحظر و الاباحہ باب الاستبراء میں بحوالۂ حدیث صحیح ہے : و كره كل لهو لقوله عليه السلام " كل لهو لمسلم حرام الا ثلاثة ملاعبة اهله و تأديبه بفرسه و مناضلته بقوسه " ۔ اور فتاویٰ عالمگیریہ کی کتاب الکراہۃ باب فی الغناء و اللہو میں ہے : و كل لهو ما سوى الشطرنج حرام بالإجماع و اما الشطرنج فاللعب به حرام عندنا ۔ پس صورت مسئولہ میں دل بہلائی کے لئے گنجفہ کھیلنے والا مرتکب حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کفار و مشرکین کو قرآن کی تعلیم دینا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

بغرضِ ہدایت ، زبانی تعلیم دینا درست ہے ۔ اور بغیر غسل کے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا درست نہیں ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الکراہۃ باب خامس میں ہے : قال ابو حنيفة رحمه الله تعالى اعلم النصراني الفقه و القرآن لعله يهتدي و لا يمس المصحف و ان اغتسل ثم مس لا بأس كذا في الملتقط ۔ فتاویٰ قاضیخاں کی کتاب السیر و الجہاد میں ہے : و لا بأس بتعليم القرآن الكافرة ۔ کبیری شرح منیۃ المصلی مطبوعہ مجدی صفحہ ۴۹۵ تتمات میں ہے : و لا بأس بتعليم القرآن الكافر او الفقه رجاء ان يهتدي لكن لا يمس المصحف ما لم يغتسل و هذا قول محمد و عن ابي يوسف لا يمسه من غير فصل ۔ فتاویٰ

قاضیخان کی کتاب الحظر و الاباحۃ فصل التسبیح و السلام میں ہے : کافر من اھل الذمۃ او من اھل الحرب طلب من مسلم ان یعلمہ القرآن و الفقہ قالوا لا بأس ان یعلمہ القرآن و الفقہ فی الدین لأنہ عسیٰ ان یہتدی الیٰ الإسلام فیسلم الا ان الکافر لا یمس المصحف ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید مزامیر و راگ کو اس وجہ سے حلال کہتا ہے کہ چشتیہ طریقہ کے مشائخین اس کو جائز رکھتے ہیں ۔ اور زید مساجد وغیرہ مقامات متبرکہ میں مزامیر یعنی ستار و سارنگی وغیرہ ساز کے ساتھ وعظ کہتا ہے ۔ کیا زید کا یہ قول و فعل شرعا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

گانا اور ساز سننا شرعا حرام ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر الاباحۃ میں ہے : و فی البزازیۃ استماع صوت الملاھی کضرب قصب و نحوہ حرام لقولہ علیہ السلام : استماع الملاھی معصیۃ و الجلوس علیھا فسق و التلذذ بھا کفر ۔ ای بالنعمۃ فصرف الجوارح الی غیر ما خلق لأجلہ کفر بالنعمۃ لا شکر فالواجب کل الواجب ان یجتنب کی لا یسمع لما روی انہ علیہ السلام أدخل إصبعہ فی أذنہ عند سماعہ ۔

صوفیہ کرام میں جو بزرگوار کہ پابند شرع و پرہیزگار ہیں اور دنیاوی لہو و لعب کی طرف ان کا میلان نہیں ہے ایسے حضرات کو محبت الٰہی اور شوق و وصال محبوب حقیقی میں گانا سننے کی اگر ایسی ہی حاجت ہو جیسے مریض کو دواء کی تو ایسی حالت میں ان بزرگواروں کو کم از کم مندرجہ ذیل چھ (۶) شروط کے ساتھ گانا سننا مباح ہے ورنہ نہیں :

۱ ۔ ان بزرگواروں کی جماعت میں گاتے وقت کوئی بے ریش مرد نہ ہو ۔

۲ ۔ تمام ایک ہی جنس اور ایک ہی مشرب کے اصحاب ہوں اور ان کی محفل میں اہل دنیا میں سے کوئی نہ ہو ، اور نہ کوئی فاسق یعنی بدکار ہو ، اور نہ کوئی عورت ہو ۔

۳ ۔ گانے والا خالصاً للہ گائے اور اس کو اجرت یا کھانے کی امید و طلب نہ ہو ۔

۴ ۔ یہ بزرگوار گانے کے مقام میں کھانا کھانے کے لئے یا کوئی فتوحات حاصل کرنے کیلئے جمع نہ ہوئے ہوں ۔

۵ ۔ گانے کی محفل میں جب وجد کی حالت میں کھڑے ہوجائیں تو مغلوب الحال یعنی بے خود ہوکر کھڑے ہوں ۔

۶ ۔ اُسی وجد کو ظاہر کریں جو سچا ہو ۔

بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جھوٹا وجد غیبت سے بھی زیادہ سخت ہے ۔ حضرت سری السقطی رحمہ اللہ سچے

وجد کی یہ کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ وجد کرنے والا اس طرح بے خود ہوجائے کہ اگر اس کے چہرہ پر تلوار ماری جائے تو اس کو کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔

فتاویٰ خیریہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۷ میں ہے: ان کان السماع سماع القرآن او الموعظة فیجوز و یستحب و ان کان سماع غناء فهو حرام لان التغنی و استماع الغناء حرام اجمع علیه العلماء و بالغوا فیه۔ و من اباحه من المشایخ الصوفیة فلمن تخلی عن الهوی و تحلی بالتقوی و احتاج الی ذلک احتیاج المریض الی الدواء و له شرائط، احدها ان لا یکون فیهم امرد۔ الثانی ان لا یکون جمیعهم الا من جنسهم لیس فیهم فاسق و لا اهل الدنیا و لا امراة۔ و الثالث ان تکون نیة القوال الاخلاص لا اخذ الاجر و الطعام۔ و الرابع ان لا یجتمعوا لاجل الطعام او فتوح۔ و الخامس لا یقومون الا مغلوبین۔ و السادس لا یظهرون وجدا الا صادقین و قال بعضهم الکذب فی الوجد اشد من الغیبة کذا و کذا سنة۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے: و قال السری شرط الوجد فی الغناء ان یبلغ الی حد لو ضرب وجهه بالسیف لا یشعر فیه بوجع اھ۔

مزامیر و آلات سماع کا بھی یہی حال ہے کہ جو لوگ عیش و عشرت اور لہو و لعب کے طریقہ پر سنتے اور استعمال کرتے ہیں ان کے لئے درست نہیں ہے، اور جو بزرگوار ازدیاد محبتِ الٰہی و توجہ الی اللہ کا ذریعہ جان کر سنتے ہیں ان کے لئے مباح ہے۔ فتاویٰ خیریہ کے اسی صفحہ میں ہے: و قد صنف الفقهاء فی ذلک مصنفات کثیرة و کذلک اهل التصوف و اجمع عبارة فیه ما قاله بعضهم و قد سئل عن السماع بالیراع وغیره من الآلات المطربة هل ذلک حلال او حرام؟ قد حرمه من لا یعترض علیه لصدق مقاله و اباحه من لم ینکر علیه لقوة حاله فمن وجد فی قلبه شیئا من نور المعرفة فلیتقدم و الا فرجوعه الی ما نهاه عنه الشرع اسلم و احکم۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے: اقول و هذا یفید ان آلات اللهو لیست محرمة لعینها بل لقصد اللهو منها اما من سامعها او من المشتغل بها و به تشعر الإضافة ألا تری ان ضرب تلک الآلات بعینها حل تارة و حرام اخریٰ باختلاف النیة و الأمور بمقاصدها و فیه دلیل لساداتنا الصوفیة الذین یقصدون بسماعها اموراً هم اعلم بها فلا یبادر المعترض بالإنکار کی لا یحرم برکتهم فانهم السادات الأخیار أمدنا الله بامداداتهم و اعاد علینا من صالح دعواتهم و برکاتهم۔

پس صورت مسئولہ میں زید اگر ان صوفیہ کرام کی جیسی باطنی حالت رکھتا ہے تو شروط مندرجہ بالا کی پابندی کے ساتھ اس کے لئے مزامیر و سماع مباح ہیں۔ مگر زید کا مسجد میں ان حرکات کے ساتھ وعظ کہنا آداب مسجد کے خلاف اور قطعی حرام ہے۔ کیونکہ مساجد، نماز و اذکار و اوراد کے لئے بنائی گئی ہیں نہ کہ غناء و طرب کے لئے۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراہۃ باب خامس میں ہے: و السادس ان لا یرفع فیه الصوت من غیر ذکر الله تعالی۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بعض اشخاص نماز وتر کے بعد ایک سجدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مرشد کا بتایا ہوا ہے اور اس کا نام سجدۂ طاق ہے ۔ کیا یہ شرعاً درست ہے ؟

الجواب

اس سجدہ کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے ۔ البتہ سجدۂ شکر کا مستحب ہونا ثابت ہے ۔ مگر اس کو بھی نماز کے بعد اداء کرنا مکروہ تحریمی بتایا گیا ہے کیونکہ اس سجدہ کو نماز سے متصل اداء کرنے سے جاہل لوگ یہ یقین کرلیتے ہیں کہ یہ واجب ہے یا سنت ۔ اور جو مباح فعل ایسا ہے کہ اس کی ادائی سے عام لوگوں کو اس کے واجب یا سنت ہونے کا شبہ گزرتا ہے شرعاً مکروہ تحریمی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ا کتاب الصلاۃ باب سجدہ تلاوت میں ہے : و سجدۃ الشکر مستحبۃ و بہ یفتی لکنھا تکرہ بعد الصلاۃ لأن الجھلۃ یعتقدونھا سنۃ او واجبۃ و کل مباح یؤدی الیہ فمکروہ ۔ رد المحتار میں ہے : و حاصلہ ان ما لیس لھا سبب لا تکرہ ما لم یؤد فعلھا الی اعتقاد الجھلۃ سنیتھا کالتی یفعلھا بعض الناس بعد الصلاۃ و رأیت من یواظب علیھا بعد صلاۃ الوتر و یذکر ان لھا اصلا و سندا فذکرت لہ ما ھنا فترکھا ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چہلم و برسی وغیرہ کا کھانا جو اہل قرابت میں تقسیم ہوتا ہے جن میں بعض محتاج اور بعض خوشحال ہوتے ہیں ، کیا یہ شرعاً درست ہے ؟ اور کیا طعام ایصالِ ثواب ، فقراء و مساکین کے سوا اہلِ قرابت کو کھلایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہمارے ملک کا رواج و دستور ہے ؟

الجواب

میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے جو کھانا کھلایا جاتا ہے وہ فی الحقیقت میت کی جانب سے صدقہ ہے ۔ صدقہ کے مستحق فقراء و مساکین ہیں ، اس لئے اہل قرابت میں جو حاجت مند ہیں پہلے ان کو کھلانا چاہئے ان کے بعد بیرونی فقراء و مساکین کو دیا جائے ۔ اگر اہل قرابت میں کوئی ایسا غنی یعنی مالک نصاب ہے جس کے اہل و عیال بہت ہیں تو اس کو بھی دے سکتے ہیں ۔ ان کے سواء دوسرے اشخاص کو بھی اگر ثواب کی نیت سے کھلائیں تو کھلا سکتے ہیں ۔ فتاویٰ قاضیخان مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیری جلد ۴ کتاب الھبۃ فصل فی التصدق میں ہے : رجل تصدق عن المیت و دعا لہ قالوا یجوز ذلک و یصل الی المیت لما جاء فی الاخبار ان الحی اذا تصدق عن المیت بعث اللہ تعالی تلک الصدقۃ الیہ علی طبق من النور ۔ ہدایہ اولین مصطفائی کے صفحہ ۲۹۰ کتاب الھبۃ فصل فی الصدقۃ میں ہے : و لا رجوع فی الصدقۃ لأن المقصود ھو الثواب و قد حصل و کذلک اذا تصدق علی غنی استحسانا لأنہ قد یقصد بالصدقۃ علی الغنی الثواب و قد

حصل و كذا اذا وهب لغنير لأن المقصود هو الثواب و قد حصل ۔ کفایہ مطبوعہ بر حاشیہ فتح القدیر مصری جلد ۷ صفحہ ۵۱۶ کتاب الہبہ فصل فی الصدقہ میں ہے : ثم التصدق على الغني يكون قربة يستحق بها الثواب فقد يكون غنيا يملك نصابا و له عيال كثير و الناس يتصدقون على مثل هذا لنيل الثواب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۳۵۲ ، ۳۸۲ و ۵۰۳ بھی دیکھا جائے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ احناف " السلام علیکم " کہتے ہیں اور شیعہ " سلام علیکم " کہا کرتے ہیں ۔ ان دونوں میں بہتر کیا ہے ؟ اور بچوں ، بزرگوں اور عورتوں پر سلام کا کیا ایک ہی طریقہ ہے ؟ یا اس میں کوئی فرق ہے ؟ " آداب " ، " قدمبوسی " ، " تسلیم " ، " کورنش " وغیرہ الفاظ جو استعمال کئے جاتے ہیں کیا ان سے سلام مسنون ادا ہوجاتا ہے ؟ اور بزرگوں پر اگر " السلام علیکم " کہا جائے تو اکثر ناخوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ برابر والوں پر سلام کرنے کا طریقہ ہے ، بزرگوں کی خدمت میں آداب عرض کرنا چاہئے ۔ کیا یہ قول درست ہے ؟

الجواب

" السلام علیکم " الف لام کے ساتھ کہنا بہتر ہے ۔ اور بغیر الف لام کے تنوین کے ساتھ کہنا بھی درست ہے ۔ سلام میں عورتیں ، بچے ، بڑے سب مساوی ہیں ، سب پر السلام علیکم کہنا چاہئے ۔ آداب ، بندگی ، قدمبوسی ، تسلیم ، کورنش وغیرہ کہنے سے مسنون سلام ادا نہیں ہوتا ۔ کنز العباد صفحہ ۴۴۹ میں ہے : في الظهيرية و لفظة السلام في المواضع كلها " السلام عليكم " او " سلام عليكم " بالتنوين ۔ و بدون هذين اللفظين كما يقول الجهال لا يكفي سلاما ۔ عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۳۲۵ کتاب الکراہیۃ باب سابع میں ہے : و لو قال المبتدي " سلام عليكم " او قال " السلام عليكم " فللمجيب ان يقول في الصورتين سلام عليكم و له ان يقول السلام عليكم و لكن الألف و اللام أولىٰ كذا في التاتارخانية ۔ صفحہ ۳۲۴ میں ہے : ينبغي لمن يسلم على احد ان يسلم بلفظ الجماعة و كذلك الجواب كذا في السراجية ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حدیث شریف " أنتم أعلم بأمر دُنياكم " کس کتاب میں ہے ؟ اور اس کا مطلب کیا ہے ؟

الجواب

یہ حدیث شریف صحیح مسلم شریف جلد دوم مطبوعہ اصح المطابع دہلی کی کتاب الفضائل صفحہ ۲۶۴ باب

وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ و سلم من معائش الدنیا علی سبیل الرأی میں ہے : حدثنا ابوبکر بن ابی شیبة و عمرو الناقد کلاھما عن الاسود بن عامر قال ابوبکر نا اسود بن عامر قال نا حماد بن سلمة عن ھشام بن عروة عن ابیه عن عائشة و عن ثابت عن انس ان النبی صلی اللہ علیه و سلم مر بقوم یلقحون فقال لو لم تفعلوا لصلح قال فخرج شیصا فمر بھم فقال ما لنخلکم قالوا قلت کذا و کذا قال أنتم أعلم بأمر دُنیاکم ۔ یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم ایک دفعہ کسی نخلستان کے پاس سے گذرے ، اس وقت لوگ کھجور کے نر درخت کا پھول مادہ درخت کے پھول پر ڈال رہے تھے (جس کو تأبیر یا تلقیح کہتے ہیں) ، آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بہتر ہے ۔ لوگوں نے چھوڑ دیا ، اس کے ترک سے درختوں پر بار اچھا نہیں آیا ۔ جب دوبارہ آپ علیہ السلام کا گزر ادھر سے ہوا تو بار کی ناقص حالت دیکھکر آپ نے سبب دریافت کیا ؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ کے فرمانے سے ہم نے نر کا پھول ڈالنا چھوڑ دیا اس لئے بار ناقص ہوگیا ۔ جب آپؐ نے فرمایا کہ ۔ تم دنیاوی معاملات کو بہتر جانتے ہو ، اپنی مصلحت کے موافق کام کرو ، میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں ، جب کوئی دینی معاملات تم کو بتاؤں تو تم عمل کرو ، اور جو بات اپنی رائے سے دنیاوی امور میں بتلاؤں اس میں تم کو اختیار ہے ۔ پس علماء کا قول یہ ہے کہ آپؐ نے جو بات شریعت کے متعلق فرمائی ہے وہ واجب العمل ہے اور دنیاوی معاملات میں جو آپ کا نیک مشورہ ہے اس پر عمل کرنے کے متعلق لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس کے قبل کی حدیث میں ہے : إنما أنا بشر إذا أمرتکم بشيء من دینکم فخذوا به و إذا أمرتکم بشيء من رأیي فانما أنا بشر ۔ قال عکرمة او نحو ھذا ۔ قال المعقری فنفضت و لم یشک ۔ اس کے قبل کی حدیث میں ہے : فقال ان کان ینفعھم ذلک فلیصنعوہ فانی انما ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن و لکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذو به فانی لن أکذب علی اللہ عز و جل ۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں : قال العلماء قوله صلی اللہ علیه و سلم "من رأیي" ای فی امر الدنیا و معایشھا لا علی التشریع فأما ما قاله باجتھاده صلی اللہ علیه و سلم و رآہ شرعاً یجب العمل به و لیس تأبیر النخل من ھذا النوع بل من النوع المذکور قبله مع ان لفظة " الرأی " إنما أتیٰ بھا عکرمة علی المعنیٰ لقوله فی آخر الحدیث " قال عکرمة او نحو ھذا " فلم یخبر بلفظ النبی صلی اللہ علیه و سلم محققا قال العلماء و لم یکن ھذا القول خبرا و انما کان ظنا کما بینه فی ھذہ الروایات قالوا و رأیه صلی اللہ علیه و سلم فی امور المعایش و ظنه کغیرہ فلا یمتنع وقوع مثل ھذا و لا نقص فی ذلک و سببه تعلق ھممه بالآخرة و معارفھا ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر شیخ ہے ۔ اس نے ایک پٹھان کے لڑکے کو متبنیٰ بنا لیا ہے ، اور اس کا نام اپنے نسبی سلسلہ کے موافق رکھا ہے ۔ کیا بچہ کا نام اسی کے سلسلہ کا رکھا جائے جس کا کہ یہ صلبی لڑکا ہے ؟ یا آغوش میں لینے والا اس کو بدل کر اپنے سلسلہ کا نام رکھ سکتا ہے ؟

الجواب

نام رکھنے کا حق باپ کو ہے ، اگر باپ کا رکھا ہوا نام اچھا نہیں ہے تو دوسرے اشخاص اس کو بدل کر اچھا نام رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ برے نام بدل کر اچھے نام رکھا کرتے تھے ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر اس لڑکے کا نام اس کے باپ نے اچھا نہیں رکھا ہے تو بکر اس کو بدل سکتا ہے ۔ پٹھان جو اپنے نام کے بعد " خاں " کا لفظ شریک کرتے ہیں یہ خطابی لقب ہے نام کے ساتھ اس کی پابندی ضروری نہیں ہے ۔ احیاء العلوم طبع مصر جلد ۲ صفحہ ۱۹۳ حقوق الوالدین و الولد میں ہے : قال صلی اللہ علیہ و سلم من حق الولد علی الوالد ان یحسن ادبہ و یحسن اسمہ ۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : و کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یغیّر الاسم القبیح الی الحسن جاءہٗ رجل یسمی اصرم فسماہ زرعۃ و جاءہ آخر اسمہ المضطجع فسماہ المنبعث و کان لعمر رضی اللہ عنہ بنت تسمی عاصیۃ فسماہا جمیلۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی کسبن (طوائف) ناچ گانے کے کمائے ہوئے روپیہ سے کھانا پکا کر دعوت کرے تو کیا اس کی دعوت کا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر ناچ گانے کی اجرت ٹھہرا کر اس کے معاوضہ میں روپیہ حاصل کیا ہے تو ایسے روپے کی دعوت کا کھانا حرام ہے ۔ اور اگر بلا تقرر کے کسی نے گانا سنکر اپنی خوشی سے دے دیا ہے یا کسی اور جائز طریقہ سے آئے ہوئے روپیوں سے دعوت کی ہے تو اس کا کھانا درست ہے ۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ فصل فی البیع میں ہے : فی المواھب و یحرم علی المغنی و النائحۃ و القوال اخذ المال المشروط دون غیرہ ۔ اسی جگہ ہے : و فی المجتبیٰ ما تأخذہ المغنیۃ علی الغناء ۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراھۃ باب الھدایا و الضیافات میں ہے : آکل الربا و کاسب الحرام اُھدیٰ الیہ او اضافہ و غالب مالہ حرام لا یقبل و لا یأکل ما لم یخبرہ ان ذلک المال اصلہ حلال ورثہ او استقرضہ و ان کان غالب مالہ حلالا لا بأس بقبول ھدیتہ و الأکل منہا کذا فی الملتقط ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت ہنود کی طرح ٹیکا (بندو) لگاتی ہے اور گانے بجانے کا پیشہ کرتی ہے ، اور باوجود اس کے اپنے آپ کو مسلمان بتلاتی ہے ۔ اگر یہ مر جائے تو کیا اس کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کی طرح کی جائے گی ؟ اور تا حیات اس کا شمار مسلمانوں میں ہوگا ؟

الجواب

اگر کوئی مسلمان کافروں اور مشرکوں کی مخصوص مذہبی علامات جیسے زنار باندھنا ، یا ٹیکہ لگانا ، یعنی قشقہ لگانا اختیار کرے تو شرعاً وہ کافر ہے ۔ کیونکہ اس نے مؤمن ہونے کے باوجود شرک و کفر کی علامات اپنے پر جاری کی ہیں جس کی وجہ سے دیکھنے والے اس کو کافر و مشرک سمجھتے ہیں ، کیونکہ یہ چیزیں تکذیب و انکار دین اسلام کی علامت ہیں ۔ شرح عقائد نسفی مطبوعہ مطبع انوار محمدی کے صفحہ ۱۹۵ میں ہے : کما فرضنا ان احدا صدق بجمیع ما جاء به النبی صلی اللّٰه علیه و سلم و اقر به و عمل و مع ذلک شد الزنار بالاختیار او سجد للصنم بالاختیار نجعله کافرا لما ان النبی صلی اللّٰه علیه و سلم جعل ذلک علامة التکذیب و الانکار ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر یہ عورت مرنے کے قبل ان کفریات سے توبہ و استغفار کرکے مرے اور مرتے دم تک کلمہ توحید پر قائم رہے تو اس کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے طریقہ پر کرنا اور اس پر نماز جنازہ پڑھنا اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانا درست ہے ۔ عقائد نسفی طبع یوسفی کے صفحہ ۱۱۵ میں ہے : و یصلی علیٰ کل بر و فاجر اذا مات علیٰ الإیمان للاجماع و لقوله علیه السلام " لا تدعوا الصلاة علیٰ من مات من اهل القبلة " ۔ تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۳۰۱ میں ہے : من استقر علی کلمة الاسلام الی آخر الوقت یجوز الصلاة علیه و ان کان یحتمل ان یسبق علیه الکتاب و یخرج من الدنیا کافرا ۔ و من استقر علی کلمة الکفر الی آخر الوقت لم یجز علیه الصلاة و ان کان یحتمل ان یسبق علیه الکتاب فیموت مؤمنا ۔ و اللّٰه اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشرکین ہنود مٹھائی ، دودھ ، دہی وغیرہ خوردنی اشیاء جو اپنے برتنوں میں تیار کرکے فروخت کرتے ہیں ، کیا مسلمانوں کے لئے ایسی اشیاء کا کھانا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

درست ہے ۔ مگر پرہیزگار شخص کے لئے بر بنائے تقویٰ و احتیاط احتراز بہتر ہے ۔ نصاب الاحتساب باب عاشر میں ہے : و ما ابتلینا به من شراء السمن و الخل و اللبن و الجبن و سائر المائعات من الهنود علی احتمال تلوث اوانیهم فان نساء هم لا یتوقین عن السرقین و کنا یأکلون لحم ما قتلوه و ذلک کله میتة فعلی المحتسب ان لم یجد بداً منهم ان یستوثق علیهم لن یجتنبوا عن السرقین و المیتة فان شق علیهم یأمرهم ان یعطوا اوانیهم مسلما یغسلها او یغسلوا ایدیهم بمرأیٰ من مسلم و الا فالإباحة فتویٰ و التحرز تقویٰ ۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراهة باب رابع عشر میں ہے : و لا بأس بطعام المجوس کله الا الذبیحة فان ذبیحتهم حرام ۔ خزانۃ الروایہ میں ہے : فی متفرقات دستور القضاة عن

الینابیع لا بأس بعیادۃ اہل الذمۃ و حضور جنائزہم و اکل طعامہم و المعاملۃ معہم و فی المضمرات لا یکرہ للمسلم ان یعزیہم و یعود مرضاہم و یأکل من طعامہم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو لوگ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ الکریم کی افضلیت کے قائل ہیں مثلاً شیعہ وغیرہ، کیا ان کے ساتھ راہ و رسم رکھنا اور ان کی مجالس میں جانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

ایسے اشخاص اہل سنت کے پاس بدعتی ہیں ۔ ان سے راہ و رسم رکھنے اور ان کی مجالس میں شریک ہونے سے احتراز کرنا چاہئے ۔ عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ میں ہے : و ان کان یفضّل علیاً کرّم اللّٰہ وجہہ علیٰ ابی بکر رضی اللّٰہ عنہ لا یکون کافرا الا انہ مبتدع ۔ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۰۲ باب المرتد میں ہے : و ان کان یفضل علیا علیہما فہو مبتدع ۔ شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۱۹۸ میں ہے : و المبتدع ہو من خالف فی العقیدۃ طریقۃَ اہل الحق و ہو کالفاسق ۔ شرح میں ہے : و حکم المبتدع البغض و العداوۃ و الإعراض عنہ و الإہانۃ و الطعن و اللعن و کراہیۃ الصلاۃ خلفہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص بزرگوں کے لئے بغرض ایصالِ ثواب کچھ کھانا پکا کر غرباء کو کھلائے ، جیسے نیازِ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ ، یا اپنے کسی عزیز کے انتقال کے بعد فاتحہ سیوم و دہم و چہلم وغیرہ کرے اور مولود خوانی کرائے ، تو کیا ایسا شخص شرعاً بدعتی و گنہگار ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر کوئی شخص کچھ عمل خیر کرے ، مثلاً نماز پڑھے یا روزہ رکھے یا صدقہ دے یا کھانا پکاکر کھلائے یا وعظ و نعت خوانی کی مجالس منعقد کرائے اور اس عمل سے اس کی یہ غرض ہو کہ اس کا ثواب بزرگانِ دین یا اپنے عزیز و اقارب کی ارواح کو پہونچے ، تو اس کا یہ فعل شرعاً جائز ہے ۔ اور اس کی نیت موافق خدائے پاک اس کا ثواب ان ارواح کو ایصال فرماتا ہے ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۳۶۱ میں ہے : للانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلاۃ او صوما او صدقۃ او غیرہا کذا فی الہدایۃ ۔ اسی صفحہ میں ہے : و فی البحر من صام او صلی او تصدق و جعل ثوابہ لغیرہ من الأموات و الأحیاء جاز و یصل ثوابہا إلیہم عند أہل السنّۃ و الجماعۃ کذا فی البدائع ۔ دُرِ مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۲ کتاب الحج باب الحج عن الغیر میں ہے :

الأصل ان كل من اتىٰ بعبادة ما له جعل ثوابها لغيرها و ان نواها عند الفعل لنفسه كظاهر الدلالة۔ رد المحتار میں ہے : (قوله بعبادة ما) اى سواء كانت صلاة او صوما او صدقة او قراءة او ذكرا او طوافا او حجا او عمرة او غير ذلك من زيارة قبور الانبياء عليهم الصلاة و السلام و الشهداء و الصالحين و تكفين الموتىٰ و جميع انواع البر كذا في الهندية ۔ پس صورت مسئولہ میں بغرض ایصال ثواب ارواح بزرگان و ارواح اہل قرابت کھانا پکاکر فقراء و مساکین وغیرہ کو کھلانا اور ایسا مولود شریف پڑھانا کہ جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی میلاد شریف کا ذکر اور آپ کی منقبت ہو ، یا اکابرِ دین کا ذکرِ خیر اور اُن کے خصائلِ حمیدہ کا تذکرہ ہو شرعاً درست ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

(تفصیل کے لئے صفحہ ۳۵۲ ، ۳۹۹ ، ۴۶۶ بھی ملاحظہ ہو)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی حنفی شخص کسی غیر مقلد کے کہنے سے آمین بالجہر و رفع یدین کرنے لگے تو کیا شرعا جائز ہے ؟ اور کیا کوئی مقلد کسی مسئلہ میں اپنے امام کے مذھب کے خلاف عمل کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

نا واقف و عامی شخص کے لئے تمام مسائل میں اپنے امام کی تقلید کرنا واجب ہے ۔ مقلد ہوکر اگر کسی مسئلہ میں اپنے امام کے مذھب کے خلاف عمل کرے تو یہ شرعا نا درست و باطل ہے ۔ ذو المناصب شیخ ابن حاجب نے مختصر اصول میں لکھا ہے : و لا يرجع عن قول المجتهد بعد تقليده اتفاقا ۔ قاضی عضد الملۃ و الدین نے شرح مختصر اصول میں لکھا ہے : اذا عمل العامي بقول مجتهد في حكم مسئلة فليس له الرجوع عنه الى غيره ۔ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۵۳ میں ہے : و ان الرجوع عن التقليد بعد العمل باطل ۔ غیر مقلدین چونکہ مذاہب اربعہ اہل سنت کے خلاف ہیں اس لئے ان کی اتباع و پیروی نہ کرنے پر علمائے اہل سنت کا اجماع و اتفاق ہے ۔ الاشباہ و النظائر میں ہے : و ما خالف الائمة الاربعة مخالف للاجماع و ان كان فيه خلاف لغيرهم و قد صرح في التحرير ان الاجماع انعقد على عدم العمل بمذهب مخالف للاربعة لانضباط مذاهبهم و انتشارها و كثرة اتباعهم ۔ تفسیر احمدی میں ہے : قد وقع الاجماع على ان الاتباع انما يجوز للاربع فلا يجوز الاتباع لمن حدث مجتهدا مخالفا لهم ۔ واللہ اعلم ۔ (صفحہ ۴۲۰ دیکھا جائے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سونے چاندی کی گھنڈیاں یا گھڑی کا توڑہ یا کنجیوں کی زنجیر

وغیرہ کا استعمال مردوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح ریشمی جانماز پر نماز پڑھنا، یا ریشمی تچھ میں کپڑے باندھنا، یا قرآن کے جزدان، اور روپیوں کی تھیلی ریشمی کپڑے کی سلوانا جو از قسم لباس نہیں ہے شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

یہ چیزیں مردوں کے لئے مباح تو ہیں مگر ایسے مباحات کا ترک بہتر ہے، کیونکہ قیامت میں مباح کا بھی حساب ہوگا۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے: و فی الوھبانیۃ عن المنتقیٰ لا بأس بعروۃ القمیص و زرہ من الحریر لأنہ تبع و فی التاتارخانیۃ عن السیر الکبیر لا بأس بأزرار الدیباج و الذھب۔ رد المحتار میں ہے: ان کلا من العلم و الکفاف فی الثوب انما حل لکونہ قلیلا و تابعا غیر مقصود کما صرحوا بہ و قد استویٰ کل من الذھب و الفضۃ و الحریر فی الحرمۃ فترخیص العلَم و الکفاف من الحریر ترخیص لھما من غیرہ ایضا بدلالۃ المساواۃ۔ صفحہ ۲۳۳ میں ہے: و لا تکرہ الصلاۃ علی سجادۃ من الابریسم لان الحرام ھو اللبس اما الانتفاع بسائر الوجوہ فلیس بحرام کما فی صلاۃ الجواھر و اقرہ القھستانی وغیرہ۔ قلت و منہ یعلم حکم ما کثر السؤال عنہ من بند السبحۃ فلیحفظ۔ بقی الکلام فی بند الساعۃ الذی تربط بہ و یعلق الرجل بزر ثوبہ و الظاھر انہ کبند السبحۃ الذی تربط بہ تامل، و مثلہ بند المفاتیح و بنود المیزان و لیقۃ الدواۃ و کذا الکتابۃ فی ورقۃ الحریر و کیس المصحف و الدراھم و ما یغطی بہ الأوانی و ما تلف فیہ الثیاب و ھو المسمیٰ "بقچہ" و نحو ذلک مما فیہ انتفاع بدون لبس او ما یشبہ اللبس۔ صفحہ ۲۳۱ در مختار میں ہے: و المباح ما أجیز للمکلفین فعلہ و ترکہ بلا استحقاق ثواب و عقاب نعم یُحاسَب علیہ حساباً یسیرا۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف کا ترجمہ انگریزی زبان میں بلا متن شائع کروایا جائے تو درست ہے یا نہیں؟ بہ صورت جواز اگر کسی لفظ قرآنی کے انگریزی میں متعدد معنی ہوسکتے ہیں تو کیا سب معنی لکھے جائیں یا ایک لکھنا کافی ہوگا؟

الجواب

قرآن شریف کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یوروپین اقوام میں اس کی اشاعت ہو اور وہ لوگ اس کی حقانیت و خوبی سے واقف ہوکر مائل بہ اسلام ہوں۔ اسلام کی روشنی ابتداء میں جب عجمی ممالک میں پھیلی اس وقت اس بات کی زیادہ ضرورت تھی کہ عجمی مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے قرآن شریف

ان کی زبان میں ترجمہ کیا جاتا، مگر صحابہ کرام نے اس کا قصد نہیں فرمایا۔ بلکہ خطبہ جمعہ بھی عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں نہیں پڑھا جاتا تھا۔ کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۱۴۳ میں یہ حدیث وارد ہے : قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلم " تعلّموا کتاب اللّٰہ و اَفشوہ و تعاھدوہ و تغنوا بہ فوالذی نفس محمد بیدہ لھُوَ اشدّ تفصیاً من صدور الرجال من المخلص فی العقل " ۔ یعنی کتاب اللہ کو سیکھو اور خوب اس کا افشاء و اظہار کرو بکثرت تلاوت کرتے رہو کیونکہ یہ انسانوں کے سینوں سے نکل بھاگ جانے والی چیز ہے۔ صفحہ ۱۴۳ میں ہے : ان اللّٰہ یحب ان یقرأُ القرآن کما انزل ۔ یعنی اللہ پاک اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ قرآن ویسا ہی پڑھا جائے جیسا کہ نازل ہوا ہے۔ پس ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن پاک جیسا نازل ہوا ہے اس کو ویسا ہی پڑھنا چاہیئے، اور اس کی اشاعت بھی اسی زبان میں ہو جس میں کہ وہ نازل ہوا ہے۔ اور یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ غیر زبان کے لوگ اس کو صحیح تلفظ میں نہیں پڑھ سکیں گے اور ان سے غلطیاں ہوں گی اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی نا دانستگی سے قرآن غلط پڑھ لے یا وہ غیر زبان والا شخص ہو تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو مقرر کرتا ہے کہ جب ایسے لوگ قرآن پاک غلط پڑھیں تو وہ فرشتہ انکے الفاظ کو درست کرکے بارگاہ خداوندی میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ کنز العمال کے صفحہ ۱۲۸ جلد ۱ میں ہے ، اذا قرأُ القرآن فأخطأ او لحن او کان اعجمیا کتبہ الملک کما انزل ۔ صفحہ ۱۲۹ میں ہے : ان مَلَکا موکل بالقرآن فمن قرأہ من اَعجمی او عربی فلم یقوّمہ قوّمہ المَلَک ثم رفعہ قواما ۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو چونکہ منظور تھا کہ قرآن پاک عربی زبان میں شائع ہو، اس لئے آپ فرماتے ہیں کہ : ان القرآن لم ینزل بالکسکسۃ و لا بالکتکتۃ و لکن بلسان عربی مبین ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا و رسول کی مرضی یہی ہے کہ قرآن شریف عربی زبان ہی میں شائع ہو نہ کہ کسی اور زبان میں۔ قطع نظر اس کے، عربی زبان جس قدر وسیع ہے تا حال انگریزی زبان کو ایسی وسعت حاصل نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ جو جو مطالب قرآن پاک میں ہیں وہ بجنسہٖ انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوسکتے اور نہ اس خوبی و اعجاز سے جو قرآن منزل کو حاصل ہے اس کا ویسا ہی ترجمہ ہوسکتا ہے۔ پس جبکہ اس کا محض ترجمہ بلا متن عربی شائع ہوگا تو لوگ اسی کو قرآن سمجھیں گے ایسی صورت حال میں گویا قرآن منزل من اللہ کی اشاعت کی جگہ ایک نئی چیز کا رواج " قرآن " کے نام سے ہوگا جس میں تحریف و تبدیل کے احتمال کے ساتھ مسلمانوں کا سچا دین اسلام ہی خطرے میں پڑجائے گا۔ انہیں اسباب کے پیش نظر محدثین کرام نے حدیث شریف کی روایت بالمعنی یعنی ترجمہ کو نا پسند کیا ہے، کیونکہ لوگ اپنی نا دانستگی سے کچھ کا کچھ سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرلیتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ ترجمہ کیا ہے وہی حق ہے! حالانکہ حق اس کے خلاف ہے۔ شرح نخبۃ الفکر کے صفحہ ۹۶ میں ہے : قال القاضی عیاض ینبغی سد باب الروایۃ بالمعنی لئلا یتسلط ممن لا یحسن ممن یظن انہ یحسن ۔ حاشیہ میں ہے : حاصلہ انہ ینبغی سد باب الروایۃ بالمعنی و لو انفتح نعلماء لظن الذین لا یعلمون انھم یعلمون فیجترؤن علی الروایۃ بالمعنی فیُحرّفون الکَلِم عن مواضعہ ۔

پس صورت مسئولہ میں قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ بلا عربی متن کے شائع کرنا درست نہیں۔ البتہ متن

قرآن شریف کے ساتھ جیسا کہ ہندوستان میں اردو فارسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے دیگر زبانوں کا ترجمہ شائع کرنا بر بنائے قول ہندوانی " درست ہے ۔ رد المحتار جلد ا صفحہ ۳۳۱ باب صفۃ الصلاۃ میں ہے : فی الفتح عن الکافی ان اعتاد القراءۃ بالفارسیۃ او اراد ان یکتب مصحفا بها یمنع و ان فعل فی آیۃ او آیتین لا فان کتب القرآن و تفسیر کل حرف و ترجمتہ جاز ۔ اس کے بعد ہے : و یکرہ کتب التفسیر بالفارسیۃ فی المصحف کما یعتادہ البعض و رخص فیہ الهندوانی و الظاہر ان الفارسیۃ غیر قید ۔ اسی صفحہ کے حاشیہ در مختار میں ہے : و تجوز کتابۃ آیۃ او آیتین بالفارسیہ لا اکثر ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔ (صفحہ ۴۴۳ اور ۴۵۴ بھی دیکھئے)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حجاب یعنی پردہ کرنا کیا مسلمان عورتوں کے لئے فرض ہے ؟ اگر کوئی عورت بوجہ ناداری و مفلسی بے پردہ ہوکر اپنی ضروریات معاش کی فکر کرے تو کیا شرعاً گنہگار ہوگی ؟ بینوا توجروا !

الجواب

آیت حجاب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی ازواج مطہرات کی شان میں وارد ہے اس کے ذریعہ ازواج مطہرات پر پردہ فرض کیا گیا ہے ۔ ان کے سوا دیگر مسلمان عورتوں پر بھی پردہ لازم ہے ۔ مگر وہ عورتیں جن کا کوئی پرورش کرنے والا اور سرپرست نہیں ہے ، اپنی ضروریاتِ معاش کے لئے موٹے دھاٹے بدوضع کپڑوں اور معمولی لباس میں خوب ساتر برقعہ پہنکر باہر جاسکتی ہیں ۔ تفسیر احمدی مطبوعہ فتح کریم بمبئی کے صفحہ ۶۳۱ میں ہے : ھذا ھو المقصود من ذکر الآیۃ فی ھذا الموضع لان موردھا و ان کان خاصا فی حق ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لکن الحکم عام لکل من المؤمنات فیفھم منہ ان یحتجب جمیع النساء من الرجال و لا یبدین انفسھن علیھم ۔ عینی شرح صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۰۳ میں ہے : قال عیاض فرض الحجاب مما اختص بہ ازواجہ صلی اللہ علیہ و سلم فھو فرض علیھن بلا خلاف فی الوجہ و الکفین فلا یجوز لھن کشف ذلک فی شھادۃ و لا غیرھا و لا اظہار شخوصھن و ان کن مستترات الا ما دعت الیہ ضرورۃ من براز کما فی حدیث حفصۃ لما توفی عمر رضی اللہ عنہ سترھا النساء عن ان یری شخصھا و لما توفیت زینب جعلوا لھا قبۃ فوق نعشھا تستر شخصھا ۔ و لا خلاف ان غیرھن یجوز لھن ان یخرجن لما یحتجن الیہ من امورھن الجائزۃ بشرط ان یکن بذۃ الھیئۃ خشنۃ الملبس تفلۃ الریح مستورۃ الأعضاء غیر مُتبرّجات بزینۃ و لا رافعۃ صوتھا ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سینڈھی ، تاڑی ، شراب وغیرہ حرام چیزوں کی آمدنی سے مسجد یا مدرسہ وغیرہ بنانا ، یا خیرات کرنا ، یا کسی نیک کام میں اس کو خرچ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

جو کام کہ حسبۃً للہ بغرضِ تقربِ الٰہی ثواب کی نیت سے کئے جاتے ہیں ، ایسے کام حرام مال سے کرنا شرعاً حرام ہے ، اور کرنے والا گنہگار بلکہ کافر ہے ۔ بناء بریں صورت مسئولہ میں حرام آمدنی سے مسجد وغیرہ کی تعمیر کرنا اور اس کا خیرات وغیرہ کرنا ناجائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۷ کتاب الزکاۃ میں ہے : و فی شرح الوھبانیۃ عن البزازیۃ انما یکفر اذا تصدق بالحرام القطعی ۔ در مختار میں ہے : رجل دفع الی فقیر من مال الحرام شیئا یرجو به الثواب یکفر ۔ اس کے آگے ہے : قلت الدفع الی الفقیر غیر قید بل مثله فیما یظهر لو بنی من الحرام بعینه مسجدا و نحوه مما یرجو به التقرب لأن العلة رجاء الثواب فیما فیه العقاب و لا یکون ذلک الا باعتقاد حله ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرعہ اندازی شریعت سے ثابت ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو کن امور میں قرعہ ڈالنا درست ہے ؟

الجواب

مساوات و عدم امتیاز کے موقعہ پر ، دفعِ تہمت و اطمینانِ قلب کے لئے مندرجہ ذیل امور میں قرعہ اندازی شریعت سے ثابت ہے :

۱ ۔ امامت کے وقت ، جبکہ سب استحقاق میں مساوی ہوں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۱ باب الامامہ میں ہے : فان استووا یقرع بین المستویین ۔

۲ ۔ کسی کی متعدد بیویاں ہوں ، اگر وہ سفر کا قصد کرے اور ان میں سے کسی ایک بیوی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو اس کے لئے بھی قرعہ ڈالنا چاہیئے ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب القسم میں ہے : و لا قسم فی السفر دفعا للحرج فله السفر بمن شاء منهن و القرعة احب تطییبا لقلوبهن ۔

۳ ۔ مال غنیمت سے جو خمس ، اللہ و رسول کا لیا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جملہ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کردیئے جاتے ہیں اور پھر ان پر قرعہ اندازی کی جاتی ہے ۔ قرعہ میں جو خمس ، اللہ کے نام کا نکلے اس کو امام وقت (امیر المؤمنین یا سلطان وغیرہ) لے لیتا ہے اور باقی حصے مجاہدین پر تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ شرح السیر الکبیر للعلامہ شمس الائمہ السرخسی جلد ۲ باب سہمان الخیل و الرجالۃ میں ہے : و ذکر عن مالک بن عبد اللہ

الخثعمی قال کنت بالمدینه فقام عثمان بن عفان رضی اللّٰہ عنه فقال هل هاهنا من اهل الشام احد فقلت نعم یا امیر المؤمنین قال فاذا اتیت معاویة (رضی اللّٰہ عنه) فأمره ان فتح اللّٰہ علیه ان یأخذ خمسة اسهم ثم یکتب فی احدها " اللّٰہ " ثم یقرع فحیث ما وقع فلیأخذه - و فی هذا بیان انه لا ینبغی للامیر ان یتخیر اذا میز الخمس من الأربعة الأخماس و لکنه یمیز بالقرعة و قد دل علیه حدیث ابن عمر رضی اللّٰہ عنهما قال کانت الغنائم یجزأ خمسة اجزاء ثم یسهم علیها فما کان للنبی صلی اللّٰہ علیه و سلم فهو له و لا یتخیر - فکان المعنی فیه ان کل امیر مندوب الی مراعاة قلوب الرعیة و الی نفی تهمة المیل و الاثرة عن نفسه و ذلک انما یحصل باستعمال القرعة عند القسمة بین من تحت رایته فکذلک یستعمل القرعة فی تمییز الخمس من الأربعة الأخماس -

۴ - مال مشترک کی تقسیم کے وقت بھی قرعہ اندازی کی جاتی ہے ، تاکہ ہر ایک شریک کو دوسرے پر الزام کا موقعہ نہ ملے کہ اس نے اچھا مال لے لیا ، اور ہر ایک کے دل کو اطمینان ہو جائے - در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب القسمۃ میں ہے : و یصور القاسم ما یقسمه علی قرطاس لیرفعه للقاضی و یعدله علی سهام القسمة و یذرعه و یقوم البناء و یفرز کل نصیب بطریقه و شربه و یلقب الأنصباء بالأول و الثانی و الثالث و هلم جرا و یکتب اسامیهم و یقرع لتطییب القلوب - و اللّٰہ اعلم -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ پادشاہ ، یا استاد ، یا پیر ، یا والدین کی قدمبوسی کرنا ، اور ان کے قدموں پر پیشانی رکھنا ، اور ان کی تعظیم کیلئے کھڑے ہونا ، اور دست بوسی کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

عادل پادشاہ یا پیر اور والدین اور استاد کا ہاتھ چومنا ، اور ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونا درست ہے - قدموں پر پیشانی رکھنا ، یا ان کے قدم چومنا ، یا ان کے روبرو سجدہ کرنا درست نہیں ہے - در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۵۳ میں ہے : لا بأس بتقبیل ید الرجل العالم و المتورع علی سبیل التبرک - درر ؛ و نقل المصنف عن الجامع انه لا بأس بتقبیل ید الحاکم المتدین و السلطان العادل و قیل سنة ، مجتبی - صفحہ ۲۵۴ میں ہے : و فی الوهبانیة : یجوز بل یندب القیام تعظیما للقادم ، کما یجوز و لو للقاریٔ بین یدی العالم -

عالمگیری جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ باب ملاقاۃ الملوک و التواضع لہم صفحہ ۳۶۸ میں ہے : من سجد للسلطان علی وجه التحیة او قبل الأرض بین یدیه لا یکفر و لکن یأثم لارتکابه الکبیرة هو المختار - صفحہ ۳۶۹ میں ہے : الإنحناء للسلطان او لغیره مکروه لأنه یشبه فعل المجوس کذا فی جواهر الأخلاطی ؛ و یکره الإنحناء عند التحیة و به ورد النهی کذا فی التمرتاشی - اسی صفحہ میں

ہے : و ان قبّل ید عالم او سلطان عادل لعلمه و عدله لا بأس به هکذا ذکره فی فتاوی اهل سمرقند ۔ ان قبّل ید غیر العالم او غیر السلطان العادل ان اراد به تعظیم المسلم و اکرامه فلا باس به ۔ اسی جگہ ہے : طلب من عالم او زاهد ان یدفع الیه قدمه لیقبله لا یرخص فیه و لا یجیبه الی ذلک عند البعض و ذکر بعضهم یجیبه الی ذلک ، و کذا اذ استأذنه ان یقبّل رأسه او یدیه کذا فی الغرائب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ " چینا سلک " جو ٹسر سے بنتا اس کا پہننا مردوں کے لئے درست ہے یا نہیں ؟ اور کیا اس کو پہنکر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں ؟ ٹسر اور ریشم میں فرق یہ ہے کہ ریشم کے کیڑے پرورش کئے جاتے ہیں ، جب وہ ریشم بنا سکتے ہیں تو اس کو پانی میں جوش دیا جاتا ہے پھر اس کے تار نکالے جاتے ہیں ۔ ٹسر کے کیڑوں کی پرورش نہیں ہوتی ۔ بلکہ وہ قدرتاً بعض درختوں پر پیدا ہوتے ہیں اور اپنے لئے ایک گھر بناتے ہیں جو ریشہ دار ہوتا ہے جب اس کو پورا کرکے وہ مر جاتے ہیں تو اس کا ریشہ نکال کر کام میں لیا جاتا ہے وہی ٹسر ہے ، اس کو پکایا نہیں جاتا اور اس میں ریشم کی طرح چمک اور ملائمت بھی نہیں ہوتی !

الجواب

ریشم کو عربی میں " حریر " کہتے ہیں اور یہ بغیر پکائے نہیں بنتا ۔ مُغرب میں ہے : و الحریر الابریسم المطبوخ ۔ ٹسر پر چونکہ ریشم کی تعریف صادق نہیں آتی اس لئے اس کا استعمال مردوں کے لئے درست ہے ، بشرطیکہ فخر و مباہات کی نیت سے استعمال نہ ہو ۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراهۃ باب اللبس میں ہے : و کان ابوحنیفة رحمه الله تعالیٰ لا یریٰ بأسا بلبس الخز للرجال و ان کان سداه حریرا ۔ قال العبد : الخز فی زمانهم کان من اوبار ذلک الحیوان المائی الذی یسمیٰ بالعربیة خزا و قضاعة و بالترکیة قندز ، و الیوم یتخذ من الحریر العفن فیجب ان یکره کالقز کذا فی الملتقط ۔ قال محمد لا بأس بالخز اذا لم یکن فیه شهرة و الا فلا خیر فیه کذا فی الغیاثیة ۔

ہر قسم کے کپڑے میں جبکہ وہ بدن ڈھانکنے والا ہو نماز ہوجاتی ہے ، مگر بغیر عذر کے ریشمی کپڑا پہنکر نماز پڑھنا باعث معصیت ہے ۔ ٹسر چونکہ ریشم نہیں ہے اس لئے اس کو پہن کر نماز پڑھنا درست ہے ۔ مبسوط جلد ۲ صفحہ ۸۸ باب نوادر الصلاۃ میں ہے : و النهی متی کان لمعنی فی غیر المنهی عنه لا یکون مفسدا کالنهی عن الصلاۃ فی الارض المغصوبة ۔ رد المحتار جلد ۱ باب شروط الصلاۃ میں ہے : قوله و الرابع تستر عورته ای و لو بما لا یحل لبسه کثوب حریر و ان اثم بلا عذر ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بعض اشخاص کا خیال ہے کہ اپنے پیر کے بالائی نصف حصہ

کی تصویر مکان میں رکھنا اور روزانہ اس کی زیارت کرنا باعث فضیلت و عبادت ہے ۔ چنانچہ بعض مرشدوں نے اپنے جسم کے بالائی حصہ کا فوٹو مریدوں میں تقسیم کیا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ نصف حصہ کی تصویر رکھنا جائز ہے ۔ پس کیا یہ فعل شرعاً جائز ہے اور ان کا قول درست ہے ؟

الجواب

جاندار کی تصویر مکان میں عزت و توقیر کی جگہ رکھنا اور اس کی تعظیم و تکریم کرنا شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے ، اور اس کا احترام شرک ہے ۔ البتہ وہ تصویر جس کا سر کٹا ہوا ہے ، یا بچھونے اور تکیہ وغیرہ روندنے اور چلنے پھرنے کے مقام میں بچھی ہے جہاں اس کی تذلیل و بے حرمتی ہوتی ہو تو اس میں مضائقہ نہیں ہے ۔ عمدۃ القاریٔ شرح صحیح بخاری جلد ۱۰ کتاب اللباس میں ہے : و فی التوضیح قال اصحابنا وغیرہم تصویر صورۃ الحیوان حرام اشد التحریم و ہو من الکبائر و سواء صنعہ لما یمتہن او لغیرہ فحرام بکل حال لأن فیہ مضاہاۃ لخلق اللّٰہ و سواء کان فی ثوب او بساط او دینار او درہم او فلس او اناء او حائط و اما ما لیس فیہ صورۃ حیوان کالشجر و نحوہ فلیس بحرام و سواء کان فی ہذا کلہ ما لہ ظل و ما لا ظل لہ بمعناہ قال جماعۃ العلماء مالک و الثوری و ابو حنیفۃ وغیرہم ۔ یعنی امام ابو حنیفہ ، امام مالک ، امام سفیان ثوری وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ، کسی بھی جاندار کی تصویر بنانا یا رکھنا سخت ترین حرام ہے اور ایسا فعل گناہ کبیرہ ہے ، خواہ وہ تصویر بے عزت یا ذلیل رکھی جائے یا اس کی عزت کی جائے ہر حال قطعاً حرام ہے ۔ کیونکہ اس کے بنانے میں اللہ رب العالمین کی تخلیق کی نقل ہوتی ہے ۔ خواہ تصویر پہننے کے لباس پر ہو یا فرش پر ہو یا سکہ پر ہو یا برتن پر ہو یا دیوار وغیرہ پر بنائی جائے ، خواہ ایسی ہو کہ اس کا سایہ پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو اس کی اشد ترین حرمت ہے ! امام نووی نے تو اس کے حرام ہونے پر اجماع ذکر کیا ہے ۔ رد المحتار کی جلد ا کتاب الصلاۃ باب المکروہات میں ہے : و ظاہر کلام النووی فی شرح المسلم الإجماع علیٰ تحریم تصویر الحیوان و قال سواء صنعہ لما یمتہن او لغیرہ فصنعتہ حرام بکل حال لأن فیہ مضاہاۃ لخلق اللّٰہ و سواء فی ثوب او بساط او درہم او اناء او حائط و غیرہا ۔

ہدایہ کے مکروہات صلاۃ میں ہے : و اذا کان التمثال مقطوع الرأس او ممحو الرأس فلیس بتمثال لأنہ لا تعبد بدون الرأس ۔ شرح سیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ میں ہے : و انما یرخص فی التمثال فی البساط و الوسادۃ و نحو ذلک مما ینام و یجلس علیہ لحدیث جبرئیل علیہ السلام حیث قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و اما ان یقطع رؤسہا او یتخذ وسائد منبوطاً و ہذا لأنہ اشد فی ذلک تعظیم الصورۃ و الشبہ لمن یعبدہا ۔ بنایہ شرح ہدایہ کے مکروہات میں ہے : لکن الجلوس و النوم علیہ لا بأس بہ لأنہ فیہ استہانۃ لہا لا تعظیمہا ۔ پس صورت مسئولہ میں جن اشخاص نے پیر کی تصویر فضیلت و عبادت و عزت و احترام کے لئے رکھی ہے قطعاً حرام ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مردوں کو کس رنگ کا خضاب استعمال کرنا جائز ہے ؟ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم اور صحابہ کرام نے کون سے رنگ کا خضاب استعمال فرمایا تھا ؟

الجواب

غازی و مجاہد کے لئے سیاہ رنگ کا خضاب استعمال کرنا جائز ہے ، دوسرے اشخاص کے لئے حنا و کتم کا خضاب مستحب ہے ۔ دُر مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : یستحب للرجل خضاب شعرہ و لحیتہ و لو فی غیر حرب فی الاصح و الأصح انہ علیہ السلام لم یفعلہ و یکرہ بالسواد قیل لا ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ خضاب شعرہ) لا یدیہ و رجلیہ فانہ مکروہ للتشبیہ بالنساء و (قولہ یکرہ بالسواد) ای بغیر الحرب قال فی الذخیرۃ اما الخضاب بالسواد للغزو لیکون اھیب فی عین العدو فھو محمود بالاتفاق ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے خضاب استعمال نہیں فرمایا کیونکہ بوقتِ وصال آپ کی ریشِ مبارک میں سترہ (۱۷) بال سفید تھے ، اس لئے آپ (صلی اللہ علیہ و سلم) کو خضاب کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ البتہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حناء (مہندی) اور کتم (ایک قسم کی نباتات) کا خضاب کیا ہے ۔ در مختار کی عبارت سابقہ میں ہے : و الأصح انہ علیہ السلام لم یفعلہ ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ و الأصح انہ الخ) لأنہ لم یحتج الیہ لأنہ توفی و لم یبلغ شیبہ عشرین شعرۃ فی رأسہ و لحیتہ بل کان سبع عشرۃ کما فی صحیح البخاری و غیرہ ۔ و ورد ان ابا بکر الصدیق رضی اللہ عنہ خضب بالحناء و الکتم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اپنے خاوند کا نام لیکر اسے پکار سکتی ہے ؟ اور اسی طرح لڑکا اپنے باپ کا نام لے کر پکار سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کو اپنے شوہر کا نام لینا اور بیٹے کو اپنے باپ کا نام لے کر پکارنا مکروہ ہے ، بلکہ چاہئے کہ " میرے سردار ، میرے آقا " وغیرہ تعظیم کے الفاظ سے پکاریں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ کے فروع میں ہے : (و یکرہ ان یدعو الرجل اباہ و ان تدعو امرأۃ زوجھا باسمہ) لم یلفظہ ۔ رد المحتار میں ہے : (قولہ و یکرہ ان یدعو الخ) بل لا بد من لفظ یفید التعظیم کیا سیّدی و نحوہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عربی زبان کا سیکھنا کیا باعث فضیلت ہے ؟ اور دنیا کی تمام زبانوں میں عربی زبان کا کیا رتبہ ہے ؟

الجواب

عربی زبان کو دنیا کی تمام زبانوں پر فضیلت ہے ، اور اس کا سیکھنا اور سکھلانا باعث ثواب ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ کے فروع میں ہے : (للعربية فضل علىٰ سائر الألسن و هو لسان اهل الجنة من تعلمها او علمها غيرها فهو مأجور) ۔ و في الحديث " أحبُّوا العرب لثلاث لأني عربيٌّ و القرآن عربيٌّ و لسان اهل الجنة في الجنة عربيٌّ " ۔ یعنی دنیا کی تمام زبانوں پر عربی زبان کو فوقیت حاصل ہے ، اس لئے کہ عربی جنت کی زبان ہے ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد گرامی ہے : " عرب سے تین چیزوں کی وجہ سے محبت رکھو ، کیونکہ میں عرب ہوں ، اور قرآن عربی ہے ، اور جنت کے اندر جنت والوں کی زبان عربی ہوگی " ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب بیوپاری بازار کا نرخ گراں کردیں ، اور اپنے مقررہ نفع سے زیادہ حاصل کرنے کی طمع میں اشیاء کی قیمت بڑھادیں ، جس سے رعایا پر تنگی واقع ہو تو ایسی حالت میں حاکم وقت اشیاء کا نرخ مقرر کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

جبکہ بیوپاری طمع و حرص سے اپنے مقررہ نفع سے زائد حاصل کرنے کے لئے اشیاء کا نرخ بڑھادیں جس سے عامۃ الناس کو تکلیف و تنگی متصور ہو تو ایسے وقت میں حاکم ، اہل رائے کے مشورہ سے اشیاء کا نرخ مقرر کرسکتا ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ کے فرع میں ہے : (و لا يسعر حاكم لقوله عليه السلام " لا تُسعِرُوا فان الله هو المُسعر القابض الباسط الرّزاق " (الا اذا تعدى الأرباب عن القيمة تعديا فاحشا فليسعر بمشورة اهل الرأى) ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مشرکین و کفار مسجد میں آسکتے ہیں یا نہیں ؟ اسی طرح مسلمان دیول (مندر) اور گرجا میں جاسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب

مشرکین و کفار مسجد میں آسکتے ہیں۔ مگر مسلمان کا مندر، دیول و گرجا میں جانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ شیاطین کے مجمع کی جگہ ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ فصل فی البیع میں ہے: (و) جاز (دخول الذمی مسجدا) مطلقا۔ رد المحتار میں ہے: یکرہ للمسلم الدخول فی البیعة و الکنیسة و انما یکرہ من حیث انه مجمع الشیاطین لا من حیث انه لیس له حق الدخول۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں اگر گھوڑے کی سواری کریں یا مردوں کی طرح ہتھیار و لباس پہنیں تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب

عورتیں اگر کھیل تماشہ یا تفریح طبع کے لئے سواری وغیرہ مردانی کام کرتی ہیں، یا ہتھیار و مردانی لباس پہنتی ہیں تو ناجائز ہے۔ ورنہ ضروریاتِ سفر یا جہاد یا کسی اور دینی و دنیوی ضرورت کے لئے ایسا کرتی ہیں تو درست ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ کے فروع میں ہے: لا تركب مسلمة علي سرج للحديث، هذا لو للتلهي و لو لحاجة غزو او حج او مقصد ديني او دنيوي لا بدّ لها منه فلا بأس به۔ رد المحتار میں ہے: (قوله للحديث) و هو "لعن الله الفروج علي السروج" ذخيرة۔ لكن نقل المديني عن ابي الطيب انه لا اصل له اھ اي بهذا اللفظ و الا فمعناه ثابت ففي صحيح البخاري وغيره "لعن رسول الله صلي الله عليه و سلم المتشبّهين من الرجال بالنساء و المتشبّهات من النساء بالرجال" و في الطبراني ان امرأة مرت علي رسول الله صلي الله عليه و سلم متقلدة قوسا فقال "لعن الله المتشبهات من النساء بالرجال و المتشبهين من الرجال بالنساء" و الله اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان شریف میں محلہ کے لوگ چندہ کرکے مسجد کے امام و حافظ کو کچھ لباس بنوادیتے ہیں اور نقد بھی بطور تحفہ دیتے ہیں۔ کیا شرعاً یہ درست ہے؟

الجواب

درست ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ کے فروع میں ہے: جمع اھل

المحلة للإمام فحسن ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله جمع اهل المحلة) ای اشیاء من القوت او الدراهم (قوله فحسن) ای ان فعلوا فهو حسن و لا یسمی اجرة کما فی الخلاصة و الظاهر ان هذا من تعریفات المتقدمین المانعین اخذ الأجرة علی الإمامة و غیرها من الطاعات لتظهر ثمرة التخصیص علیه و الا فمجازاة الإحسان بالإحسان مطلوبة لکل احد ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی اپنے جان و مال و دین و اہل و عیال کی حفاظت کے لئے ظالم و جابر عہدیداروں کو کچھ دے ؟ یا اپنا حق حاصل کرنے کے لئے تحفہ تحائف سے کسی حاکم کی مدارات کرے ، یا شاعروں کو تعریف و توصیف کے صلہ میں یا ان کی زبان بندی کے لئے کچھ دے ، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ کے فروع میں ہے : لا بأس بالرشوة اذا خاف علی دینه و النبی علیه السلام کان یعطی الشعراء و لمن یخاف لسانه و کفی بسهم المؤلفة من الصدقات دلیلا علی امثاله ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله اذا خاف علی دینه) عبارة المجتبی : لمن یخاف و فیه ایضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه و ماله و لاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع (قوله کان یعطی الشعراء) فقد روی الخطابی فی الغریب عن عکرمة مرسلا قال اتی شاعر النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فقال " یا بلال اقطع لسانه عنی " فأعطاه اربعین درهما ۔ اور صفحہ ۲۹۶ رد المحتار میں ہے : لأنه انما یدفع له عادة قطعا للسانه کما مرّ فلو کان ممن یؤمن شره فالظاهر ان ما یدفع له حلال بدلیل دفعه علیه السلام بُردَته لکعب رضی اللّٰه عنه لما امتدحه بقصیدته المشهورة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سائل جو سلام کرتا ہے اور اس کی غرض اس سلام سے محض مانگنا ہوتا ہے ، کیا اس سلام کا جواب دینا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب

ضروری نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : و لا یجب رد

سلام السائل لأنه ليس للتحية ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی مسلمان کو کبھی کسی مشرک یا کافر کو سلام کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے ؟ اور اگر کرے تو کن الفاظ کے ساتھ ؟ بیان فرمایا جائے !

الجواب

مسلمان ضرورت کے وقت مشرک و کافر پر سلام کرسکتا ہے ۔ اور چاہئے کہ السلام علی من اتبع الھُدیٰ کے لفظ سے سلام کرے اور تحریر میں بھی یہی لکھے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے : (و یسلم) المسلم علی اهل الذمة لو له حاجة الیه و الا کره و هو الصحیح ۔ رد المحتار میں ہے ، لکن فی الشرعة اذا سلم علی اهل الذمة فلیقل " السلام علیٰ من اتبع الھُدیٰ " و كذلك يكتب فى الكتاب اليهم و فى التاتارخانية قال محمد اذا كتبت الى يهودى او نصرانى فى حاجة فاكتب " السلام علیٰ مَن اتَّبع الھُدیٰ " ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو شخص کسی عورت سے عقد کرنا چاہتا ہے ، اگر قبل از عقد اس کو دیکھنا چاہے تو کیا شرعا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

سنت سمجھکر دیکھنا جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ فصل فی النظر و المس میں ہے : و كذا مريد نكاحها و لو عن شهوة بنية السنة لا قضاء الشهوة ۔ رد المحتار میں ہے : و لو اراد ان يتزوج امرأة فلا بأس ان ينظر اليها و ان خاف ان يشتهيها لقوله عليه السلام للمغيرة بن شعبة حين خطب امرأة " انظر اليها فانه احرىٰ ان يؤدم بينكما " رواه الترمذى و النسائى و غيرهما و لأن المقصود اقامة السنة لا قضاء الشهوة اهـ ۔ و الادم و الإيدام ، الإصلاح و التوفيق ؛ اتقانى ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں عموماً آپس میں پردہ نہیں کرتیں ، نیز ایک دوسری کے سامنے بے ستر ہونے کو عیب نہیں جانتیں ۔ اسی طرح کٹنوں اور ہیجڑوں کے سامنے نکلنا بھی معیوب نہیں

خیال کرتیں ۔ اور اجنبی مردوں کی طرف نظر کرنا بھی ان کے پاس کوئی عیب نہیں ہے ۔ کیا یہ افعال عورتوں کے لئے شرعاً جائز ہیں یا نہیں ؟

الجواب

ایک مسلمان مرد دوسرے مرد کے جن اعضاء کو نہیں دیکھ سکتا ، ایک مسلمان عورت بھی دوسری عورت کے ان اعضاء کو نہیں دیکھ سکتی ۔ مثلاً ایک مرد دوسرے مرد کے ناف سے زانو تک کے حصہ کو نہیں دیکھ سکتا ، اسی طرح عورت بھی دوسری عورت کے ناف سے زانو تک کے حصہ کو نہیں دیکھ سکتی ۔

شریف و نیک عورت کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ بدکار عورتوں کے روبرو نہ آئے اور ان کے سامنے اپنی چادر وغیرہ نہ نکالے ، کیونکہ یہ غیر مردوں کے سامنے اس کا ذکر کریں گی ۔ اور غیر مسلم عورتیں تو مسلمان عورتوں کے حق میں مثل اجنبی مرد کے ہیں ، کہ مسلمان عورت جیسا غیر مرد سے پردہ کرتی ہے ویسا ہی کافرہ عورت سے کرنا چاہیے ۔ البتہ دایہ اور طبیب کو صرف اسی مقام کے دیکھنے کی اجازت ہے جہاں علاج کی ضرورت ہے اور بلا دیکھے کے چارہ نہ ہو اور نظر کا کچھ متبادل نہ ہو ۔

عورتوں کے لئے مخنثوں اور ہیجڑوں وغیرہ کے سامنے ہونا ناجائز ہے ۔ ہاں عورت اجنبی مرد کو ناف سے زانو تک کے سوا باقی حصہ کو دیکھ سکتی ہے بشرطیکہ اس کو شہوت کا خوف نہ ہو ، ورنہ حرام ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الإباحۃ فصل فی النظر میں ہے : (و تنظر المرأۃ المسلمۃ من المرأۃ کالرجل من الرجل) و قیل کالرجل لمحرمہ و الأول اصح (و کذا) تنظر المرأۃ (من الرجل) کنظر الرجل للرجل (ان امنت شھوتھا) فلو لم تأمن او خافت او شکت حرم استحسانا کالرجل ھو الصحیح فی الفصلین تاتارخانیۃ معزیا للمضمرات (و الذمیۃ کالرجل الأجنبی فی الأصح فلا تنظر الی بدن المسلمۃ) ۔ رد المحتار میں ہے : لا یحل للمسلمۃ ان تنکشف بین یدی یھودیۃ او نصرانیۃ او مشرکۃ الا ان تکون امۃ لھا کما فی السراج و نصاب الاحتساب ۔ و لا ینبغی للمرأۃ الصالحۃ ان تنظر الیھا المرأۃ الفاجرۃ لأنھا تصفھا عند الرجال فلا تضع جلبابھا و لا خمارھا کما فی السراج ۔ اس کے کچھ قبل در مختار میں ہے : و ینظر الطبیب الی موضع مرضھا بقدر الضرورۃ اذ الضروریات تتقدر بقدرھا و کذا نظر قابلۃ ۔ اس کے بعد کے صفحہ میں ہے : و الخصی و المجبوب و المخنث فی النظر الی الأجنبیۃ کالفحل ۔ رد المحتار میں ہے : و المخنث فحل فاسق ، قہستانی ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اولیاء اللہ کی مزاروں پر جو غلاف ، عمامے ، کپڑے اور پردے وغیرہ بغرض اظہار تجمل و شان ڈالے جاتے ہیں ۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے، مگر متأخرین نے صاحب مزار کی عزت و توقیر کے لئے ڈالنا جائز رکھا ہے، تاکہ عام لوگ صاحب مزار کی تعظیم کریں اور ناواقف زائرین خشوع و ادب کے ساتھ زیارت کریں۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۵۳ میں ہے: کرہ بعض الفقهاء وضع الستور و العمائم و الثياب علی قبور الصالحين و الأولياء قال في فتاوی الحجة و تكره الستور علی القبور اھ۔ و لكن نحن نقول الآن اذا قصد به التعظيم في عيون العامة حتی لا يحتقروا صاحب القبر و لجلب الخشوع و الادب للغافلين الزائرين فهو جائز لأن الأعمال بالنيات و ان كان بدعة فهو كقولهم بعد طواف الوداع يرجع القهقری حتی يخرج من المسجد اجلالا للبيت حتی قال في منهاج السالكين انه ليس فيه سنة مروية و لا اثر محكي و قد فعله اصحابنا اھ كذا في كتاب كشف النور عن اصحاب القبور للاستاذ عبد الغني النابلسي قدس سره۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہاتھ، منہ اور ناک صاف کرنے کے لئے جو دستی (رومال) رکھی جاتی ہے، کیا اس کو جیب میں رکھکر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا دستی رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

دستی رکھنا شرعاً جائز ہے، مگر اس کو جیب میں رکھکر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے: (لا) يكره (خرقة لوضوء) بالفتح لبقية بلله (او مخاط) او عرق لو لحاجة و لو للتكبر تكره۔ رد المحتار میں ہے: ثم هذا في خارج الصلاة لما في البزازية و تكره الصلاة مع الخرقة التي يمسح بها العرق و يؤخذ بها المخاط لا لأنه نجسة بل لأن المصلی معظم و الصلاة عليها لا تعظيم فيها۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مردوں کو چاندی کی انگوٹھی پہننا درست ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنی مقدار کی جائز ہے؟ کیا لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا ملمع کرکے پہنی جائے تو درست ہے یا نہیں؟ اور انگوٹھی کس ہاتھ کی کونسی انگلی میں پہنی جائے؟

الجواب

چاندی کی انگوٹھی جو ایک مثقال سے کم وزن ہو مردوں کے لئے جائز ہے۔ چاہئے کہ بائیں ہاتھ کی

کن انگلی (چھنگلی) میں پہنیں ۔ مگر بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکام جن کو مہر کی ضرورت پڑتی ہے یہ لوگ ہر وقت پہن سکتے ہیں ۔ ان کے سوا دوسرے اشخاص کا نہ پہننا بہتر ہے ۔ اور لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا ملمع کرکے پہن سکتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے : و لا یتختم الا بالفضۃ لحصول الاستغناء بها فیحرم بغیرها ۔ رد المحتار میں ہے : فقال یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم ای شیء اتخذه قال اتخذه من ورق و لا تتمه مثقالا ۔ دوسرے صفحہ میں ہے : و ترک التختم لغیر السلطان و القاضی و ذی حاجة الیه کمتول افضل ۔ اس کے قبل در مختار میں ہے : و یجعله لبطن کفه فی یده الیسریٰ و قیل الیمنیٰ اِلا انه من شعار الروافض فیجب التحرز عنه ؛ قهستانی ۔ رد المحتار میں ہے : (قوله فی یده الیسری) و ینبغی ان یکون فی خنصرها دون سائر اصابعه و دون الیمنی ، ذخیرة ۔ اس کے قبل ہے : لا باس بان یتخذ خاتم حدید قد لوی علیه فضة و البس بفضة حتی لا یری ، تاتارخانیة ۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مردوں کے لئے کون سے رنگ جائز ہیں اور کون سے نا جائز ؟ اور کیا مرد بھی زینت کے لئے ہاتھ پیر میں مہندی رچا سکتے ہیں جیسا کہ عموماً حیدرآباد میں نوشہ (دُلہے) کو لگائی جاتی ہے ؟

الجواب

سرخ رنگ کسوم کا ، اور گہرا زعفرانی ، اور گہرا پیلا رنگ مردوں کے لئے مکروہ ہے ۔ اس کے سوا باقی اور رنگوں سے رنگے ہوئے کپڑے مرد پہن سکتے ہیں ۔ اسی طرح ہاتھ پیر کو زینت کے لئے مہندی وغیرہ لگانا مردوں کے لئے مکروہ ہے کیونکہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے ، البتہ بطور دواء علاج کے لئے لگا سکتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۳۹ کتاب الحظر و الاباحہ فصل فی اللبس میں ہے : و کره لبس المعصفر و المزعفر الأحمر و الأصفر للرجال مفاده انه لا یکره للنساء و لا بأس بسائر الألوان ۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۵۲ میں ہے : و یکره للانسان ان یخضب یدیه و رجلیه و کذا الصبی الا لحاجة ؛ بنایة ۔ و لا بأس به للنساء ۔ صفحہ ۲۹۵ میں ہے : لا یدیه و رجلیه فانه مکروه للتشبه بالنساء ۔ واللّٰہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کتب متبرکہ مثلاً قرآن پاک ، کتب تفسیر و حدیث و فقہ و اصول وغیرہ اگر اس قدر پرانی ہوجائیں کہ ان سے کام لینا مشکل ہو ، تو کیا ان کو جلانا یا پانی میں ڈال دینا بہتر ہے یا دفن کرنا ؟

الجواب

جلانے یا پانی میں ڈالنے سے دفن کرنا بہتر ہے۔ قبر کی طرح گڑھا کھود کر اس میں بغلی بنائی جائے، پھر ان متبرک کتابوں کے بوسیدہ اوراق کو ایک پاک کپڑے میں لپیٹ کر بغلی میں رکھا جائے، پھر دیوار لگاکر بغلی بند کردی جائے اور گڑھے کو مٹی سے بھر دیا جائے۔ یا بغلی نہ بناکر گڑھے کو پتھر کی سلوں سے ڈھانک دیا جائے، پھر اس پر مٹی ڈالی جائے۔ بہر حال اس طرح دفنائے جائیں کہ اوراق پر مٹی نہ پڑنے پائے، کیونکہ اس میں ان اوراق کی تحقیر و تذلیل ہوتی ہے۔ دُر مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۹۰ میں ہے: الکتب التی لا ینتفع بھا یمحی عنھا اسم اللّٰہ و ملائکتہ و رسلہ و یحرق الباقی و لا بأس بأن تلقی فی ماء جار کما ھی او تدفن و ھو احسن کما فی الأنبیاء۔ رد المحتار میں ہے: و فی الذخیرۃ المصحف اذا صار خلقا او تعذر القراءۃ منہ لا یحرق بالنار الیہ اشار محمد و بہ نأخذ و لا یکرہ دفنہ و ینبغی ان یلف بخرقۃ طاھرۃ و یلحد لہ لانہ لو شق و دفن یحتاج الی إھالۃ التراب علیہ و فی ذلک نوع تحقیر الا اذا جعل فوقہ سقف۔ اگر اس طرح کا اہتمام نہ ہوسکے تو اس کو کسی پاک جگہ پر ایسی حفاظت سے رکھیں کہ کوئی ناپاک اس کو چھو نہ سکے اور گرد و غبار و غلاظت سے محفوظ رہیں۔ رد المحتار میں عبارت سابقہ کے بعد ہے: و ان شاء غسلہ بالماء او وضعہ فی موضع طاھر لا تصل الیہ ید محدِث و لا غبار و لا قذر تعظیما لکلام اللّٰہ عز و جل۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شادیوں میں عموماً اطلس وغیرہ کی ریشمی رضائی اور توشک وغیرہ دی جاتی ہیں، جس کو دلہا دلہن دونوں استعمال کرتے ہیں۔ کیا مردوں کے لئے ایسی رضائی اور توشک کا استعمال درست ہے؟ اسی طرح ریشمی مچھردان میں سونا مرد کے لئے درست ہے یا نہیں؟

الجواب

ریشم کی رضائی، لحاف اور توشک مرد کے لئے جائز نہیں ہے۔ البتہ ریشمی مچھردان کے اندر سونے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۳۶ فصل اللبس میں ہے: فی القنیۃ استعمال اللحاف من الأبریشم لا یجوز لأنہ نوع لبس۔ اسی صفحہ پر در مختار میں ہے: و لا بأس بکلۃ الدیباج۔ رد المحتار میں ہے: و فی القاموس "الکِلّۃ" بالکسر الستر الرقیق و غشاء رقیق یتوقی بہ من البعوض۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حاجت سے زیادہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ایک وقت میں متعدد کھانے اور سالن پکواکر کھانے اور فواکہات وغیرہ روزانہ استعمال کرنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب

انسان کو اپنی جان بچانے اور نماز روزہ کے لئے طاقت قائم رکھنے کی مقدار کھانا فرض ہے، اور اس پر وہ اجر و ثواب کا بھی مستحق ہے۔ پیٹ بھر جانے تک کھانا تاکہ طاقت و قوت میں زیادتی ہو مباح ہے۔ پیٹ بھرلے کے بعد پھر کھانا کہ جس سے معدہ خراب ہونے کا گمان ہو حرام ہے۔ اگر اس زیادتی سے یہ مقصود ہو کہ دوسرے دن روزہ رکھنے کے لئے اس سے تقویت ہو، یا مہمان کا ساتھ دینے کے لئے زیادہ کھالے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ متعدد قسم کے کھانے ایک وقت میں پکواکر کھانے سے عبادت کے لئے قوت حاصل کرنا مقصود ہو یا مہمانوں کی ضیافت کے لئے پکوائے گئے ہوں تو جائز ہے، ورنہ اسراف و فضول خرچی ہے۔ فواکہات کے روزانہ استعمال کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر ان کا ترک کرنا افضل ہے تاکہ لذات کے استعمال کے سبب غذا کے پاس مرتبہ کم نہ ہو۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے: (الأکل) للغذاء و الشراب للعطش و لو من حرام او میتة او مال غیرہ و ان ضمنه (فرض) یثاب علیه بحکم الحدیث و لکن (مقدارَ ما یدفع) الإنسان (الهلاک عن نفسه) و ماجور علیه (و) هو مقدار ما (یتمکن به من الصلاة قائما و) من (صومه) مفادہ جواز تقلیل الأکل بحیث یضعف عن الفرض لکنه لم یجز کما فی الملتقی وغیرہ. قلت و فی المبتغیٰ بالغین الفرض بقدر ما یندفع به الهلاک و یمکن معه الصلاة قائما انتهی فتنبه. (و مباح الی الشبع لتزید قوته و حرام) عبر فی الخانیة "یکرہ" (و هو فوقه) ای الشبع و هو کل طعام غلب علی ظنه انه افسد معدته و کذا فی الشرب۔ قهستانی (الا ان یقصد قوة صوم الغد او لئلا یستحیی ضیفه) او نحو ذلک و لا تجوز الریاضة بتقلیل الاکل حتی یضعف عن اداء العبادة و لا بأس بأنواع الفواکه و ترکه افضل و اتخاذ الأطعمة سرف و کذا وضع الخبز فوق الحاجة۔ رد المحتار میں ہے: (قوله و اتخاذ الأطعمة سرف) الا اذا قصد قوة الطاعة او دعوة الاضیاف قوما بعد قوم؛ قهستانی ۔ اس عبارت کے قبل ہے (قوله و ترکه افضل) کی لا تنقص درجته و یدخل تحت قوله تعالیٰ " اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا " و التصدّق بالفضل افضل تکثیراً للحسنات؛ در منتقی۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حیدرآباد میں یہ رواج ہے کہ نئی دلھنوں کو ابتداءِ محرم میں دس پندرہ روز تک شوہر سے علحدہ رکھتے ہیں۔ کیا اس کا شرع میں کوئی ثبوت ہے؟

الجواب

شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حیدرآباد میں اس کا رواج غالباً شیعوں کی پیروی و اتباع میں ہے کیونکہ وہ عشرۂ محرم کو سوگ کے دن سمجھتے ہیں اِس لئے اُن کے پاس ان ایام میں خوشی کے کام نہیں ہوتے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف کو تلاوت کی غرض سے دیکھکر پڑھنا بہتر ہے یا زبانی ؟

الجواب

قرآن شریف کو حفظ سے زبانی پڑھنے کی بہ نسبت دیکھکر پڑھنا افضل ہے ، کیونکہ اس میں دو۲ عبادتیں حاصل ہوتی ہیں ۔ ایک تو تلاوت ، اور دوسری اس کا دیکھنا ۔ قرآن شریف میں نظر کرنا بھی ایک مستقل عبادت ہے ۔ فتاویٰ قاضیخان مطبوعہ بر حاشیہ عالمگیریہ مصری جلد ۱ صفحہ ۱۹۲ کتاب الصلاۃ مسائل کیفیۃ القرآن میں ہے : و قراءۃ القرآن فی المصحف أولیٰ من القراءۃ عن ظہر القلب لما روی عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم انہ قال " افضل عبادۃ امتی قراءۃ القرآن نظراً " و لأن فیہ جمعا بین العبادتین و ھو النظر فی المصحف و قراءۃ القرآن ۔ کبیری شرح منیۃ المصلی مطبوعہ مجدی صفحہ ۴۹۳ میں ہے : و قراءۃ القرآن فی المصحف افضل لأنہ جمع بین عبادتی القراءۃ و النظر ۔ عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۳۱۶ کتاب الکراہیۃ باب رابع میں ہے : قراءۃ القرآن فی المصحف أولیٰ من القراءۃ عن ظہر القلب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی عالم دین یا فقیہ کو بلا وجہ گالی دینا گناہ ہے یا نہیں ؟

الجواب

عالم دین کو گالی دینے سے گالی دینے والے کے کافر ہوجانے کا اندیشہ ہے ، اس لئے اس سے بہت احتراز کرنا چاہئے ۔ عالمگیری جلد ۲ کتاب السیر باب موجبات الکفر منھا ما یتعلق بالعلم و العلماء میں ہے : و یخاف علیہ الکفر اذا شتم عالما او فقیھا من غیر سبب ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ واعظین کا منبر پر اشعار گا گا کر پڑھنا مناسب ہے یا نہیں ؟

الجواب

واعظین کا منبر پر اشعار گا کر پڑھنا قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے ، اور شرعا ممنوع ہے ۔ نصاب الاحتساب کے الباب الثالث و الستون فی المذکرین میں ہے : ھل یجوز للمذکر ان یقرأ علیٰ

المنبر دو بیتی کما اعتادہ مُذکِّرو زماننا ام لا ؟ الجواب : فی الحدیث " من أشراط الساعة ان توضع الأخیار و ترفع الأشرار و ان تقرأ المثناة علیٰ رؤس الناس " و المثناة هی التی تسمی بالفارسیة "دو بیتی" من الصحاح ۔ و الفقه فی منعه انه غناء و انه حرام فی غیر المنبر فما ظنک فی موضع مُعَدٍّ للوعظ و النصیحة ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اولیاء اللہ اور شہداء کی مزاروں پر بغرض زیارت جانا موجب حصول ثواب و برکات ہے یا نہیں ؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی یہ فعل ثابت ہے ؟ اور مؤمنین کے لئے موت باعث استراحت و مسرت ہے یا نہیں ؟ اور زیارت کرنے والے کو مزار پر حاضر ہوکر کیا پڑھنا چاہئے ؟ اور زیارت کے آداب کیا ہیں ؟ ہمارے دور میں جو طریقہ فاتحہ پڑھنے کا رائج ہے ، کیا اس کے لئے شریعت میں کوئی ثبوت ہے یا نہیں ؟ مفصل تحریر فرمایا جائے !

الجواب

مسلمانوں کے لئے بزرگان دین و شہداء و صلحاء کی قبور کی زیارت برکت و فیض حاصل کرنے کے لئے کرنا مستحب ہے ۔ ہر ہفتہ میں جمعہ کے دن جانا افضل ہے ۔ شنبہ ، دوشنبہ اور پنجشنبہ کو جانا بھی باعث فضیلت ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اکثر بقیع میں اموات کی زیارت کے لئے تشریف فرما ہوتے تھے ، اور ہر سال کی ابتداء میں شہدائے اُحد کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے ۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان غنی رضوان اللہ علیہم نے بھی اپنے اپنے عہد خلافت میں اس عادت کو جاری رکھا ۔ اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اپنی حین حیات اس کی پابند رہیں ۔ رد المحتار جلد ا کتاب الصلاۃ باب صلاۃ الجنازۃ مطلب فی زیارۃ القبور میں ہے : (قوله و بزیارة القبور) ای لا بأس به بل تندب کما فی البحر عن المجتبیٰ فکان ینبغی التصریح به للأمر بها فی الحدیث المذکور کما فی الامداد و تزار فی کل اسبوع کما فی مختارات النوازل قال فی شرح لباب المناسک الا ان الأفضل یوم الجمعة و السبت و الاثنین و الخمیس فقد قال محمد بن واسع الموتیٰ یعلمون بزوّارهم یوم الجمعة و یوما قبله و یوما بعده فتحصل ان یوم الجمعة افضل اهـ ۔ و فیه و یستحب ان یزور شهداء جبل اُحُد لما روی ابن ابی شیبة ان النبی صلی الله علیه و سلم کان یأتی قبور الشهداء باُحُد علیٰ رأس کل حول فیقول " اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ " ۔ اس عبارت کے چند سطور بعد ہے : و اما الأولیاء فانهم متفاوتون فی القرب من الله تعالیٰ و نفع الزائرین بحسب معارفهم و أسرارهم قال ابن حجر فی فتاواه و لا تترک لما یحصل عندها من

منکرات و مفاسد کاختلاط الرجال بالنساء و غیر ذلک لأن القربات لا تترک لمثل ذلک بل علی الإنسان فعلها و إنکار البدع بل و إزالتها ان امکن اھ ۔ اتحاف السادۃ شرح احیاء العلوم مصری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۳ میں ہے : و روی البیہقی فی الشعب عن الواقدی قال کان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم یزور الشہداء باُحد فی کل حول و اذ بلغ رفع صوتہ فیقول " سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ " ثم ابو بکر کل حول یفعل مثل ذلک ثم عمر ثم عثمان و کانت فاطمۃ رضی اللّٰہ عنہا تأتیہ و تدعو و کان سعد بن ابی وقاص یسلم علیہم ثم یقبل علی اصحابہ فیقول أ لا تسلّمون علیٰ قوم یردّون علیکم السلام ۔ احیاء العلوم کے صفحہ ۳۶۱ میں ہے : زیارۃ القبور مستحبۃ علی الجملۃ للتذکر و الاعتبار و زیارۃ قبور الصالحین مستحبۃ لأجل التبرک مع الاعتبار ۔

مؤمن صالح کے لئے موت نہایت فرحت و سرور کی چیز ہے ۔ کیونکہ اس کو دنیا کی تمام مصیبتوں سے راحت مل جاتی ہے ، اور اس کے سامنے جلال خداوندی کی وہ وسعت پیش ہوجاتی ہے کہ دنیا اس کے مقابل تنگ و تاریک قید خانہ معلوم ہوتی ہے ۔ اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے موت کو مؤمن کے لئے تحفہ و ریحانہ فرمایا ہے ۔ اور یہ بھی ارشاد مبارک ہے کہ ، مؤمن موت سے بڑھکر کسی چیز کو محبوب نہ رکھے کیونکہ خداوند عالم کی ملاقات سے بڑھکر کوئی چیز مؤمن کو راحت و لذت دینے والی نہیں ہے ۔ احیاء العلوم صفحہ ۳۸۲ میں ہے : قال مسروق ما غبطت احدا ما غبطت مؤمنا فی اللحد قد استراح من نصب الدنیا و امن عذاب اللّٰہ تعالی ۔ و قال یعلیٰ بن الولید کنتُ أمشی یوما مع ابی الدرداء فقلت ما تحب لمن تحب ؟ قال الموت قلت فان لم یمت ؟ قال یقل مالہ و ولدہ و انما احب الموت لأنہ لا یحبہ الا المؤمن و الموت إطلاق المؤمن من السجن ۔ قال عبد اللّٰہ بن عمر و انما مثل المؤمن حین یخرج نفسہ او روحہ مثل رجل بات فی سجن فأخرج منہ فہو یتفسح فی الأرض و یتقلب فیہا و ہو الذی ذکرہ حال من تجافی عن الدنیا و تبرم بہا و لم یکن انس الا بذکر اللّٰہ تعالی و کانت شواغل الدنیا تحبسہ عن محبوبہ و مقاساۃ الشہوات تؤذیہ فکان الموت خلاصہ من جمیع المؤذیات و انفرادہ بمحبوبہ الذی کان بہ انسہ من غیر عائق و لا واقع ۔ صفحہ ۳۸۳ میں ہے : و اعلم ان المؤمن ینکشف لہ عقیب الموت من سعۃ جلال اللّٰہ ما تکون الدنیا بالإضافۃ إلیہ کالسجن و المضیق و یکون مثالہ کالمحبوس فی بیت مظلم فتح لہ باب إلی بستان واسع الأکناف لا یبلغ طرفہ اقصاہ فیہ انواع الأشجار و الأنہار و الثمار و الطیور فلا یشتہی العود الی السجن المظلم ۔ صفحہ ۳۸۳ میں ہے : و قیل لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان فلانا قد مات فقال مستریح او مستراح ۔ کنز العمال جلد ۸ صفحہ ۷۷ میں ہے : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم " ان حفظت وصیتی فلا یکون شیء أحب إلیک من الموت " (الأصبہانی فی الترغیب عن انس) ۔ و قال " الموت ریحانۃ المؤمن " (الدیلمی عن السبط الحسین رضی اللّٰہ تعالی عنہ) ۔ و قال " لیس للمؤمن راحۃ دون لقاء اللّٰہ تعالی " ۔ و قال " الموت تحفۃ المؤمن " ۔ ہے ...

جب کوئی مزار پر بغرض زیارت حاضر ہو تو اس کو چاہئے " السلام علیکم دارَ قومٍ مؤمنین و اِنّا اِن شاء اللّٰہُ بِکُم لاحِقون و نسأل اللّٰہَ لنا و لکُم العافیۃَ " کہنا چاہئے، پھر مزار کے پائیں سے داخل ہوکر اور کھڑے ہوکر صاحب مزار کے لئے مغفرت و رحمت کی دعاء مانگے۔ پھر سورۂ فاتحہ ایک بار، قل ھو اللہ تین بار یا سات بار یا گیارہ دفعہ یا بارہ دفعہ پڑھے، پھر اول سورۂ بقرہ سے مُفلحون تک اور آیت الکرسی، آمن الرسول، سورۂ یٰسین، سورۂ ملک، سورۂ تکاثر پڑھے، پھر یوں کہے کہ: اے اللہ رب العالمین میں نے یہ جو کچھ پڑھا ہے اس کا ثواب صاحب مزار کی روح کو پہنچا دے۔ سورۂ بقر کے اوائل یعنی " الٓمّٓ " سے " مُفلحون " تک سرہانے پڑھنا چاہئے۔ اور زیارت کرنے والا اگر مزار کے پاس بیٹھنا چاہے تو چاہئے کہ قریب و دور جہاں چاہے بیٹھے مگر اس کا ضرور لحاظ رہے کہ اگر صاحب مزار اس وقت زندہ ہوتے تو یہ ان کے پاس کس طرح بیٹھتا، اسی ادب و مرتبہ کے موافق عمل کرے۔ اگر زائر کو اتنی دیر تک توقف کرکے مذکورہ بالا آیات و سورتوں کے پڑھنے کی مہلت نہیں ہے تو صرف سورہ فاتحہ اور تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھنے پر اکتفاء کرسکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی چونکہ زیادہ فضائل ہیں اور انہیں فضائل کی وجہ سے یہ قرآن پاک کی ابتداء میں رکھا گیا ہے اور نماز میں بھی ہر رکعت کے شروع میں اس کا پڑھنا لازم گردانا گیا ہے اس لئے اموات کے لئے ایصال ثواب میں ان آیات وغیرہ کو پڑھکر میت کی روح پر ایصال کرنے کا نام بھی " فاتحہ " رکھدیا گیا ہے، اور ہر شخص فاتحہ کی ابتداء بھی سورہ فاتحہ ہی سے کرتا ہے جیسا کہ نماز میں قراءت قرآن کی ابتداء اسی سے کی جاتی ہے۔ رد المحتار جلد ۱ کتاب الصلاۃ باب صلاۃ الجنائز صفحہ ۶۶۳ میں ہے: قال فی الفتح و السُّنَّۃ زیارۃ القبور قائما و الدعاء عندھا کما کان یفعلہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی الخروج الی البقیع و یقول السلام علیکم الخ۔ و فی شرح اللباب لمُلا علِی القاریؒ ثم من آداب الزیارۃ ما قالوا من انہ یاتی الزائر من قِبَل رجلَی المتوفی لا من قِبَل رأسہ لأنہ أتعب لبصر المیت بخلاف الأول لأنہ یکون مقابل بصرہ لکن ھذا اذا امکنہ و اِلا فقد ثبت انہ علیہ الصلاۃ و السلام قرأ أوّل سورۃ البقرۃ عند رأس میت و آخرھا عند رجلیہ، و من آدابھا ان یسلم بلفظ " السلام علیکم " علی الصحیح لا " علیکم السلام " فانہ ورد " السلام علیکم دارَ قومٍ مؤمنینَ و اِنّا اِن شاءَ اللّٰہُ بِکُم لَاحقونَ و نسألُ اللّٰہَ لنا و لکمِ العافیۃَ " ثم یدعو قائما طویلا و ان جلس یجلس بعیدا او قریبا بحسب مرتبتہ فی حال حیاتہ اھ۔ قال ط و لفظ الدار مقحم او ھو من ذکر اللازم لأنہ اذا سلم علی الدار فاولیٰ ساکنھا و ذکر المشیئۃ للتبرک لأن اللحوق مُحقَّق او المراد اللحوق علی اتم الحالات فتصح المشیئۃ ۔ در مختار صفحہ ۶۶۵ میں ہے: و یقرأ یٰسٓ و فی الحدیث: من قرأ الإخلاص إحدیٰ عشرۃ مرۃ ثم وھب اجرھا للاموات اُعطِی من الأجر بعدد الأموات۔ رد المحتار میں ہے: (قولہ و یقرأ یٰسٓ) کما ورد: من دخل المقابر فقرأ سورۃ یٰسٓ خفف اللّٰہ عنھم یومئذ و کان لہ بعدد من فیھا حسنات، بحر۔ و فی شرح اللباب و یقرأ من القرآن ما تیسر لہ من الفاتحۃ و اول البقرۃ الی المُفلِحُونَ و آیۃ الکرسی و آمَنَ الرَّسُوْلُ و سورۃ یٰسٓ و

تبارک الملک و سورۃ التکاثر و الاخلاص ثنتی عشرۃ مرۃ او احدیٰ عشرۃ او سبعا او ثلاثا ثم یقول: اللہم اوصل ثواب ما قرأناہ الی فلان او الیہم ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بعض اشخاص کسی سے مصافحہ کرکے اپنا ہاتھ چوم لیتے ہیں ۔ کیا یہ شرعاً درست ہے ؟

الجواب

یہ جاہلوں کا فعل ہے اور شرعا مکروہ ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر الاباحہ صفحہ ۲۶۸ میں ہے : (و) کذا ما یفعلہ الجہال من (تقبیل ید نفسہ اذا لقی غیرہ) فہو (مکروہ) فلا رخصۃ فیہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کہ فقہ و حدیث وغیرہ لکھے ہوئے کاغذوں میں کوئی چیز باندھنا یا اسی طرح کے متبرک اوراق کو کسی چیز پر لپیٹنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

جائز نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحہ صفحہ ۲۷۰ میں ہے : و لا یجوز لف شیء فی کاغذ فقہ و نحوہ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گوشت میں اگر بدبو ہوجائے تو کیا اس کا کھانا درست ہے؟ اسی طرح گھی تیل اور دودھ میں بدبو ہوجائے اور کھانا اُبس جائے تو کیا اس کا کھانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

گوشت میں اگر بدبو ہوجائے تو اس کا کھانا حرام ہے ۔ گھی ، تیل اور دودھ وغیرہ میں اگر بو ہوجائے تو وہ حرام نہیں ہوتے ۔ البتہ کھانا جب اُبس جائے تو نجس ہوجاتا ہے ۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراہۃ باب حادی عشر میں ہے : و اللحم اذا انتن یحرم اکلہ و السمن و اللبن و الزیت و الدہن اذا انتن لا یحرم و الطعام اذا تغیر و اشتد تنجس و الاشربۃ بالتغیر لا تحرم کذا فی خزانۃ الفتاوی ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مٹی کھانا درست ہے یا نہیں؟ اکثر عورتیں اور بچے قلہ کی سیاہ سی شوق سے کھاتے ہیں۔ اور بعض لوگ تحفہ کے طور پر متبرک مقاموں کی مٹی لاتے ہیں اور لوگ اس کو متبرک ہونے کی وجہ سے کھا لیتے ہیں۔ کیا یہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

مٹی کھانا مکروہ ہے، کیونکہ اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی اس سے منع کرنا چاہئے۔ متبرک مقام کی مٹی بغرضِ تبرک کبھی کھالیں تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، لیکن نہ کھانا بہتر ہے۔ کیونکہ جواہر الفتاوی وغیرہ کتب میں ہے کہ کراہت عام ہے خواہ کہیں کی بھی مٹی ہو۔ الحاوی میں امام ابو القاسم سے روایت ہے کہ مٹی کھانا احمقوں کا فعل ہے، عقلاء کا نہیں۔ محیط میں ہے، اگر عورت مٹی کھانے کی عادت بنالے تو اسے روکا جائے کیونکہ اس میں صحت و جمال کا نقصان ہے اور فائدہ کچھ نہیں۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراہۃ باب حادی عشر صفحہ ۲۷۰ میں ہے: اکل الطین مکروہ هکذا ذکر فی فتاوی ابی اللیث رحمه الله تعالی و ذکر شمس الأئمة الحلوانی فی شرح صومه اذا کان یخاف علی نفسه انه لو اکله اورثه ذلک علة او آفة لا یباح له التناول و کذلک هذا فی کل شیء سوی الطین و ان کان یتناول منه قلیلا او کان یفعل ذلک احیاناً لا بأس به کذا فی المحیط۔ الطین الذی یحمل من مکة و یسمی طین حمزة هل الکراهة فیه کالکراهة فی اکل الطین علی ما جاء فی الحدیث؟ قال الکراهة فی الجمیع متحدة کذا فی جواهر الفتاوی۔ و سئل بعض الفقهاء عن اکل الطین البخاری و نحوه قال لا بأس بذلک ما لم یضر و کراهیة اکله لا للحرمة بل لتهییج الداء و عن ابن المبارک کان ابن ابی لیلیٰ یرد الجاریة من اکل الطین و سئل ابو القاسم عمن اکل الطین قال لیس ذلک من عمل العقلاء کذا فی الحاوی للفتاوی و المرأة اذا اعتادت اکل الطین تمنع من ذلک اذا کان یوجب نقصانا فی جمالها کذا فی المحیط۔ و الله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ انگریزوں کی دعوتوں میں جہاں کہ شراب پی جاتی ہے اور مردار وغیرہ کھایا جاتا ہے، اگر کوئی مسلمان شریک ہو اور ان حرام چیزوں کو چھوڑ کر حلال چیزیں کھائے تو کیا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

جن دعوتوں میں کہ شراب پی جاتی ہے اور مردار و حرام چیزیں کھائی جاتی ہیں، مسلمانوں کا ان میں

شریک ہونا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ وہاں جاکر حلال اشیاء ہی کیوں نہ کھائیں ۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراہۃ باب حادی عشر صفحہ ۴۰۰ میں ہے ؛ و لا یحضر المسلم مائدۃ یشرب فیھا خمر او تؤکل المیتۃ کذا فی الفتاوی العتابیۃ ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زوجہ اگر نماز کی پابند نہ ہو اور پاک و صاف نہ رہتی ہو تو کیا شوہر اس کو اس بارے میں تنبیہ و تادیب کرسکتا ہے ؟

الجواب

شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ نماز کی پابندی اور غسلِ جنابت اور صفائی و طہارت کے سلسلہ میں زوجہ کو تاکید کرے ، اور زبان سے نہ مانے تو مار کر تنبیہ کرے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۹۸ میں ہے ؛ و لہ ضرب زوجتہ علی ترک الصلاۃ علی الاظھر ۔ رد المحتار میں ہے ؛ و کذا علی ترکھا الزینۃ و غسل الجنابۃ و علی خروجھا من المنزل و ترک الاجابۃ الی فراشہ و مرّ تمامہ فی التعزیر و ان الضابطۃ ان کل معصیۃ لا حد فیھا فللزوج و المولی التعزیر ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی خط میں سلام لکھکر بھیجے ، یا زبانی کہلوائے ، جیسا کہ اِس زمانہ کا دستور ہے ، تو اس کا جواب دینا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب

غائب شخص کی تحریر ، حاضر کے خطاب کے قائم مقام ہے ۔ پس جیسا کہ حاضر کے سلام کا جواب دینا ضروری ہے اسی طرح غائب کے تحریری سلام کا بھی جواب دینا ضروری ہے ۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ محض سلام کا جواب دینے کے لئے اس کو دوبارہ خط لکھا جائے ؛ بلکہ اس کا تحریری سلام پڑھکر زبانی جواب کہہ دے تو کافی ہوگا ۔ اسی طرح جب قاصد کی زبانی سلام آئے تو اس کا بھی جواب دینا ضروری ہے ، سلام سنکر خاموش نہ ہونا چاہئے ؛ بلکہ بہتر یہ ہے کہ سلام پہونچانے والے اور بھیجنے والے دونوں کو جواباً سلام کہنا چاہئے ۔ در مختار جلد ۵ کتاب الحظر و الاباحۃ صفحہ ۲۹۰ میں ہے ؛ و یجب رد جواب کتاب التحیۃ کرد السلام و لو قال لآخر اِقرأ فلانا السلام یجب علیہ ذلک ۔ رد المحتار میں ہے ؛ قولہ و یجب رد جواب کتاب التحیۃ لان الکتاب من الغائب بمنزلۃ الخطاب من الحاضر ، مجتبی ۔ و الناس عنہ غافلون ط ۔ اقول المتبادر من ھذا ان المراد رد سلام الکتاب لا رد الکتاب لکن فی الجامع الصغیر للسیوطی " رد جواب الکتاب حق

کرد السلام " قال شارحه المناوی ای اذا کتب لک رجل بالسلام فی کتاب و وصل الیک وجب علیک الرد باللفظ او بالمراسلة ۔ اسی صفحہ کے اخیر میں ہے : لکن قال فی التاتارخانیة ذکر محمد حدیثا یدل علیٰ ان من بلغ انسانا سلاما عن غائب کان علیه ان یرد الجواب علی المبلغ اولاً ثم علیٰ ذلک الغائب اھ ۔ سلام پہونچانے والے کو علیک و علیه السلام کہنا چاہیے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ داڑھی ایک مٹھی رکھنا سنت ہے، مگر بعض لوگ ایک مٹھی سے زیادہ رکھتے ہیں، اور بعض تو اس کو بالکل نہیں کترتے ۔ کیا یہ حد مشروع سے زیادہ رکھنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

ایک مٹھی کے بعد داڑھی کترنا چاہیے ۔ اس سے زیادہ چھوڑنا کم عقلی کی دلیل ہے ۔ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۸۳ کتاب الحظر و الاباحۃ میں ہے : (قوله و السنة فیها القبضة) و هو ان یقبض الرجل لحیته فما زاد منها علی قبضة قطعه کذا ذکر محمد فی کتاب الآثار عن الامام قال و به نأخذ، محیط اھ ط ۔ (فائدة) روی الطبرانی عن ابن عباس رفعه " من سعادة المرأ خفة لحیته " و اشتهر ان طول اللحیة دلیل علی خفة العقل و أنشد بعضهم :

ما احد طالت له لحیته فزادت اللحیة فی هیئته
الا و ما ینقص تک عقله اکثر مما زاد فی لحیته

و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ گھوڑ دوڑ وغیرہ کھیلوں میں جو شرط لگائی جاتی ہے، کیا شرعاً حرام ہے؟ اگر حرام ہے تو اس کی کیا دلیل ہے؟

الجواب

اگر شرط یکطرفہ ہو مثلاً زید، عمرو سے یوں کہے کہ اگر تیرا گھوڑا میرے گھوڑے سے آگے بڑھ جائے تو میں تجھے اتنے روپے دوں گا اور اگر میرا گھوڑا آگے بڑھ جائے تو تجھ پر کچھ نہیں، تو یہ شرط شرعاً جائز ہے کیونکہ یہ انعام ہے ۔ اگر دونوں جانب سے شرط لگائی جائے مثلاً یوں کہے کہ اگر تیرا گھوڑا آگے بڑھے تو اتنے روپے دوں گا اور اگر میرا گھوڑا آگے ہو تو تجھ سے اتنے روپے لوں گا، تو ایسی شرط حرام ہے، کیونکہ یہ جوئے بازی ہے جو نص قطعی سے حرام ہوتی ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۸۱ کتاب الحظر و الاباحۃ میں

ہے: (حل الجعل ان شرط المال) فی المسابقة (من جانب واحد و حرم لو شرط) فیها (من الجانبین) لأنه یصیر قمارا ۔ رد المحتار میں ہے: (قوله من جانب واحد) او من ثالث بأن یقول احدهما لصاحبه ان سبقتنی اُعطیک کذا و ان سبقتک لا آخذ منک شیئا او یقول الأمیر لفارسین او رامیین من سبق منکما فله کذا و ان سبق فلا شیء له ؛ اختیار و غرر الأفکار ۔ (قوله من الجانبین) بأن یقول ان سبق فرسک فلک علیّ کذا و ان سبق فرسی فلی علیک کذا ؛ زیلعی ۔ و کذا ان قال ان سبق ابلک او سهمک ۔ (قوله لأنه یصیر قمارا) لأن القمار من القمر الذی یزداد تارة و ینقص اخریٰ و سُمِی القمار قمارا لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز ان یذهب ماله الیٰ صاحبه و یجوز ان یستفید مال صاحبه و هو حرام بالنص و لا کذلک اذا شرط من جانب واحد لأن الزیادة و النقصان لا تمکن فیهما بل فی احدهما تمکن الزیادة و فی الآخر الانتقاص فقط فلا تکون مُقامَرة لأنها مفاعلة منه ؛ زیلعی ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو مرغی نجاست کھاتی ہے، جب اس کو ذبح کرنا چاہیں تو کیا تین روز تک بند رکھنا چاہئے تاکہ نجاست اس کے جسم میں تحلیل ہوجائے؟ یا بغیر بند رکھے کے اس کو ذبح کرکے کھا سکتے ہیں؟

الجواب

مرغی چونکہ اکثر غلہ کھاتی ہے اور اس کے ساتھ کبھی نجاست بھی کھالیتی ہے اس لئے اس کے گوشت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ نجاست کھانے کے بعد تین روز تک بند رکھکر ذبح کرنے کا حکم بر بنائے احتیاط و نفاست ہے۔ ورنہ بغیر اس احتیاط کے بھی اس کو ذبح کرکے بلا کراہت کھا سکتے ہیں۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۳۹ کتاب الحظر و الاباحہ میں ہے: و لو اکلت النجاسة و غیرها بحیث لم ینتن لحمها حلت ۔ رد المحتار میں ہے: (قوله حلت) و عن هذا قالوا لا بأس بأکل الدجاج لأنه یخلط و لا یتغیر لحمه و روی انه علیه السلام کان یأکل الدجاج ، و ما روی ان الدجاجة تحبس ثلاثة ایام ثم تذبح فذلک علیٰ سبیل التنزه ؛ زیلعی ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شادی وغیرہ کی دعوت قبول کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ عموماً شادیوں کی دعوت میں ناچ گانا اور دیگر منکرات ہوتے ہیں۔ کیا ایسی جگہ کھانا کھانے کیلئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

لا بدعة و لا معصية اھ و الظاھر حمله علی غیر الولیمة لما مرّ و یأتی، تأمّل۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ السلام علیکم کے جواب میں بعض لوگ و علیکم السلام و رحمة اللہ و برکاته و مغفرته وغیرہ الفاظ زیادہ کرتے ہیں۔ کیا یہ زیادتی مسنون ہے؟

الجواب

السلام علیکم کے جواب میں و علیکم السلام و رحمة اللہ و برکاته کہنا چاہئے، اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہا جائے، کیونکہ برکاته کے لفظ پر سلام کی انتہاء ہوجاتی ہے۔ البتہ سلام کرنے والے کے لئے افضل یہ ہے کہ السلام علیکم کے ساتھ ورحمة اللہ و برکاته بھی کہے۔ عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۳۴ کتاب الکراھة میں ہے: و الأفضل للمسلم ان یقول "السلام علیکم و رحمة اللہ و برکاته" و المجیب کذلک یرد و لا ینبغی ان یزید علی البرکات شیئا قال ابن عباس رضی اللہ عنھما لکل شیء منتھی و منتھی السلام البرکات، کذا فی المحیط۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نمازی جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جمع ہوکر تلاوت قرآن اور ذکر وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں، اور باہر سے آنے والے اُن پر سلام کرتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ اور ان کے سلام کا جواب دینا بیٹھنے والوں پر لازم ہے یا نہیں؟

الجواب

یہ سلام کا وقت نہیں ہے، آنے والوں کو سلام نہیں کرنا چاہئے۔ اگر آنے والے سلام کریں تو بیٹھنے والوں پر جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ عالمگیری جلد ۵ کتاب الکراھة صفحہ ۳۴ میں ہے: السلام تحیة الزائرین۔ و الذین جلسوا فی المسجد للقراءة و التسبیح و لانتظار الصلاة ما جلسوا فیه لدخول الزائرین علیھم فلیس ھذا أوان السلام فلا یسلم علیھم و لھذا قالوا لو سلم علیھم الداخل وسعھم أن لا یجیبوہ، کذا فی القنیة۔ و اللہ أعلم بالصواب، و إلیه المرجع و المآب۔

کتاب الرَّھْن و القَرْض

الاستفتاء

زید نے عمرو کو کچھ رقم اس شرط سے دی کہ اگر مدت پر اداء کی جائے تو اصل رقم لی جائے گی ورنہ بعد ختمِ مدت اصل رقم سے اسی قدر رقم بطورِ تاوان زیادہ دینا ہوگا ۔ پس اس طریقہ سے قرض دینا اور جرمانہ دینا جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

الجواب

اس طریقہ سے قرض دینا نا جائز ، اور تاوان لینا حرام ہے ۔ کیونکہ اس قرض میں منفعتِ ذاتی مشروط ہے جو سود کے مشابہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے ۔ جیسا کہ محیط سرخسی صفحہ ۱۹۸ میں ہے : و لا یجوز قرض جر منفعة ، الخ لأن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم نھیٰ عن قرض جر منفعة و لأنہ یحصل لہ زیادة منفعة مالیة فیشبہ الربا ۔ اور در مختار صفحہ ۵۹۵ میں ہے : و فی الخلاصة القرض بالشرط حرام و الشرط لغو و فی الأشباہ کل قرض جر نفعا حرام ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زمین کو ۵۰۰ روپیوں کے مقابل اور پانچ سال کے وعدہ سے عمرو کے پاس اس شرط پر رہن رکھا کہ اس کی کاشتکاری میرے متعلق رہے گی ۔ اور طرفین کی رضامندی سے یہ بات بھی طے ہوئی کہ مرتہن تحصیل سرکاری کامل یا نصف اور نصف اجرت کاشتکاری دیا کرے گا ، اور جو کچھ پیداوار از قسم غلہ وغیرہ اس زمین سے حاصل ہوگی ، اس میں نصف حصہ مرتہن کا ہوگا ۔ آیا اس طریقہ سے مرتہن کا پیداوار میں سے نصف حصہ لینا علاوہ ان پانچ سو روپیوں کے جو ختم مدت رہن پر لے لیے جائیں گے جائز ہوگا یا نہیں ؟

الجواب

(راہن = چیز کا مالک ، رہن رکھوانے والا۔ مرتہن = رہن لے کر رقم دینے والا)

مرتہن کا ، زمین مرہونہ سے ما حصل کا نصف حصہ لینا اگر رہن کے وقت شرط ٹھہرایا گیا ہے ، یعنی راہن و مرتہن دونوں اس بات کو جانتے ہیں کہ نصفِ ما حصل زمین دینے کی شرط پر مرتہن نے راہن کو رقم

دی ہے ، اور اگر یہ شرط نہ کی جاتی تو رقم نہ ملتی ۔ پس ایسی صورت میں یہ رقم مرتہن کے لئے حرام ہے اور رہن نا جائز ۔ کیونکہ یہ صورت قرض بالمنفعۃ کی ہے جو شرعا سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے ۔ فتاویٰ شامی جلد ۵ مطبوعہ مصر صفحہ ۳۲۰ میں ہے : ثم رأیت فی جواهر الفتاویٰ اذا کان مشروطا صار قرضا فیه منفعة و هو ربا و الا فلا بأس ۔ اور اگر یہ نصف حصہ شرط نہیں ٹھہرا ہے بلکہ راہن نے مرتہن کے لئے بخوشی تمام بلا کسی مجبوری کے مباح کردیا ہے اور اجازت دی ہے تو ایسی صورت میں مرتہن کا اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے ۔ الدر المختار بر حاشیہ رد المختار جلد ۵ صفحہ ۳۲۰ میں ہے : (لا الانتفاع به مطلقا) حالا باستخدام و لا سکنیٰ و لا لبس و لا اجارة و لا اعارة سواء کان من مرتهن او راهن (الا باذن) کل للآخر ۔ مگر اس صورت کو بھی فقہاء نے بر بنائے احتیاط مکروہ تحریر کیا ہے ، اور وجہ یہ بتلائی ہے کہ اس میں ربا یعنی سود کا شبہ و شائبہ ہے ۔ جیسا کہ حموی شرح الاشباہ و النظائر مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۳۱۰ میں ہے : و الاحتیاط فی الاجتناب عنه قلت لما فیه من شبهة الربا ۔ اور یہی عبارت فتاویٰ ابراہیم شاہی قلمی صفحہ ۱۳۵ میں بھی ہے ۔

اور اگر مرتہن نے راہن کے اس مباح کردہ نفع کو اس بناء پر قبول کیا ہے کہ یہ اس رہن کا نفع ہے اگر راہن اس کو میرے لئے مباح نہ کرتا تو میں اس کو ہرگز رقم نہ دیتا ۔ پس یہ صورت بعینہٖ شرط کی صورت ہے جو سابق میں نا جائز بتلائی گئی ہے ۔ فتاویٰ رد المختار شامی جلد ۵ مطبوعہ مصر صفحہ ۳۲۰ میں ہے : و الغالب من احوال الناس انهم انما یریدون عند الدفع الانتفاع و لولاه لما اعطاه الدراهم و هذا بمنزلة الشرط لأن " المعروف کالمشروط " و هو مما یعین المنع ۔

زمین مرہونہ کا خراج یعنی محصول سرکاری راہن کے ذمہ ہے کیونکہ زمین اسی کی مملوکہ ہے ، اسی طرح جو کچھ اس کی حفاظت و بقاء کے مصارف ہوں گے وہ شرعاً راہن ہی کے ذمہ رہیں گے ۔ در مختار بر حاشیہ ردّ المختار جلد ۵ مطبوعہ مصر صفحہ ۳۳۳ میں ہے : (و نفقة الرهن و الخراج) و العشر (علی الراهن) و الأصل فیه ان کل ما یحتاج الیه لمصلحة الرهن بنفسه و تبقیته فعلی الراهن لانه ملکه ۔ اور جو چیز کہ شرعاً راہن کے ذمہ ہے ، اگر راہن کی بجائے مرتہن اس کو ادا کردے تو یہ مرتہن کا احسان ہوگا ، پھر راہن کو اس کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے ۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ ۳۳۴ میں ہے : و کل ما وجب علی احدهما فاداه الآخر کان متبرعا ۔ اگر راہن کے کہنے پر یا قاضی کے حکم سے مرتہن نے اس کو ادا کیا ہے تو راہن پر اس کا ادا کرنا واجب ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۴۵۵ کتاب الرهن میں ہے : و لو انفق المرتهن ما یجب علی الراهن بأمر القاضی او بأمر صاحبه یرجع علیه و کذلک الراهن اذا أدیٰ ما یجب علی المرتهن بأمر القاضی او بأمر صاحبه یرجع علیه کذا فی الظهیریة ۔ پس صورت مسئولہ میں از روئے شرع شریف سرکاری محصول ادا کرنے کا راہن ذمہ دار ہے ، اور جب راہن نے مرتہن سے ادائی محصول سرکاری کی خواہش کی ہے تو ایسی صورت میں بعد ادائی محصول مرتہن کو حق ہے کہ راہن سے وصول کرلے ۔ ......

اجرت کاشتکاری راہن ہی کے متعلق ہے، کیونکہ زمین مرہونہ میں کاشتکاری کرنے کا راہن ہی مستحق ہے۔ بلکہ مرتہن اگر اس زمین میں اپنی طرف سے بیج بوئے تو رہن باطل ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۳۰ سطر ۶ میں فتاویٰ بزازیہ سے منقول ہے : و ان اخذ المرتھن الأرض مزارعة بطل الرھن لو البذر منه، و لو من الراھن فلا ۔ لہذا مرتہن، زمین مرہونہ پر خود سے کاشت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اور اس پر نہ تو محصول سرکاری لازم ہے اور نہ اجرت کاشتکاری، بلکہ یہ سارے کام راہن و مالکِ اراضی کے ہیں اور وہی اس کا ذمہ دار و مستحق ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ زید نے اپنی ایک چیز عمرو کے پاس بمعاوضۂ رقم رہن رکھوائی۔ زید نے کچھ دن بعد رقم ادا کردی۔ اور ابھی شئے مرہونہ واپس لینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ طغیانی و سیلاب سے عمرو کا مکان منہدم ہوگیا۔ اب عمرو کا بیان ہے کہ شئے مرہونہ بھی اس میں تلف ہوگئی۔ ایسی صورت میں آیا عمرو پر اس کا تاوان دینا شرعاً واجب ہے یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں جبکہ زرِ رہن ادا کردیا گیا ہے اور شئے مرہونہ واپس نہیں لی گئی تو ایسی حالت میں شئے مرہونہ عمرو کے پاس امانت ہے، اور امانت کے متعلق شرعاً یہ حکم ہے کہ اگر امین نے اس شئے کی اپنے مال کی طرح حفاظت کی ہے اور عمداً تلف نہیں کیا، تو اس پر اس کے تلف ہونے سے تاوان نہیں آتا۔ البتہ اس کو اس بات پر حلف اٹھانا ہوگا کہ شئے مرہونہ باوجود کامل حفاظت کرنے کے میرے پاس سے تلف ہوگئی۔ رحمۃ الاُمّۃ فی اختلاف الائمۃ کی کتاب الودیعہ صفحہ ۸۵ میں ہے : اتفق الأئمة علیٰ ان الودیعة من القرب المندوب إلیها و ان فی حفظها ثوابا و انها امانة محضة و ان الضمان لا یجب علی المودع الا بالتعدی و ان القول قوله فی التلف و الرد علی الإطلاق مع یمینه ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنا ذاتی مکان بلا قبض رہن رکھوا کر قرض لیا، پھر اسی مکان کو بحالت رہن بلا قبض اپنے چھوٹے لڑکے کو ہبہ کردیا۔ اور چند روز بعد زید نے بحیثیتِ ولی چھوٹے لڑکے کی جانب سے اسی مکانِ مرہونہ و موہوبہ کو دوسرے شخص کے پاس رہن مع القبض رکھوایا۔ چنانچہ اس وقت مکان مذکور مرتہن ثانی کے قبضہ میں ہے۔ پس ایسی صورت میں بعد رہنِ بلا قبض زید سے جو انتقالات ہبہ و رہن مع القبض وقوع میں آئے از روئے احکام شرع جائز ہے یا نہیں؟

بصورتِ جواز جوڈیشل کمیٹی نے روبکار صدر المہامی عدالت نظامت ۱۵۱ مورخہ ۳ / ربیع الاول ۱۳۹۵ھ کے حوالے

سے اس مقدمہ میں جو فیصلہ کیا ہے کہ " رہن بلا قبض کو رہن مع القبض و ہبہ پر ترجیح ہے " اور سابق رہن بلا قبض کے مقابل ما بعد کا ہبہ و رہن بالقبض نا درست و نا قابل اعتبار ہے " کیا ایسا فیصلہ جس میں مسائل شرعیہ سے انحراف کیا گیا ہے صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب

رہن بلا قبض شرعاً نا جائز و نا قابل اعتبار ہے ۔ در مختار کی کتاب الرہن میں ہے : و ینعقد بایجاب و قبول غیر لازم فللراهن تسلیمه و الرجوع عنه فاذا سلمه و قبضه المرتهن محوزا مفرغا ممیزا لزم ۔ افاده ان القبض شرط اللزوم کما فی الهبة ۔ عالمگیریہ جلد ۵ کتاب الرہن فصل اول میں ہے : قال محمد رحمه الله تعالیٰ فی کتاب الرهن لا یجوز الرهن الا مقبوضا فقد اشار ان القبض شرط جواز الرهن ۔ قال الشیخ الإمام الأجل المعروف بخواهر زاده الرهن قبل القبض جائز الا انه غیر لازم و انما یصیر لازما فی حق الراهن بالقبض شرط اللزوم لا شرط الجواز کالقبض فی الهبة و الأول اصح کذا فی المحیط ۔ فتاویٰ مهدیہ جلد ۵ کتاب الرہن میں ہے : سئل فی رجل علیه دین الجماعة وله بیت رهنه علی الدین المذکور الیٰ ستین یوما و لم یزل ساکنا فیه بأمتعة وینتفع به الی الآن فهل یکون هذا الرهن باطلا و یکون البیت باقیا علیٰ ملک الراهن ؟ اجاب : الرهن علی هذا الوجه بلا تسلیم للمرتهن مفرغا غیر معتبر فلا تترتب علیه احکامه و للراهن الرجوع قبل القبض ۔

باپ اپنے کم سن لڑکے کو کوئی چیز ہبہ کرسکتا ہے اور اس کی طرف سے شئے موہوبہ کو ولایۃً خود قبضہ میں رکھ سکتا ہے ۔ عالمگیریہ جلد ۴ کتاب الرہن باب سادس میں ہے : و هبة الأب لطفله تتم بالعقد و لا فرق فی ذلک بینما اذا کان فی یده او فی ید مودعه بخلاف ما اذا کان فی ید الغاصب او فی ید المرتهن او فی ید المستأجر حیث لا تجد الهبة بعدم قبضه و کذا لو وهبته امه و هو فی یدها و الأب میت و لیس له وصی و کذا کل من یعوله کذا فی التبیین و هکذا فی الکافی ۔ اسی جگہ ہے : و الموهوب له ان کان من اهل القبض فحق القبض الیه و ان کان الموهوب له صغیرا او مجنونا فحق القبض الی ولیه و ولیه ابوه او وصی ابیه ثم جده ثم وصیه ثم وصی وصیه ثم القاضی و من نصبه القاضی ۔

باپ اپنے کم سن لڑکے کے مال کو بر بنائے ولایتِ شرعیہ اپنے ذاتی قرضہ میں بھی رہن رکھ سکتا ہے ۔ تبیین الحقائق جلد ۶ صفحہ ۱۲۵ کتاب الرہن میں ہے : یجوز رهن مال الغیر بغیر إذنه بولایة شرعیة کالأب و الوصی یرهن مال الصبی بدینه و دین نفسه ۔

پس صورت مسئولہ میں زید نے جو پہلے رہن بلا قبض کیا ہے چونکہ شرعاً نا جائز و نا معتبر ہے اس لئے زید کا اس مکان کو اپنے کمسن لڑکے کے نام ہبہ کرنا اور ولایۃً اس کو اپنے قبضہ میں رکھکر دوسرے شخص کے

پاس رہن بالقبض کرنا شرعاً درست ہے ۔

جوڈیشیل کمیٹی نے جو رہن بلا قبض کو جائز و نافذ رکھکر ھبہ و رہن بالقبض کو نا جائز و نا معتبر ٹھہرایا ہے شرعاً درست نہیں ۔ اور اس قسم کا فیصلہ کہ جس میں احکام شرعیہ کی صریح خلاف ورزی ثابت ہو اصلاً درست نہیں ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیات کریمہ " وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ " اور " وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ " اور " وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ " میں خلافِ احکامِ خداوندی و شریعتِ مصطفوی فیصلہ کرنے والوں کو ظالم ، فاسق ، کافر فرمایا ہے ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے جو عابدہ کا دادا ہے ، عابدہ کو اپنی کُل مِلک کا مالک کردیا ہے ۔ اس وقت زید کی مرحومہ بہو فاطمہ کے ورثاء زید سے فاطمہ کے مہر کا مطالبہ کررہے ہیں ۔ کیا ان کا مطالبہ شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

زوجہ کا مہر شرعاً زوج پر واجب ہے ۔ زوج کے والد پر تا وقتیکہ وہ ادائے مہر کا ضامن نہ ہو ، مہر کی ادائی واجب نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۹۹ باب المہر میں ہے : و لا یطالَب الأب بمهر ابنه الصغير الفقير الا اذا ضمنه ۔ اور فتاویٰ مہدیہ کی جلد ۱ صفحہ ۹۵ باب المہر میں ہے : لا یُجبَر اَبُ الزوج الصغير علىٰ دفع صُداق زوجة ابنه المذكور من مال نفسه بدون كفالة شرعية ۔

اسی طرح میت کے قرضہ کو ورثاء کے ذاتی مال و جائداد سے طلب کرنا شرعاً درست نہیں ہے ۔ فتاویٰ مہدیہ مصری کی جلد ۵ صفحہ ۲۳۳ کتاب المداینات میں ہے : تتعلق ديون الميت بعد ثبوتها بتركته فاذا لم تكن له تركة لا يجبر الوارث علىٰ ايفائها من ماله ۔ پس صورت مسئولہ میں فاطمہ کے مہر کی ادائی اس کے زوج کی جائداد سے ہونی چاہئے ۔ عابدہ کو جو جائداد زید نے ھبہ کی ہے وہ عابدہ کی ذاتی ہے ، فاطمہ کے مہر کا مطالبہ عابدہ کی ذاتی جائداد یا زید کی ذاتی جائداد سے شرعاً درست نہیں ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی زمین جس کا ما حصل سالانہ ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپئے ہے ، عمرو کے پاس پانچ سو (۵۰۰) روپیہ قرض کے بدلے اس شرط پر رہن رکھنا چاہتا ہے کہ رقم مذکور پر کوئی سود نہ لیا جائے ، مگر ڈیڑھ سو ما حصل زمین سے تا ادائی رقم زید ، عمرو کو پچاس (۵۰) روپے معاف کردے گا اور صرف سو (۱۰۰) روپیہ پر اس کا " قول " پانچ سال ادائی قرضہ کی مدت تک رہے گا ۔ اگر اس مدت کے اندر رقم کامل ادا ،

ہوجاتے تو پھر اس زمین کا " قول " کال ڈیڑھ سو روپے رہے گا۔ کیا اس شرط سے قرضہ دینا اور لینا شرعاً درست ہے ؟ اگر کوئی شخص ایسا معاملہ کرے تو اب اسے کیا کرنا ہوگا ؟

الجواب

شرط لگاکر قرضہ دینا جس میں قرض دینے والے کا نفع ہو، سود ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام ہے۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار طبع مصر جلد ۳ صفحہ ۱۸۲ باب القرض میں ہے: و فی الخلاصۃ القرض بالشرط حرام و الشرط لغو و فی الاشباہ کل قرض جر نفعا حرام۔ رد المحتار میں ہے: ثم رأیت فی جواہر الفتاوی اذا کان مشروطا صار قرضا فیہ منفعۃ و ہو ربا۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ عمرو ماحصل سے پچاس روپیہ سالانہ معافی کی بناء پر قرض دے رہا ہے، اس لئے نفع زید کے لئے سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ زید و عمرو کے درمیان اگر ایسا معاملہ ہوگیا ہے تو عمرو کو چاہئے کہ رقم معافی جس قدر حاصل ہوتی ہے زید کے قرضہ میں مِنہا کرلے، اور آئندہ بھی تا ادائی رقم اس رقم کو قرضہ میں شمار کرتا جائے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ دائن یعنی قرض خواہ اگر میعادِ مقررہ کے قبل مدیون سے اپنا قرض طلب کرنا چاہے تو کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

کرسکتا ہے۔ رد المحتار جلد ۴ باب المرابحۃ و التولیۃ میں ہے: قولہ فلا یلزم تأجیلہ ای انہ یصح تأجیلہ مع کونہ غیر لازم فللمقرض الرجوع عنہ۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے اپنے ذاتی مکان کے ایک حصہ کو رہن رکھکر قرض حاصل کیا، اور بلا ادائی زرِ قرض اس کو اپنے نواسہ کے حق میں ھبہ کرنا چاہتی ہے کیا یہ ھبہ شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

اگر مرتہن کی رضا مندی کے بغیر ہندہ اس کو ھبہ کررہی ہے تو یہ ھبہ تا ادائی زرِ رہن نافذ نہیں ہے۔ مرتہن یعنی قرض خواہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس مکان کو اپنے قبضہ میں روک کر اپنی رقم وصول کرلے۔ عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۴۴۳ کتاب الرہن باب الثامن میں ہے: و تصرف الراہن قبل سقوط الدَّین فی المرہون اما تصرف یلحقہ الفسخ کالبیع و الکتابۃ و الاجارۃ و الھبۃ و الصدقۃ و الاقرار و نحوھا او تصرف لا یحتمل الفسخ کالعتق و التدبیر و الاستیلاد۔ اما الذی یلحقہ الفسخ لا ینفذ بغیر رضاء المرتہن و لا یبطل حقہ فی الحبس و اذا قضی الدَّین و بطل حقہ فی الحبس نفذت

التصرفات کلھا ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و ہندہ دونوں ایک مکان کے حصہ دار ہیں ۔ زید نے ہندہ کے حصہ کو اس کی اجازت کے بغیر رھن رکھوا دیا ، اور پھر ھبہ کردیا ۔ کیا زید کا یہ تصرف شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب

ایک حصہ دار دوسرے حصہ دار کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرسکتا ۔ لہذا صورت مسئولہ میں زید کا یہ تصرف شرعاً نا جائز ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۳ کتاب الشرکہ کے اوائل میں ہے : و کل من شرکاء الملک اجنبی فی الامتناع عن تصرف مضر فی مال صاحبه لعدم تضمنها الوکالة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے چند افراد کو قرض دیا تھا ، زید کا قرض لوگوں پر وصول طلب ہے ۔ زید کے انتقال کے بعد اس کے بھتیجے بکر کا بیان ہے کہ زید نے اس کو تمام رقم قرض ھبہ کردی ہے ۔ کیا قرض قبل از وصول ھبہ ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

اجنبی شخص جس پر کہ قرض نہیں ، اگر اس کو قرض کی رقم قبل از قبض ھبہ کی جائے تو ھبہ درست نہیں ہے ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۴ کتاب الھبہ میں ہے : و شرائط صحتها فی الموھوب ان یکون مقبوضا ۔ صفحہ ۵۴۴ میں ہے : و تملیک الدّین ممن لیس علیه الدّین باطل ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر قرض دار اپنے قرض خواہ سے جبراً قرض معاف کروالے تو کیا قرض معاف ہوجائے گا ؟

الجواب

جبر سے قرض معاف نہیں ہوتا ۔ در مختار کے کتاب الاکراہ میں ہے : لا یصح مع الإکراہ إبراء مدیونه ۔ و اللہ اعلم بالصواب ، و الیه المرجع و المآب ۔

کتاب الوَصایا

٨

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ علاءالدین خاں نے اپنی تمام جائداد اپنے نواسہ محبوب خان کو دینے کے لئے وصیت کی، اور باقی ورثاء کی پرورش محبوب خان موصیٰ لہ کے ذمہ کی۔ بعد انتقال علاءالدین خان تمام ورثاء نے بلا جبر و اکراہ اس پر رضامندی ظاہر کی، اور ایک عرصہ تک حق پرورش محبوب خاں سے حاصل کرتے رہے۔ اب کچھ عرصہ سے بعض ورثاء حق پرورش لینے سے انکار کرکے متروکۂ علاء الدین خاں سے اپنا حصہ چاہتے ہیں۔ کیا ان کا رجوع شرعاً جائز ہے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر تمام ورثہ نے علاءالدین خاں کے انتقال کے بعد بحالتِ عقل و بلوغ وصیت کو جائز رکھا اور بلا جبر و اکراہ تسلیم کرلیا ہے، تو اب ان کو اس سے رجوع کرنے اور واپس ہونے کا حق نہیں ہے۔ ہدایہ کی کتاب الوصایا میں ہے : (و لا تجوز بما زاد علی الثلث الا أن یُجیزھا الورثۃ بعد موتہ و ھم کبار) لأن الامتناع لحقھم و ھم أسقطوہ (و لا معتبر بإجازتھم فی حال حیاتہ) لأنھا قبل ثبوت الحق اذ الحق یثبت عند الموت فکان لھم ان یردوہ بعد وفاتہ بخلاف ما بعد الموت لأنہ بعد ثبوت الحق فلیس لھم ان یرجعوا عنہ ۔ فتح القدیر میں ہے : ان اجازتھم بعد الموت اسقاط لحقھم بعد ثبوتہ و الساقط متلاش لا یعود فلم یتیسر لھم الرجوع عنہ ۔ عالمگیریہ جلد ۶ کتاب الوصایا میں ہے : و کل ما جاز بإجازۃ الوارث فانہ یملکہ المجاز لہ من قبل الموصی عندنا حتی یتم بغیر قبض و لا یمنع الشیوع صحۃ الاجازۃ و لیس للوارث ان یرجع فیہ کذا فی الکافی ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے اپنے انتقال کے وقت عمرو کو یہ وصیت کی تھی کہ میری جائدادِ منقولہ و غیر منقولہ سے میری اور میرے شوہر کی فاتحہ کرنا۔ عمرو وصی نے ہندہ کی وفات کے بعد حسبِ وصیت عمل نہیں کیا اور فوت ہوگیا۔ اب عمرو وصی کی اولاد کیا اس جائداد کو اپنا متروکہ جان کر تصرف میں لاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

مالِ وصیت امانت ہے ، وصی کی وفات کے بعد وصی کی اولاد اس کی مالک نہیں ہے ۔ اگر وصی مرتے وقت اپنے مال کے لئے کوئی وصی مقرر کیا ہے تو وہی اس مال کا بھی وصی ہوگا ۔ ورنہ قاضی اس کے لئے اپنی طرف سے وصی مقرر کرکے حسب وصیت خرچ کروائے ۔ ملتقی الابحر کے باب الوصی میں ہے : فان مات احد الوصیین اقام القاضی غیرہ مقامہ ان لم یوص الی آخر ، و ان اوصی الی الحی جاز و وصی الوصی وصی فی الترکتین ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنِ مسلمہ کو جو صاحب جائداد منقولہ و غیر منقولہ ہے ، اپنی جائداد کے متعلق کہاں تک وصیت کرنے کا حق حاصل ہے ؟ اگر وہ اپنے شوہر کی زندگی میں فوت ہوتی ہے ، تو اس کی وصیت کہاں تک موثر ہوگی ؟ اور اس کی ذاتی جائداد کا جس پر اس کو ہمیشہ بذاتِ خود قبضہ و تصرف رہا ہے ، اس کی وفات کے بعد کون وارث ہوگا ؟

الجواب

وارث کے موجود ہونے کی صورت میں اجنبی کے لئے ثلثِ مال سے زیادہ وصیت جائز نہیں ۔ اور اگر زائد از ثلثِ مال وصیت کی گئی ہے تو اس کا اجراء اجازت ورثاء پر موقوف ہے ۔ اور اگر ثلث مال یا اس سے کم میں وصیت کی ہے تو بعد ادائیِ دَین بلا رضامندی ورثاء اس کا اجراء لازمی ہے ۔ در مختار کی کتاب الوصایا میں ہے : و تجوز بالثلث للاجنبی و ان لم یجز الوارث ذلک لا الزیادۃ علیہ الا ان تجیز ورثتہ بعد موتہ ۔ پس صورت مسئولہ میں اگر زنِ مسلمہ کا شوہر کے سواء کوئی اور وارث شرعی نہیں ہے تو بعد ادائیِ دین و اجرائیِ وصیت در ثلثِ مال ، باقی کل مال کا حسب فرض و رد شوہر ہی مالک ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو کو یہ وصیت کی کہ میری وفات کے بعد میرا مال میرے فرزند کو دیا جائے ۔ عمرو کا انتقال ہوگیا اور مالِ وصیت عمرو کے ورثاء کے پاس ہے ۔ کیا زید اس کو واپس لے سکتا ہے ؟ یا ورثائے عمرو کے لئے لازم ہے کہ حسبِ وصیت زید کے فرزند ہی کو دے دیں ؟

الجواب

موصی کو چونکہ وصیت سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے ، اس لئے ورثائے عمرو کو چاہئے کہ کہ حسبِ طلب ، مالِ وصیت زید کو واپس کردیں ۔ عالمگیریہ جلد ۶ صفحہ ۹۲ کتاب الوصایا باب اول میں ہے : و یصح

للموصی الرجوع عن الوصیۃ ۔ در مختار کی کتاب الوصایا میں ہے : و له ای للموصی الرجوع عنها ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نقد دو سو ستر (۲۷۰) روپے چھوڑ کر فوت ہوئی ، اور قبل انتقال ایک وصیت نامہ اپنی تجہیز و تکفین و زیارت و دہم و چہلم و ختم قرآن و حج بدل کرواتے اور کچھ درخت خرما خرید کر وقف کرنے کے لئے لکھا ۔ ہندہ کے ورثاء میں ایک زوج ہے اس کے سوا کوئی وارث نہیں ۔ زوج نے تمام مصارف وصیت کے موافق بلکہ زائد از وصیت اداء کیا ، مگر حج بدل اور خرما کے درخت لگانے کے متعلق وصی کہتا ہے کہ ان دو چیزوں کو میں اپنے ہاتھ پر خرچ کروں گا ۔ رقم مذکورہ بالا سے جملہ ایک سو اسی (۱۸۰) روپئے صرف ہوئے ہیں ۔ تجہیز و تکفین میں پینتیس (۳۵) اور وصیت وغیرہ کے اجراء میں ایک سو پینتالیس (۱۴۵) خرچ ہوئے ، باقی نوے (۹۰) روپے موجود ہیں ۔ کیا یہ روپئے از روئے شریعت زوج کو ملنا چاہئے یا وصی کو ؟

الجواب

زوجہ کی تجہیز و تکفین کے مصارف زوجہ اگرچیکہ مالدار ہی کیوں نہ ہو زوج کے ذمہ ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار طبع مصر جلد ۱ صفحہ ۶۰۲ میں ہے : و اختلف فی الزوج و الفتویٰ علی وجوب کفنها و ان ترکت مالا ۔ پس صورت مسئولہ میں ہندہ کی تجہیز و تکفین کے مصارف بقدر ضرورت زوج کے ذمہ ہیں ۔ اور ہندہ کے متروکہ دو سو ستر روپے سے پہلے ہندہ کا قرض اداء کیا جائے ۔ اس کے بعد جو رقم باقی رہے اس کے تین حصے کئے جائیں ۔ تیسرا حصہ وصیت میں صرف کیا جائے ۔ باقی دو حصوں میں ایک حصہ زوج کو بطور فرض دیا جائے ۔ اور دوسرا حصہ بھی بطورِ رد دیا جائے کیونکہ متاخرین علمائے احناف نے بوجہ فسادِ بیت المال جبکہ میت کا کوئی اور وارث نہ ہو تو زوجین پر رد کرنے کے لئے فتویٰ دیا ہے ، چنانچہ سراجیہ مطبوعہ نظامی کے صفحہ ۲۹ میں حاشیہ رد المحتار شامی سے منقول ہے : و فی الاشباہ انه یرد علیهما فی زماننا لفساد بیت المال و قال فی القنیۃ و یفتی بالرد علی الزوجین فی زماننا لفساد بیت المال و فی الزیلعی عن النهایۃ ما فضل عن احد الزوجین یرد علیه و قال فی المستصفی و الفتویٰ الیوم بالرد علی الزوجین و هو قول المتأخرین من علمائنا و قال الحدادی الفتویٰ الیوم بالرد علی الزوجین و قال المحقق احمد بن یحیی ابن التفتازانی افتیٰ کثیر من المشایخ بالرد علیهما اذا لم یکن من الأقارب سواهما لفساد الإمام و ظلم الحکام فی هذه الأیام ۔ بناء بریں ہندہ پر کوئی قرض واجب الاداء نہ ہونے کی صورت میں دو سو ستر روپے سے صرف نوے (۹۰) روپے وصیت میں صرف کرنے کے قابل تھے ۔ اور باقی ایک سو اسی روپے زوج کا حق تھا ۔ اب جبکہ زوج نے مصارف تجہیز و تکفین و اجراء وصیت میں ایک سو اسی روپے صرف کردیے ہیں تو اس میں تجہیز و تکفین کے پینتیس روپے مصارف چونکہ

شرعاً زوج کے ذمہ تھے اس لئے اس کے حصہ سے وضع کیے جانے کے بعد اجراء وصیت میں زوج نے بوجہ لا علمی نوے روپے سے زیادہ رقم اپنے حصہ شرعی سے صرف کردی ہے ۔ لہذا اس وقت جو نوے روپے باقی ہیں از روئے شرع وہ زوج ہی کا حق ہے ، اب آئندہ ہرگز اجراءِ وصیت میں صرف نہ کئے جائیں بلکہ وہ بالکلیہ زوج کو دیدیے جائیں ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک مکان خریدا اور یہ وصیت کی کہ میری وفات کے بعد اس کا مالک میرا فلاں لڑکا ہوگا ، اس کے سوا دوسروں کو اس مکان میں کوئی حق نہیں ہوگا ۔ کیا یہ وصیت شرعاً جائز و قابل نفاذ ہے ؟

الجواب

زید نے یہ وصیت وارث کیلئے کی ہے ، زید کی وفات کے بعد اگر باقی ورثہ اس کی اجازت دیں تو نافذ ہوگی ، ورنہ تمام ورثہ حسب فرائض اس میں حصہ پائیں گے ۔ فتاویٰ مہدیہ جلد ، صفحہ ۹۲ کتاب الوصایا میں ہے ، سئل فی رجل له اربعة بنين و ثلاث بنات اوصی بجمیع املاكه لستة منهم دون واحد لم يوص له بشئ، لكونه يبغضه فهل اذا مات عن اولاده المذكورين و لم يجز الابن السابع الوصية لا تكون وصية صحيحة و يقسم جميع ما تركه الميت على ورثته بالفريضة الشرعية ؟ اجاب : الوصية لبعض الورثة موقوفة في حق باقيهم على اجازته ۔ صفحہ ۲۰ میں ہے : سئل في رجل له اربعة بنين و بنتان و زوجة فأوصى في حال حياته بجميع ما يملكه من دار و مواش و غير ذلك مما يورث لأولاده الذكور دون الاناث فهل اذا مات لا تنفذ وصيته و تتوقف صحتها على اجازة باقي الورثة و اذا لم تجزها يكون جميع ما تركه ميراثا يقسم بين جميع ورثته بالفريضة الشرعية ؟ اجاب : لا تصح الوصية المذكورة لبعض الورثة و الحال هذه ۔ صفحہ ۱۲ میں ہے : لا تنفذ الوصية لأحد الورثة بدون اجازة باقيهم و يقسم ما تركه المتوفى بين ورثته بالفريضة الشرعية ۔ عالمگیری جلد ۶ کتاب الوصایا میں ہے ، و لا تجوز الوصية لوارث عندنا الا ان يجيزه الورثة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص مرض موت میں وصیت کرے تو کیا اس کی وصیت نافذ ہوگی ؟

الجواب

جس کے لئے وصیت کی ہے اگر وہ اس کا وارث نہیں ہے ، تو متروکہ کے تیسرے حصہ سے وصیت

نافذ ہوگی۔ یعنی متروکہ سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کی جائے، پھر اس کا قرض ادا کیا جائے، اس کے بعد جو بچے اس کے تین حصے کرکے ایک حصہ سے وصیت پوری کی جائے، پھر جو کچھ بچے وہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ سراجیہ کے صفحہ ۱ میں ہے: الأول يبدأ بتكفينه و تجهيزه من غير تبذير و لا تقتير ثم تقضى ديونه من جميع ما بقي من ماله ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقي بعد الدين ثم يقسم الباقي بين ورثته بالكتاب و السنة و الإجماع۔ در مختار کی کتاب الوصایا میں ہے: و تجوز بالثلث للأجنبي عند عدم المانع و ان لم يجز الوارث ذلك لا الزيادة عليه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر زید کے ذمہ زکاۃ واجب ہو اور بلا ادائی کے وفات پائے اور ادائی کے متعلق وصیت کرے یا نہ کرے ان دونوں صورتوں میں کیا ورثاء کے ذمہ زکاۃ ضروری ہے؟

الجواب

ورثاء کے ذمہ زکاۃ واجبہ کی ادائی لازم نہیں ہے۔ اور اگر مورث نے ادائی کے لئے وصیت کی ہے تو بعد تجہیز و تکفین و ادائی قرض جو بچے گا اس کے تیسرے حصہ سے زکاۃ ادا کی جائے۔ دُر مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۵ کتاب الفرائض میں ہے: و اما دين الله تعالى فان اوصى به وجب تنفيذه من ثلث الباقي و إلا لا۔ رد المحتار میں ہے: و ذلك كالزكاة و الكفارات و نحوها قال الزيلعي فانها تسقط بالموت فلا يلزم الورثة اداؤها الا اذا اوصى بها او تبرعوا بها هم من عندهم لأن الركن في العبادات نية المكلف و فعله و قد فات بموته فلا يتصور بقاء الواجب۔ اسی صفحہ میں ہے: (قوله من الثلث الباقي) اى الفاضل عن الحقوق المتقدمة و عن دين العباد فانه يقدم لو اجتمع مع دين الله تعالى لأنه تعالى هو الغني و نحن الفقراء كما في الدر المنتقى۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اگر اپنی زندگی میں اپنے ورثاء کے لئے ایک وصیت نامہ لکھدے اور اس میں ورثاء کے شرعی حصوں کے خلاف کسی کو کم اور کسی کو زائد لکھے، تو کیا ایسی وصیت نافذ ہوگی؟ اور زید کی وفات کے بعد اس پر عمل ہوگا؟

الجواب

مورث کی وفات کے بعد تمام ورثاء عاقل و بالغ اگر اس پر راضی ہوجائیں تو اسی پر عمل ہوگا۔ ورنہ حسب فرائض عمل ہوگا۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۶ صفحہ ۱۵۹ کتاب الوصایا میں ہے: اما اذا كان التمليك مضافا

کتاب الفرائض
(میراث)

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ منکوحہ مرگئی، ناکح کے ذمہ مہر واجب الاداء ہے۔ پس یہ مہر منکوحۂ متوفاۃ کے مترو کہ میں داخل ہے یا نہیں؟ بحوالۂ کتب حنفیہ جواب ادا فرمائیے۔

الجواب

در صورتِ صدقِ مستفتی زوجہ متوفاۃ کا مہر شرعاً مترو کہ ہے جو حسبِ فرائض دیگر املاک کی طرح ورثہ پر تقسیم کیا جائے گا۔ فتاوی ہندیہ جلد اول صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ مصر میں ہے : یتاکد بموت احد الزوجین فیکون ترکۃ یقسم بین ورثتھا بالفریضۃ الشرعیۃ کجمیع ما یتحقق انہ مملوک لھا۔ واللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سامان جہیز بعد وفات زوجہ مترو کہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

شرعاً سامان جہیز لڑکی کو اس کے باپ یا ماں یا اور کسی ولی جائز نے جب بروجہ تملیک یعنی اس کی مِلک گردان دیا ہو، تو ایسا سامان مترو کہ ہے۔ لڑکی کی وفات کے بعد اس کے جس قدر ورثہ ہوں گے از روئے حکم شرعی حصہ پائیں گے۔ شرعاً سامان جہیز کے متعلق رواج ملک کا اعتبار کیا گیا ہے۔ بعض ممالک میں جہیز عاریتاً دیا جاتا ہے۔ اور بعض میں تملیکاً اور بعض شہروں میں مشترک یعنی کچھ عاریتاً اور کچھ تملیکاً۔ حیدرآباد میں چونکہ لڑکیوں کو عموماً سامان جہیز کا مالک بتایا جاتا ہے، اس لئے یہاں جہیز لڑکیوں کی مِلک ہے۔ بلکہ شریعت میں تو عام طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ لڑکی کا باپ اگر شریف لوگوں سے ہے اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں نے جہیز لڑکی کو عاریتاً دیا ہے تو ہرگز اس کا قول قابل اعتبار نہیں، کیونکہ شریف لوگوں کے لئے اپنی اولاد کو شادی میں عاریتاً کوئی جہیز دینا معیوب ہے۔ فتاوی در مختار بر حاشیہ رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۰۵ میں ہے : جھز ابنتہ بجھاز و سلمھا ذلک لیس لہ الاسترداد منھا و لا لورثتہ بعدہ بل تختص بہ و بہ یفتی۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۲ میں ہے : قال فی الدر المختار جھز

الدر المختار جهز ابنته ثم ادعى ان ما دفعه لها عارية و قالت هو تمليك او قال الزوج ذلك ليرث منه فقال الأب او ورثته بعد موته عارية فالمعتمد ان القول للزوج و لها اذا كان العرف مستمرا ان الأب يدفع مثله جهازا لا عارية و اما اذا كان مشتركا كمصر و الشام فالقول للاب كما لو كان اكثر مما يجهز به مثلها و الأم كالأب في تجهيزها و كذا ولي الصغيرة و استحسن في النهر تبعا لقاضيخان ان الأب ان كان من اشراف الناس لم يقبل قوله انه عارية ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل میں کیا فرماتے ہیں ؟

۱ ۔ زید نے اپنی دختر ہندہ کو قبل از عقد کچھ سامان دیا ، اور بعد از عقد کچھ زیور وغیرہ دیا ۔ پس یہ سامان بعد انتقالِ دختر ، مالِ میت قرار پاکر اس کی تقسیم مثل مالِ متروکہ کے ہوگی ؟ یا کل پدر کو واپس دیا جائے گا ؟

۲ ۔ ہندہ لا ولد فوت ہوئی ، اس کے ورثاء یہ ہیں ، پدر ، مادر ، خواہر حقیقی ، برادر حقیقی اور زوج ۔ کیا ہندہ کا کل زرِ مہر مالِ میت قرار دیا جائے گا اور اس کی تقسیم مثل ترکہ کے ہوگی ؟ اور ہندہ کے زوج کے ذمہ کل زرِ مہر قرض اور واجب الاداء ہوگا ؟

۳ ۔ ہندہ کا شوہر عمرو لا ولد فوت ہوا ۔ اس کے ورثاء میں ایک حقیقی بہن اور تین چچا زاد بھائی ہیں ۔ متروکہ کس طرح تقسیم ہوگا ؟

الجواب

۱ ۔ زید نے اپنی دختر ہندہ کو جو چیز کہ قبل عقد دی ہے اگر ہندہ کو اس پر قبضہ بھی دیدیا ہے ، تو ہبہ تمام ہونے کی وجہ سے ہندہ کی ملک ہوگئی ۔ زید کو ہندہ کے انتقال کے بعد واپس لینے کا حق نہیں کیونکہ یہ ہندہ کا متروکہ ہے ۔ ہدایہ کی کتاب الہبۃ میں ہے : و تصح بالإيجاب و القبول و القبض ۔ اور باب ما یصح رجوعہ میں ہے ، او بموت احد العاقدين ۔ زید نے اپنی دختر ہندہ کو جو سامان و زیور کہ بطور جہیز دیا ہے بلحاظِ عرفِ حیدرآباد ہندہ کی ملک ہے ، اور وفات کے بعد یہ اس کا متروکہ ہے جس کی تقسیم ورثاء پر حسب فرائض ہوگی ۔ در مختار کی کتاب النکاح باب المہر مطلب في دعوى الأب ان الجهاز عارية میں ہے : جهز ابنته بجهاز و سلمها ذلك ليس له الاسترداد منها و لا لورثته بعده ان سلمها ذلك في صحته بل يختص به و به يفتي ۔ اس عبارت کے بعد ہے : جهز ابنته ثم ادعى ان ما دفعه لها عارية و قالت هو تمليك او قال الزوج ذلك ليرث منه فقال الأب او ورثته بعد موته عارية فالمعتمد ان القول للزوج و لها اذا كان العرف مستمرا ان الأب يدفع مثله جهازا لا عارية ۔ و اما اذا كان مشتركا كمصر و الشام فالقول للاب في تجهيزها ، و كذا ولي الصغيرة و استحسن في النهر تبعا لقاضيخان ان الأب ان كان من أشراف الناس لم يقبل قوله انه عارية ۔ ۔۔۔۔۔۔۔

۲۔ ہندہ کا زرِ مہر ہندہ کے انتقال کے بعد متروکہ ہے۔ حسبِ فرائض اُس کے ورثہ کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اور خاوند کے ذمہ قرض واجب الاداء ہے۔ فتاویٰ ہندیہ کی جلد ۱ صفحہ ۱۴۳ بابِ المہر میں ہے: ینأکد المهر بموت احد الزوجين فيكون تركة يقسم بين ورثتها بالفريضة الشرعية كجميع ما يتحقق انه مملوك لها۔ اور صفحہ ۱۳۱ میں ہے: و هو دين في ذمة الزوج۔ پس صورت مسئولہ میں بعد ادائی دیون و مصارفِ تجہیز و تکفین و اجرائے وصیت، ہندہ کے متروکہ کے چھ (۶) حصے کرکے خاوند کو تین، ماں کو ایک، اور باپ کو دو حصے دیے جائیں۔ بھائی بہن محروم ہیں۔

۳۔ بعد ادائی دیون و مصارفِ تجہیز و تکفین و اجرائے وصیت عمرو کے متروکہ کے چھ (۶) حصہ کرکے حقیقی بہن کو تین، اور ہر ایک چچا زاد بھائی کو ایک ایک دیا جائے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

زید نے اپنی لڑکی ہندہ کو کچھ سامان بطور جہیز کے دیا۔ اب زید کی وفات کے بعد اس کے ورثہ کو اس سامانِ جہیز میں ترکہ کی حیثیت سے کچھ مل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

سامانِ جہیز کی حیثیت کو شرعاً عرفِ بلد پر چھوڑا گیا ہے۔ اگر اس شہر کی یہ رسم ہے کہ سامانِ جہیز لڑکیوں کو بطور عطاء و ھبہ کے دیا جاتا ہے تو وہ یقیناً لڑکی کی مِلک ہے اس کو بعد وفات معطی، معطی کے ورثہ کو واپس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر سامان لڑکی کو عارضی بطریق اشتراک یعنی کچھ تو بطورِ ھبہ کے اور کچھ بطورِ عاریت دینے کی عادت ہے تو اس صورت میں لڑکی کا باپ یا اس کی وفات کے بعد اس کے ورثہ جو کچھ کہیں وہی معتبر ہوگا۔ در مختار جلد ۲ بر حاشیہ شامی صفحہ ۳۰۵ میں ہے: جهز ابنته بجهاز و سلمها ذلك ليس له الاسترداد منها و لا لورثته بعده ان سلمها ذلك في صحته بل تختص به۔ رد المحتار صفحہ ۳۰۶ میں ہے: و لها اذا كان العرف مستمرا ان الاب يدفع مثله جهازا لا عارية۔ اور فتاویٰ ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۴ میں ہے: سئل في رجل اعطى لبنته عند الزفاف امتعة و قبضتها و استقلت بها مدة حياة والدها ثم بعد موته اراد بعض الورثة ادخالها في التركة و قسمها على حكم الميراث فهل يجابون لذلك ام لا و تكون على ملكها خاصة و تأخذ حصتها من الميراث كاملة؟ اجاب: اذا كان العرف مستمرا ان الأب يدفع مثل هذا جهازا لا عارية يكون القول قولها و ان كا مشتركا يكون القول للاب او ورثته بعد موته۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی بالغہ لڑکی کی شادی کے واسطے جہیز کا سامان

اور اسباب تیار کیا ۔ مگر کسی قسم کی رسم اور شادی ہونے سے قبل ہی زید کا انتقال ہوگیا ۔ ایسی صورت میں اسباب جہیز مذکور کیا ورثہ میں تقسیم ہونے کے قابل ہے یا لڑکی کے ملنے نامزد ہونے سے اسی کی ملک ہوجائے گی ۔ زید کی دوسری لڑکی بھی نابالغہ موجود ہے ؟

الجواب

صورت مسئولہ میں جبکہ زید نے لڑکی کو اس اسباب کا ملک نہیں بنایا ہے ، اور ھبہ بھی نہیں کیا ہے ، تو بے شک یہ زید کا متروکہ ہے ۔ اس میں زید کے تمام ورثہ شریک ہیں ۔ فتاویٰ ہندیہ مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ میں ہے ، مسئل فی رجل له بنت بالغة مكلفة هيأ لها اشياء من المصاغ و النحاس وغيره و يريد ان يهبه لها و يدفعه لها وقت الجهاز عند تزوجها بزوج فمات قبل ان يملكه لها و قبل ان تتزوج احدا من الأزواج فهل يكون ذلك ميراثا بين ورثته حيث لم يقر لها به ؟ اجاب : نعم يكون ما ذكر ميراثا عن الأب حيث لم تثبت البنتُ المذكورة تمليكهُ لها من ابيه حال صحته بالوجه الشرعي ۔ و الله اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا انتقال ہوا ، اور اس نے ایک لڑکی چھوڑی ، اور اس کی زوجہ اس کے حین حیات ہی فوت ہوئی تھی ۔ اب زید کا تمام مال اس کے بھتیجے کے قبضہ میں ہے ۔ اس حالت میں لڑکی اپنی ماں کے مہر کا دعویٰ کرسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب

میت کا مہر شرعاً متروکہ ہے جس سے تمام ورثائے میت کا حق متعلق ہے ۔ فتاوی ہندیہ طبع مصر جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ میں ہے ، يتأكد المهر بعد موت احد الزوجين فيكون تركة يقسم بين ورثتها بالفريضة الشرعية كجميع ما يتحقق انه مملوك لها ۔ زید کی حین حیات زوجہ کا مہر اس پر قرض تھا اس کی وفات کے بعد قبل تقسیم ترکہ بعد وضع مصارفِ تجہیز و تکفین جملہ مال متروکہ سے وضع کیا جائے گا ۔ فتاویٰ ہندیہ طبع مصر جلد ۱ صفحہ ۱۴۱ میں ہے : و هو دَين فى ذمة الزوج ۔ خزانۃ الروایہ قلمی کے صفحہ ۱۰۲ میں ہے : المهر دَين ۔ فتاویٰ ہندیہ جلد ۵ صفحہ ۳۲۳ کتاب الدایات میں ہے ، تتعلق ديون الميت بعد ثبوتها بتركته ۔ پس صورت مسئولہ میں چونکہ زوجہ کا انتقال زید کے روبرو ہوا ہے اس لئے اس کے مہر میں تمام ورثاء شریک رہیں گے ۔ اور صرف لڑکی ہونے کی وجہ سے زید کو بھی زوجہ کے متروکہ سے چوتھا حصہ ملے گا ۔ اب بعد وفات زید زوجہ کی لڑکی زید کے متروکہ سے دینِ مہر کا دعویٰ اپنے حصۂ شرعیہ کے مطابق کرسکتی ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ورثاء کو وراثت کا حق مورث کی وفات کے بعد پیدا ہوتا ہے یا حین حیات ؟ اور کیا کسی وارث کو یہ حق حاصل ہے کہ مورث کی حیات میں اس کی املاک میں میراث کا دعویٰ کرے ؟

الجواب

مورث کی وفات کے بعد اس کا مال ، متروکہ ہوتا ہے اور اس میں ورثاء کا حق متعلق ہوتا ہے ۔ اس کی حین حیات اس کی ملک میں کسی وارث کو دعویٰ کا حق حاصل نہیں ہے ۔ در مختار کی کتاب الفرائض جلد ۵ میں ہے : و هل إرث الحي من الحي أم من الميت ؟ المعتمد الثاني ، شرح وهبانية ۔ عالمگیریہ کی کتاب الفرائض جلد ۹ میں ہے : و الإرث في اللغة البقاء و في الشرع انتقال مال الغير إلى الغير على سبيل الخلافة كذا في خزانة المفتين ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی زوجہ ہندہ کو اس کے پہلے شوہر سے ایک لڑکی مسماۃ سُلمیٰ ہے ۔ کیا زید کے انتقال کے بعد سلمیٰ کو زید کے متروکہ سے کچھ ملے گا یا نہیں ؟

الجواب

سُلمیٰ چونکہ زید کی لڑکی نہیں ہے ، اس لئے اُس کے متروکہ سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حقیقی بھائی بہن کے ساتھ ، علاتی بھائی بہن بھی حصہ پائیں گے یا نہیں ؟

الجواب

حقیقی کے مقابل علاتی محروم ہیں ۔ سراجی کے باب العصبات میں ہے : و ذو القرابتين أولى من ذي قرابة واحدة ذكراً كان او أنثىٰ لقوله عليه السلام : إن أعيان بني الأم يتوارثون دون بني العلات ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے دو ۲ بہنوں سے ایک کے بعد ایک نکاح کیا۔ دونوں سے دو ۲ لڑکے پیدا ہوئے۔ کیا یہ دونوں آپس میں حقیقی بھائی ہوں گے یا علاتی؟

الجواب

یہ دونوں علاتی بھائی ہیں۔ رد المحتار جلد ۵ کتاب الفرائض میں ہے: ان بنی الأعیان الإخوۃ لأب و ام سموا بذلک لأنھم من عین واحدۃ أی أب و أم واحدۃ، و ان بنی العلات الإخوۃ لأب سموا بذلک لأن الزوج قد عل من زوجته الثانیة۔ و العلل الشرب الثانی یقال علّه اذا سقاه السقیة الثانیة۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر متروکہ ذوی الفروض پر تقسیم ہوجائے اور عصبات کے لئے باقی نہ رہے، تو کیا عصبات متروکہ سے محروم ہوجائیں گے؟

الجواب

اگر ذوی الفروض سے کچھ بھی نہ بچے تو عصبات محروم ہوجائیں گے۔ سراجی مجتبائی کے صفحہ ۳ میں ہے: فیه إیماء إلیٰ أن أصحاب الفرائض لو استغرقوا المال فلا نصیب للعصبات۔ و اللہ اعلم۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کا بکر و خالد کو اپنے فرزند صلبی بیان کرکے انتقال ہوا، اور زید کی زوجہ ہندہ نے بھی یہ بیان کیا کہ دونوں میرے فرزند زید کے صلب سے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں بکر و خالد، زید کے ترکہ سے میراث پائیں گے؟

الجواب

میراث پائیں گے۔ عالمگیری جلد ۱ باب ثبوت النسب میں ہے: رجل قال لغلام ھذا ابنی ثم مات ثم جاءت أم الغلام و ھی حرۃ و قالت أنا امرأته فھی امرأته و یرثانه۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بکر کا انتقال ہوا۔ ورثہ میں دو ۲ چچا زاد بھائی اور دو ۲ مرحوم

چچا زاد بھائیوں کی اولاد ہے۔ کیا بکر کے ترکہ کے مستحق فقط چچا زاد بھائی ہوں گے ؟ یا مرحوم بھائیوں کی اولاد کو بھی حصہ ملے گا ؟

الجواب

چچا زاد بھائی چونکہ وارث قریب ہیں اس لئے ان کے مقابل چچا زاد بھائیوں کی اولاد محروم ہے۔ سراجی کے باب العصبات میں ہے: الأقرب فالأقرب یرجعون بقرب الدرجة ۔ و اللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید صرف ایک زوجہ چھوڑکر فوت ہوا ۔ ریاستِ حیدرآباد دکن میں چونکہ بیت المال غیر منتظم ہے ، تو کیا زید کی زوجہ اس کے تمام متروکہ کی بہ بنائے فرض و رد مستحق ہوگی یا نہیں ؟

الجواب

ریاست حیدرآباد دکن میں بیت المال غیر منتظم ہونے کی وجہ سے زید کی زوجہ بعد تقدیم ما تقدم علی الارث زید کے جملہ متروکہ کی بہ بنائے فرض و رد مستحق ہے ۔ سراجی طبع نظامی کے صفحہ ۲۹ باب الرد کے حاشیہ میں ہے: و فی الأشباہ انه یرد علیهما لفساد الزمان قال فی القنیة و یفتی بالرد علی الزوجین و هو قول المتاخرین من علمائنا و قال الحدادی الفتوی الیوم بالرد علی الزوجین ۔ و اللہ اعلم ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی کافر ہندو مالدار مرجائے اور اس کا ایک لڑکا مسلمان ہوگیا ہو ، تو کیا یہ لڑکا اس کے متروکہ سے حصہ پائے گا ۔ اور اگر اس کے دوسرے لڑکے باپ کے مذہب کے خلاف نصرانی یا آریہ وغیرہ ہوگئے ہیں تو ان کے متعلق کیا حکم ہے ؟

الجواب

مسلمان لڑکا ، کافر باپ کی میراث سے شرعاً محروم ہے ۔ البتہ وہ لڑکے جنہوں نے اسلام کے سوا دوسرا مذہب اختیار کرلیا ہے ، متروکہ سے حصہ پائیں گے ۔ کیونکہ شریعت میں کفار کے تمام فرقے ایک ہی دین سمجھے جاتے ہیں ۔ در مختار مطبوعہ بر حاشیہ رد المحتار جلد ۵ کتاب الفرائض صفحہ ۵۴۴ موانع ارث میں ہے: (و اختلاف الدّین) إسلاماً و کفراً ۔ رد المحتار میں ہے: قید به لأن الکفار یتوارثون فیما بینهم و ان اختلف مللهم عندنا لأن الکفر کله ملة واحدة ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے چھوٹے فرزند خالد کو اپنے خالہ زاد بھائی کی آغوش میں دے دیا۔ کیا خالد زید کے متروکہ سے محروم رہے گا؟

الجواب

متبنیٰ اپنے ماں باپ کے متروکہ سے محروم نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کو پرورش کرنے والے کے متروکہ سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ شریعت میں یہ اپنے ماں باپ کا لڑکا کہلاتا ہے، پرورش کرنے والے کا نہیں۔ جیسا کہ سورہ احزاب کی آیت کریمہ "وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ" سے ثابت ہے۔ و اللہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمرو نے پچاس سال کی عمر میں ایک نابالغ لڑکے کو اپنی آغوش میں لیا تھا، اور ہر ایک کے روبرو اس کو اپنا لڑکا ہونا مشہور کیا۔ حالانکہ عمرو ابتداء سن شعور سے اس عمر تک عنین تھا۔ عمرو کا انتقال ہوگیا ہے۔ کیا از روئے شرع شریف آغوش میں لیا ہوا لڑکا عمرو کے متروکہ سے میراث پاسکتا ہے یا عمرو کا بھائی؟

الجواب

شرع میں متبنیٰ کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگرچیکہ ایام جاہلیت میں متبنیٰ بھی متروکہ کا وارث بنایا جاتا تھا، مگر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زمانہ سے محروم کردیا گیا اور یہ صراحت کی گئی کہ کسی کو محض "بیٹا" کہنے سے حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا بلکہ وہ اپنے باپ ہی کا بیٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آیت ۴۔ ۵ میں ہے "وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اٰبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ مَوَالِيْكُمْ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَا اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○" تفسیر خازن میں اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ہے، و فيه نسخ التبني و ذلك ان الرجل كان في الجاهلية يتبنى الرجل و يجعله كالابن المولود يدعوه اليه الناس و يرث ميراثه و كان النبي صلى الله عليه و سلم اعتق زيد بن حارثة بن شراحيل الكلبي و تبناه قبل الوحي و آخى بينه و بين حمزة بن عبد المطلب فلما تزوج رسول الله صلى الله عليه و سلم زينب بنت جحش و كانت تحت زيد بن حارثة قال المنافقون تزوج محمد امراة ابنه و هو ينهى الناس عن ذلك فانزل الله هذه الآية و نسخ بها التبني۔ پس صورت مسئول عنہا میں آغوش میں لیا ہوا لڑکا عمرو کے متروکہ کا وارث نہیں ہے۔ بلکہ حسب فرائض بھائی و دیگر ورثہ جن کو عمرو نے مرتے وقت چھوڑا ہے متروکہ کے

مستحق ہیں۔ اگر عمرو نے اپنی حین حیات بحالتِ صحت یعنی مرض موت سے پہلے اپنے متبنیٰ کو کچھ دیدیا ہے اور قبضہ بھی کروادیا ہے تو وہ متبنیٰ کی ملک ہے عمرو کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کو واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کے مرنے کے بعد جبکہ زید کی زوجہ بقید حیات ہے، اس کے سامان جہیز و زیور وغیرہ میں زید کے ورثاء کو کچھ حق ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کس قدر؟ زید کا باپ اور ایک لڑکی اور زوجہ زندہ ہیں۔

الجواب

زوجہ کا سامانِ جہیز جو اُس کے ماں باپ نے دیا ہے، یا خاوند نے اپنی حین حیات ھبہ کرکے قبضہ بھی کروادیا ہے، وہ سب زوجہ کی ملک ہے۔ زوجہ کی حین حیات زید کے ورثہ کا اس میں کوئی حق نہیں۔ البتہ جو املاک و زیورات کہ زید نے زوجہ کو ھبہ بالقبض نہیں کیا وہ زید کا متروکہ ہے۔ بعد وضع مصارف تجہیز و تکفین و ادائی قرض و اجرائے وصیت، باقی کے ۲۴ حصے کرکے لڑکی کو ۱۲، باپ کو ۹ اور زوجہ کو ۳ حصے دیے جائیں۔ ھکذا صورۃ المسألہ:

زید مسألہ من ۲۴،

بنت	اب	زوجہ
۱۲	۹	۳

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی جائداد چھوڑ کر اپنی جائے قیام سے بوجہ ضرورت کسی اور مقام گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ ورثائے زید بوجہِ مسافتِ بعیدہ و دیگر وجوہ، مقام موت تک نہیں پہنچ سکے۔ اس واقعہ کو بیس پچیس سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ سرکار نے کسی وارث کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے عمرو کو زید مرحوم کی جائداد کے انتظام کے لئے مقرر کردیا۔ پس اس حالت میں ورثائے زید اپنی وراثت ثابت کرنے کے بعد کیا زید کی جملہ جائداد کے مستحق ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

میراث اور وقف کے دعویٰ کی سماعت کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔ ہر وقت ان دونوں دعووں کی سماعت ہوسکتی ہے۔ فتاویٰ ھندیہ جلد ۲ صفحہ ۴۴۳ میں ہے: و لم یقیدوا دعویٰ الارث و

الوقف بمدۃ۔ دُرِّ مختار مطبوعہ بر حاشیۂ رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۰۹ کتاب القضاء میں ہے: حتیٰ لو امر السلطان بعدم سماع الدعویٰ بعد خمس عشرۃ سنۃ فسمعہا لم ینفذ قلت فلا تسمع الآن بعدہا الا بامر الا فی الوقف و الارث و وجود عذر شرعی۔ پس صورتِ مسئولہ میں در صورتِ صداقتِ مستفتی، ورثائے زید بیس پچیس سال کے بعد بھی اپنی وراثت، بیّنۂ شرعیّہ سے ثابت کرکے زید کا متروکہ لے سکتے ہیں۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کسی لڑکے کو کم سنی کے زمانہ میں کسی کی آغوشی میں دیکر متبنیٰ بنا دیا جائے، یا گھر داماد بنا دیا جائے، تو ایسی صورت میں کیا اس کو اپنے والدین کا متروکہ ملے گا؟ اور اس پر والدین کے حقوق فرض ہیں یا نہیں؟

الجواب

در صورتِ صداقتِ مستفتی، لڑکے کے کسی کا متبنیٰ یا گھر داماد بن جانے سے وہ والدین کی میراث سے محروم نہیں ہوتا۔ والدین کی عین حیات ان کے تمام حقوق اس لڑکے پر باقی رہتے ہیں، اور ان کی وفات کے بعد ان کے متروکہ سے میراث بھی پاتا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں اگرچہ متبنیٰ لینے والے کی میراث سے متبنیٰ کے حقوق سمجھے جاتے تھے مگر اسلام میں سورۂ احزاب کی آیت کریمہ "وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ" سے اس قسم کے تمام حقوق بالکلیہ باطل کردیے گئے۔ پس جبکہ شریعت میں متبنیٰ، متبنیٰ لہ کی میراث سے محروم کردیا گیا ہے، تو اپنے والدین و عزیز و اقارب کے متروکہ سے ہرگز محروم نہیں ہوسکتا۔ و اللہ اعلم بالصواب، و الیہ المرجع و المآب۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

خاتمہ

شیخی و استاذی حضرت مولانا الحاج الحافظ مولوی محمد انوار اللہ خان بہادر نواب فضیلت جنگ علیہ الرحمہ معین المہام امورِ مذہبی سرکاری عالی نے راقم کو غرۂ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۸ ہجری سے مفتی مدرسہ نظامیہ مقرر فرماکر دار الافتاء کا افتتاح فرمایا تھا ۔ حضرت کے فیوض و برکات کی تائید سے راقم اس خدمت کو ۲۵ / شعبان سنہ ۱۳۳۷ ہجری مطابق ۲۰ / تیر سنہ ۱۳۲۸ فصلی تک انجام دیتا رہا ۔ اس نو (۹) سال کی خدمت میں راقم نے جس قدر فتوے لکھے ہیں وہ فتاویٰ نظامیہ حصۂ اول و حصۂ دوم کے نام سے سابق میں شائع ہوگئے ہیں ۔ باقی فتوے اس تیسرے حصہ میں شائع کئے گئے ہیں ۔

ناظرین کرام کے اعلیٰ اخلاق سے توقع ہے کہ بعد ملاحظہ راقم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے ۔ فقط

محمد رکن الدین



فہرست مسائل۔ فتاویٰ نظامیہ

کتاب العقائد

کتاب الطہارۃ

کتاب الصلاۃ

صلاة الجمعة و العيدين

کتاب الجنائز - ص ۹۷

کتاب الزکاۃ

کتاب الصوم

کتاب الحج - ص ۱۴۰

کتاب النکاح - ص ۱۴۷

(حلال و حرام رشتے)

کتاب الرضاع - ص ۲۲۰

باب النفقة - ص ۳۰۱

خورد و نوش، لباس، سکونت کے مصارف کے احکام

کتاب الطلاق - ص ۲۳۲

فسخ نکاح

عنین

مفقود الخبر - ص ۲۸۵

باب ثبوت النسب - ص ۲۸۸

کتاب الحضانۃ۔ ص ۲۹۲
(بچہ کو پرورش کرنے کا حق اور اس کا خرچ)

کتاب الأیمان۔ ص ۳۱۲
(قسم کھانے اور حنث ایمانا)

كتاب الحدود

(قصاص وغیرہ تعزیر جاری کرنا)

كتاب السير و الجهاد

کتاب البیوع - ص ۳۶۱
بیع و فروخت کے احکام

کتاب القضاء

(حکام اور ججوں کے احکام)

کتاب الشہادۃ

(گواہی کے احکام)

کتاب الوکالۃ (نیابت کے مسائل)

کتاب الدعوی

کتاب الاقرار

کتاب الودیعۃ
(امانت رکھوانے کے احکام)

کتاب العاریۃ
(عارضی طور پر چیز دینا)

کتاب الہبۃ ۔ ص ۳۹۳

باب العطایا
(سلطانی عطیات کے احکام)

کتاب الاجارۃ
(اجرت پر کام کرنے اور کرایہ کے احکام)

کتاب الحجر والماذون
(دیوانہ، نابالغ اور غلام کے معاملات کرنے پر روک ٹوک اور اجازت)

کتاب الغصب
(ناجائز قبضہ)

کتاب الشفعۃ

کتاب الصید والذبائح
(شکار اور ذبح کرنے کے مسائل)

کتاب الاضحیۃ
(قربانی کے مسائل)

کتاب الرھن و القرض

کتاب الوصایا۔ ص ۵۱۹
(وصیت کے احکام)

کتاب الفرائض۔ ص ۵۲۵
وراثت کے مسائل